

نورث کسٹریکٹ

سینسٹریکٹ

ماہنامہ

جولائی 2012

نورث کسٹریکٹ

سینسٹریکٹ

PDFBOOKSFREE.PK

مسافر

نئی سنسٹریکٹ خیز داستان کی
پانچویں قسط اندر کے صفحہ پر



حاصل اور وقت کے رنگوں
کھیتی ایک لکھن تصویر

مریم کے خان



آپ کے ہاتھوں کی لکھن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق ہم آہنگ

قارئین



گل دنگل سے لہو پر حنا تک ایک
مسافر بے نوا کی روداد حیات

ناصر ملک



معشری معاشرے کی جیسی اور
رشتہ کی نوا کی کاغذ کا احساس

تنویر ریاض



ایک عظیم بادشاہ اور عظیم
پیغمبر حضرت سلیمان کی روداد حیات

رضوانہ ساجد



حقوق کی بھٹی بھٹی بھٹی والے
ایک خوش قسمت کلمہ حبرا

نسیم جاوید سید



سید کی نگلی ڈھیر لگھی
نکا لے والا ایک شاعر فکار

سلیم انور



سرد کی ہنسی میں ایک
برساں چہرے پر کھنکھن

مختار آزاد



دنیا بھر سے لطف لے کر
سکراہٹیں اور قہقہے بکھڑکے

ارارہ



جہر زلزلہ کے اندر ہے جذبات میں غلام
برائے دینے والی ایک ہنگامہ خیز داستان

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی



سپنس کی مجلس شاورت قارئین کی تنخواہ
شیر باتیں، گلے شکوے اور پر خلوص مشورے



رقص جل کے درمیان صنف
نازک کے عزائم کی پختگی



نام نہاد فلاحی اداروں کی ستاعی
کھولتی ایک پراثر تحریر



جیتے جاگتے گارڈوں کی کہانیاں
کاغذ پر اندازہ اور عدالت کا منظر نامہ



حسین چہروں میں چھپی غلاظت
اور شرف کی بدحواسیاں

ڈاکٹر شیر شاہ سید



اب کو نقصان پہنچانے والے مافی ریوی
کی نشاندہی سماج کے اثر اور زندگی پر



ماضی کا آئینہ اختیار اور با اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



اسرار اور تحریر کے پردے میں
پیشا ایک منفرد طویل سلسلہ



بند مٹھی سے ریت کے نمائند
بکھرنی یادوں کا قصہ



دوڑوں کی کتنی اہلی بڑی کے احساس
مخمسلوب ایک سبق آموز جھلک

غلام قادر

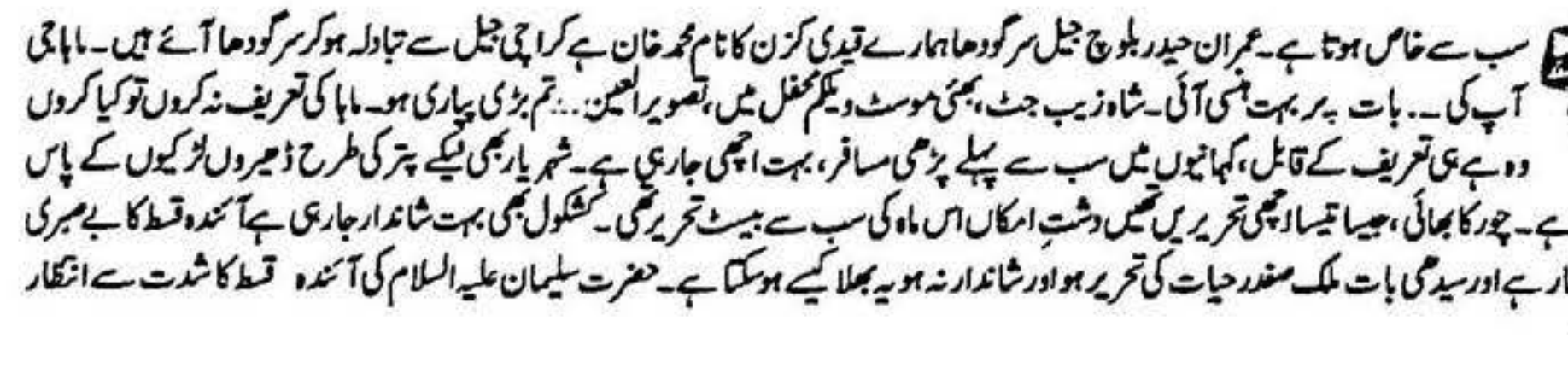
مشاعرہ

مشاعرے کے معنی ہیں شاعروں کا ایک دوسرے کو شعر ستانا یا شاعروں کا فن شعر گوئی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا۔ پہلے معنی کے پیش نظر غیر شاعر سامعین کا مشاعرے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شاعروں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اب رہے دوسرے معنی تو ان معنی کی رو سے مشاعرے کا سامعین سے بنیادی تعلق ہے اس لیے کہ جب شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوگا تو اس مقابلے کا فیصلہ کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو شاعر نہ ہوں اور اگر شاعر ہوں تو اس مقابلے میں شامل نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اب ناقد کہلاتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے دو عظیم شاعروں میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کا فیصلہ کرنے کے لیے ان دو شاعروں میں سے ایک شاعر کی بیوی مقرر کی گئی جو شاعری کی بہت بڑی پارکھچی۔ اس خاتون نے اپنے شوہر کی نظم کے خلاف اور حریف شاعر کی نظم کے حق میں فیصلہ دیا۔ عجب خاتون تھی۔ اس نیک بخت خاتون کا انجام کیا ہوا، یہ بات مجھے یاد نہیں رہی بہر حال اگر ہم میں سے کسی کی بیوی ہماری تخلیق کے خلاف اور ہمارے حریف کی تخلیق کے حق میں فیصلہ دیتی تو ہم اسے طلاق دے دیتے۔ ہمارے یہاں مشاعرے کا مفہوم مختلف ہے اور اپنے اس مفہوم کے پیش نظر مشاعرہ صرف اردو زبان سے مخصوص ہے۔ عربی میں مشاعرے کا جو دوسرا مفہوم ہے یعنی دو شاعروں کا باہمی مقابلہ، اس مفہوم کے اعتبار سے اردو مشاعرے اور عربی مشاعرے کی کیفیت میں فربہی مناسبت پائی جاتی ہے۔ اردو مشاعرے میں بھی دو شاعروں کے درمیان تو نہیں، مشاعرے میں شریک ہونے والے تمام شاعروں کے درمیان خواہ مخواہ مقابلے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فضا کے پیدا کرنے میں سامعین حسب ذوق اور برائے جانبدار کی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اس کے نتیجے میں کوئی ایک شاعر یا چند شاعر داد و تحسین کی بنیاد پر مشاعرے کے فتح مند شاعر قرار پاتے ہیں۔ مگر فتح مندی، کا یہ فیصلہ ایک ہنگامی فیصلہ ہوتا ہے اور اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی لیکن مشاعرے کے عام سامعین بلکہ تماشا بین اس شاعر کو جسے سب سے زیادہ داد ملے اور جس سے بار بار شعر ستانے کی فرمائش کی جائے سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بدترین شاعر یا بہت معمولی شاعر اپنے اشعار کے سطحی اور اپنی بڑھت کے انداز کے منوثر ہونے کی وجہ سے بہترین شاعر قرار پاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بڑے شاعروں کو مقابلے کی اس سطح پر بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کم یا زیادہ داد پانا کسی کسوٹی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ مشاعروں کے انعقاد کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہرگز نہیں ہوتا کہ کون شاعر یا کون کون سے شاعر بڑے یا بہترین شاعر ہیں۔

اردو کے قدیم مشاعروں کے سامعین معاشرے کے وہ لوگ ہوتے تھے جو اعلیٰ ادبی اور فنی شعور رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مشاعرہ کوئی عوامی ادارہ نہیں تھا۔ یہ مشاعرے درباروں اور اسراء کی حویلیوں میں منعقد ہوتے تھے۔ مشاعرے کو عوامی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب کالجوں اور یونیورسٹیوں یا دوران سال کی خاص سماجی تقریبات کے مواقع پر مشاعرے برپا ہونے شروع ہوئے۔ سیاسی تحریکوں نے بھی مشاعروں کو ایک خاص اہمیت بخشی۔ بہر حال ”عظیم الشان“ مشاعرے بیسویں صدی کی پیداوار ہیں اور اردو زبان کے خواص و عوام کے لیے سب سے اہم تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے خواص اور عوام کے فرق کو دور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

مشاعرے کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اس ضمن میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ مشاعرے کی نسبت سے دیکھا جائے تو شاعری کی چار قسمیں متعین ہیں۔ شاعری کی ایک قسم وہ ہے جو اچھی بھی ہو اور مشاعرے میں بھی پسند کی جائے۔ دوسری قسم وہ ہے جو اچھی ہو مگر مشاعرے میں داد حاصل نہ کر سکے۔ تیسری قسم وہ ہے جو بری ہو اور مشاعرے میں بھی بری قرار پائے اور چوتھی قسم وہ ہے جو بری ہو مگر مشاعرے میں بہت پسند کی جائے۔ بہر حال مشاعرہ ایک ایسا خطرناک ہنگامہ ہے جس میں شاعر کی عزت لمحہ لمحہ خطرے کی زد میں رہتی ہے۔ یہاں مجھے برادر عزیز معراج رسول نے ایک خاص معاملے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جو افراد یا ادارے مشاعرے منعقد کرتے ہیں وہ بلاشبہ قابل داد ہیں اس لیے کہ وہ ایسے ”ہنگامے“ بھی برپا کر سکتے ہیں جن سے عوام الناس کو مشاعروں سے کہیں زیادہ دلچسپی ہے اور جن کے ذریعے مشاعرے منعقد کرتے ہیں وہ بلاشبہ قابل داد ہیں اس لیے کہ وہ مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اب بعض مثالیں ایسی بھی پائی جانے لگی ہیں کہ مشاعرے ادبی اور تہذیبی ذوق کی تسکین کے بجائے شخص تجارتی مقصد کے پیش نظر برپا کیے جاتے ہیں اور ان میں ایسے ”شعرا“ اور ”شاعرات“ کو خاص اہتمام طور پر مدعو کیا جاتا ہے جو شخص گوئیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قبیل کے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خود کہتے ہیں اور بہت برا کہتے ہیں۔ مگر اپنی گانگی کی وجہ سے مشاعرے کو تروبالا کر ڈالتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خود نہیں کہتے بلکہ کسی ”مرد غیب“ سے کہلو لاتے ہیں اور اپنے نینٹوے کے زور پر مشاعرے کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس قسم میں شاعرات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ صورت حال بہت عام ہے۔ ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ترنم سے پڑھنے والے شاعروں کی تنقید کریں۔ ترنم سے پڑھنے والے بے شمار شاعر ایسے بھی ہیں جن کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مشاعرے کے عوام پسند اور خواص پسند تہذیبی ادارے کو اب آہستہ آہستہ شخص ایک سطحی قسم کے تفریحی ہنگامے کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ذمے دار وہ افراد اور ادارے ہیں جو مشاعروں کو اپنا تجارتی مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ معاملہ ہے جس کی شدید ہمت شکنی کی جانی چاہیے۔ کیونکہ اب مشاعرہ ہی وہ سب سے بڑا ادبی اور معیاری ادارہ رہ گیا ہے جو اعلیٰ ذہنی فرحت بخشی اور تہذیبی نفس کا فرض انجام دیتا ہے اور اس کی اس محترم اور اہم حیثیت کی حفاظت کرنا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔

طاہرہ یاسمین، ضلع سرگودھا سے محفل میں چلی آ رہی ہیں۔ اس ماہ کا شمار 17 مئی کی دوپہر کو مل گیا تھا۔ شہزاد نے لاکر دیا۔ داخل کرل بہت سندر
نی بالکل اپنی سحد یہ بخاری جیسی۔ پھر محفل یاراں میں پہنچے تو کرسی صدارت پر محمد جاوید بلوچ بھائی کو پایا، مبارک ہو بھائی جان، آپ کا تبرہ اس بار سب سے
برون تھا۔ اس بار جتنی شیل جی نے ہم سب کی التجا آخر مان لی۔ آپ کی کہانی بہت شاندار تھی اب ناراض مت ہونا اور لکھتی رہنا۔ سحد یہ بخاری جی آپ کے
ن الفاظ سے بہت خوشی ہوئی سب گھروالوں کو بھی اور مجھے بھی معصوم سا تبرہ والی بات پر آپ کا بے حد شکریہ۔ آپ کا تبرہ بھی بہت اچھا لگا۔ حجاب کنول خان
سپ کا یہ اندازہ تو غلط ثابت ہو گیا کہ شیر علی خان کا اگلا خط چپے گا۔ حجاب کنول جی آپ نے یہ کیوں کہا کہ قدرت اللہ کے تبرے میں خاص بات نہ تھی ان کا تبرہ تو



✽ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ہاؤن، خانہ نال سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سرورق کی حسرت امید و یاس کی کیفیت میں نظر آئی کہ اتنا انتظار تو کر لیا ہے نیازی“ آتا بھی ہے یا نہیں؟ (واہ واہ..... کیا خوش فہمی ہے) جون ایلیا شعور انسانی پر لب کشا ملے۔ ادارہ میں گزشتہ ماہ ہونے والے حادثات کا ذکر تھا ہر پاکستانی افسردہ ہے۔ اتنے روز کی جدوجہد کے بعد بھی تکیاری میں ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی (حکمران کچھ پیش رفت نظر آ رہی ہے) محمد علی اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ اول نمبر پر تھے، بلاشبہ ایک بہترین تبصرہ تھا۔ سحدیہ بخاری وہ محاورہ ہے کہ ”زبان خلق نقارہ خدا“ تو اب مان ہی یادداشت کے معاملے میں آپ کے بارے میں تمام دوستوں کی رائے ایک ہی ہے..... ماہا کی واپسی کو آپ نے نارزن کی واپسی قرار دے کر بہت زیادتی..... حسین حماس بلوچ! خیر مبارک اور دعا ہے کہ اللہ آپ کو پھر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع دے، آمین۔ ماہا ایمان! آخر آپ نے خود کو مانند حاکم سلیم یا عمر بھی تو بہت ہو گئی ہے۔ 1990ء کا ایک سسٹم بچھلے دنوں ہاتھ لگا تو آپ کا خط پڑھنے کا اتفاق بھی ہوا باقی حساب کتاب دوست خود کر لیں اور ایک بھی آپ کو بتانا چلوں کہ آپ کی ”شارقہ“ اب کبھی نہیں آئے گی محفل میں۔ شاہ زیب جٹ! ابراہم آپ نے تو سسٹم اور جاسوسی کو گڈ کر دیا ہے۔ عمران آپ کو گس نے روکا ہے بوتلیاں مارنے سے۔ لہیا انصاری! یہ بڑھے ویلے B.A. کرنے کی کیا سوچھی آپ کو؟ کتا میں تو ہیں لیکن دیں گے نہیں کیونکہ Change ہو گیا ہے۔ بہتر ہے نئی کتابیں لے لیں۔ طاہرہ یاسمین! جیو، دل خوش کر دیا، ہماری طرف سے ماہا کو جواب دے کر۔ احمد خان توحید! ابھی نے کا مشورہ سحدیہ بخاری کو دیا گیا ہے آپ کی یادداشت تو ماشا اللہ کافی اچھی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی، شہر یار کا مطلوبہ بندہ یقیناً ن ہی ہوگا۔ مشکوٰۃ میں لیاقت حسین کے ہم زاد نے پھر کام دکھا دیا اور جگا اور اس کے آدمیوں کو دھماکے والی جگہ سے نکال کر لے گیا۔ ہاشم کی خودکشی اچھی جب مرثیائی تھا تو شیخ حامد کو مار کر ہی مر جاتا اور دل کا تو بھلا ہو جاتا۔ ڈاکٹر ساجد امجد شہاب الدین کے دور حکومت کی تاریخ بیان کرتے نظر آئے اور اس کو لچپ ہیرائے میں کہانی کے قالب میں ڈھالا جس سے تاریخ کے خشک واقعات بھی دلچسپ محسوس ہوئے۔ ایم اے راحت وصال ختم میں عورت کے بے سے آگاہ کرتے نظر آئے۔ ثمانہ خان کا طرچہ واردات واقعی لا جواب تھا اس کا حسرت اور دولت مل کر مرد حضرات کو بالکل ہی دیوانہ کر دیتے تھے اور وہ دکھا جاتی۔ اپنا بچہ میں حکیم صاحب تو بڑے چالاک نکلے اور بے چارے میاں بیوی کو مل دے کر دس لاکھ ہڑپ کر گئے۔ ملک مفرد حیات سید می بات نے، نوا جا اور اس کے سامنے نے رقم کے لاچ میں ایک ماں کو اس کے اکلوتے بیٹے سے محروم کر دیا اور خود بھی سزا سے نہ بچ سکے۔ دوستوں کے اص بار پر جتنی ٹیل کاغج کی چوڑی لے کر آئی تھیں۔ کانتا جب ریش سے دھوکا کھا بیٹھی تو اسے راجن کمار اچھا لگنے لگا۔ راجن نے سب کچھ جانتے ہوئے جرات بہت عجیب لگا۔ نپلے پہ دیلا میں چور کو پڑ گئے مور، میٹلکم واقعی احسن نکلا، ذاتی اے، ٹی ایم رسید کو دھمکی نما پیغام کے لیے استعمال کیا اور پھر ادھ کھا یا سینڈویچ ہماگ نکلا۔ رابرٹ نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اب بات ہو جائے آخری صفحات پر موجود کہانی دشت امکان کی اگرچہ یہ ایک اچھی کہانی تھی لیکن بہت سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ ایک نقل شدہ کہانی ہے۔ عائشہ قاسم نے اگرچہ ایک دو جگہ صورت حال میں تبدیلی کی ہے۔ تاہم آغاز و انجام سب وہی ہے (بعض کہانی میں مشابہت صرف اتفاقی ہوتی ہے) محفل شعرو سخن میں بہت اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔ کمال انور اور محمد لطیف ساحل کا انتخاب سب سے بہترین تھا۔“

لوڈیٹنگ نے میرپور خاص کے باسیوں کو دہرے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ جمہوریت پسندوں کو خلق خدا کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ عوام بلک رہے ہیں۔ تڑپ رہے ہیں۔ لیکن حکمران ہیں کے کو الیغائیڈ اور ڈس کو الیغائیڈ کے چکر میں لگے ہوئے ہیں..... اللہ کی پناہ، اس قدر ظلم۔ نہ جانے عالم یہ بات کیوں بھول گیا ہے کہ جب مظلوم کی آہ عرش سے گمراہے گی اور جب خالق کائنات کی پکڑ شروع ہوگی تو پھر کوئی نہیں بچے گا کوئی نہیں.....

✽ عمران علی، جھنگ سے ملے آ رہے ہیں "اس دفعہ سہسپس 18 تاریخ کو ملا۔ انگل ذکر لگتا ہے اس بار آپ بڑی سادگی پہ اتر آئے ہیں۔ شاہکار بہت اچھا اور سادہ تھا۔ انشاء میں اس بار شعور کے موضوع پر بحث کی گئی تھی۔ شعور ہی کی وجہ سے انسان زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے اگر انسان میں شعور ہے تو منزلیں جلد طے کر لے گا ورنہ منزلیں بہت کٹھن، دشوار گزار راستوں کی طرح اس کو آگے نہ بڑھنے دیں گی۔ یاران محفل میں محمد جاوید بلوچ صاحب کو کرسی صدارت پر ابراجمان پایا۔ سدا خوش رہے جاوید صاحب۔ سب سے پہلے لیبیا انصاری کے تبرے پر بحث کروں گا۔ تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ کیا لیبیا کو ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ سب دوست اگر مل کر یہ مسئلہ حل کر دیں تو نیکی اور کار ثواب میں حصہ لینے کے مترادف ہوگا (آپ سب کا کیا خیال ہے) اس بار تبرہ نہیں لکھتا تھا بالکل نام نہیں تھا اگلے مہینے ایم اے کے امتحان ہیں اور ساتھ ٹیکہ بھی، بڑی مشکل سے نام نکالا ہے۔ شاید اگلی محفلوں میں کچھ غیر حاضری ہو، دعا کرنا رب غافل امتحانوں میں کامیابی عطا فرمائے، آمین۔ لیبیا اگر بی اے کا نصاب پنجاب اور بہاولپور یونیورسٹی کا ایک جیسا ہے تو کتاب میں میرے پاس پڑی ہیں تو ایڈریس بتا دیں میں بھیج دوں گا۔ جاوید صاحب بہت خوب فرمایا۔ رجسٹر حاضری نہیں واقعی کھڑے لائن ہے۔ یہ تو تفسیر صاحب سے پوچھنا پڑے گا کہ تبرہ کہاں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ جی تفسیر صاحب، بتائیں ذرا۔ سعد یہ بخاری یہ ماہانہ نازن کب سے بنی ہیں۔ لگتا ہے آپ نے لیڈی پولیس جو ان کی ہوئی ہے۔ حسنین بھائی دعاؤں کا شکر یہ۔ آپ جھنگ کس جگہ پر رہتے تھے۔ حجاب کنول جی، سویت ویکم، جی آیاں نوں۔ عمران حیدر بلوچ رب تعالیٰ آپ کو رہائی نصیب فرمائے۔ واقعی ماہا کے آنے سے محفل بھی ہے۔ شاہ زیب جٹ، جی آیاں نو اللہ آپ کو کامیابی دے (آمین) آتے رہے گا۔ کچھ پرانے چہروں سے شناسائی ہو رہی ہے مثلاً حمیرا رضا، لیبیا انصاری، سعد یہ بخاری جیسے اور چہرے بھی منظر عام پر آنے لگ گئے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ طاہرہ آج کل کے دور میں کوئی اچھی بات کو اپنی زندگی میں مثال نہیں کرتا، مہتاب سے عمل نہیں کرتا۔ سب کو سیدھے نام سے پکارنا چاہیے۔ شاید حدیث پاک پڑھی تھی کہ جب کوئی بندہ کسی دوسرے کا نام سیدھا نہیں بولتا اس کے لیے نیکی جس کا نام بولا اس کی طرف چلی جاتی ہے۔ تصویر العین یہ کیا کہیں ماہا کو داد دے رہی ہو کہیں اس کی ٹانگ کھینچ رہی ہو خیر تو ہے۔ احمد خان توحیدی آئی سہسپس دسر گزشت میں بہت اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جو انسان کو بہت کچھ سوچنے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ طاہرہ یا سمین، ماہا ایمان اور جاوید بلوچ کے تبرے اچھے لگے۔ اب آتے ہیں خوبصورت کہانیوں کی طرف، سب سے پہلے بڑی بے مبری سے مسافر اور کشکول پڑھی وہ بھی ایک ہی نشست میں ختم، بہت مزہ آیا۔ دونوں کہانیوں کا ایڈ وچر اب بہت جاندار ہو گیا ہے۔ عائشہ فاطمہ کی کہانی دشت امکان زندگی میں حقیقت یہی ہے کہ تقدیر کسی کے ساتھ رحمت عایت نہیں کرتی کسی زندگی میں جو کرنا ہو وہ بڑی سادگی سے کر دیتی ہے۔ محبت میں بھڑنا آزمائنا اک ادا اسی ہے لیکن کبھی اتنی کٹھن آزمائش ملتی ہے کہ جو زندگی میں نہ بھولنے والا حصہ بن جاتی ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی سیدھی بات واقعی لالچ بری بلا ہے، ہر مجرم سے کوئی نیکوئی محمول ہو جاتی ہے اور اللہ کی لاشی بھی بے آواز ہے۔ روحانیت کے موضوع پر رضوانہ ساجد کی کہانی حضرت سلیمان، سبحان اللہ..... اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو بہت اعلیٰ مقام عطا فرمایا۔ حضرت سلیمان کی سوانح حیات میں کچھ نئے واقعات پڑھنے کو ملے۔ شکر یہ۔"

سینٹینٹل انجینئرنگ کالج، لاہور



متاثر ہیں اور میرے سسپنس کی نسبت جاسوسی میں شائع ہونے والے خطوط کو زیادہ توجہ سے پڑھتی ہیں اور دوسری یہ کہ میرا ہر خط پچھلے کا تسلسل ہوتا ہے سو اس لیے مجھے آپ کی طرح اردو لغت اور پرانے رسالے کھانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رمضان پاشا، سعدیہ بخاری اور ماہ ایمان صاحبہ ہمبرہ پسند کرنے کا شکر یہ۔ لہذا انصاری آپ کا کام تو صرف ایک بندہ ہی کر سکتا ہے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ، تصویر الحسن صاحبہ آپ کے خاکے کب شائع ہو رہے ہیں؟ وصال منم نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ اپنا پچھلی مزاح کی حامل عام سی تحریر تھی۔ مکمل ہی مکمل میں جرائم پیشہ افراد کی رسائی کی روداد لیے شرارتی معیاری انتخاب تھا۔ چور کا بھائی ان لوگوں کو آئینہ دکھا رہی تھی جو زندگی کے ہر شعبے میں مکمل منافقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کاشف صاحب کی تحریر ہمیشہ سے جداگانہ اور منفرد ہوتی ہے۔ جیسا تیسرا بھی ان کا بہترین انتخاب تھا۔ ضرورت جب بڑھ کر حرم کی شکل اختیار کر جائے تو وہی کچھ ہوتا ہے جو خواب میں سوئی ٹیلر کے ساتھ ہوا۔ ادب اپنے اظہار کے لیے کسی مخصوص ماحول، موضوع یا تخیل کا مہوون منت نہیں ہوتا۔ رجنی ٹیلر کی جتنی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، گستاخی معاف محترمہ سعادت حسن منٹو اور محنت چٹائی کی فکر سے متاثر تھیں، رجنی صاحبہ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ تحریروں میں خورج، معاشرتی ناہمواریوں، مسائل، طبقاتی تقسیم اور برائیوں کے خلاف جدوجہد کا رنگ نمایاں ہونا چاہیے۔ ذہانت اور طاقت کے درمیان معمولی سافرق ہوتا ہے، اسی فرق کو بیان کرتی نیلے پہ دہلا بہترین رہی۔ بد نصیبی اور بری قسمت کے گرد گھومتی جیت ہار متاثر کن رہی۔ محفل شعر و سخن میں محمد کامران اور ماریہ بیٹو کا انتخاب پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی سلطان شہاب الدین غوری کے بارے میں تحریر پڑھنے کے بعد تپشی کا احساس نمایاں تھا۔ حضرت سلیمان کی روداد حیات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ کھنکھول اپنے ابتدائی تاثر کے برعکس ثابت ہو رہی ہے۔ کہانی کچھ غیر حقیقی اور دواہسی کی مانند کسی اور سمت میں رواں دواں ہے۔ مسافر کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ اپنے سابقہ انداز کے برعکس ناصر صاحب بڑی خوب صورتی سے مسافر کا سفر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور اتار چڑھاؤ کو مد نظر رکھتے ہوئے موثر انداز میں بیان کر رہے ہیں۔ ملک صفدر حیات صاحب کی سیدمی بات کافی نیڑی کھیر ثابت ہوئی۔ پتا نہیں کیوں یوں لگتا ہے کہ ملک صاحب کے کیسوں میں اب حقیقت کم اور افسانوی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ دشت امکان ہماری تمام تر امیدوں کے برعکس عام سی تحریر رہی۔“

✽ اور ایس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سب سے پہلے ٹائٹل کا تعریفی و تنقیدی جائزہ لیا جہاں ٹائٹل گرل آنکھیں بند کیے سہانے پنپنے دیکھنے میں منہمک ہے۔ آگے بڑھ کر انٹرویو کے دانش مندی کی گفتگو میں شامل ہوئے جہاں شعور اور بے شعوری کا ادراک کیا جا رہا ہے۔ ادارے سے مستفید ہونے پھر اپنی اور سب دوستوں کی سبکی سنواری محفل میں قدم رنج فرمایا۔ پہلے نمبر پر آنے پر محمد جاوید بلوچ کو مبارک باد۔ دیگر ساتھیوں میں نرم گرم گفت و شنید جاری تھی۔ پانچ مہینوں کے بعد اپنا خط نظر آیا بہت بہت شکر یہ۔ محفل کو گرما گرمی پر چھوڑ کر آگے بڑھے سب سے پہلے مسافر سے ابتدا کی۔ مسافر دلچسپی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ بوریت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ کھنکھول بھی اچھی تحریر ہے اور دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہے۔ تاریخی کہانی غزنی تادیلی ڈاکٹر ساجد امجد کی کہنہ مشققی کا ثبوت تھی۔ منتظر امام کی اپنا پچھلی اچھی تحریر تھی، بخاری آزاد کی شرارت جہاں دو بچوں نے شرارت کے دوران دو ڈاکوؤں کو پکڑوا دیا جو ان کے لیے باعث فخر بن گیا۔ چور کا بھائی بھی ایک اچھی کہانی تھی جہاں چور کو مور پڑ گئے۔ جیسا تیسرا، خواب، کا کچھ کی چوڑی اچھی کہانیاں تھیں۔ میکلم کی شاطر دماغی کے جادو جودہ رقم کے حصول میں ناکام ہوا اس کی محنت کا پھل کسی اور نے کھایا۔ خوب صورت روحانی سلسلہ حضرت سلیمان علیہ السلام پڑھ کر ایمان کو جلا ملی اور دل روشنی سے منور ہوا۔ دوسری قسط کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔ شرعاً اس کی جیت ہار جھانٹا کر لیے تھی جہاں کتھرن نے اپنے شوہر کو مار کر ساری دولت کے لالچ میں آدمی سے بھی اپنے آپ سے محروم کر لیا۔ گھٹیا حرکت میں جونی اور بیٹریک بھاری دولت سے ناکامی سے دوچار ہوئے۔ حسب معمول دروایت صفحات کی آخری کہانی بہت خوب صورت اور معنوی اثر لیے تھی۔ جہاں محبت کے جذبات سے زیادہ ہوش اور تدبیر سے کام لیا۔“

✽ ساجدہ راجا، ہندواں، سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئی ہیں ”میں کافی عرصے سے سسپنس ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ اناڑی میری پسندیدہ ترین کہانی تھی۔ پھر اناڑی کی نئی مسافر نے پوری کردی۔ ناصر ملک صاحب نے جب بھی لکھا، خوب لکھا۔ جنت کے بعد مسافران کی زبردست تحریر ہے۔ اگر میں کہوں کہ اناڑی کے بعد مسافر ہی میرے سسپنس پڑھنے کی وجہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ باقی رسالہ بھی بہت اچھا ہے بس ایک چیز کافی بور کر دیتی ہے اور وہ ہے قارئین کے لیے بے خطوط اور پھر ایک دوسرے پر حد سے زیادہ تعریف و تحقیر۔ ویسے میں سرگودھا والوں کے خطوط بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ پچھلے سال انٹریا ہے۔ اب بی اے کی طرف رواں دواں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ قارئین مجھے کوئی بوڑھی ٹائپ سمجھنے لگیں، ماہلک کی طرح۔ صنف نازک اور صنف کرخت کے درمیان جو جنگ لگی رہتی ہے کیا خیال ہے میں سیز فائر کروا دوں؟ صرف اتنا کہوں گی کہ پلیز ایک دوسرے پر اتنی تحقیر مت کیا کریں کہ اگلا بندہ شرمندہ ہو جائے۔“ (آپ کی تحریر کو پڑھ کر فیصلہ کیا جائے گا)

✽ انور یوسف زئی، اسلام آباد سے محفل کی زینت بنے ہیں ”برسوں سے سسپنس کا شیدائی ہوں پر لکھنے کی جرات پہلی بار کر رہا ہوں۔ (خوش آمدید) جون ایلیا کا شعور زبردست رہا۔ ناصر ملک صاحب کی مسافر بس ٹھیک ہی رہی کیونکہ اس بار وہ سب رنگ ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے بازی گر کی نقل کرنے لگے ہیں۔ ان سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنی طرز برقرار رکھیں۔ انوار صدیقی کا اپنا ہی رنگ ہے جو کھنکھول میں اپنانے میں کامیاب جا رہے ہیں۔ عائشہ فاطمہ کی دشت امکان خالص مستورات کے لیے ہے۔ غیر ملکی کہانیوں کے اصل معنی کا نام بھی شائع ہوتا بہتر ہوگا۔ صفدر حیات صاحب کی سیدمی بات اچھی تحریر ہے۔ ایم اے راحت کی وصال منم اس ماہ کی بہترین تحریر ہے۔“

✽ حاجی عبدالکیم، خانوالا سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”شکر ہے ذاکر صاحب نے اس دفعہ مردوق کو صنف کرخت سے محفوظ رکھا ہے۔ جون ایلیا صاحب کا انٹرویو انسانی شعور کس اور کس کے خوب صورت گلدستے سے سجا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس میں اُپس اور اُپس سے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ تخت طاؤس پر محمد جاوید بلوچ صاحب رونق افروز ہیں، بہترین تبصرے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ ماہ ایمان مینی کو عاشقان سسپنس میں



سرفہرست آنے پر بھی مبارک باد قبول ہو۔ حسین بلوچ صاحب میں ہر روز نماز تہجد میں آپ کی رہائی کی دعا کرتا ہوں۔ آپ کی کتنی سزا باقی ہے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب اور ماہ ایمان، ہمایوں سعید راج، شیر علی خاں (خانوالا سے) سب نے اپنے حکیم انگل کو بھلا دیا اور آپ نے بھی ماشا اللہ ہمیں بلیک لسٹ میں شامل کر لیا ہے لیکن ہم اس پر بھی آپ کے مشکور ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف کھنکھول اور مسافر نے دل کو مسحور کر دیا ہے۔ باقی کہانیوں میں غزنی تادیلی سے لے کر دشت امکان اور اچھوتی محبت تک تمام کہانیاں پھولوں کا ایک ایسا بیارنگ گلدستہ ہے جس کے ہر پھول کی خوشبو علیحدہ ہے میری طرف سے تمام قارئین کو تمام ادارتی اسٹاف کو بہت بہت دعائیں۔ جس شعر سے متاثر ہو کر میں نے ماہنامہ سسپنس کے قارئین میں شمولیت اختیار کی تھی ایک بار پھر آپ سب کو الوداع کہتے ہوئے وہی شعر آپ سب کی نذر کر رہا ہوں کیونکہ اب میری زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس اللہ تعالیٰ کی یاد میں گزر رہی ہے۔ اس شعر کے ساتھ ہی آپ سب سے اجازت چاہتا ہوں۔

سجدوں کے عوض مجھے بہشت ملے یہ بات مجھے منظور نہیں ہے
لوٹ عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں
(اللہ آپ کی عبادت قبول فرمائے اور ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کریں لیکن ہم سے رشتہ نہ توڑیں اور محفل کے لوگوں کی دل آزاری نہ کریں کیونکہ دل توڑنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔ محفل کے شرکا آپ کا انتظار کریں گے)

✽ احسان سحر، میانوالی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”شمارہ ہاتھ آتے ہی اس بار ٹائٹل گرل صنف نازک کوئی چھوٹی عمر کی کھلتی ہوئی محسوس ہوئی بالوں کا اسٹائل ہی بتا رہا تھا کہ شرارتی بھی بڑی ہوگی..... آغاز جون ایلیا صاحب سے کیا۔ شعور، یہ شعور ہی ہمیں حیوان سے انسان بناتا ہے۔ عقل و شعور سے ہی ہم ممکن کو ناممکن بنادیتے ہیں..... آغاز محفل گفتگو سے کیا جہاں پر اس مرتبہ محمد بلوچ صاحب تشریف آور تھے اور اس ماہ کی پتھر کی کرسی لے اڑے، مبارک ہو بھی۔ سعدیہ بخاری سالوئی سلونی محبوبہ کو یاد کر کے تبصرے کا آغاز کیا اور ماہ کی اتنی خوشامد بھی مت کرو، غرور میں جلتا ہو گئی تو.....؟ حسین عباس آپ کے لیے اور آپ کے دوست کے لیے دل سے دعائیں لکھتی ہیں۔ حجاب کنول اب تو خوش ہیں نا آپ.....؟ ماہاجی عاشقان سسپنس میں سب ہی اس کے عاشق ہیں پر ہر کوئی دوسرے کی نسبت خود کو زیادہ تسلیم کرتا ہے۔ تصویر الحسن اس دفعہ اداس دل کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ طاہرہ یاسمین اللہ پاک آپ کے بیٹے کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سب سے پہلے اپنا پچھ پڑھی مختصر مگر جامع تحریر تھی۔ میاں بیوی کی حماقتوں نے خوب ہنسایا۔ وصال منم میں ایم اے راحت صاحب بازی لے گئے۔ کالے راستے کے بعد یہ کہانی بھی شاہکار رہی۔ شانہ خان کی عیاریوں نے حیران کیا اور صنف کے ابتدائی ڈائلاگ دل میں بس گئے۔ چور کا بھائی لالچ کے انجام پر بھی تحریر رہی، دولت کی ہوس ہی آخر میکلم کو لے ڈوبی..... جیت ہار شرعاً اس کی مختصر مگر چوکنا دینے والی تحریر رہی۔ حضرت سلیمان پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ شعر و سخن میں تمام اشعار اچھے لگے۔ قسط وار کہانی مسافر پڑھی، مسافر ناصر ملک کی اسٹوری ہر ماہ دل میں اترتی جا رہی ہے۔ جس طرح کی یہ کہانی ہے، بہت جلد سسپنس کے قیمتی صفحات پر دل میں بس جانے والی خوشبو پیدا کر دے گی..... انداز موثر ڈائلاگ، کردار نگاری، منظر نگاری کا چٹا بہت شاندار ہے۔ سسپنس کی پوری ٹیم اور معراج انگل کا بہت بہت شکر یہ کہ ایسی شاہکار کہانی کو سسپنس کے صفحات پر سجایا۔“

✽ حسن نظامی، قبولہ شریف سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ”پہلی بار اپنی محفل میں دستک دے رہا ہوں۔ پرچہ مختلف رنگوں کا حسین استخراج ہے۔ دیکھی سکی اور واقعاتی سلسلوں کا انمول اور منفرد مجموعہ ہے جو ہر ماہ رسے ناسوروں پر مرہم کا کام دیتا ہے۔ جون ایلیا ہر ماہ اپنے انشائیے میں ہر موضوع پر طبع آزمائی خوب صورت انداز میں سجاتے ہیں اور بلاشبہ یہ ایڈیٹر کی کامیابی و کامرانی کے مرہون منت ہے۔ سعدیہ بخاری ایک سے جلدو گر تھیں جنہوں نے پرچہ پر خوب صورتی سے اپنے جذبات کی عکاسی کی۔ حسین عباس بلوچ صاحب ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا نے جس پہلو سے پردہ اٹھایا۔ خداوند کریم انہیں بازیاب کرائے اور انہیں تندرستی سے نوازے۔ عمران علی شورو کوٹ ضلع جھنگ، ماہ ایمان حافظ عباس، طاہر الدین بیگ میر پور خاص، طاہرہ یاسمین سرگودھا، جمیر ارشاد لاہور بھی ساتھیوں نے اپنے انداز میں پرچہ پر خوب صورت تبصرے کیے۔ تاریخی تحریر ڈاکٹر ساجد امجد، غزنوی تادیلی کا سفر اچھا معیاری اور منفرد انداز تحریر تھا۔ غزنوی اور شاہی خاندانوں اور مسلم مجاہدوں کی تاریخ سنہری حروف سے عبارت ہے۔ ایم اے راحت، وصال منم کے ساتھ جلدو گر تھے جو گفتگوں، محبتوں اور وفاؤں کے بلاشبہ اچھے عکاس ظاہر ہوئے مگر خوابوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ انوار صدیقی صاحب ہمیشہ کی طرح کھنکھول میں اپنے لفظوں کا جادو جگا رہے تھے۔ لیاقت حسین کو خدا کی عطا اور شبی طاقت کا ساتھ تھا جو ہر قدم اور ہر مشکل گھڑی میں ساتھ دے جایا کرتی تھی۔ سیدمی بات میں حسام بٹ اپنے راوی ملک صفدر حیات کے سنگ قوانین اور واقعات کی روشنی میں اپنے قلم کا جادو جگا رہے تھے وہ زندگی کے مختلف چہروں کی حقیقتوں کو بہت کشادگی سے رقم کرتے ہیں اور آج کے نفسانسی کے اس دور میں ایسے فرض شناس آفیسر تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ دوسری سلسلہ دائرہ تحریر ناصر ملک کی مسافر اچھی راہوں کی طرف گامزن تھی۔ ملک صاحب ہمیشہ سے خشک قلم چلانے کے ماہر رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جذبے سے بچے ہوں تو راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ شرعاً اس، جیت ہار مقدروں کی بازی پر قلم چلانے والے لکھاری نے اپنا انداز تحریر خوب سے خوب ترکی تلاش میں سرگرداں رکھا۔ تقدیر اور قسمت کے مکمل کو منفرد انداز میں بیان کیا جو مدت تک یاد رہے گا۔ عبدالقیوم شاد کی گھٹیا حرکت میں بدلنے ہوئے انداز زندگی بسر کرنے والوں کا انجام وہی ہوتا ہے جسے لکھاری نے اپنے خوب صورت لفظوں سے سنوارا۔ عائشہ فاطمہ دشت امکان کے ساتھ حاضر تھیں۔ وفاؤں کو نہایا کے کناروں کے مانند ٹھہرایا جو دور دورہ کرکھی ساتھ ساتھ نہیں رہ پاتے مگر جذبے صادق ہوں تو کبھی کبھی قسمت مہربان ہوئی جایا کرتی ہے۔ پرچہ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔“

✽ شبانہ حسن، لاہور کینٹ سے تبصرہ کر رہی ہیں ”جون کا شمارہ 17 تاریخ کو ملتا تو دل کو سکون سا آ گیا۔ ٹائٹل گرل کچھ مفرد سی لگی۔ جون ایلیا کے انشائیے بہت اچھے اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ وصال منم میں مورت کو روئے زمین پر خوفناک جاندار لکھا گیا لیکن آخر میں مرزے مات دے دی مورت کو۔ کھنکھول اب کافی بہتر ہو گئی ہے، سیون اسٹار کی کردار تا میرا خیال ہے میڈم روہی ہے۔ مسافر کے کیا کہنے شروع سے زبردست جا رہی ہے۔



کہانی اب گاؤں سے شہر جا پہنچی ہے شہر یار نے تو فرہاد تیور علی کی یاد دلا دی کہ ہر لڑکی اس پر فدا ہو جاتی ہے۔ منظر امام کی کہانی اپنا پیچہ پڑھی تو ایک محاورہ یاد آ گیا کہ بچہ اپنا اچھا لکھا ہے اور بیوی دوسرے کی۔ کالج کی چوڑی اچھی تھی کہ مرد عورت پر اعتبار کرے تو وہ ماضی کی غلطی نہیں دہرائی۔ دشت امکان عاتشہ فاطمہ کی کاوش اچھی ہے کہ محبت اور دوستی میں آزمانے سے دکھ اور جدائی کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ ایک گزارش ہے کہ سکندر اعظم اور چنگیز خان کے بارے میں تفصیل سے دوبارہ شائع کریں۔ شرارتی میں بچوں کی ذہانت قابل دید تھی۔ محی الدین نواب اور ایم اے راجت میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ اشعار کی محفل میں افتخار احمد قادر، کوثر قادر بخش، راجا افتخار علی افغانی فرام چو آسمان شاہ، محمد اشفاق سیال فرام شور کوٹ کے اشعار اچھے تھے۔

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے فرما رہے ہیں ”دیکھتے ہی سرورقی آنکھوں کو بھا گیا، حینہ کا درخت کی شاخ سے لگا کر سوچتا ہوا جاذب نظر ہے۔ پچھلے دنوں دو بہت ہی اندوہناک حادثوں پر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک برف میں سیکڑوں مجاہدین کا دفن ہونا، دوسرا بھوجا ایئر کا حادثہ۔ خدا ہم کو معاف کر دے اور اب کسی ایسے سانحے کی اس قوم کو تاب نہیں۔ ڈاکٹر ساجد اجد کاشاب الدین غوری پر تاریخی مضمون بہت شاندار رہا۔ شہاب الدین غوری کی شجاعت اور حوصلہ مندی کو سلام۔ ناصر ملک کا مسافر پچھلی قسط کے مقابلے میں اس دفعہ بہت معرکہ آرا رہا اور دلچسپ مرحلے میں داخل ہو رہا ہے۔ شہر یار اب بہت خوب ہیر و کا روپ دھار چکا ہے۔ ملک مندر کی سیدی بات اچھی کہانی رہی۔ لیکن مجرم تک رسائی بہت جلد اور بڑی آسان ہو گئی۔ بابر نعیم کی کہانی چور کا بھائی مختصر لیکن دل کو چھو لینے والی تھی۔ بہت سادگی سے لکھی تحریر میں ہیکڑ کو خوب سزا دلوائی۔ کاشف زبیر کا جیسا تیسرا بہت دلچسپ رہا اور ہیری کا ٹوک خوب دوز لگوئی۔ محفل شعر و سخن میں جو دیوی آپ نے بٹھادی۔ اس سے اشعار پر لطف ہو گئے۔ یہ آئیڈیا قابل تحریف ہے۔ مبارک باقپول ہو۔ رجنی ٹیل نے کالج کی چوڑی میں لڑکیوں کی کردار کشی کر کے کہانی کو چٹ پٹا بنانے کی کوشش کی مگر کہانی بے جان تھی۔ سلیم انور نے نیلے پہلا میں تانے بانے خوب ملائے لیکن میٹلکم کو مکینک سے ہیر و نہ بنا سکے۔ رضوانہ ساجد کی تحقیق و ترتیب بہت معلوماتی رہتی ہے۔ شرعباس کی تحریر جیت ہار مختصر اور چونکا دینے والے انجام پر مبنی تھی اور سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔ کہانی گھٹیا حرکت میں تقدیر اور تدبیر کی جنگ دکھائی گئی۔ آخر میں میری دعا ہے کہ سسپنس ڈائجسٹ کو اور ترقی اور مقبولیت عطا ہو تاکہ ہم جیسے اردو ادب کے دیوانوں کی پیاس بجھتی رہے۔“ (شکریہ)

بابر عباس، بھیانہ روڈ، کھاریاں سے محفل کی زینت بنے ہیں ”اس خالق کائنات سے امید کرتا ہوں کہ آپ اور سسپنس کے دیگر اراکین خیریت سے ہوں گے۔ سسپنس کا نیا شمارہ جو کہ ماہ جون کی شکل میں تھا، اٹھارہ مئی کو لاہور سے خرید۔ سرورقی کی حینہ کا چہرہ کچھ کچھ پٹائی کو متاثر کر رہا تھا، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ ارے یہ تو اپنی حجاب کنول خان ہے۔ سرجنی پانچ چھ ماہ کے بعد ایک دھماکا خیز انٹری دے رہا ہوں کہ میں ڈیڑھ ماہ جیل میں رہ کر آیا ہوں اور مئی کا سسپنس میں نے جیل میں ہی وصول کیا تھا۔ حسین عباس بلوچ کا ڈسٹرکٹ جیل مرگڑو حائے لکھا ہوا خط اکثر پڑھتا تھا تو بڑا دکھ ہوتا تھا مگر اب جبکہ خود ڈیڑھ ماہ جیل میں گزار کر آیا تو اس کرب کا احساس ہوا جس کرب سے حسین عباس بلوچ اور عمران حیدر بلوچ گزر رہے ہیں اپنے جیل جانے کی تفصیل نہیں لکھ سکتا بس یوں سمجھ لیں اڈے پر پھڑا ہو گیا تھا (بہت افسوس ہوا یہ پڑھ کر) اس بار کرسی صدارت پر جناب عزت مآب تحصیل ہری پور کی شان محمد جاوید بلوچ صاحب شان تیوری کے ساتھ براجمان تھے۔ بھیا ایک ماہ کے لیے جی حضوری میرا مطلب ہے خوشامد، بادشاہی مبارک ہو، تبصرہ اچھا تھا مگر افسوس میرا ذکر آپ نے نہیں کیا۔ اور ایس احمد خان صاحب اور ستائیں کیا حال ہے آپ کا، بھیا بڑا سادہ سا تبصرہ کیا ہے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ میری تمغوی سی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر آپ بڑا اچھا لکھا کر دیا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ قدرت اللہ نیازی صاحب تبصرے ہی شاندار نہیں لکھتے بندے بھی بڑے شاندار ہیں۔ رمضان پاشا بھائی میں جب بھی آپ کا خط پڑھتا ہوں مجھے دیوتا کا ایک کردار پاشا یاد آ جاتا ہے۔ حسین عباس بلوچ یار تمہارا خط پڑھ کر اکثر مجھے دکھ ہوتا تھا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ جیل کی زندگی کیسی ہوتی ہوگی اور اب تو تمہاری اور عمران حیدر بلوچ کی تکلیف کو کچھ سکتا ہوں خدا تم دونوں کو رہائی نصیب فرمائے (آمین) حجاب کنول خان عزیزہ دل توڑنا اچھی بات نہیں، دل بڑی نازک سی چیز کا نام ہے بہر کیف تمہارا خط محفل میں دیکھ کر خوش ہوئی خدا تمہیں خوش رکھے (آمین) عمران حیدر بلوچ جیسا جیتے رہو خدا تمہاری مشکلات ختم کرے۔ (آمین) ماہا ایمان صاحبہ ملی جتنا بھی میاؤں میاؤں کرے ملی ہی رہتی ہے اور ملی کو خواب میں اکثر..... خوش آمدید شاہ زیب جٹ صاحب! آپ پہلی بار محفل میں آئے ہیں تو کیا پہلی کا قاعدہ بھی ساتھ لائے ہیں کہ نہیں۔ عمران علی صاحب آپ کہیں عمران میریز کے علی عمران تو نہیں جو اکثر اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے قارئین کو ہنساتا تھا۔ واہ جی واہ میرا رضا صاحبہ بھی آئی ہیں، میرا جی یہ محفل ہی ایسا ہے ہر کوئی چڑھتے سورج کو سلام کرتا ہے محفل میں متواتر آرہے ہیں تو ٹھیک ورنہ دوسروں کو کیا پڑی کسی کو یاد کرنے کی۔ انصاری صاحبہ پاگل لوگ اکثر الٹی سیدی ہی باتیں کرتے ہیں اور آپ ماشاء اللہ کافی زیادہ..... عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے اور آپ یقیناً خود کو عقل مند سمجھتی ہوں گی۔ عزیزہ طاہرہ یا سمین دنیا میں کتنا غم ہے میرا غم کتنا کم ہے، لوگوں کا غم دیکھا تو میں اپنا غم بھول گیا۔ تصویر اللعین علی صاحبہ کیا بونگا تبصرہ لکھا ہے ذرا مزہ نہیں ہے جبکہ احمد خان توحیدی صاحب کا تبصرہ بھی بس سوسوی تھا۔ بلیک لسٹ میں آغا فرید احمد، طاہرہ گلزار، ہمایوں سعید راج، ڈاکٹر وسیم خالق کا نام دیکھ کر دکھ ہوا۔ (دکھ کیسا..... یہ تو کم نہیں والی بات ہو گئی) کبھی وہ وقت تھا سب سے پہلے دیوتا کو پڑھا کرتا تھا پھر یوں ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ دیوتا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور اب آج اس کی جگہ سکھول نے لے لی ہے آج کل دیوتا کی جگہ سکھول کو سب سے پہلے پڑھتا ہوں پھر مسافر! مسافر کے رائٹر ناصر ملک کے مقابلے میں انوار صدیقی صاحب کافی سینئر ہیں۔ بہر حال اس بار سکھول بھی اچھی جارہی ہے اور مسافر بھی، دونوں ہی مبارک باد کے مستحق ہیں جبکہ مندر حیات صاحب کی سیدی بات بھی حسب معمول اچھی تھی۔ سسپنس والوں نے آج کل جو نئے لکھاریوں کو لکھنے کی دعوت دی ہوئی ہے۔ اس سے بہت ہی اچھے اچھے رائٹر سامنے آرہے ہیں، اس بار آخری صفحات پر بالکل نئی رائٹر عاتشہ فاطمہ کی تحریر دشت امکان پڑھی اور یہ بات میں اکثر کہتا ہوں کہ یہ سسپنس والوں کا ہی



وصف ہے کہ آخری صفحات پر ایسی کہانی دیتے ہیں جو زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ دتوں یاد رہتی ہے۔ دشت امکان بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

محمد ہمایوں تنولی، ضلع تاول سے تبصرہ کر رہے ہیں ”ایک سال بعد حاضری دے رہا ہوں۔ اس دفعہ جون کا شمارہ 18 مئی کو مل گیا۔ لگتا ہے کہ آپ کے پاس واقعی جادو کا چراغ آ گیا کہ ٹائم سے دو دن پہلے پرچہ بازار میں آ گیا۔ سکھول ماہ جولائی میں ایک سال کا ہوا جائے گا۔ لہذا بطور سالگرہ محمد اس کے صفحات بڑھا دیں۔ پہلے جس طرح دیوتا اور موت کے سوداگر کے بعد وہی اصول کہانیاں تھیں اس طرح اب سکھول اور مسافر بھی انہی کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ باقی ملک مندر حیات اور مرزا امجد بیگ تو سسپنس کی جان ہیں۔ ان کے بارے میں لکھنا تو چاند کو سورج دکھانے کے برابر ہے، شرارتی بھی نہایت اچھی کہانی تھی۔ نیلے پہلا بھی ایک سبق آموز کہانی ہے کہ کسی پرائیڈ کا اعتماد نہ کرنا چاہیے خواہ وہ کسی بینک کا کیشیئر ہی کیوں نہ ہو۔ کالج کی چوڑی رجنی ٹیل کی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ گھٹیا حرکت عبدالقیوم شاد نے اپنے منفرد انداز میں پیش کی۔ ایچ اقبال کی طرح کا اعزاز لیے ہوئے تھی۔ اس شمارے میں ایچ اقبال کی کوئی کہانی نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ سوئٹزر لینڈ گئے ہیں کہانی کا پلاٹ تیار کرنے۔ باقی تحریروں میں دشت امکان اچھی لگی۔ مسافر کے شہرے کو کہاں گاؤں سے ملان چیل اور پھر میڈم جیسی زمانہ شناس عورت کے ہاتھ میں دے دیا۔“

ہمایوں سعید راج، بنوں سے محفل میں آئے ہیں ”محترم جاوید بلوچ صاحب! کسی کی بے سرو پات بات کو اسی کے سر پر انڈیل دینا ایک اعلیٰ ادبی فن ہے۔ سعدیہ بخاری آپ کے شہر کے مرزا روڈ چوکی نمبر تین میں واقع فیڈریشن پبلک اسکول میں مسلسل پانچ بار پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ اس لیے بتا دیتے ہیں کہ عون کو انگریزی میں ٹرپل او این لکھا جاتا ہے۔ رمضان برادر! تمہارا خط ہمیشہ اتنا پر فیکٹ ہوتا ہے کہ میں باوجود کوشش کے کوئی ایسا پوائنٹ نہیں ڈھونڈ پاتا کہ جس کی وجہ سے آپ سے مخاطب ہو سکوں۔ حجاب کنول جی! میں تنہا غنغون تمغوی کر رہا تھا آپ بھی تو ساتھ تھیں۔ عمران علی! میں ناراض کبھی نہیں ہوتا۔ وہ کیا ہے کہ میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں اور اسی وجہ سے میرے مزاج اور اعزاز سے آوارہ پن جھلکتا ہے جس کا یہ چھٹی حس پہ نازاں مخلوق پتا نہیں کیا مطلب لے رہی ہے۔ حیرا جی خیریت ہے آپ کے شوہر جی کو نہ صرف حسین کے آنے جانے پہ کوئی اعتراض نہیں بلکہ اکثر اس کے نہ آنے پہ بے چین بھی دکھائی دیتے ہیں۔ طاہرہ الدین بیگ صاحب محفل میں خواتین کی ڈمیر ساری آمد سے بے تحاشا خوش تھے اور کانوں کو چھوٹی باچھوں کو مقام اصل پہ لانے کی ذرا کوشش بھی نہیں کی۔ لہذا انصاری آپ کے خط نے بڑا متاثر کیا قسم سے۔ کاش میں بہاد پور کا ہوتا۔ طاہرہ یا سمین! اتنے عرصے میں کبھی ہوا بھی لکھنے نہیں دی کہ آپ میرے ہیں۔ اپنی وے ہم آپ کے بیٹے کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ تصویر اللعین صاحبہ! میں لڑکی نہیں ہوں جو ہوش سنبھالتے ہی شادی کا سدا بہار پہنا آنکھوں میں سجالتی ہے اور دوسرا میرے والدین کو اشارے دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ نیک کام میں بہ قلم خود کروں گا۔ اس بار بالکل خلاف معمول حضرت سلیمان کی داستان سے آغاز کیا۔ حضرت سلیمان کی شان حکومت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا مگر آپ کی زندگی کا اتنا حیرت انگیز پہلو ہمارے لیے قلمی نیا تھا۔ ہم رضوانہ ساجد کے شکر گزار ہیں۔ مسافر حسب توقع نہایت شاندار رہی۔ شہر یار پر بھی ٹیک کی طرح ہر لڑکی پوری جان سے فدا ہونے کو تیار نظر آتی ہے۔ میڈم کی انٹری یقیناً نئے ہنگاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ ملک صاحب بھی حسب معمول اپنی شاندار ذہانت اور انتھک محنت کی بنا پر ایک مشکل کیس حل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بس یہ وضاحت نہیں ہوئی کہ مفر اور رحمت علی میں سے کون سچا تھا۔ ایم اے راحت کی وصال منم لا جواب ثابت ہوئی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی پرائیویٹ جاسوسوں کا دواج پروان چڑھ رہا ہے۔ منظر امام کی کہانی اپنا پیچہ غیر متاثر کن رہی۔ کہانی کا میٹج متاثر کن مگر منظر نگاری اور واقعات بے حد بھونڈے انداز میں پیش کیے گئے۔ مختار آزاد کی شرارتی سب سے زیادہ پسند آئی۔ دوشیروں نے نہایت زبردست انداز میں مشاق ڈاکوؤں کو گتھی کا ناچ چھایا۔ شرعباس کی جیت ہار مغرب کی مخصوص طرز زندگی کی عکاس نظر آئی۔ کیتھرن کی پلاننگ تو اچھی تھی مگر اس کی قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور کمین ایک عورت سے زیر ہو گیا۔ نیلے پہلا میں میٹلکم کی عقل پر جی بھر کے غصہ آیا جس نے اے ٹی ایم کی رسید پر پیغام تحریر کیا۔ گھٹیا حرکت بھی اچھی رہی۔ چیتری پلاننگ اور اس پر عمل درآمد یقیناً زبردست تھے مگر یہاں بھی بد قسمتی آڑے آئی۔ محفل شعر و سخن میں کمال انور اور ایم یوسف خان کے اشعار اچھے لگے۔“

رائے قیصر عباس کھنرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”جناب عالی شمارہ 22 تاریخ کو ملا۔ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے محفل یاراں میں چھلانگ لگا لی لیکن کسی بھی جگہ پر اپنے خط کو موجود نہ پا کر بڑی مایوسی ہوئی۔ بہر حال صبر کر گئے۔ ماہا ایمان کا خط بھی کافی زوردار تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر کا مزہ لیا۔ بڑی زبردست جارہی ہے۔ شہر یار اب نئے ہنگاموں میں پڑنے والا ہے۔ امید ہے کہ کہانی اسی طرح چلے گی۔ اس کے بعد سکھول پڑھی۔ اس کے صفحات تمغوے سے کم محسوس ہوئے۔ کہانی بہر حال بڑی زبردست جارہی ہے۔ تاریخی کہانی بھی بڑی زبردست تھی، مسلمانوں نے واقعی ہندوستان کو بڑے بڑے طریقے سے روندنا تھا اور اپنی بہادری کی لازوال داستانیں قائم کی تھیں۔ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ حافظ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں ”منگلی“ میں میرے پیارے چاچو ریاض سمیت سسپنس پڑھنے والے تمام افراد کو سلام۔ امید ہے میرا خط شامل محفل ہوگا۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
اسلم عارضی، گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ بشیر احمد بھٹی، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ احمد خان توحیدی پاکستان اسٹیل مل۔ منزل خان، کبیر والا۔ رمضان پاشا، گلشن اقبال (کراچی)۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ منو برادر س، کورنگی کراچی۔ شائستہ رحیل، ملتان۔



جراغِ افغان

ڈاکٹر ساجد امجد



وقت نے ثابت کیا ہے کہ تقدیر یاوری کرے تو رستے میں آنے والی ہر چٹان کو سر کیا جاسکتا ہے۔ قوموں کی ترقی اور پھر اقبال کو زوال کا سفاکانہ عمل ماضی کے اوراق میں نام بدل بدل کر رقم ہوتا رہا ہے مگر سبق حاصل کرنے والے عمل کرتے وقت پھر ایسی ہی کسی غلطی کو دہرا کر انہی حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سازشی دماغ رکھنے والے فتنہ گر لوگ ہر دور میں دنیا کو اپنا تابع رکھنا چاہتے ہیں مگر طاقت کے نشے میں مست و مخمور یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب زوال کا عمل شروع ہوتا ہے تو چٹانیں بھی دھیرے دھیرے جگہ جگہ چھوڑنے لگتی ہیں... پیدائش کے وقت جس بچے کی ماں نے ساتھ چھوڑا اسے مقدر میں لکھے گئے حالات و واقعات نے ایک عہد کا بادشاہ بنا دیا۔ بہلول لودھی، تاریخ کا ایک ایسا درخشاں ستارہ جس کی نیک خصلت اور بہادری نے سب کے دلوں کو مسخر کر دیا... مگر بدقسمتی سے حالات دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پھر اسی مرکز پر آگئے جہاں سلطنت میں موجود فتنہ گر اقتدار کے حصول کے لیے تمام حدود پہلانگنے کے لیے تیار رکھتے تھے... بادشاہ ہویا ادنی غلام... بہت آخر میں احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا تو فقط چند لمحوں کا پڑاؤ ہے... جہاں مسافر کچھ دیر ٹھہر کر پھر آگے بڑھ جاتا ہے...

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



۵۰ بستر پر چت لیتی ہوئی تھی۔ اس کا پیٹ ضرورت سے زیادہ ابھرا ہوا تھا۔ بات یہ بھی کہ وہ نہ صرف حاملہ تھی بلکہ ولادت کا وقت قریب آ گیا تھا۔ بس ایک دو روز ہی کی بات تھی۔ اسی لیے اسے بستر سے پاؤں نیچے رکھنے کو منع کر دیا گیا تھا۔ ایک بوڑھی ملازمہ بھی جو اس کی خدمت کے لیے مقرر تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے سر ہانے بیٹھی تھی۔ دونوں نہیں جانتی تھیں کہ تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے۔ زلزلے کا جھٹکا تھا یا کیا تھا مکان کی چھت اچانک گر گئی۔ چھت کا لمبا بستر پر لپٹی ہوئی حاملہ عورت پر آیا۔ محل نما مکان میں بھگدڑ مچ گئی۔ نوکر جا کر اس کمرے کی طرف بھاگے جس کی چھت منہدم ہوئی تھی۔ جلدی جلدی ملبا ہٹا یا گیا بد قسمت حاملہ عورت مر چکی تھی۔ پیدائش کا وقت چونکہ قریب تھا لہذا عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لیا گیا۔

یہ عورت کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ دور الہ کے حاکم ملک کالا کی بیوی تھی اور یہ بچہ آنے والے دور میں تاریخ کے اوراق پر بہلول لودھی کے نام سے چکا۔

اسلام خاں والی سرہند زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے وفادار افغان سردار اس بڑے کمرے میں جمع تھے جہاں اسلام خاں نیم بے ہوشی کے عالم میں لیٹا تھا۔ اس کے معالج کچھ دیر پہلے اس کے لیے نئی دوا کی تجویز کر کے گئے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں اندیشوں کی پرچھائیاں صاف نظر آرہی تھیں۔

اسلام خاں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولتا اور اپنے بچتے بہلول خاں کے بارے میں پوچھتا تھا جو ابھی تک اسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔

”بہلول خاں کو آخر کیا ہوا ہے۔ وہ اب تک کیوں نہیں آیا؟“ بوڑھے اسلام خاں کی آواز نے افغان سرداروں کو پھر متوجہ کیا تھا۔

”خان، وہ سرہند میں نہیں ہے۔ قطب خاں کے ہمراہ سامانہ کی طرف گیا ہوا ہے۔“

”اسے بلانے کے لیے فوراً آدمی روانہ کرو۔ اسے دیکھے بغیر ہم مرنے والے نہیں۔“ اسلام خاں نے کہا۔ ”اور ہاں، ہمیں اٹھا کر بٹھا دو تاکہ ہم اسے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی دیکھ سکیں۔“ اسلام خاں کی پشت پر کئی ٹیکے رکھ کر بٹھا دیا گیا۔

ایک تیز رفتار گھڑ سوار سرہند سے نکلا اور سامانہ کے راستے پر روانہ ہو گیا۔

اسلام خاں کا بوائے فیروز خاں چند سرداروں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کا ایک نوکر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور اسلام خاں کے کمرے میں جو باتیں ہو رہی تھیں انہیں دہرانے لگا۔ اسے اسی مقصد کے لیے اسلام خاں کے پاس بھیجا گیا تھا۔ فیروز خاں کو معلوم ہوا کہ بہلول کو بلانے کے لیے قاصد دوڑایا گیا ہے تو وہ فکر مند ہو گیا۔

”یہ تو ہمیں پہلے ہی سوچ لینا چاہیے تھا کہ نوبت یہ بھی آسکتی ہے۔ اس قاصد کو بہلول خاں تک نہیں پہنچنا چاہیے۔“

”ملک فیروز، اب بھی کون سا وقت چلا گیا ہے۔“

ایک سردار نے اٹھ کر کہا۔

”اسی طرح باتیں ہوتی رہیں تو یہ وقت بھی چلا جائے گا۔ جانے والا گھوڑے پر گیا ہے اور اسے جلدی بھی ہے۔“

”آپ کا حکم ہو تو میں چند ساتھیوں کو لے کر اس کے پیچھے جاؤں؟“

”کیا اب بھی تمہیں اجازت کی ضرورت ہے۔ بہلول خاں اور قطب خان میں سے کسی کو بھی اسلام خاں کی حالت کے بارے میں کوئی علم نہیں ہونا چاہیے۔“

اس سردار نے فیروز خاں کی بات بھی مکمل نہیں ہونے دی تھی اور کمرے سے نکل گیا تھا۔ فیروز خاں کو اب اسلام خاں کے پاس جانا تھا جو موت وزیست کی کش مکش میں تھا۔

”اسلام خاں کی موت کے وقت مجھے اس کے پاس ہونا چاہیے۔“ فیروز خاں نے اپنے سرداروں سے کہا اور اسلام خاں کے پاس پہنچ گیا۔

”میرے بھائی ملک فیروز۔“ اسلام خاں کی نحیف آواز بلند ہوئی۔ ”تم سنتے رہے ہو گے کہ یہ سب برسوں پہلے افغانی گروہ کے گروہ ہندوستان میں تجارت کرنے آتے تھے میرا اور تمہارا باپ ملک بہرام اپنے بھائی سے ناراض ہو کر ملتان آ گیا تھا۔ اس نے ملتان کے حاکم کی ملازمت کر لی تھی۔ ملک بہرام کے بعد جب خضر خاں ملتان کا حاکم بنا تو میں اس کے مقررین خاص میں شامل ہو گیا۔ اس نے مجھے اسلام خاں کا لقب دیا اور سرہند کا حاکم بنا دیا۔ میں نے تم سمیت سب بھائیوں کا خیال رکھا۔ ملک کالا، بہلول کا باپ ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس وقت سے اب تک بہلول میرے پاس ہے۔ اس کی نیک خصلت اور بہادری نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا ہے۔ میں اپنے بیٹے قطب خاں سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ میں نے سرہند پر جس انداز کی حکومت کی ہے صرف بہلول ہی اس کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اس وقت ہندوستان جن حالات سے گزر رہا ہے بہلول ہی ان

حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر اس کے آنے سے پہلے میری آنکھیں بند ہو جائیں تو بہلول کو میرا جانشین مقرر کرنا اور تمام افغانی متحد رہنا۔“

ملک فیروز خاں پر اسلام خاں کی ہیبت طاری تھی۔ اس وقت مخالفت نہ کر سکا لیکن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بہلول یہاں پہنچے گا تو جانشین بنے گا۔ اگر وہ اسلام خاں کے مرنے کے بعد یہاں پہنچا تو اسے میری تلوار روکے گی۔

اس نے اسلام خاں سے عہد کیا کہ اس کی وصیت پر عمل کیا جائے گا لیکن اس کے پاس سے ہٹے ہی اپنے سرداروں کے پاس آیا۔

”مجھے جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ اسلام خاں نے بہلول کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ اب بہلول خاں کو یہاں نہیں پہنچنا چاہیے۔“ اس کے ساتھیوں نے قسم کھائی کہ بہلول کو یہاں نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ طے یہ پایا کہ بہلول خاں اور قطب خاں کو سرہند پہنچنے ہی قتل کر دیا جائے گا۔

اسلام خاں کا بھیجا ہوا قاصد سامانہ کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ اس نے کچھ افغانوں کو اپنے پیچھے آتا ہوا دیکھا۔ وہ یہ سمجھ کر رک گیا کہ یہ اپنے ہی بھائی بند ہیں، کوئی پیغام لے کر آئے ہوں گے۔

ان افغانوں نے آتے ہی اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اب وہ سمجھا کہ کہیں کوئی غداری ہوئی ہے۔ اس نے بھی مقابلے کے لیے تلوار سونت لی لیکن وہ مرنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ آٹھ مسلح سواروں سے اس اکیلے کا کیا مقابلہ۔ کچھ دیر بعد اس کی لاش زمین پر پڑی تھی۔

بہلول اور قطب خاں سامانہ میں ایک مجذوب بزرگ کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ان بزرگ کے پاس آئے تھے کہ سامانہ چھوڑنے سے پہلے دعائیں لے کر رخصت ہوں (ان بزرگ کا نام سید ابن بتایا جاتا ہے۔ ضلع لدھیانہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ان بزرگ کا نام صدر جہاں یا صدر الدین تھا اور وہ بہاؤ الدین ذکر یا ملتان کے مرید تھے) وہ بزرگ اس وقت حالت جذب میں تھے۔ دونوں کو دیکھ کر انہوں نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔ ”کوئی شخص ہے جو دہلی کی حکومت کو دو ہزار تنکے میں خریدتا ہے؟“

نظام کی یہ بولی سن کر قطب خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی لیکن بہلول خاں سنجیدہ تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس وقت اس کے پاس ایک ہزار چھ سو تنکے تھے۔ اس نے یہ تنکے بزرگ کے سامنے رکھ دیے۔

چواغ افغان

”میں دہلی کو خریدنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس ایک ہزار چھ سو تنکے ہیں۔ اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔“ بزرگ نے یہ نذرانہ قبول کر لیا۔ ”جا تجھے دہلی کی حکمرانی قبول ہو۔“

بہلول اور قطب خاں نے بزرگ کی خدمت میں سلام پیش کیا اور ان کے آستانے سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی قطب خاں پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔

”ہاں بھی دہلی کے بادشاہ۔ اب تو تم سے ڈرنا چاہیے تم غنقریب دہلی کے بادشاہ بننے والے ہو۔“

”یوں مذاق مت بناؤ۔ خدا کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”دہلی کی حکومت اتنی سستی نہیں کہ ڈیڑھ ہزار تنکوں میں خریدتے پھرو۔ تم نے خواہ مخواہ اپنی رقم اس فقیر کے حوالے کر دی۔“

”میں پھر بھی گھائے میں نہیں ہوں۔ اگر فقیر کا قول سچا ہے تو مجھے کوڑیوں کے مول جواہرات ملیں گے۔ اگر سچا نہ بھی نکلا تو فقیر کی خدمت کرنا کارِ ثواب ہے۔ میں سمجھوں گا میں نے ثواب کمالیا۔“

”بس یہی سمجھو کہ تم نے ثواب کمالیا۔“

”اب ہمیں سرہند چلنے کی تیاری کرنی چاہیے۔“

”ہاں بھئی، وہاں سے تمہیں دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے لیے جانا بھی تو ہے۔“ قطب خاں ابھی تک مذاق اڑانے پر تلا ہوا تھا۔

وہ سامانہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ انہوں نے ایک لاش پڑی دیکھی۔ قطب خاں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا لیکن یہ سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ وہ یہاں کیوں ہے اور اسے کس نے قتل کر ڈالا۔ قطب خاں تو اسے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن بہلول خاں کے چہرے پر تشویش کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

”قطب خاں سرہند میں ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔“

”اس لاش کا سرہند میں گڑبڑ سے کیا تعلق؟“

”یہ شخص یقیناً کوئی پیغام لے کر ہماری طرف آیا ہوگا۔“

”لیکن قتل کس نے کر دیا؟“

”ان لوگوں نے جو نہیں چاہتے ہوں گے کہ یہ ہم تک پہنچے۔“

”ایسا کون ہو سکتا ہے؟“

”کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“

”چچا فیروز خاں کے علاوہ کوئی بھی وہاں اتنا با اثر نہیں

کھٹی میٹھی

+ ایک آدمی میٹھی ہوم میں تین بچے آیا تو نرس نے کہا۔ ”مبارک ہو، آپ تین بچے آئے ہیں اور آپ کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔“ آدمی نے کہا۔ ”شکر ہے کہ میں اپنے مقررہ وقت بارہ بچے نہیں آیا۔“

+ میاں بیوی مارکیٹ جا رہے تھے تو ایک فقیر نے کہا۔ ”شہزادی دس روپے دے دو میں اندھا ہوں۔“

شوہر نے کہا۔ ”بیگم ضرور دے دو تمہیں شہزادی کہہ رہا ہے تو یقیناً اندھا ہی ہوگا۔“

+ فقیر نے صدالگائی۔ ”اللہ کے نام پر کچھ دے دو، گھر سے لڑکی بولی۔ کچھ نہیں ہے معاف کرو۔“

اپنا موبائل نمبر ہی دے دو۔ ”بابا دعا بھی کرے گا اور میسج بھی۔“

+ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بیوی سے پیار بھری باتیں کرنے سے ٹینشن دور ہو جاتی ہے۔ ہارٹ ایک کا خطرہ 80 فیصد کم ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی پر لطف ہو جاتی ہے آدمی ہر وقت تروتازہ اور خوشگوار موڈ میں رہتا ہے لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ بیوی اپنی نہ ہو۔

مراسلات: حسنین عباس بلوچ،
ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا

آگاہ نہیں کیا صرف اپنی حق تلفی کا ذکر کیا۔

”میرے باپ کی وفات کے بعد اس کا جانشین مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن بہلول خاں لودھی نے جو میرے چچا کا لڑکا ہے میرے باپ کے خزانے اور حکومت پرز بردستی قبضہ جمایا ہے اور اب وہاں ظلم کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ اس کے خوف سے کوئی کچھ نہیں بولتا۔ سرہند پٹھانوں کا مرکز ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں فساد برپا ہو جائے گا۔ ملک بہلول بڑی تیزی سے افغانوں کا لشکر جمع کر رہا ہے۔ اگر اس وقت اس کی سرکوبی نہیں ہوئی تو وہ بہت سے دیگر علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اگر حضور سرہند کا حاکم مجھے بنادیں تو میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا اور افغان آپ کے مطیع ہو جائیں گے۔“

محمد شاہ کو اس سے تو کوئی سروکار نہیں تھا کہ قطب خاں کو اس کی وراثت ملتی ہے یا نہیں لیکن اس کی دیگر باتوں سے اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کے کانوں تک یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ بہلول لودھی اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا ہے۔ قطب خاں ابھی دہلی میں تھا کہ بادشاہ کو یہ خبر بھی مل گئی کہ بہلول لودھی نے بادشاہ کے علم میں لائے بغیر دیپالپور پر قبضہ کر لیا ہے اور پانی پت تک آنے کی منصوبہ سازی کر رہا ہے پھر دہلی کتنی دور رہ جاتی ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ بہلول خاں لودھی کو اس کی سرکشی کی سزا دے گا۔

اس نے اپنے ایک سالار ملک سکندر تحفہ کو ایک بڑی فوج دے کر ہدایت کی کہ وہ سرہند جا کر افغانوں کو دہلی بھیج دیں۔ اگر وہ بغاوت پر آمادہ ہوں تو ان سے جنگ کرو اور انہیں سرہند سے باہر نکال دو۔ قطب خاں کو بھی حکم دیا کہ وہ اس لشکر کے ہمراہ جائے۔ سکندر تحفہ کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ قطب خاں کے مشورے پر عمل کرتا رہے۔

بہلول خاں لودھی اس وقت سرہند میں موجود نہیں تھا۔ ملک فیروز خاں اس کی نیابت کر رہا تھا۔ اس نے جب دہلی کے لشکر کی آمد کی خبر سنی تو مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے تمام افغانوں کو لے کر کوہستانی سلسلوں میں جا کر چھپ گیا۔

ملک سکندر تحفہ سرہند پہنچا تو افغانوں کے پاس پیغام بھیجا۔ ”تم لوگوں نے کوئی ایسا قصور نہیں کیا ہے جو ادھر ادھر خوفزدہ ہو کر پھر دو اور گھر سے بے گھر ہو جاؤ۔ ہم تم سے جنگ کرنے نہیں آئے ہیں ہمیں تو صرف بہلول لودھی سے سروکار ہے۔ تمہیں امان دی جاتی ہے۔ تم اپنے گھروں میں آ کر آباد ہو جاؤ۔“

فیروز خاں نے عہد نامہ مانگا۔ سکندر تحفہ اور ایک اور

بعض لوگ فیروز خاں کی طرف داری کرتے تھے کچھ لوگ قطب خاں کی خیر خواہی کرنے لگے۔

قطب خاں ان تینوں میں سب سے مضبوط دعویدار تھا کیونکہ وہ اسلام خاں کا بیٹا تھا لیکن جن سرداروں کے سامنے اسلام خاں نے مرنے سے پہلے اپنی وصیت کا اظہار کیا تھا وہ بہلول خاں کے حق میں تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ملک فیروز کو بھی سمجھانے کی کوشش کی جس کے سامنے اسلام خاں نے جانشینی کے لیے بہلول لودھی کا نام لیا تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے بہلول لودھی کے حق میں چپ سادھ لی۔

”میں کھل کر بہلول کی حمایت کا اعلان نہیں کر سکتا۔ اس طرح میرے آدمی میرے خلاف ہو جائیں گے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اس کی مخالفت بھی نہ کروں۔“

قطب خاں کو معلوم ہوا کہ ملک فیروز نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا ہے تو اس کی ہمت بھی ٹوٹ گئی کیونکہ وہ تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ وہ فیروز خاں کو اپنے حق میں ہموار کر کے بہلول کو سرہند سے نکال دے گا لیکن اب وہ یہ کام اکیلے نہیں کر سکتا تھا۔

بہلول خاں کا گردہ بہت مضبوط تھا لہذا کسی خون خرابے کے بغیر اس کے حریف پیچھے ہٹ گئے اور اسے سرہند کا حاکم بنادیا گیا۔ اسلام خاں کا لشکر، خزانہ اور جتنے ہاتھی تھے بہلول لودھی نے اپنے قبضے میں لے لیے۔ جب اس نے طاقت پکڑ لی تو حریف افغان بھی اس کا دم بھرنے لگے۔

قطب خاں انکاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسلام خاں کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے حکمرانی کا حق اس کا تھا لیکن اب یہ حق تلوار ہی سے مل سکتا تھا۔ وہ اب اکیلا رہ گیا تھا اگر بہلول سے ٹکراتا تو ملک فیروز بھی بہلول کا ہی ساتھ دیتا۔ اس نے بہلول کا خیال چھوڑا اور سلطنت دہلی کی طرف دیکھنے لگا۔

دہلی میں اس وقت خاندانِ سادات کی حکومت تھی اور محمد شاہ بن فرید خاں یہاں کا بادشاہ تھا جو مبارک شاہ کے ناگہانی قتل کے بعد سریر آرائے۔ سلطنت ہوا تھا۔

قطب خاں سرہند سے نکلا اور دہلی چلا گیا۔ اسلام خاں کا بیٹا تھا۔ دہلی میں اسے سب ہی جانتے تھے۔ امیر امرا ایسی سازشوں کے دلدادہ تھے جس کا منصوبہ قطب خاں لے کر آیا تھا۔ اس نے دہلی کے قیام میں ان امرا کے ذریعے دہلی کے سلطان محمد شاہ تک رسائی حاصل کر لی اور اسے سرہند کے واقعات سے آگاہ کیا۔ اسلام خاں کی وصیت سے تو اسے

کہ اتنا بڑا قدم اٹھا سکے۔“ قطب خاں نے کہا۔ ”بھائی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑے خاں، اسلام خاں اس دنیا میں نہیں رہے۔“ ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ ”اسلام خاں کی موجودگی میں فیروز خاں یہ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے یا تو وہاں کوئی بغاوت ہوئی ہے یا بڑے خاں کی جان کو کچھ ہوا ہے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔“ ”اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر سرہند پہنچنا چاہیے۔“ ”پہلے اس افغان بھائی کی لاش تو عزت کے ساتھ دفن دیں۔“ ان دونوں نے مل کر تلواروں سے مٹی ادھر ادھر کی اور اس افغان کو لٹا کر مٹی کا ڈھیر اس کے اوپر ڈال دیا اور سرہند کی طرف دوڑ پڑے۔ انہوں نے کسی ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے عام راستے سے ہٹ کر غیر معروف راستہ اختیار کیا اور اسلام خاں کے محل کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ملک فیروز خاں کو ان کے پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس وقت اپنے آدمیوں پر برس رہا تھا جو انہیں راستے میں روکنے سے ناکام رہے تھے۔

”وہ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر پہنچ گیا۔“ ”ہم کیا کریں وہ دوسرے راستے سے آ گیا۔ ہمارے آدمی معروف شاہراہ پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ وہ وہاں سے گزر رہی نہیں۔“

ملک فیروز سرہند پہنچنے کے بعد ان پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب اسے یہ کوشش کرنی تھی کہ اسلام خاں کی وصیت پر عمل نہ ہو سکے۔

ملک بہلول اور قطب خاں اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں اسلام خاں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے دونوں کو دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی روح نفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

اسلام خاں کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا۔ اسلام خاں نے ملک فیروز کے سامنے بہلول خاں کو جانشین بنانے کی وصیت کی تھی۔ اس وقت وہ خاموش رہا تھا لیکن اب اس نے اس وصیت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ قطب خاں کو بھی یہ وصیت قبول نہیں تھی۔

اسلام خاں کے بعد اس کے ماننے والے تین گروہوں میں بٹ گئے۔ عام افغانوں نے اسلام خاں کی وصیت کی پوری پوری پابندی کی اور ملک بہلول کے خیر خواہ رہے اور

بتاتا رہا حتیٰ کہ اس کے بیٹے کی لاش اس کے سامنے آئی مگر اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ”میں اسے نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔“

”کمال ہے تم اسے نہیں جانتے۔“ جیرت کھکر نے کہا۔ ”یہ تو تمہارے قبیلے کا بہادر ترین نوجوان تھا۔ اسی کی وجہ سے ہمیں غلبہ پانے میں اتنی دیر لگی۔ اس نے ہمارے کئی سپاہیوں کو قتل اور زخمی کیا ہے اور تم اس کا نام تک نہیں جانتے۔“

یہ سن کر فیروز خاں رونے لگا۔ ”یہ میرا بیٹا شاہین خاں ہے۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم اسے نہیں جانتے۔“ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس نے بزدلی نہ دکھائی ہو۔ اب جبکہ خود تمہاری زبانی معلوم ہو گیا کہ اس نے بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی ہے تو میں اسے پہچاننے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ یہی میرا بیٹا شاہین خاں ہے۔ خدا اس کی شہادت قبول فرمائے۔“ فیروز خاں کو پھر زنداں میں پہنچا دیا گیا۔

جیرت کھکر نے سکندر تحفہ کو سر ہند میں چھوڑا اور خود تمام اسیروں کو لے کر پنجاب چلا گیا اور وہاں سے ان اسیروں کو دہلی بھیج دیا۔ ملک فیروز خاں لودھی بھی ان اسیروں میں شامل تھا۔ بھلول لودھی کے ہاتھ سے سر ہند نکل چکا تھا۔ اب اس کے ساتھ چند ہمراہیوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ملک فیروز داخل زنداں ہو چکا تھا۔ قطب خاں نے غداری کی تھی۔ بہت سے رشتے دار مارے جا چکے تھے۔ ملک سکندر تحفہ سر ہند پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ دولت پاس نہیں تھی کہ لشکر تیار کرتا۔ اس نے رہزنی کو اپنا شعار بنالیا تا کہ دولت حاصل کرے اور بہادر افغانوں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔

وہ کوئی عام ڈاکو نہیں تھا جو غریبوں کو لوٹتا۔ اس نے ارد گرد کے علاقوں کے حکمرانوں پر دھاوے بولنے شروع کر دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نام بہت کا نشان بن گیا۔ وہ کئی مرتبہ سر ہند بھی آیا اور سرکاری عمال کو لوٹ کر بڑی صفائی سے نکل گیا۔

اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ادھر ادھر کے افغان اس کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب منگول جوق در جوق اسلام قبول کرتے ہوئے ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ لہذا منگولوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ تھوڑا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کر لیا۔

ملک فیروز دہلی میں قید تھا۔ سلطان محمد شاہ کے بہت

امیر جیرت کھکر نے جو اس وقت موجود تھے ایمان اور خدا کی قسم کھا کر عہد کیا کہ وہ اپنے قول میں سچے ہیں۔ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ فیروز خاں پھر بھی مطمئن نہیں ہوا لیکن اس خیال سے کہ ان لوگوں سے مزید بات چیت کی جائے اور اگر یہ دہلی لے جانا چاہیں تو دہلی جا کر بادشاہ کو مطمئن کرے، باہر نکل آیا۔ وہ اپنے بیٹے شاہین خاں کو اپنے بال بچوں اور دیگر افغانوں کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

فیروز خاں ان لوگوں کے ہمراہ جب ان کے خیمے میں پہنچا اور اپنے بھتیجے قطب خاں کو وہاں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ”تو اس غداری کے پیچھے تو ہے قطب خاں۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں قید کر لیا جاؤں گا۔“ ملک سکندر اور جیرت کھکر نے اسے تسلی دی کہ تمہارے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے۔ تم اپنے دل میں کوئی اندیشہ نہ لاؤ۔

قطب خاں نے دیکھا کہ سارا اھیل ہی بگڑ گیا ہے۔ اس کی دشمنی فیروز خاں سے تھی جس نے بھلول لودھی سے مصالحت کر لی تھی اور بعد میں قطب خاں سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا۔ وہ اس باعزت معاہدے کے خلاف تھا جو سکندر تحفہ اس سے کر آیا تھا۔

قطب خاں نے سکندر تحفہ اور جیرت کھکر کے کچھ اس طرح کان بھرے کہ انہوں نے عہد کی پاس داری نہیں کی اور فیروز خاں کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لشکر کو پہاڑوں کی طرف بھیجا کہ وہ فیروز خاں کے بال بچوں اور دوسرے افغانوں کا قتل عام کریں۔

شاہین خاں نے اس ناگہانی افتاد کو دیکھا تو مقابلے پر ڈٹ گیا۔ شاہی لشکر تعداد میں بہت زیادہ تھا لیکن افغان اس بہادری سے لڑ رہے تھے کہ شاہی لشکر کئی مرتبہ پسپائی پر مجبور ہوا لیکن اپنی تعداد پر بھروسہ کر کے پھر آگے بڑھا۔ شاہین خاں نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا لیکن ایک جگہ وہ بہت سے سپاہیوں کے درمیان گھر گیا اور مارا گیا۔ افغان پھر بھی لڑتے رہے تھے لیکن ان کی تعداد اتنی کم رہ گئی تھی کہ شاہی فوج نے ان پر غلبہ پالیا۔ سیکڑوں افغان قتل ہوئے باقی کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقتول افغانوں کی لاشیں سر ہند لائی گئیں۔ ان لاشوں کو ایک بڑے میدان میں رکھ دیا گیا۔ فیروز خاں کو بھی زنداں سے نکال کر اس میدان میں لایا گیا۔

”اپنے بہادر افغانوں کا انجام دیکھو اور ان لاشوں میں اپنے بیٹے کو پہچاننا کہ ہم اس کے مرتبے کے مطابق اسے دفن کر سکیں۔“ جیرت کھکر نے فیروز خاں سے کہا۔

فیروز خاں ایک ایک مقتول کو دیکھتا رہا اور ان کے نام

سے امر اس کی گرفتاری سے ناخوش تھے کیونکہ سکندر تحفہ نے عہد توڑ کر اسے گرفتار کیا تھا۔ اس لیے یہ امر برابر اس کو شش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح اسے اس قید سے نجات دلا دیں۔ آخر ایک روز انہیں یہ موقع مل گیا۔ انہوں نے فیروز خاں کو قید سے رہائی دلا دی۔ فیروز خاں دہلی سے نکلا اور بھلول لودھی کے پاس پہنچ گیا جو کوہستانی علاقے میں قیام کیے ہوئے تھا۔

قطب خاں بھی دہلی میں تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ فیروز خاں فرار ہو گیا ہے اور یہ بھی سنا کہ وہ بھلول کے پاس پہنچ گیا ہے تو اس نے خود کو اکیلا محسوس کیا۔ اسے اپنی سابقہ حرکتوں پر افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے بھائی بندوں پر کیسی مصیبت ٹوٹی۔ اس نے سوچا اب اس کا کفارہ اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ وہ بھلول خاں کے پاس چلا جائے اور اپنے گناہوں کی اس سے معافی طلب کرے۔ اگر وہ معاف کر دے تو اس کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ وہ ایک رات دہلی سے نکلا اور بھلول کے پاس پہنچ گیا۔

”بھائی، مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ میری وجہ سے آج افغان بے حکومت ہو گئے۔ اگر مجھے معافی مل جائے تو ہم سب مل کر سر ہند کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔“

”میرے دل میں تمہاری طرف سے جو برائی تھی وہ نکل گئی۔ ہم دونوں کے چچا فیروز خاں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ تمہاری وجہ سے شاہین خاں مارا گیا۔ فیروز خاں کو قید کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ کیا وہ تمہیں معاف کر سکتے ہیں؟“

”ہم دونوں دوست رہے ہیں۔ اگر تمہاری سفارش ہو تو چچا میرا قصور معاف کر سکتے ہیں۔“

”لیس اس معاملے میں نہیں پڑوں گا تم اپنا قصور خود معاف کراؤ۔“

قطب خاں چپکے حضور حاضر ہوا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے چچا سے معافی مانگی۔ بہادروں کے دل بڑے ہوتے ہیں۔ فیروز خاں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا۔

”میرا بیٹا تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب بھلول اور تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں بھلول کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا لیکن میں جب اس سے ملا تو اس نے مجھے معاف کر دیا پھر میں تجھے کیوں معاف نہ کروں۔ ہمارا اتحاد ہی تو افغانوں کی طاقت ہے۔ ہم میں اتفاق ہو تو دہلی کے کمزور بادشاہ کی کیا مجال کہ ہماری طرف میلی

ایک پرانے سرور کو آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا۔ ایک نئی فلم میں کام کرنے کے لیے تین لاکھ پینے کی پیش کش کی گئی۔ ”مناسب معاوضہ ہے، ادا کار نے خوشی سے سر ملاتے ہوئے کہا۔ فلم کا نام کیا ہے؟“

”گھڑا عاشق“ ڈائریکٹر نے جواب دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ لکھنے عاشق کا دل تھی کو دیا جائے۔ اگر اصرار ہو تو مشکل کے دن سیٹ پر پہنچ جائے۔

”تین لاکھ پینے کے لیے اگر تم ہو تو میں کل ہی سیٹ پر آنے کے لیے تیار ہوں۔“

”نہیں کل نہیں، ڈائریکٹر نے کہا۔ کل تو ہم تمہاری ایک ٹانگ کٹوائیں گے۔“

دل برداشتہ

ان دنوں حکومت فحاشی کے بارے میں بے حد حساس تھی۔ چنانچہ اخبارات و رسائل پر بر سخت سنسرناؤں ہوتا تھا۔ ایک روز نامے کے ادارے میں نقرہ لکھا تھا۔

”عوام کو موجودہ حالات میں دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اخبار سنسر کے لیے پیش ہوا تو افسر مجاز نے ”داشتہ“ کے گرد سرخ دائرہ کھینچ دیا۔ ”داشتہ“ فحش لفظ ہے، آپ یہ لفظ کاٹ دیں، ”دلبر“ بے شک رہنے دیں۔“

اجہ محمد۔ کہوٹہ، راولپنڈی

آوارہ

کاہل

جوڑھا

ادھیرو

فوجرات

باہمت

سرماہ دار

میں کوئی کام نہیں کروں گا۔ کر سکتا ہوں کروں گا نہیں۔ شاید کروں۔ کوشش کرتا ہوں۔ کرتا ہوں۔ میں نے ناکام ہونا نہیں دیکھا۔ میں ہر کام کر سکتا ہوں۔

آنکھ سے دیکھے۔“ دونوں اٹھ کر بھول خاں کے پاس آئے اور ایک مرتبہ پھر اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ سرہند پر دوبارہ قبضے کے لیے مشورے کیے جانے لگے۔

بہلول نے لشکر آراستہ کیا اور سرہند پر چڑھائی کر دی۔ اب وہ فقط رہزن نہیں تھا۔ بارہ ہزار سے زیادہ لشکر کا مالک تھا۔ قطب خاں اور فیروز خاں کے آجانے کے بعد افغانوں کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا۔ سرہند میں تعینات شاہی فوج اس کا مقابلہ نہ کر سکی اور سرہند پر افغانوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔

بہلول لودھی کی سرکشی کا علم جب سلطان محمد شاہ کو ہوا تو اس نے وزیر الملک حسام خاں کو ایک لشکر جرار کے ہمراہ سرہند کی طرف بھیجا۔

بہلول لودھی نے بھی اپنے لشکر کو باہر نکالا۔ موضع گڑھ میں جو خضر آباد اور شاہ پور (ریٹالہ کے نزدیک) میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ اب نہ افغانوں کی تعداد کم تھی نہ شاہی فوج کی۔ ایسا گھمسان کارن پڑا کہ زمین کا سینہ کانپ اٹھا۔ کئی گھنٹوں کی لڑائی کے بعد حسام خاں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حسام خاں اٹھ قدموں دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ بہلول لودھی کا مران و بامراد سرہند واپس آیا۔ مال غنیمت کی ایک بڑی مقدار اس کے ساتھ تھی۔

اس فتح نے اس کے حوصلے بڑھادیے۔ کیا وہ شاہی فوج سے مقابلہ کرنے کی سکت بھی رکھتا ہے۔ یہ خیال ہی ایسا تھا کہ نوجوان بہلول کی رگوں میں نشہ سا اترنے لگا۔ اس وقت اچانک اسے وہ مجذوب یاد آ گیا جس نے آواز لگائی تھی کہ ہے کوئی جو دو ہزار تنکوں میں دہلی کی حکومت خریدے۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اس فقیر کو ایک ہزار چھ سو تنکے دیے تھے۔ کیا مجھے دہلی کی بادشاہت ملنے والی ہے؟

یہ خیال پختہ ہونے لگا۔ بہلول لودھی دہلی پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس خواب کو تعبیر تک پہنچانے کے لیے صرف طاقت کی نہیں عقل اور مصلحت کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے سلطان محمد شاہ کی خدمت میں ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے لکھا۔۔۔ ”میں صرف حسام خاں کی وجہ سے سلطنت سے دور ہوں۔ اگر حسام خاں کو قتل کر دیا جائے اور اس کی جگہ بادشاہ اپنے دوسرے سالار۔۔۔ حمید خاں کو وزیر الملک کے عہدے پر سرفراز کرے تو بادشاہ مجھے اپنا فرزند تصور کرے۔ میں آپ کی فرماں برداری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھوں گا۔“

محمد شاہ کو یہ عریضہ ملا تو وہ کئی دن اس پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ بہلول لودھی طاقتور اور بہادر آدمی ہے۔

پوری افغان قوم اس کے ساتھ ہے۔ اگر اس کی فرماں برداری خرید لی جائے تو میری سلطنت کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ بڑے دشمن کو دوست بنانے کے لیے چھوٹے دوست کو راہ سے ہٹا دینا ہی بہتر ہے۔ اس نے بہلول لودھی کی درخواست پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ حسام خاں کو قتل کر دیا اور حمید خاں کو نیا وزیر مقرر کر دیا۔ بہلول لودھی وعدے کے مطابق دہلی آیا اور محمد شاہ کے روبرو پہنچ کر اپنی نیاز مندی اور فرماں برداری کا عہد دہرایا۔ افغانوں کی جاگیریں از سر نو بحال ہوئیں اور بہلول لودھی کو حکم ہوا کہ وہ ایک وفادار کی حیثیت سے سرہند پر حکومت کرتا رہے۔

حسام خاں نے بڑی تدبیر سے انتظامی امور انجام دیے تھے۔ جب اسے قتل کر دیا گیا تو گردنوں کے امرا بادشاہ کی قوت کو گھٹتے ہوئے دیکھ کر خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے۔ زمینداروں نے مقررہ لگان اور خراج کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ محمد شاہ عیش پرستی میں ایسا مصروف تھا کہ اس افراتفری سے بالکل ہی غافل رہا۔ ان سرکشوں اور باغیوں کو ختم کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی۔ اس بے پروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ زہریلے عناصر سارے ملک میں پھیل گئے۔

مانڈو کا حکمران سلطان محمود خلجی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر دہلی پر حملہ کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ سلطان محمد شاہ تو خواب غفلت سے اس وقت بیدار ہوا جب دشمن شہر سے صرف دو کوس کے فاصلے پر خیمے ڈال کر ٹھہر گیا۔ محمد شاہ اس کا لشکر دیکھ کر گھبرا گیا۔ شہر کے دروازے بند کر لیے اور بہلول لودھی کے پاس قاصد دوڑا دیے۔ بہلول خاں تو ایسے کسی احسان کا موقع ڈھونڈ ہی رہا تھا۔ وہ پیغام ملتے ہی بیس ہزار ہتھیار بند فوجیوں کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔

محمد شاہ کے پاس اپنا لشکر بھی بہت تھا اور بہلول لودھی بھی جنگجو لے آیا تھا۔ اس کے باوجود محمد شاہ نے میدان جنگ میں جانا گوارا نہیں کیا بلکہ اپنے امرا کو میدان جنگ میں بھیجا۔ سلطان محمود خلجی کو جب معلوم ہوا کہ سلطان محمد شاہ جنگ میں شامل نہیں ہے تو وہ خود بھی نہیں گیا اور اپنے بیٹوں غیاث الدین اور قدر خاں کو مقابلے کے لیے بھیج دیا۔

شام تک معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ بہلول کے ساتھ آئے ہوئے مغل اور افغان تیر اندازوں نے ایسے جہم دکھائے کہ دشمن کے حوصلے پست کر کے رکھ دیے۔ پھر اندھیرے کی وجہ سے یہ سوچ کر جنگ موقوف کر دی کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوگا تو فیصلہ کن معرکہ سرانجام دیا جائے گا۔

محمد شاہ بادشاہ نے اسی رات خوفناک خواب دیکھا۔ صبح ہوتے ہی توہمات کے شکار بادشاہ نے کسی امیر سے مشورہ کیے بغیر چند مذہبی لوگوں کو سلطان محمود کے پاس صبح کے لیے بھیج دیا۔ سلطان محمود پہلے دن کے معرکے کے بعد ہی یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی طرح صلح ہو جائے لیکن صلح کا لفظ اپنے منہ سے نکالنا شرمندگی کا باعث سمجھ رہا تھا۔ اس کے لیے تو غیب سے امداد آگئی۔ اس نے فوراً صلح کر لی۔

بہلول کو محمد شاہ کی بزدلی پر سخت غصہ آیا۔ یہ احساس بھی تھا کہ محمد شاہ نے اسے مشورے کے لائق بھی نہیں سمجھا۔ اس نے اس صلح کو تسلیم نہیں کیا۔ سلطان محمود جب میدان چھوڑ کر جانے لگا تو اس نے تعاقب کیا۔ سلطان محمود کا لشکر بھی جاتے جاتے رک گیا۔ دونوں کے درمیان خوب مقابلہ ہوا۔ پھر بے ہوئے بہلول نے دشمن کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔

جب دشمن نے جائے پناہ نہ دیکھی تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ بہلول نے بے شمار مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ بہلول لودھی نے مال غنیمت بادشاہ کے قدموں میں رکھا تو بادشاہ اس کی بہادری اور دیانت داری سے بہت خوش ہوا۔ اسے خان خانان کے لقب سے سرفراز کیا۔

بہلول نے اپنا فرض پورا کر دیا لیکن عوام اس بات کو نہ بھول سکے کہ بادشاہ نے محمود خلجی سے صلح کی درخواست کی تھی۔ اس کی تعظیم لوگوں کی نگاہوں سے جاتی رہی اور آہستہ آہستہ اس کے زوال کا باعث بنی۔

اب بہلول خاں کی طاقت اور اقتدار میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ اب اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں۔ خزانے میں دولت بھی اتنی تھی کہ بڑے سے بڑا۔۔۔ لشکر رکھ سکتا تھا۔ سرہند اس کے لیے مبارک بھی ثابت ہو رہا تھا لہذا اس شہر کو بابرکت سمجھتے ہوئے امرا کو حکم دیا کہ اپنے اپنے ناموں سے الگ الگ محلے آباد کریں۔

ترنی کا سفر شروع ہو گیا۔ بہلول لودھی نے بھی قلعے کے باہر اپنے لیے ایک حویلی تعمیر کرائی۔ جب یہ حویلی تعمیر ہوئی، ترمین و آرائش ہو چکی تو وہ وہاں کبھی بھی جا کر قیام کرنے لگا۔ ایک روز وہ اس حویلی کی چھت پر ٹھہل رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر بنے ایک مکان پر نظر پڑی تو پھر نظریں اس مکان سے ہٹا بھول گئیں۔ مکان کے چھن میں ایک لڑکی بیٹھی اپنے بال سکھا رہی تھی۔ بال اتنے لمبے تھے کہ اس کی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس لڑکی نے بالوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ چہرہ کیا تھا، ایک چاند

عورت

عورت چلبے چھوٹی ٹمٹمکی ہو یا بڑی ٹمٹمکی۔ اس کی مقبولیت اور محبوبیت سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز اس کے دل کو نہیں بہکاتی چلبے آپ خود اپنی زبان سے اظہار پسندیدگی کر دیں یا اُسے کسی اور طرح معلوم ہو جائے یا تشبیہات و استعارات سے کہیں کوئی اشتادہ کرے کہ آپ اُسے پسند کرتے ہیں یا ان باتوں کو پسند کرتے ہیں جو اس کے اندر موجود ہیں۔

تو پھر۔۔۔ وہ دیوانی سی ہو جاتی ہے۔

از مرم۔۔۔ سید حسن مشتاق ندوی

تھا جو بدلی سے نکل آیا تھا۔ بہلول کو فوراً احساس ہوا کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔ پہلی نظر تو ٹھیک تھی لیکن وہ مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بے کلی تھی کہ اصرار کر رہی تھی۔ دل تقاضا کر رہا تھا کہ پھر اس طرف دیکھے۔ اس نے مجبور ہو کر پھر اس مکان کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی اٹھ کر اندر کی طرف جا رہی تھی۔ پھولوں سے بھری ایک شاخ تھی جو درخت سے جدا ہو کر چلنے لگی تھی۔ اس کے بعد چھن میں اندھیرا تھا۔ بہلول نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ نہ بات کی تھی نہ اس کا نام معلوم تھا۔ یہ نظارہ بھی دور کا نظارہ تھا لیکن وہ بے چین ہو گیا تھا۔ چھت سے نیچے اتر آتو آنکھیں اسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ اور سوچتا لیکن اسے بتایا گیا کہ مہمان خانے میں قطب خان، فیروز خاں، عیسیٰ خاں اور چند دوسرے امرا آئے بیٹھے ہیں۔ اس کے خیالوں کا سلسلہ کسی اور طرف چلا گیا۔

وہ ان لوگوں سے ملاقات کے لیے مہمان خانے پہنچ گیا۔

”اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم آپ سے چند باتیں کرنے آئے ہیں۔“ عیسیٰ خاں نے گزارش کی۔

”میرے پاس وقت نہیں بھی ہوگا بھی تو میں آپ لوگوں کی بات سنوں گا۔“

”اس وقت محمد شاہ کی کمزوری نے ہندوستان کی حالت کو ابتر کر دیا ہے۔“ قطب خان نے کہا شروع کیا۔ محمد

اسے صبح ہی صبح بلوایا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس کا استقبال اس طرح ہوا تھا جسے وہ کسی دوست ملک کا راجا ہو۔ بہلول نے اسے اپنے برابر بٹھایا تھا وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ بہلول اس کے گھر آیا تھا۔ یہ بھی عجیب سی بات تھی کہ بہلول نے اسے طلب کر لیا تھا۔

بہلول کے خاطر تواضع کے بعد گفتگو کا آغاز کیا۔ ”یہ مت سمجھئے گا کہ میں نے آپ کو طاقت کے بل پر بلوایا ہے یا آپ بہلول والی سرہند کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ میں جو کچھ پوچھوں اس کا بلا جھجک جواب دیجئے گا۔“

”آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ ڈرنا تو لازمی ہے لیکن پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ آپ کے سامنے اپنی زبان کھول سکوں۔“

”میں تمہاری بیٹی ہیما کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کس غلطی ہو گئی اس معصوم سے؟“

”غلطی اس سے نہیں، ہم سے ہوئی ہے میں نے اسے دیکھنے کی جسارت کی۔“

”وہ تو آپ کی رعایا ہے۔ بادشاہ سے کیا پردہ۔“

”میں چاہتا ہوں اس کے وجود سے میری حویلی آباد ہو۔“

”آپ فرمادیجئے میں اسے ساتھ لے آتا۔“

زرگر بہلول کے اشاروں کو سمجھ ہی نہیں پاتا تھا۔ اب بہلول نے کھل کر بات کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

”اگر آپ مجھے اس لائق سمجھیں تو میں آپ کی دامادی کا شرف حاصل کر سکتا ہوں۔ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”حضور، نخل میں کبھی ٹاٹ کا پوند لگا ہے؟“

”نہ میں نخل ہوں نہ تم ٹاٹ ہو۔ سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ سب برابر ہیں۔“

”یہ بات کہنے کے لیے آپ کو میرے گھر آنا چاہیے تھا جیسا کہ قاعدہ ہے۔“

”جب وقت آئے گا تو میں پیدل چل کر تمہارے گھر آؤں گا۔ ابھی تو میں نے صرف یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہے تو مجھے بامراد کر دیں ورنہ آپ انکار بھی کر سکتے ہیں۔ اس وقت میرے اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی۔“

”یہ تو میری بیٹی کی خوش قسمتی ہوگی کہ وہ والی سرہند کو بیابانی جائے۔“

سوچ رہا تھا وہ کسی غلط گھر میں تو نہیں آ گیا۔ کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر اسے ایک ترکیب سمجھا دی گئی۔

”تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟“

”میری ایک ہی بیٹی ہے سرکار!“

”کہاں ہے وہ، نظر نہیں آئی؟“

”سرکار وہ بڑی شرمیلی ہے۔ آپ کے سامنے آتے ہوئے جھجک رہی ہے۔ میں نے کہا بھی کہ آپ سے کیا پردہ۔ آپ تو ہمارے بادشاہ ہیں۔ ٹھہریے میں پھر اسے بلاتا ہوں۔“

”رہنے دو، وہ نہیں آئی تو اسے مجبور مت کرو۔ مجھے تو تم سے ملنا تھا۔ تمہاری ضرورتوں کے بارے میں پوچھنا تھا۔ اپنی رعایا کا خیال میں نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا۔“

صاحب خانہ اس خیال سے کہ کہیں بہلول خفانہ ہو جائے اٹھ کر گیا اور اپنی بیٹی کو بلا کر لے آیا۔

”یہ ہے میری بیٹی، ہیما۔“

کمرے میں روشنی سی ہو گئی۔ بہلول نے اسے بہت دور سے دیکھا تھا۔ اب جو قریب سے دیکھا تو روشنی اور خوشبو ہی دوسری تھی۔ انسانی حسن ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ لڑکی اس معمولی سے گھر کے لائق نہیں۔ اسے تو میرے محل میں ہونا چاہیے تھا۔

ہیما کا باپ اپنی بیٹی کے بارے میں اور نہ جانے کیا کیا بتا رہا تھا۔ بہلول کو اپنی سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو بس یہ سن سکتا تھا۔ ”یہ ہے میری بیٹی ہیما۔“

ہیما گڑبازی سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

بہلول زرگر سے مخاطب ہوا۔ ”میں نے سنا تھا تمہاری ایک بیٹی بھی ہے۔ میں اس کے لیے یہ ننگن لے کر آیا۔ اس نے اپنی جیب سے ننگن نکال لے اور زرگر کی طرف بڑھادیے

”اگر یہ ننگن آپ اپنی بیٹی کو اسی وقت پہنا دیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”ہم اس کے بدلے میں آپ کو کچھ بھی دینے کے لائق نہیں ہیں۔“

”میں آپ سے صرف وہ مانگوں گا جو آپ دے سکتے ہیں اور وہ بھی ابھی نہیں۔ آپ یہ تحفہ قبول فرمائیں۔“ زرگر نے یہ ننگن اپنی بیوی کے ہاتھ میں دیے۔ بیوی نے بیٹی کے ہاتھوں میں ڈال دیے۔

بہلول اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ہیما کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے بھی اسی وقت بہلول کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اٹھائی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ ایک کہانی شروع ہوئی جس کا آغاز دوسرے دن ہونا تھا۔

ہیما کا باپ بہلول کی حویلی میں آیا ہوا تھا۔ بہلول نے

تیاری کا حکم دے دیا۔ یہ لوگ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ بہلول پھر تنہا رہ گیا۔ تنہائی میں وہ لڑکی پھر اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے ایک نوکر کو اپنے پاس بلایا اور اسے اس مکان کی شناخت کرانے کے بعد اس کے بارے میں پوچھا کہ وہ مکان کس کا ہے۔ اس نوکر نے بتایا کہ وہاں کوئی زرگر رہتا ہے۔

”میں چاہوں گا کہ ایک اچھے مسائے کی طرح اس سے ملاقات کے لیے جاؤں۔“

”آپ فرمائیں تو میں اس زرگر کو یہاں بلواؤں؟“

”نہیں، اس طرح وہ یہ سمجھے گا کہ ہم نے اسے اپنی طاقت کے بل بوتے پر اسے بلوایا ہے۔“

”وہ آپ کی رعایا ہے سرکار۔“

”جو تم سے کہا جا رہا ہے وہ کرو، اس شخص سے جا کر کہو کہ بہلول لودھی تمہارے گھر آ کر تم سے ملاقات کا خواہاں ہے۔“

”جو آپ کا حکم۔“

وہ نوکر گیا اور کچھ ہی دیر میں پیغام پہنچا کر واپس آ گیا۔ یہ جواب بھی لایا کہ زرگر کو کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ اس کی ضیافت کے انتظامات کے لیے کچھ وقت مانگ رہا ہے۔

”در بارہ پھر جاؤ اور اسے کہو، بہلول کو تمہاری ضیافت سے غرض نہیں وہ صرف ملاقات چاہتا ہے لہذا کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ رہا ہے۔“

نوکر واپس آیا تو بہلول گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دو محافظوں کو ساتھ لیا اور زرگر کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہ بے چارہ دروازے پر کھڑا تھر تھرا رہا تھا۔

چند قدم ہی کا تو فاصلہ تھا۔ گھوڑا اس کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ زرگر آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”سرکار نے مجھے طلب کر لیا ہوتا۔“

”ایک ہی بات ہے، میں چلا آیا۔“

”میرا گھر اس لائق تو نہیں بہر حال آپ اندر شریف لائیں۔“

وہ کوئی غریب آدمی نہیں تھا۔ گھر میں وہ سب کچھ تھا جو گھر کی آرائش و زیبائش کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اسے ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک عورت سفید قیمتی ساڑی پہنے اندر داخل ہوئی۔ یہ اس زرگر کی بیوی تھی بہلول ان دونوں سے اچھی طرح ملا لیکن اس کی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے کسی اور کا بھی انتظار تھا۔ وہ لڑکی نہیں آئی تھی جس کو اس نے صحن میں دیکھا تھا۔

شاہ کی قوت کم ہوتے ہی طالع آزمائوں نے مختلف علاقوں پر قبضے کر لیے ہیں۔ دکن، گجرات، مالوہ، بنگالہ غرض ہر جگہ حکمران اپنا سکہ چلا رہے ہیں۔ جو جہاں بیٹھا تھا وہیں خود مختار بن گیا ہے۔ دریا خاں سبھل پر حکمرانی کر رہا ہے۔ مرک بچہ عیسیٰ خاں ”کول“ (علی گڑھ کا قدیم نام) پر قابض ہے۔ احمد خاں میواتی مہروٹی سے سرائے لاڈر تک (جو دہلی سے نزدیک تھا) قابض ہو گیا ہے۔ واہڑی سے قصبہ، بھوینگاؤں تک قطب خاں سر حسن خاں نے ہتھیالیا ہے۔ پٹیالی میں رائے پر تاپ اور بیانہ میں داؤد خاں اور حدی حکومت کر رہا ہے۔ محمد شاہ تو بس دہلی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

”ہاں یہ سب تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“ بہلول لودھی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں محمد شاہ کے ملازم کی طرح ہوں۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتا ہے لیکن میں اس کی عاقبت نا اہندگی اور بزدلی دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ سارے علاقے اسے فتح کر کے دے دوں۔“

”ہم اس لیے آپ کے پاس آئے ہیں کہ اب وفاداری کا وقت نہیں رہا۔ اگر آپ خاموش بیٹھے رہے تو بادشاہ کی مخالف طاقتیں اتنی طاقت پکڑ لیں گی کہ سرہند بھی ان کی دست برد سے بچ نہیں سکے گا۔“

”کیا تم لوگ یہ کہنے آئے ہو کہ بہلول کمزور ہو گیا ہے۔ میری طاقت تو تم لوگ ہو تمہارے ہوتے ہوئے کون ہے جو سرہند کی طرف بڑھے۔“

”اس طوائف الملوکی کے عالم میں ہم کیا صرف سرہند پر تکیہ کر کے بیٹھے رہیں گے؟“

”تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”آپ کی اجازت۔“

”کیسی اجازت؟“

”ہم جتنے علاقے فتح کر سکتے ہیں کر لیں۔ محمد شاہ سے اب کوئی توقع فضول ہے۔“

”تم کن علاقوں کی طرف بڑھنا چاہتے ہو؟“

”جیرت گھڑ کو آپ بھولے تو نہیں ہوں گے جس نے عہد طبعہ توڑا تھا اور افغانوں کو خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔ یہ موقع اچھا ہے کہ اسے سبق پڑھایا جائے۔ پنجاب کے علاقے پر حملہ کر کے لاہور میں اپنی حکومت مستحکم کی جائے۔ دیپالپور بھی ہم سے دور نہیں۔ اگر ہم پانی پت تک چلے گئے تو دہلی کی طرف بڑھنے والے جتنے قدم ہوں گے ہماری زد میں ہوں گے۔“

بہلول لودھی نے اس مشورے کو پسند کیا اور ان امر کو

”آپ کی اس اجازت کے بعد ہمیں ہمارے نام کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ میں ایک دوروز میں ایک مہم پر روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تم سن لو کہ میں میدان جنگ میں مارا گیا تو تم آزاد ہو گے۔ ہمیں شادی نہیں کرنی دینا ورنہ میرا انتظار کرنا۔ میں واپس آ کر تمہارے گھر آؤں گا۔“

بہلول نے اس سے وعدہ لیا اور نہایت عزت سے رخصت کیا۔

بہلول لودھی نے اپنے امرا کے مشورے پر عمل کیا۔ لشکر جرار لے کر سرہند سے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے پنجاب، دہلی، پالپور، اور دیگر علاقوں پر قابض ہوتا ہوا پانی پت تک کے علاقے کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس نے لاہور میں ایک مستحکم حکومت قائم کر لی۔ یہاں جبریت کھڑی کی حکومت تھی جو اس نے لڑے بغیر بہلول کے حوالے کر دی اور مع خزانہ بہلول کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہلول نے فراخ دلی سے اس کے سابقہ قصور معاف کر دیے۔ جبریت کھڑی محمد شاہ بادشاہ سے باغی ہو گیا تھا اسے یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ محمد شاہ کہیں بہلول کے ذریعے اس گرفتار یا قتل نہ کرادے۔ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ دونوں کے تعلقات میں رخنہ پڑ جائے۔ دوستی، دشمنی میں بدل جائے۔ اس نے بہلول کی خیر خواہی کا دم بھرتے ہوئے اس کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ لب لباب یہ تھا کہ وہ تخت دہلی کا حکمران بننے کی کوشش کرے۔

”اس وقت ہندوستان میں افغانوں کے سوا مجھے دوسری طاقت نظر نہیں آتی۔ محمد شاہ کا حال یہ ہے کہ وہ کمزوروں کے ہاتھوں میں اپنی کمزوریوں سے ٹھیل رہا ہے۔ پورا ہندوستان دھوڑوں میں بٹ گیا ہے۔ کوئی بھی طاقت مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دہلی پر قابض ہو سکتی ہے۔ پھر آپ کیوں نہیں؟ ابھی تو محمد شاہ ہے جو آپ کو اپنا فرزند کہتا ہے۔ اگر کوئی اور تخت دہلی پر براجمان ہو گیا تو معلوم نہیں آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ وہ وقت آنے سے پہلے دہلی پر حملہ کر دیں۔ میرا تعاون آپ کے ساتھ ہوگا۔“

”آپ نے ابھی اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ محمد شاہ مجھے اپنا فرزند کہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ یہ سلوک کروں؟“

”معاف کیجیے گا۔ ذرا وہ وقت یاد کیجئے جب اس نے افغانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنا لشکر سرہند بھیجا تھا۔ آپ کا نام اس وقت بھی بہلول لودھی تھا۔ جب آپ کے پاس طاقت جمع ہوگئی تو آپ کو فرزند کہنے لگا۔ وہ آپ سے خلوص

نہیں رکھتا آپ سے ڈرتا ہے۔ کئی مرتبہ مجھ سے تنہائی میں کہہ چکا ہے کہ افغان میری حکومت کے لیے سخت خطرہ ہیں۔ کوئی چال ایسی چلو کہ افغانوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ یہی بات اس نے دوسرے حکمرانوں سے بھی ضرور کہی ہوگی۔ ویسے آپ کی مرضی۔ آپ فرزند کی کارشتہ نبھاتے رہیے۔“

وہ جب آتا تھا یہی بات کرتا تھا۔ بہلول کے سر میں بھی دارالسلطنت پر حملہ کرنے کا سودا سما گیا۔ اس فقیر کی پیش گوئی بھی اس کا تعاقب کرتی رہتی تھی جن سے وہ ابتدائی دنوں میں سامانہ میں مل چکا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ دہلی پر حملہ کر دے گا۔

اس نے قطب خاں اور فیروز خاں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی اس کے اس ارادے کی توثیق کی بلکہ قطب خاں نے اسے نبل از وقت مبارک باد بھی دے ڈالی۔

بہلول نے بڑے کروفر سے محمد شاہ کو نیچا دکھانے کے لیے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ ایک مدت تک محاصرہ کرنے کے بعد بھی کامیابی نہیں ہوئی تو وہ محاصرہ ٹھا کر سرحد پار آ گیا۔

سرہند آ کر اس نے خود کو سلطان بہلول لودھی کہلوا دیا البتہ خطبہ وسک کو دہلی کی فتح تک ملتوی کر دیا اور اپنی طاقت بڑھانے لگا تا کہ دہلی کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کرے۔ ابھی وہ اپنے لشکر میں اضافہ کرنے میں مشغول تھا کہ محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا علاؤ الدین تخت دہلی پر متمکن ہوا۔

۵۵۵

دہلی کے سلطان علاؤ الدین کو بدایوں کی آب و ہوا بہت پسند تھی۔ اس کا زیادہ قیام بدایوں ہی میں رہتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ وہیں مقیم تھا۔ اس کا وزیر حمید الدین خاں بھی اس کے ساتھ ہی بدایوں آیا تھا۔

مالوہ کا راجا، پرتاب دیو، حمید الدین خاں سے سخت عداوت رکھتا تھا کیونکہ کسی موقع پر اس کے باپ کو حمید الدین خاں نے قتل کر دیا تھا۔ سلطان محمد شاہ کی زندگی میں پرتاب دیو کو یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ حمید الدین خاں سے انتقام لیتا لیکن علاؤ الدین جیسے کمزور بادشاہ کی موجودگی میں اسے یہ موقع مل گیا۔ اس نے ایک عرضداشت کے ساتھ تیز رفتار قاصد بدایوں کی طرف دوڑا دیے۔

اس عرضداشت میں لکھا گیا تھا۔

”آپ کا وزیر حمید خاں، مانڈو کے حکمران محمود خلجی کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف سازش کر رہا ہے اور عنقریب حمید خاں اور محمود خلجی دونوں مل کر آپ کو تخت و تاج

کی بار بار آمد سے پہلے ہی شک ہو گیا تھا وہ تیار ہی بیٹھا تھا۔ اس نے دولت خان کو ساتھ لیا اور ایک لشکر کے ساتھ بدایوں سے نکل گیا۔

جمال خاں جسے بادشاہ نے حمید خاں کی نگرانی پر مامور کیا تھا اسے جب حمید خاں کے بھاگنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ حمید خاں اپنے گھرنیک پہنچ گیا تھا کہ جمال خاں نے اسے جالیا۔ دونوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ اس جھڑپ میں جمال خاں ایک تیر لگنے سے زخمی ہوا اور اس نے بھاگنے ہی میں عافیت جانی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں نے اسی میں اپنی سلامتی سمجھی کہ حمید خاں کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ حمید خاں نے ان لوگوں کو ساتھ لیا اور بادشاہ کی حرم سرا میں گھس گیا۔ سلطان کی بیگمات، لڑکیوں اور لڑکوں کو سر برہنہ کر کے قلعے سے نکال دیا اور سلطنت کے خزانے پر قابض ہو گیا۔ سلطان علاؤ الدین ایسا ناقابل قبول تھا کہ قلعے میں موجود سپاہیوں میں سے کسی نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ وہ خود بادشاہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد وہ اس فکر میں ڈوب گیا کہ بادشاہ کسے بنایا جائے۔ اس کے ذہن میں دو آدمیوں کے نام گونجے۔ سلطان محمد شرقی جو پور کا حکمران تھا۔ مگر وہ علاؤ الدین کا داماد

سے محروم کر دیں گے۔“ عرضداشت میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ سلطان محمود ایک بہت بڑا لشکر لے کر چڑھ آنے والا تھا۔ اس وقت تو میں نے اسے حیلے بھانے سے روک دیا ہے لیکن وہ کسی وقت حملہ ضرور کرے گا۔ سلطان محمود تو آپ کے اختیار میں نہیں لیکن آپ کا وزیر تو آپ کے پاس ہے۔ آپ فوراً اسے گرفتار کریں، تاکہ اس سازش کا قلع قمع ہو جائے۔“

بادشاہ ابھی اس عرضداشت پر غور کر رہی رہا تھا کہ پرتاب دیو کے قاصد ایک مرتبہ پھر آئے اور عرض کیا۔ ”اگر حمید خاں کو قتل کر دیا جائے تو ہم لوگ چالیس لاکھ کے پرگنہ بادشاہ کی سلطنت میں شامل کر دیں گے۔ ساری رعیت حمید خاں سے عاجز آ چکی ہے لہذا کوئی آواز بلند نہ ہوگی۔“

علاؤ الدین کے پاس اس وقت دہلی اور ارد گرد کے علاقے رہ گئے تھے۔ ایسے میں جب چالیس پرگنوں کی پیش کش کی گئی اس کے منہ میں پانی بھر آیا وہ کانوں کا کچا بھی تھا اور ناعاقبت اندیش بھی۔ اس نے سوچ سمجھے بغیر حمید خاں کے قتل کے احکام جاری کر دیے۔

جس وقت یہ قاصد آئے بیٹھے تھے، حمید خاں کا ایک ساتھی دولت خاں بھی وہاں موجود تھا اس نے وفاداری نبھائی اور حمید خاں تک یہ خبر برداشت نہ کی۔ حمید خاں کو قاصدوں

تھا اس لیے مناسب نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرا نام سلطان محمود خلجی کا تھا لیکن وہ دور تھا۔ قریب تو پھر لودھی تھے۔ اسے ملک بہلول لودھی کا خیال آیا۔

حمید خاں کا مقصد یہ تھا کہ وہ برائے نام بہلول لودھی کو بادشاہ بنائے اور خود حکومت کی باگ ڈور سنبھالے۔

حمید خاں نے بہلول لودھی کو طلب کیا۔ بہلول ایک فوج لے کر دہلی آگیا اور عہد و پیمان کے بعد حمید خاں نے قلعہ کی کنجیاں بہلول کے سپرد کیں اور اسے تخت نشین کر دیا۔

کچھ دن ہی گزرے تھے کہ بہلول اپنی بے بسی کو محسوس کرنے لگا۔ بادشاہ بہلول تھا لیکن قبضہ و اقتدار حمید خاں کا تھا۔ حکم اسی کا چلتا تھا۔ بہلول کو یہ صورت حال منظور نہیں تھی۔ وہ حمید خاں کو درمیان سے ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ حمید خاں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے۔ وہ حمید خاں کے گھر برابر جاتا رہتا کہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ایک روز گیا تو افغانوں کی ایک جماعت کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اس نے انہیں پہلے ہی سمجھا دیا کہ وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔

بہلول کے ساتھ یہ افغانی جماعت حمید خاں کے گھر پہنچی تو ان لوگوں نے عجیب و غریب مضحکہ خیز حرکتیں کرنا شروع کر دیں۔ بعض نے فرش پر آتے وقت جوتیاں کر سے باندھ لیں۔ بعض نے اس طاق پر اپنے جوتے رکھ دیے جو حمید کے سر کے عین اوپر تھا۔ اس بے ہودگی کی وجہ ان لوگوں نے یہ بیان کی کہ جوتیاں چوری نہ ہو جائیں اس لیے ایسا کیا ہے۔

یہ ایسی بے ہودگی تھی کہ حمید خاں شکایت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ”یہ کیا بے ہودگی ہے۔ ان لوگوں کو روکتے کیوں نہیں؟“ ”یہ لوگ حد درجہ بے وقوف ہیں اور تہذیب سے ناواقف۔ آئندہ آیا تو ان لوگوں کو سمجھا کر لاؤں گا۔“ بہلول نے یہ کہہ کر معاملہ رفع و دفع کر دیا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چند افغان براہ راست حمید خاں سے مخاطب ہوئے۔ ”آپ کا فرش تو مختلف رنگوں کے پھولوں کا ایک گلہ استہ ہے۔ اگر آپ اس کبل کا ایک ٹکڑا ہم لوگوں کو عنایت کریں تو ہم اس کی ٹوپیاں بنوا کر اپنے بال بچوں کو بھیج دیں تاکہ اس تحفے سے ہمارے گھروالوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ ہم خان والا شان کے ملازم ہیں۔“

حمید خاں نے ہنس کر کہا ”ٹوپیاں بنانے کے لیے تم لوگوں کو زربفت اور ٹمبل دے دیا جائے گا۔“ اس کے بعد عطر کی کشتیاں اور پان محفل میں آئے۔ اس موقع پر بھی ان افغانوں نے خوب بے ہودگی مچائی بعض نے عطر کی پھر۔ بری پان میں لگا کر چبانا شروع کی۔ بہتوں

نے پان کا چونا نہ چھڑایا اور کسی طرح پان کھالیا بعض نے پان تو پھینک دیے اور چونا چھڑا کر کھانا شروع کر دیا۔ چونس نے اپنا کام دکھایا۔ منہ کٹ گیا تو پاگلوں کی طرح رونا دھوا شروع کر دیا۔

حمید خاں.... ان بے وقوفوں پر ہنسنے بغیر نہ رہ سکا اور کہہ اٹھا ”بہلول خاں تمہاری قوم تو بالکل ہی اجڑ ہے۔“ بہلول نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”جامل ہیں اچھا ماحول بھی انہیں نہیں ملا لہذا انہیں پیٹ بھرنے اور سونے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں۔ عقل کی کوئی بات انہیں آتی ہی نہیں۔“

بہلول وہاں سے لوٹا تو حمید خاں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ بہلول کے ساتھی سب کے سب ناکارہ اور بے وقوف ہیں۔ یہ عقل کی کوئی بات بہلول کو سکھا ہی نہیں سکتے لہذا بہلول کو بے آسانی انھیلوں پر نچایا جاسکتا ہے۔ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔

بہلول کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ چند روز کے بعد ملک بہلول پھر حمید خاں کے گھر گیا۔ اس کے افغان ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس مرتبہ قطب خاں بھی اس جماعت میں شامل ہو کر آیا تھا۔

پچھلی مرتبہ کا تجربہ شامل تھا لہذا دربانوں نے بہلول کو تو اندر جانے دیا مگر اس کے ساتھیوں کو باہر ہی روک لیا کہ تم لوگ اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے ہو اس لیے باہر ہی کھڑے رہو۔ ان افغانوں نے زور زور سے چیخا اور بہلول کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے جاتے تھے۔

”اگر بہلول خان اندر جاسکتا ہے تو ہمیں بھی یہ حق ہے کہ ہم اندر جائیں اور حمید خاں کو سلام کر کے آئیں۔“

شور کی آواز اندر آگئی اور حمید خاں کو معلوم ہوا کہ معاملہ کیا ہے تو اس نے کہلوادیا۔ ان سب کو اندر آنے دیا جائے۔ یہ حکم پاتے ہی سب افغان اندر آگئے اور حمید خاں کو سلام کر کے اس کے محافظوں کو پاس دو دو کی تعداد میں کھڑے ہو گئے۔

اب قطب خاں کو اپنا کام شروع کرنا تھا۔ وہ زنجیر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس زنجیر کو نکالا اور حمید خاں کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے قطب خاں؟“ ”اسے زنجیر کہتے ہیں جو کسی کو قید کرتے ہوئے پہنائی جاتی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم گونہ نشیں ہو کر خدا کی عبادت کرو۔ تمہاری جان بخشی کی جاتی ہے صرف اس لیے کہ تم وفادار

رہے ہو۔ اب تم جب تک زندہ رہو گے یا جب تک خدا کو منظور ہوگا زنداں کی دھول چاٹو گے۔“

حمید خاں کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ بہلول نے اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ کسی خوں ریزی کے بغیر حمید خاں جیسا طاقتور وزیر راستے سے ہٹ گیا تھا۔ اب صرف سلطان علاؤ الدین رہ گیا تھا جو کسی بھی وقت تخت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ اس کے لیے بہلول نے یہ طریقہ سوچا کہ اسے عریضہ لکھ کر دہلی بلایا جائے اور حمید خاں کے ساتھ اسے بھی داخل زنداں کر دیا جائے۔

اس نے علاؤ الدین کو لکھا ”چونکہ میں آپ کے والد کا پروردہ ہوں لہذا حقیقت میں آپ کی طرف سے سلطنت کے کاموں کو انجام دے رہا ہوں۔ آپ کا نام بھی خطبے سے خارج نہیں کیا ہے۔ حمید خاں راستے سے ہٹ گیا ہے۔ آپ بلا خوف و خطر تشریف لائیں اور اپنی سلطنت سنبھالیں۔“

علاؤ الدین ایسا دلبرداشتہ ہوا تھا کہ سلطنت کے کاموں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے لکھ بھیجا۔

”میرے والد نے چونکہ تجھ کو فرزند کہا ہے لہذا میں تجھ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور سلطنت تیرے لیے چھوڑتا ہوں اور خود بدایوں پر قناعت کرتا ہوں۔“

اب بہلول کو کسی طرف سے خطرہ نہیں رہا تھا۔ دہلی میں اس کے تمام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سکے بھی اس کے نام کا جاری ہوا۔ اب وہ بلا شرکت دہلی کا بادشاہ تھا۔

اس کے کانوں میں اس وقت یقیناً اس فقیر کی آواز گونجی ہوگی ”کوئی شخص ہے جو دو ہزار تنکوں کے عوض دہلی کی بادشاہت خریدے۔“

قطب خاں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ”قطب خاں تمہیں وہ فقیر یاد ہے جو ہمیں سامانہ میں ملا تھا؟“

”ہاں یاد تو آ رہا ہے۔“ قطب خاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”پھر تو تمہیں یہ بھی یاد آ گیا ہوگا کہ میں نے ایک ہزار چھ سو تنکے اس فقیر کو دیے تھے اور وہ دہلی کی بادشاہت خرید لی تھی۔“

”ارے ہاں۔ آپ نے تو واقعی بادشاہت خرید لی اور وہ بھی کسی بڑی جنگ کے بغیر۔“

”تمہیں یاد ہے تم نے اس وقت میرا مذاق اڑایا تھا۔ یاد رکھو بزرگوں کی باتوں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔“

”مجھے تو سب کچھ یاد آ گیا لیکن آپ کچھ بھول رہے

ہیں۔“

”میں نے تمہیں یاد دلایا ہے، تم مجھے یاد دلادو۔“

”آپ سرہند میں کسی سے کوئی وعدہ کر کے آئے تھے۔“

”کیسا وعدہ اور کس سے وعدہ کیا تھا؟“

”آپ کو وہ زرگر یاد ہے جس کی بیٹی آپ کے نام پر بیٹی ہوئی ہے۔“

”مجھے یاد آ گیا لیکن یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟“

”آپ کے ایک نوکر نے مجھے بتایا ہے۔ وہ زرگر اس نوکر سے ملا تھا اور اس سے کہا تھا کہ سلطان بہلول کو اس کا وعدہ یاد دلانے۔“

سلطان بہلول کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔ ”مہنات کے بکھیروں میں مجھے اپنی غرض یاد ہی نہیں رہی۔ واقعی یہ بڑی زیادتی ہوگئی۔ زرگر میرے خوف سے اس کی کہیں شادی بھی نہیں کر سکا ہوگا اور میں نے بھی پلٹ کر اسے نہیں پوچھا۔ اب اس کا ازالہ کروں گا۔“

بہلول لودھی اسلام خاں کا فقط بھتیجا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا داماد بھی تھا۔ اس وقت تک اس کے نو بیٹے پیدا ہو چکے تھے۔

اس نے قطب خاں سے جو اس کا چچا زاد بھائی بھی تھا اور سالہا بھی، معذرت کی کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر شادی کا وعدہ کر بیٹھا اور اب اس وعدے کو پورا کرنا اس کا فرض ہے۔

وہ اب سرہند کا والی نہیں دہلی کا بادشاہ تھا۔ نہایت شان و شوکت کے ساتھ عازم سفر ہوا اور سرہند جا کر اپنی حویلی میں مقیم ہوا۔

اسے اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے زرگر سے کہا تھا جب وہ وقت آئے گا تو پیدل زرگر کے گھر آئے گا۔ وہ اس روز گھوڑے پر سوار نہیں ہوا۔ چند محافظوں اور نکاح خواں کو ساتھ لے کر اپنی سسرال پہنچ گیا۔

دہلی کا بادشاہ معمولی زرگر کے مکان پر آیا تھا۔ زرگر کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے یا حقیقت اس کے سامنے ہے۔ بہر حال بہلول نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ہیما (تاریخ فرشتہ نے اس کا نام زیبا لکھا ہے) سے عقد کیا۔

کچھ دن اپنی حویلی میں رہا اور پھر دہلی آ گیا۔

علاؤ الدین کی نااہلی نے حکومت بہلول لودھی کے حوالے کی تھی لیکن اس کے بعض امرا اس فیصلے کے خلاف تھے۔ انہیں یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ دہلی پر ایک اجڑ افغان حکومت کرے۔ ان امرائے پہلے تو خود خفیہ طور پر یہ

طے کیا لکڑہ لشکر لے کر بدایوں سے نکلیں اور دہلی پر حملہ آور ہو جائیں لیکن ان کی کم ہمتی نے جلد ہی یہ فیصلہ واپس لے لیا۔ اس طرح تو وہ علاؤ الدین کی نظروں میں بھی گر جاتے اور ناکامی کی صورت میں کہیں کے نہ رہتے۔ بہلول کی طاقت نے خوفزدہ بھی تھے۔ علاؤ الدین کو سمجھانا بے سود تھا۔ اب اسے ایسی کسی مہم سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔

کئی دن کے غور و فکر کے بعد آخر ایک راستہ نکل ہی آیا ایک امیر نے اپنی رائے پیش کی۔

”ہمیں سلطان محمود شرقی والی جو پور کی مدد لینا چاہیے۔ وہ علاؤ الدین کا داماد ہے۔ دہلی کی سلطنت پر اس کا حق بنتا ہے۔ اگر اس نے پس و پیش کی بھی تو علاؤ الدین کی بیٹی جو اس کی بیوی ہے۔ وہ یہ ضرور چاہے گی کہ اس کے خاندان کی حکومت اس کے خاندان میں رہے۔ وہ اپنے شوہر کو اس مہم کے لیے ضرور تیار کر لے گی۔“

”اگر پھر بھی وہ تیار نہیں ہوا۔“ ایک امیر نے اسے بیچ میں ٹوکا۔

”پھر کوئی اور راستہ اختیار کریں گے۔ فی الحال تو اس تجویز پر عمل کرتے ہیں۔“

وہاں موجود دوسرے امرانے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اور اسی دن ایک تیز رفتار قاصد جون پور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

سلطان محمود شرقی اس وقت اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی، ماں بی بی راجی، دونوں بیٹے محمود شاہ شرقی اور حسین شرقی اس گفتگو میں شامل تھے کہ اس کے چوہدار نے بدایوں سے قاصد کے آنے کی اطلاع دی۔ بدایوں کا نام سن کر سلطان محمود شرقی کی بیوی نے تشویش بھری نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا۔ اس کا ذہن لامحالہ اپنے باپ سلطان علاؤ الدین کی طرف گیا ہوگا۔

سلطان محمود شرقی نے دونوں خواتین کو وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہا اور قاصد کو از ن بار یابی دیا۔ قاصد نے اندر آکر اس کے دونوں بیٹیوں کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو مجھے جو کچھ کہنا ہے کیا ان کے سامنے کہہ دوں۔ ”یہ دونوں میرے بیٹے ہیں ان کی فکر مت کرو۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے ان کی موجودگی میں کہہ سکتے ہو۔“

”مجھے علاؤ الدین کے دو سالاروں نے آپ کی جانب بھیجا ہے۔ راز داری کی غرض سے ان کے نام نہیں لے سکتا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس میں دوسرے امرانے بھی شامل ہے۔“

”تو قاصد ہے وکیل نہیں۔ صفائیاں مت پیش کر، جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے صرف وہ بیان کر۔“

”سلطان علاؤ الدین کی غیر ذمے داری اور عدم دلچسپی کی وجہ سے ہندوستان کا تاج و تخت بہلول لودھی کے پاس چلا گیا ہے۔ بدایوں کے سالاروں نے آپ سے استدعا کی ہے کہ آپ ایک لشکر لے کر انھیں بدایوں میں جو لشکر ہے وہ بھی آپ کا ساتھ دے گا۔ دہلی پر حملہ کریں اور بہلول کو وہاں سے نکال دیں تاکہ دہلی کا تخت دوبارہ آپ کے سر سلطان علاؤ الدین کے قبضے میں آجائے۔“

”یہ پیغام تو سلطان علاؤ الدین کی جانب سے آتا چاہیے تھا۔“

”اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھ سے یہ ضرور کہا گیا تھا کہ سلطان اب ایسی کسی مہم میں دلچسپی نہیں رکھتا۔“

”ہم نے تمہاری پوری بات سن لی۔“ محمود شرقی نے قاصد سے کہا، ”تم بہت لمبا سفر طے کر کے آئے ہو۔ آج کی رات آرام کرو۔ ہم اپنے سالار اعلیٰ سے مشورہ کر کے کل تمہیں اپنے جواب سے آگاہ کریں گے۔“

قاصد کے جانے کے بعد محمود شرقی کی بیوی اندر آ گئی۔ اسے فکر لگی ہوئی تھی کہ قاصد بدایوں سے کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ سلطان علاؤ الدین اس کا باپ خیریت سے تو ہے؟

سلطان محمود شرقی نے اسے بتایا کہ سب خیریت ہے اور قاصد سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ اسے سنا دیا۔

وہ نیک بخت شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ”سالاروں نے جو فیصلہ کیا ہے درست کیا ہے۔ دہلی میرے باپ دادا کا ملک ہے۔ بہلول لودھی کون ہوتا ہے وہاں حکومت کرنے والا۔ سلطان علاؤ الدین کے کوئی اولاد زینہ نہیں ہے ورنہ اس کام کے لیے وہ نکلتے۔ آپ داماد ہیں۔ بیٹے کی جگہ ہیں میرے باپ کو اس کا حق دلائیں۔ بہلول کو نکال باہر کریں۔ اگر آپ نے پیٹھ دکھائی تو میں جو پور کا لشکر لے کر دہلی جاؤں گی۔“

”بیگم اتنی بے تاب کیوں ہوتی ہو۔ میں نے ان قاصدوں کو ابھی کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ فتح خاں (سالار اعلیٰ) سے مشورہ کر لوں گا۔ اس کے بعد کوئی جواب دوں گا۔“

سلطان نے فتح خاں سے مشورہ کیا تو اس نے بھی وہی کچھ کہا جو اس کی بیوی کہہ چکی تھی۔ سلطان نے قاصد کے ذریعے اپنا پیغام بدایوں پہنچا دیا۔

”ہم ایک ہفتے بعد یہاں سے نکلیں گے اور دہلی کا رخ کریں گے۔ بدایوں کا لشکر ہمیں راستے میں ہی مل جانا

چاہیے۔“

قاصد کے جاتے ہی سلطان نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک لشکر جہاز تیار کیا جس میں کم از کم ایک ہزار کوہ پیکر باہمی شامل تھے۔ سلطان اس لشکر عظیم کو لے کر سالار اعلیٰ فتح خاں کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ ہوا۔

ادھر دہلی کا احوال یہ تھا کہ بہلول لودھی اپنا لشکر لے کر پنجاب دہلی کے امور سلطنت میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے دیہا پور چلا گیا تھا۔ حکومت اپنے بڑے بیٹے بایزید کے سپرد کی تھی۔ چند امرا تھے جو دہلی میں رہ گئے تھے اور معمولی سا لشکر تھا جو اپنا دفاع تو کر سکتا تھا لیکن باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔

سلطان محمود شرقی طوفان کی طرح بڑھا چلا آ رہا تھا کہ اسے ایک اور تقویت ملی۔ دریا خاں جو ذات کا لودھی تھا اور سنبھل کا حکمران۔ ایک لشکر لے کر سلطان شرقی سے آن ملا سلطان محمود کے لشکر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ سلطان کا لشکر دہلی پہنچا اور محاصرہ کر لیا بایزید پسر بہلول لودھی قلعہ بند ہو گیا اور بہلول کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ قلعے میں مرد کم تھے لہذا اسلام خاں مرحوم کی زوجہ بی بی۔ عورتوں کو مردوں کے کپڑے پہنا کر قلعے کے کنگروں پر بھیجتی رہی تاکہ دشمن کو یہ تاثر ملے کہ قلعے میں لڑنے والے مرد موجود ہیں۔ اس تاثر کو مزید تقویت ایک دن کے اس واقعے سے مل گئی۔

بہلول کا ایک سالار سکندر سروانی قلعے کے کنگرے پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سلطان محمود کا سقہ کنگرے کی باؤلی سے پانی لے کر جا رہا ہے۔ شاہ سکندر نے تاک کر ایسا تیر چھوڑا مشکیزے کے آ رہا ہو گیا۔ اس دن کے بعد قلعے کے آس پاس کوئی نہ آیا۔

شہر کا محاصرہ اب بھی جاری تھا۔ اس محاصرے کی نگرانی دریا خاں لودھی کر رہا تھا۔ بہلول لودھی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ شہر کے اندر جو حفاظتی لشکر تھا وہ بدل ہوتا جا رہا تھا۔

دریا خاں نے محاصرے میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے منجنیقوں کے ذریعے شہر کے اندر سنگ باری شروع کر دی۔ بڑے بڑے پتھر شہر میں آ کر گر رہے تھے۔ ان سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ آخر لشکری عاجز ہو کر صلح پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ شہر کی کنجیاں سلطان محمود شرقی کے سالاروں کی حوالے کر دیں گے۔ اس کام کے لیے دہلی کے ایک امیر شمس الدین کو تیار کیا گیا کہ وہ جاگیر اور شہر پناہ کی چابیاں دریا خاں کے حوالے کر دیں۔

سید شمس الدین قلعے کی کنجیاں لے کر سلطان کے لشکر میں گئے اور دریا خاں سے ملاقات کی جس نے محاصرہ کر رکھا تھا۔

شمس الدین نے اس سے کہا۔ ”میں دو ایک باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ تجلیہ فرمائیں۔“

دریا خاں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہٹا دیا۔

”سید صاحب، اب فرمائیے۔“

”آپ کو سلطان محمود شرقی سے کیا نسبت ہے؟“ شمس الدین نے پوچھا۔

”کوئی خاص نسبت نہیں۔ بس سلطان محمود کا نوکر ہوں۔“ دریا خاں نے کہا۔

”اور سلطان بہلول سے آپ کو کیا نسبت ہے؟“

”ہم بھی لودھی ہیں اور بہلول بھی لودھی ہے۔“ دریا خاں یہ نسبت بتاتے ہوئے ہنسیاں۔

فاصلے پر ایک قصبہ میں اتر چکا ہے۔ سلطان محمود شرقی نے فتح خاں اور دریا خاں کو تیس ہزار سوار اور چالیس جنگی ہاتھیوں کے ساتھ روانہ کیا۔ سلطان محمود باقی ماندہ فوج کے ساتھ وہیں رکا رہا۔

یہ دونوں امیر سلطان بہلول سے دو کوس ادھر خیمہ زن ہو گئے۔

دوسرے روز دونوں لشکروں نے لڑائی کے لیے صف آرائی کی۔ دشمن کے لشکر کی تعداد گنی سے بھی زیادہ تھی لیکن لودھی جم کر لڑ رہے تھے۔ تعداد کی وجہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شرقی کے لشکر کا پلہ بھاری ہے۔ پھر یہ تاثر بھی ختم ہو گیا۔ قطب خاں نے ایک ہاتھی کے ماتھے پر ایسا تیر مارا کہ اندر تک دھنس گیا۔ ضرب ایسی شدید تھی کہ ہاتھی پلٹ کر اپنی ہی فوج پر پل پڑا۔ صفیں تتر بتر ہو گئیں تو قطب خاں نے کچھ چابک دست افغانوں کے ساتھ دشمن کا قتل عام شروع کر دیا۔

اسی قتل عام میں قطب خاں لودھی کا سامنا دریا خاں لودھی سے ہو گیا۔ قطب خاں نے بھی اسے وہی طعنہ دیا جو وہ شمس الدین کی زبانی سن چکا تھا۔

”تو ہمارا ہم قوم ہے۔ تیری مائیں اور بہنیں دشمن کی قید میں ہیں اور تو غیروں کی فتح مندی کے لیے کوشاں ہے تجھ ایسے باجمیت انسان کو یہ فعل زیب نہیں دیتا۔“

دریا خاں یہ سن کر غیبت سے زمین میں گر گیا۔ اس نے قطب خاں کی طرف سے آنکھیں ہٹالیں۔ ”میں جا رہا ہوں مگر میرا تعاقب نہ کرنا۔“

دریا خاں نے میدان جنگ سے منہ موڑ لیا۔

اس کے جاتے ہی شکست کا بازار بج گیا۔ سلطان شرقی کا سالار اعلیٰ فتح خاں قتل ہوا۔ اس کا سر کاٹ کر بہلول لودھی کے پاس بھیج دیا گیا۔

سلطان کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہاتھی گھوڑے اور دوسرا مال غنیمت بہلول کے ہاتھ لگا۔

سلطان محمود قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ اس نے قلعے کے اندر سے شاد۔۔۔ نے بجائے جانے کی آوازیں سنیں۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”معلوم کرو قلعے میں شادیانے کیوں بج رہے ہیں؟“ محمود نے اپنے آدمیوں کو قلعے کے قریب بھیجا۔

ان کے آدمیوں نے آ کر بتایا۔ ”قلعے کے لوگ آج بہت خوش ہیں۔ مبارک سلامت کی آوازیں سننے میں آ رہی ہیں، ماجر کیا ہے یہ نہیں معلوم۔“

”کم بختو! کوئی جائے اور معلوم کر کے آئے کہ پانی

ہت میں میرے لشکر پر کیا گزری؟“

اس کی نوبت ہی نہیں آئی دریا خاں شکست کی بدخبر لے کر پہنچ گیا۔ اس پیچھے پیچھے لٹا پٹا بے تربیت لشکر بھی پہنچ گیا۔

دریا خاں نے اپنے لشکر کی پراگندگی کا حال اس طرح بیان کی کیا کہ مایوسی پھیل گئی۔ سلطان محمود کو اس حد تک ڈرا دیا کہ وہ فرار کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس اثنا میں بہلول بھی آن پہنچا۔ اس نے تیس کوس تک بھاگتے ہوئے لشکر کا پیچھا کیا۔

سلطان محمود شکست کی شرمندگی اٹھا کر جوہنور واپس چلا گیا۔

اس عظیم الشان فتح کے بعد سلطان بہلول کی سلطنت مستحکم ہو گئی اور رعب سلطانی کا چرچا دور دور تک پھیل گیا

اب وہ وسعت سلطنت کے لیے علاقوں کی فتح کو روانہ ہوا۔ پہلے میوات کی طرف گیا۔ احمد خان میواتی نے استقبال کر کے اس کی اطاعت کر لی سلطان نے سات پر گئے اس کے قبضے سے نکال کر باقی اس کے پاس چھوڑ دیے۔ احمد خاں نے اپنے چچا مبارک خاں کو مستقل طور پر سلطان کی خدمت کے لیے مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سلطان بہلول برن (بلند شہر) گیا۔ سنبھل کا حاکم دریا خاں لودھی بھی مطلع ہو گیا اور سات پر گئے پیش کیے۔ وہ وہاں سے کول آیا پھر برہان آباد پہنچا۔

پھر کئی دوسرے علاقوں سے ہوتا ہوا راہری کے قلعے پر پہنچا۔ سلطان علاؤ الدین کا ایک امیر قطب خاں بن حسن خاں یہاں کا حکم تھا۔ وہ قلعہ بند ہو گیا۔ بہلول نے اس کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ قطب خاں معافی کا طلب گار ہوا۔ بہلول نے اس کی جاگیر برقرار رکھی۔ اثادہ کے حاکم نے بھی اطاعت قبول کر لی۔

بہلول لودھی کی نئی بیوی جہان نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ چاند آسمان سے جدا ہو کر اس کی آغوش میں آگرا ہے۔

یہ خواب ایسا نہیں تھا کہ نظر انداز کر دیا جاتا بلکہ تعبیر بھی مبارک ہی معلوم ہو رہی تھی۔ بہلول نے منجموں اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلایا۔

ان منجموں نے بتایا کہ اس ملکہ کے بطن سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تخت گیر اور تاجور ہوگا اور اس کی ذات بابرکت سے نشانات سلطنت اور آثار ولایت آشکار ہوں گے۔

سلطان بے حد مسرور ہوا۔ مستحقوں کو صدقات دیے گئے۔

جلوس کے ساتویں برس اس خواب کی تعبیر نے چہرہ

دکھایا۔ پسر فرخندہ قال اور ہمایوں بخت متولد ہوا جب یہ اختر ہمایوں طلوع ہوا تو نجومیوں نے ایک مرتبہ پھر بہ حکم سلطانی پیدائش کے وقت اور بروج سماوی کی کیفیت پر نظر ڈالی۔ عرض کیا ”یہ شہزادہ“ بلند اقبال ایک ایسا ستارہ لیے دنیا میں آیا ہے کہ بادشاہت کا باغ اس سے سرسبز و شاداب ہو جائے گا۔“

جب کام میں نظام دیکھا تو ”میاں نظام“ کے خطاب والا سے مخاطب کیا۔ بچپن ہی سے اسے گھر بار سے الگ کرتے ہوئے سنبھل کی سرکار پر تعینات کیا اور خان خانا قرطی خاں کے سپرد کرتے ہوئے اسے اس کا اتالیق مقرر کیا۔ جب یہ شہزادہ ابھی پانچ برس کا تھا ایک روز تیر کمان لیے بہلول کے سامنے سے گزرا سلطان نے اسے بلایا اور اپنے دل میں سوچا کہ مجھے رانا داود پور کی مہم و پیش ہے۔ ذرا اس کے سر سے فال تو نکالوں، اگر اس کا تیر نشان پر بیٹھا ہے تو مجھے فتح کی امید رکھنی چاہیے۔ بہلول نے اسے پودے پر لگے ایک پھول کو نشانہ بنانے کے لیے کہا شہزادے نے کمان سنبھالی اور تیر چلا دیا۔ نشانہ ایسا درست تھا کہ پودے کو جنبش نہیں ہوئی اور پھول پودے سے الگ ہو گیا۔

سلطان ایسا خوش ہوا کہ سرہند کی سرکار بھی اس کو بخش دی۔

رانا کے خلاف فتح کی نوید مل چکی تھی۔ بہلول لودھی نے اسی وقت امر کا اجلاس طلب کیا۔ جب تمام امراء جمع ہو چکے تو بہلول ان سے مخاطب ہوا۔

”آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اودھے پور، مالوہ اور گوالیار کے وارا جگان کا اک مثلث ہے جس نے کبھی ہماری حکومت کو پسند نہیں کیا بلکہ وہ ہمارے سلطان بننے سے پہلے ہمارے مخالف تھے لیکن جب ہم نے حمید خاں کو زیر کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا تو ان کا ہر خواب ٹوٹ گیا۔ اب وہ کھیانی بی بی بن کر کھمبانوچ رہے ہیں۔ ان میں اودھے پور کا رانا سب سے زیادہ سرکش ہے۔ اب اس نے اپنے بھانجے کے چتر سال کو دس ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا ہے۔ جو ارد گرد کارروائیاں اور رانا دہلی کا بادشاہ بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ میں رانا پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جو خواب دیکھ رہا ہے وہ حماقت پر مبنی ہے اگر وہ یہ خیال کیے ہوئے ہے کہ اودھے پور سے نکل کر دہلی آئے گا تو ہم اسے اودھے پور سے باہر ہی نکلنے دیں گے۔

اس کے لیے میں ایک لشکر روانہ کر رہا ہوں۔ اس لشکر کی کمانداری قطب خاں کے ہاتھوں ہوگی۔

رانا کا بھانجا چتر سال اپنے لشکر کے ساتھ اودھے پور سے کئی میل باہر پڑاؤ کر چکا تھا۔

سلطان بہلول جاہ و جلال کے ساتھ اجیر پہنچا اور فوج کو قطب خاں کے ہمراہ اودھے پور کی طرف بھیجا۔

دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔ چتر سال اپنے علاقے کے قریب تھا۔ دوسرے اس جنگ میں فتح کے بعد اسے رانا کی دامادی کا شرف بھی ملنے والا تھا۔ لشکر کو بھی یقین دلایا تھا کہ یہ جنگ اودھے پور میں لڑی جا رہی ہے لیکن دراصل دہلی کی فتح کے لیے ہے۔ اس لیے یہ لشکر بڑی دل جمعی سے لڑ رہا تھا۔

کافروں کی شدید جنگ کے باعث سلطانی فوج نے پہلے تو منہ پھیر لیا اور بہت سے تجربہ کار افغان اس جنگ میں شہید ہو گئے لیکن تھوڑی دیر بعد جنگ کے حالات نے پلٹا کھانا شروع کر دیا چتر سال کے لشکر کی جنگ سے جی چرانے لگے۔

قطب خاں اور خان خانا قرطی جان تھیلی پر رکھے تلواریں لیے آگے بڑھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پٹے لگ گئے۔

چتر سال کے مارے جاتے ہی لشکر بھاگ کھڑے ہوئے۔

رانا اودھے پور میں تھا اور چتر سال کے بھاگتے ہوئے لشکر کی آوازیں تصور سماعت سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے سنا کہ بہلول کا لشکر اودھے پور کی دیواروں کے پاس آگیا ہے۔ اس کے پاس صلح کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے صلح کر لی۔ شرط کے مطابق سلطان کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔

سلطان محمود شرقی پہلی شکست کے بعد انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ نئے لشکر کی بھرتی کے لیے سرگرداں رہا تھا۔ اسلحہ کے ذخیرہ لگاتار رہا تھا۔ اب وہ اتنی تیاری کر چکا تھا کہ بہلول لودھی سے ٹکرائے۔ اس نے اپنے امراء اور سالاروں کو جمع کر کے انہیں اپنے ارادے سے واقف کیا۔

”مجھے ماضی کی شکست اب تک یاد ہے لیکن وہ شکست ہماری کمزوری سے نہیں دریا خاں لودھی کی غداری کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ہمیں خبر نہیں تھی کہ وہ اندر ہی اندر بہلول لودھی کے لیے کام کر رہا ہے۔ اب وہ کھل کر سامنے آگیا ہے اور بہلول لودھی کا مطیع ہو گیا ہے۔

میرے تجربوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ بہلول نے اپنی طاقت میں اضافہ کر لیا ہے لیکن ہماری عسکری طاقت اب بھی اس سے زیادہ ہے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جون پور سے کوچ کیا جائے

اور بہلول پر ضرب لگانے کے لیے دہلی کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

میں اب بھی کہتا ہوں کہ دہلی کے تخت و تاج اور حکمرانی کا مالک بننے کا حق دار میں ہوں اس لیے کہ دہلی کے شاہی خاندان سے میرا تعلق ہے بہلول لودھی کا نہیں۔“

اس کی رائے سے تمام امراء متفق تھے۔ اس نے صرف دو دن لشکر کی تیاری میں گزارے اور لشکر جرار لے کر جونپور سے نکل گیا۔

اس سفر میں سلطان محمود شرقی کے دونوں بیٹے حسین شرقی اور بھیکن خاں (جو بعد میں محمد شاہ شرقی کے نام سے مشہور ہوا) بھی شامل تھے۔

بہلول لودھی ان دنوں علاقوں کی فتح کے لیے نکلا ہوا تھا اور اس وقت اثاودہ میں تھا۔ اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کا ایک امیر جو نا خاں سلطان شرقی سے جا ملا ہے اور سلطان نے اسے شمس آباد کا حاکم بنا دیا ہے۔

بہلول لودھی نہایت ذہین سلطان تھا۔ یہ اطلاع ملنے ہی وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

”اس کا مطلب ہے ہمیں بہت جلد سلطان محمود شرقی سے ٹکرانے کا موقع ملے گا۔ اس لیے کہ سلطان، جو نا خاں کا سہارا لے کر اپنا دیرینہ خواب پورا کرنے کے لیے نکلے گا بلکہ نکل چکا ہوگا۔“

بہلول نے اسی وقت مجبوروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ ”جاؤ خبر لاؤ، کسی لشکر کی آمد تو نہیں ہے؟“

دوسرے دن یہ خبر تیز رفتار پرندوں کی طرح دوڑتے ہوئے آئے اور یہ خبر لائے کہ سلطان محمود کا لشکر شمس آباد کے قریب آ کر ٹھہر گیا ہے۔

بہلول کا اندازہ درست نکلا تھا۔

سلطان کو راستے میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ بہلول اپنے لشکر کے ساتھ اثاودہ میں ہے۔ اس نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا اور شمس آباد کے قریب ٹھہر گیا۔

بہلول لودھی نے بھی اپنے لشکر کو روانگی کی اجازت دی۔

دونوں لشکر آئے سامنے جنگ کی ابتدا کی صفیں درست کرنے لگے۔ بہلول کے ساتھ اس وقت نہایت جہاندیدہ اور بڑے نامور سالار تھے۔ عمر خاں، علی خاں، مبارز خاں، قطب خاں یہ سب اعلیٰ صفوں میں تھے۔

عسکی خاں اور قرطی خاں دہلی کی حفاظت کے لیے ایک

لشکر کے ساتھ پیچھے رہ گئے تھے۔

پہلے دن طرفین کی فوجوں میں زوردار معرکہ آرائی ہوئی لیکن دوسرے روز قطب خاں اور رائے پر تاب نے صلح کی گفتگو کر کے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ مبارک شاہ بادشاہ دہلی کے قبضے میں تھا وہ سلطان بہلول کے قبضے میں رہے گا اور جو کچھ سلطان ابراہیم بادشاہ جونپور کے قبضے میں تھا وہ سلطان محمود کے قبضے میں رہے گا اور سلطان محمود کے جوسات ہاتھی سلطان کے قبضے میں آگئے تھے ان کو سلطان بہلول نے واپس کر دیا اور یہ طے پایا کہ شمس آباد کو موسم برسات کے بعد سلطان اپنے قبضے میں لے لے گا کیونکہ وہ اسے فتح کر چکا تھا اور جو نا خاں کو وہاں کا حاکم بنایا تھا۔ جو نا خاں سلطان محمود سے مل گیا تھا۔ اس طرح شمس آباد سے اس کا قبضہ ختم ہو گیا تھا۔

سلطان محمود جونپور چلا گیا۔

برسات کا موسم گزرا تو بہلول نے جو نا خاں کے پاس اپنا قاصد بھیجا کہ وہ معاہدے کے مطابق شمس آباد اس کے حوالے کر دے۔

جو نا خاں یہ سمجھا تھا کہ برسات کا پانی اس معاہدے پر بھی پڑ چکا ہے۔ اس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ بہلول کے قاصد کو کئی دن اپنے پاس روک لینے کے بعد بڑی ذلت کے ساتھ واپس کیا۔ اس عرصے میں وہ سلطان محمود کو بھی لکھ چکا تھا کہ وہ اس کی مدد کو پہنچے۔

سلطان بہلول نے سنا تو شمس آباد پر چڑھ دوڑا۔ جو نا خاں تو سلطان محمود کا منتظر تھا۔ جب وہ بروقت نہیں پہنچا اور بہلول سر پر آگیا تو فرار ہو گیا۔

بہلول نے شمس آباد کی حکومت رائے کرن کے حوالے کی اور گردونواح کے علاقوں کو اچھی طرح مستحکم کر لیا۔

محمود شرقی اپنے قصر میں اطمینان سے بیٹھا تھا کہ مفرور جو نا خاں جونپور پہنچ گیا اور محمود شرقی سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ اس کا گرد آلود چہرہ دیکھ کر محمود شرقی اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”جو نا خاں، اس حال میں اور یہاں۔“

”آپ کی دوستی کا مجھے یہ صلہ ملا ہے۔ بہلول نے میرے علاقے پر قبضہ کر کے رائے کرن کو وہاں کا حاکم بنا دیا ہے۔“

”جو نا خاں معاہدے میں یہی طے ہوا تھا کہ شمس آباد

بہلول کے پاس رہے گا۔“

”شمس آباد اس کے پاس رہے گا لیکن یہ طے نہیں ہوا

تھا کہ حاکم میں نہیں رائے کرن ہوگا۔ مجھے یہ سزا آپ کا ساتھ

دینے کی وجہ سے ملی ہے ورنہ بہلول نے خود مجھے وہاں کا حاکم

بنایا تھا۔

”اس کے لیے اس سے بات کی جاسکتی ہے۔“
”باتوں کا وقت اب گزر گیا۔ اسی لیے بہلول کے آنے سے پہلے میں نے آپ کی خدمت میں عریضہ روانہ کر دیا تھا۔ اس کے قاصد کو بھی میں ٹال منول سے روکے ہوئے تھا لیکن آپ تشریف ہی نہیں لائے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو جو ناخاں، تمہارا کوئی خط ہم تک نہیں پہنچا۔“ محمود شرقی کہتے کہتے کچھ دیر کے لیے رکا پھر خود ہی بول پڑا۔ ”اس کا مطلب ہے کوئی سازش جو چور میں بھی جگہ بنا رہی ہے۔“

”سلطان معظم! کیسی سازش۔“

”کوئی تو ہے جس نے وہ خط ہم تک نہیں پہنچنے دیا۔“
جونا خاں اس کا کیا جواب دیتا خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد سلطان محمود نے اسے مہمان خانے میں جانے کا حکم دیا اور خود یہ سوچتے بیٹھ گیا کہ خط کو اس تک پہنچنے سے روکنے والا کون ہو سکتا ہے۔ اس کا دھیان اپنی بیوی کی طرف گیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اس خیال کو ٹھکرا دیا۔ وہ تو خود یہ چاہتی ہے کہ میں بہلول سے ٹکرا جاؤں۔ وہ کیوں اس خط کو مجھ تک نہیں پہنچنے دے گی۔ پھر اس کا گمان اپنی والدہ بی بی راجی کی طرف گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ماں کے پاس پہنچ گیا۔

”جونا خاں کی طرف سے کوئی قاصد آیا تھا؟“

”آیا تو تھا۔“

”آپ نے اسے مجھ سے ملنے نہیں دیا۔“

”وہ جو پیغام لایا تھا وہ ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ تم تک پہنچایا جاتا۔“

”وہ کیا پیغام لایا تھا؟“

”معاہدے کے مطابق شمس آباد پر بہلول کا حق ہے۔ تمہیں اس معاہدے سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے۔“
”وہ میرے حاکم کو نکال دے پھر میرا کیا رعب رہ جائے گا۔“

”جس علاقے پر اس کا قبضہ ہے اس پر وہ جس کو چاہے حاکم مقرر کرے۔“

”معاہدے میں یہ طے نہیں ہوا تھا۔“

”ہر بات معاہدے میں نہیں لکھی جاتی۔“

”میں جونا خاں کو اس کا حق دلاؤں گا۔“

”میرا کہنا مان لو اور اس قصے کو ہمیں رہنے دو۔“

”آپ خاتون ہیں۔ مملکت کے امور کو میں بہتر جانتا ہوں۔“

”میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ اب تم جانو۔“

جو چور میں جنگ کی تیاریاں پھر شروع ہو گئی تھیں۔ وہ لشکر لے کر نکلا اور شمس آباد کے آس پاس پڑاؤ ڈالا۔ بہلول لودھی شمس آباد ہی میں تھا۔ اسے خبر مل چکی تھی کہ سلطان جو چور ایک بڑے لشکر کے ساتھ شمس آباد پر قبضہ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ اس لیے وہ پوری تیاری سے تیار بیٹھا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سلطان محمود پہنچ چکا ہے اور پڑاؤ ڈال کر جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے تو اس نے بھی اپنے سالاروں کو طلب کیا اور جنگی حکمت عملی پر مشورے کرنے لگا۔ اس موقع پر قطب خاں اور دریا خاں نے تجویز پیش کی۔

”سلطان محمود ابھی اپنی تھکن اتار رہا ہے۔ وہ کوشش کرے گا کہ دو تین دن کا وقفہ دے کر جنگ کا آغاز کرے۔ ہم بھی جنگ کا آغاز نہیں کرتے۔ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر شب خون مارتے ہیں۔ ممکن ہے اس شب خون ہی سے ہمیں اتنی کامیابی مل جائے کہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔“

جنگوں میں یہ ہوتا ہی ہے۔ بہلول نے شب خون مارنے کی اجازت دے دی۔

رات کی تاریکی میں قطب خاں ایک چھوٹے سے لشکر کو لے کر شب خون مارنے کے لیے نکلا۔ سلطان محمود، بہلول لودھی کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اپنے پڑاؤ سے کچھ پہلے اپنے کچھ سپاہیوں کو چھپا رکھا تھا کہ اگر شب خون مارا جائے تو یہ سپاہی حملہ آوروں کو پڑاؤ تک نہ پہنچنے دیں۔

قطب خاں اس خطرے سے بے خبر اپنے آدمیوں کو لے کر نکلا اور اس مقام تک پہنچ گیا جہاں یہ سپاہی چھپے ہوئے تھے۔ قطب خاں اندھیرے میں انہیں دیکھ نہ سکا اور زرعے میں آ گیا لیکن وہ قطب خاں تھا۔ اس نے نگوں کے وہ ہاتھ دکھائے کہ مٹھی بھر سپاہی اس کے حملوں کی تاب نہ لاسکے۔ بے تحاشا اپنے پڑاؤ کی طرف بھاگے۔ قطب خاں کو لوٹ آنا چاہیے تھا لیکن وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے پڑاؤ کے بہت قریب پہنچ گیا۔ سلطان محمود کا لشکر اس وقت تک بیدار ہو چکا تھا وہ مقابلے پر آ گیا۔ قطب خاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ اتنے آدمی نہیں تھے کہ وہ مقابلہ کر سکتا۔ اس نے واپسی کے لیے گھوڑے کو تیزی سے موڑنا چاہا۔ اسی دم گھوڑے کو ٹھوکر لگی۔ گھوڑا نیچے گرا اور اس سے پہلے قطب خاں زمین پر آ گیا۔ محمود شرقی کے سالار تاک میں لگے ہوئے تھے۔ اس کے گرتے ہی اس پر بچھے اور قطب خاں گرفتار ہو گیا۔

اندھیرے میں انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ انہوں نے کس کو گرفتار کیا ہے لیکن جب اسے لشکر میں لایا گیا اور مشعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا تو پورے لشکر میں فحشے نعرے بلند ہونے لگے۔ قطب خاں کو فوراً سلطان محمود کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

قطب خاں کے آدمیوں نے کچھ دیر مقابلہ کیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ قطب خاں گرفتار ہو گیا تو وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

یہ لشکر شمس آباد پہنچا تو باقی لشکر میں بددلی پھیل گئی۔ یہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ قطب خاں گرفتار نہیں ہوا بلکہ سلطان محمود کے ساتھ مل گیا ہے۔

سلطان محمود شرقی کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قطب خاں بہلول لودھی کا سالار بھی ہے، چچا زاد بھائی بھی اور ایک بہادر سالار بھی۔ وہ اس کی رہائی کے لیے کڑی سے کڑی شرط قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا پھر جونا خاں کی خاطر جنگ کرنے کا کیا فائدہ۔ وہ اس وقت جو چور واپس چلا جائے اور بہلول لودھی کی پیشکش کا انتظار کرے۔ وہ دیر پائے لڑکا کو پار کرتا ہوا اپنے علاقوں کی طرف چلا گیا۔ فتح کی بجائی قطب خاں پابہ جولان اس کے ساتھ تھا۔ بہلول خاں کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ اب اسے سلطان محمود کا تعاقب کرنے کا یارا نہیں تھا۔ اس نے اپنی فوج سیٹی اور دہلی واپس آ گیا۔

قطب خاں کی بہن شمس خاتون کو جب یہ معلوم ہوا کہ لشکر واپس آ گیا لیکن قطب خاں اس لشکر کے ساتھ نہیں بلکہ یہاں سے میلوں دور جو چور کے کسی زندان میں ہے تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔

بہلول اس وقت اپنی بیوی ہیما کے پاس تھا کہ شمس خاتون کا پیغام اس کے پاس پہنچا۔ اس نے کہلا بھیجا تھا بلکہ سوال کیا تھا۔ ”قطب خاں دشمن کی قید میں ہے۔ اس حالت میں تمہیں نیند کیسے آتی ہے۔ تم پر تو کھانا پینا حرام ہو جانا چاہیے تھا۔“ اس پیغام کو سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ ہیما نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”تم نے سنا نہیں، شمس خاتون نے کیا کہلوا دیا ہے۔“
”میں نے سن لیا ہے۔ جنگوں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔“
”یہ تو تم کہہ رہی ہو۔ شمس خاتون اس کی بہن ہے۔ غلطی میری ہے۔ مجھے اس کے پاس جا کر اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ اسے بتانا چاہیے تھا کہ میں قطب خاں کی طرف سے غافل نہیں ہو گیا ہوں۔“

تین بجے رات کو چابک

فون کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ گہری

نیند سو یا ہوا زبا ہڈا اٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا میلیغون

تک پہنچا۔

”میں تمہارا پڑوسی حامد بول رہا ہوں؟ دوسری طرف

سے غضب ناک آواز آئی۔ ”تمہارا آٹا سر شام سے گلا پھاڑ

پھاڑ کر میسرے باغ میں بھونچا جا رہا ہے۔ ابھی تک مجھے

ایک منٹ بھی سکون کی نیند میسر نہیں ہو سکی ہے۔ اگر تم

اپنے کتے کو یہاں سے نہیں لے گئے تو میں اسے گولی مار

دوں گا۔“

دوسری رات کو ڈھائی تین بجے کے درمیان زبا بنے

حامد کو فون کیا اور برسے پر سکون لہجے میں کہا ”میں تمہارا

پڑوسی زبا بول رہا ہوں۔ اطلاع عرض ہے کہ میں نے

آج تک کبھی کوئی کتا پالنے کی غلطی نہیں کی۔“

”ابھی تو آپ آئے ہیں، کیا پھر کسی معرکے کے لیے نکلیں گے۔“

”دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ابھی تو مجھے شمس خاتون کے پاس جانا چاہیے۔“

وہ شمس خاتون کے پاس پہنچا تو اس نے ایک ایسی عورت کو اپنے سامنے دیکھا، جو کئی دن برابر روتی رہی ہو۔

”شمس خاتون، آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہمیں قطب خاں کی فکر نہیں۔ وہ ہمارا دایاں ہاتھ تھا۔ اس کے بغیر تو ہم معذور ہو جائیں گے۔“

”آپ نے اس کی رہائی کے لیے کچھ کیا بھی تو نہیں۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں کہ سلطان شرقی اس کی رہائی کے لیے کیا شرائط پیش کرتا ہے۔“

”آپ خود بھی تو اس سے رجوع کر سکتے ہیں۔“

”بات میں نے آگے بڑھائی تو وہ اسے میری کمزوری سمجھے گا۔ اس کی شرائط میں سختی آجائے گی۔ میں چاہتا ہوں وہ پہل کرے۔“

”آپ کی یہ ضد میرے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“

”یہ میری ضد نہیں مصلحت ہے۔ رہی یہ بات کہ قطب

خاں کو نقصان پہنچے گا۔ اس سے آپ بے فکر رہیں۔ سلطان محمود اسے زندہ رکھنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ قطب خاں کو مار دے گا تو مجھ سے کیا لے سکے گا۔ ابھی محض ایک ہفتہ ہوا ہے۔ میں لشکر کی تیاری میں مشغول ہوں۔ بہت جلد اس کی رہائی کے لیے جو پور جاؤں گا۔“

شمس خاتون مطمئن ہو گئی لیکن بہلول کی نیند واقعی اڑ گئی۔ اس کی یہ نیند اس خبر نے اڑا دی تھی کہ سلطان محمود کا انتقال ہو گیا۔ اب اسے یہ دیکھنا تھا کہ سلطان محمود کا جانشین کس کو مقرر کیا جاتا ہے اور نئے بادشاہ کے کیا عزائم سامنے آتے ہیں۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کی ماں بی بی راجی تے امرا کے مشورے سے بھیکن خاں کو محمد شاہ کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

کئی مہینے ان انتظامات میں گزر گئے۔ بہلول نے اب ضروری سمجھا کہ نئے بادشاہ سے سلسلہ مراسلت شروع کیا جائے۔ اس نے محمد شاہ کو لکھا۔

”آپ کے بھائی کے دور میں میرے چچا زاد قطب خاں کو گرفتار کر لیا گیا تھا لہذا میں چاہتا ہوں کہ قطب خاں کو رہا کر دیا جائے تاکہ دونوں حکمرانوں کے درمیان اچھے اور پائیدار تعلقات قائم ہو سکیں۔“

محمد شاہ نے اس خط کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

جب بہلول لودھی کی طرف سے کئی خط پہنچ چکے تو اس کا بھائی حسن خاں اسے بہلول لودھی کا مطالبہ پورا کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ محمد شاہ نے اپنے بھائی کو زنداں میں ڈالنے کا حکم جاری کر دیا۔

اس کو بھی اسی زنداں میں ڈال دو جہاں قطب خاں ہے۔ یہ اس کا بڑا حمایتی ہے اچھا ہے اس کا بھی دبی انجام ہو جو قطب خاں کا ہوا ہے۔“

محمد شاہ دراصل دہلی پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا اور اپنی عسکری قوت میں اتنا اضافہ کر لیا تھا کہ بہلول کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہا تھا بلکہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے رویے سے بہلول کو جنگ پر آمادہ کرے۔

بہلول لودھی، محمد شاہ کے رویے سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے سالاروں کو بلایا۔ وہ ہر معرکے سے پہلے اپنے سالاروں سے مشورہ ضرور کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ انہیں حالات سے آگاہ کر رہا تھا۔

”میں جو پور کے نئے حکمران سے مایوس ہو چکا

ہوں۔ وہ کسی طرح بھی صلح پر آمادہ نہیں بلکہ میرے کسی خط کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس نے اپنے بھائی کو زنداں میں ڈال رکھا ہے۔ ایسے ظالم بادشاہ سے کچھ بعید نہیں۔ وہ قطب خاں کو قتل بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے مزید دیر کرنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اس کے خلاف لشکر کشی کی جائے گی۔“

”آپ جب اور جس وقت چاہیں گے ہم محمد شاہ کے خلاف لشکر کشی کے لیے تیار ہیں۔“ تمام امرا نے یہ ایک آواز کہا۔ اس کا ایک امیر اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ”مجھے لشکر کشی پر اعتراض نہیں لیکن معاملہ قطب خاں کی رہائی کا ہے اس لیے میری ایک تجویز ہے۔“

”کہو کیا تجویز ہے۔ ہم سب ہمدن گوش ہیں۔“

”سلطان محترم! میں چاہتا ہوں اس جنگ میں فتح یا شکست سے زیادہ ہماری توجہ اس پر ہو کہ ہم جنگ کے دوران محمد شاہ کے کسی عزیز ترین رشتہ دار یا کسی ہر دل عزیز سالار کو گرفتار کر لیں تاکہ اس کی رہائی کے بدلے میں قطب خاں کی رہائی کا مطالبہ کر سکیں۔“

اس تجویز کی تمام امرا نے حمایت کی۔ بہلول لودھی نے بھی توصیفی کلمات ادا کیے۔

سلطان محمد شاہ کو اس کے مخبروں نے اطلاع دی کہ بہلول لودھی ایک لشکر کے ساتھ دہلی سے جون پور کی طرف کوچ کر چکا ہے۔ اب تک وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ بہلول لودھی اتنی ہمت نہیں کرے گا لیکن اس اطلاع کے بعد اس نے مناسب سمجھا کہ بہلول کو جو پور تک نہ پہنچنے دے اور آگے بڑھ کر راستے ہی میں اسے روکے۔

محمد شاہ شرقی منزلیں مارتا ہوا سرستی آیا۔ سلطان بہلول نے سرستی کے نزدیک ہی راپری میں قیام کیا۔ سرستی تک آ کر محمد شاہ کی شکی طبیعت نے ایک عجیب خیال کو جنم دیا۔ اس نے سوچا میں تو یہاں جنگ کے عذاب میں مبتلا ہوں۔ میرے پیچھے کہیں کوئی حسن خاں کو قید سے نکال کر تخت پر نہ بٹھا دے۔ یہ خوف اسے اپنی والدہ بی بی راجی سے بھی تھا جو اسے اب ناپسند کرنے لگی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جو پور کے کوتوال کو حکم بھیجا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جلد از جلد حسن خاں کو زنداں سے نکال کر قتل کر دو۔ فوراً حرکت میں آؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی سازش جنم لے۔ میں کسی وقت بہت مجبور ہو گیا تو قطب خاں کے قتل کے احکام بھی بھیجوں گا۔ فی الحال تم حسن خاں کا کام تمام کر دو۔

کوٹوال کی طرف سے عرضداشت آئی۔ ”بی بی راجی ان دونوں کی اسی طرح حفاظت کر رہی ہیں کہ ان کا قتل کرنا میری قوت سے باہر ہے۔ اگر بی بی راجی جو پور سے باہر چلی جائیں تو میں یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہوں۔“

یہ عریضہ پڑھتے ہی اس نے والدہ کے نام خط لکھا۔ ”میں سرستی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے بھائی حسن خاں کے ساتھ زیادتی کی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس سے صلح کر لوں اور ملک کا کچھ حصہ حسن خاں کو دے دوں۔ میں نے کوٹوال کو لکھ دیا ہے وہ حسن خاں کو میرے پاس پہنچا دے گا۔ آپ بھی تشریف لے آئیں۔ حسن خاں کے دل میں میری طرف سے یقیناً کدورت ہوگی آپ یہاں ہوں گی تو اسے سمجھالیں گی۔“

بی بی راجی نہایت جہانمیدہ اور ذہین خاتون تھیں لیکن بیٹے کی اس چال کو نہ سمجھ سکیں۔ خط ملتے ہی جو پور سے نکل آئیں۔ ان کے نکلنے ہی کوٹوال حرکت میں آیا اور حسن خاں کو قتل کر دیا۔ بی بی راجی کے وفادار امرانے یہ خبر انہیں راستے ہی میں پہنچا دی۔ بی بی راجی قنوج پہنچ کر رک گئیں، محمد شاہ کے پاس نہیں آئیں۔

محمد شاہ نے بی بی راجی کو لکھا۔ ”میں حسن خاں کی تعزیت کے لیے آپ کے پاس ضرور آتا لیکن سوچتا ہوں جب تمام شہزادوں کا یہی حال ہو جائے گا تو آپ سے تعزیت ایک ساتھ کروں گا۔“

ابھی جنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ محمد شاہ کا دوسرا بھائی حسین خاں، محمد شاہ کی خلوت میں آیا اور اس سے عرض کرنے لگا۔

”میرے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ سلطان بہلول کا لشکر ہم پر شب خون مارنا چاہتا ہے۔ مجھے ایک لشکر دیں تاکہ میں اس کا راستہ روکوں۔“

محمد شاہ اس کی باتوں میں آ گیا۔ حسین خاں نے تیس ہزار سوار اور تیس ہاتھی ساتھ لیے اور محمد شاہ کے لشکر سے الگ ہو گیا۔ وہ بہلول لودھی سے لڑنے کے لیے نہیں نکلا تھا بلکہ اپنے بھائی حسن خاں کے انجام سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور قنوج کی طرف جانا چاہتا تھا جہاں اس کی والدہ تھیں۔ کچھ دور چل کر جب وہ جھرنے کے کنارے پہنچا تو اسے خیال آیا کہ اپنے بھائی جلال خاں کو بھی ساتھ لے چلے۔ وہ وہیں رک گیا اور کسی کو اسے بلانے کے لیے بھیجا۔ کچھ دیر بعد اس نے سوچا

رکنے کا کیا فائدہ۔ جلال خاں پیچھے آ ہی جائے گا۔ وہ قنوج کی طرف چل دیا۔

سلطان بہلول کا معشی دستہ اتفاق سے وہاں آیا اور جھرنے کے کنارے ٹھہر گیا۔ جلال خاں، حسین خاں کی طلبی کے بموجب محمد شاہ کے لشکر سے نکل کر جھرنے کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں اس نے قنوج کو دیکھا۔ یہی سمجھا کہ حسین خاں کے آدمی ہیں جو اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ لاعلمی میں گرفتار ہو گیا۔

سلطان کے امرانے یہی طے کیا تھا کہ جنگ کے دوران یہ کوشش کی جائے گی کہ محمد شاہ کا کوئی عزیز گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ موقع جنگ سے پہلے ہی ہاتھ آ گیا۔ بہلول نے اسے عنایت خداوندی سمجھا اور سجدہ شکر بجالایا۔

محمد شاہ کو جب معلوم ہوا کہ حسین خاں اور جلال خاں دونوں اس کا لشکر چھوڑ کر چلے گئے تو اسے بہلول سے زیادہ جو پور کے دفاع کی فکر ہوئی۔ اب اس کا لشکر لڑنے کے قابل رہا ہی کہاں تھا۔ دوسرے اسے یہ بھی فکر ہوئی کہ حسین خاں اسے برطرف کر کے ضرور اس کے تخت پر بیٹھے گا۔ اب اسے والدہ بی بی راجی کی حمایت کا یقین بھی نہیں رہا تھا۔

محمد شاہ نے پسپائی اختیار کی اور قنوج کی طرف چل دیا۔

محمد شاہ شرقی قنوج کے قریب تین کوس کے فاصلے پر راجگیر گھاٹ پر پہنچ کر رک گیا کیونکہ یہاں سے معلوم ہوا کہ بی بی راجی نے دولت شرقیہ کے امرا کی حمایت سے حسین خاں کو تخت پر بٹھا دیا ہے۔

محمد شاہ کے لشکر میں جب یہ خبر پھیلی کہ حسین خاں نے جو پور کے تخت پر قبضہ کر لیا ہے تو لشکری بھی محمد شاہ سے بدظن ہونے لگے۔ چوری چھپے اس سے الگ ہو کر سلطان حسین کے پاس پہنچنے لگے۔

محمد شاہ کے پاس بہت کم لشکری رہ گئے تھے۔ یہ صورت حال اس کے لیے حوصلہ شکن تھی۔

سلطان حسین نے ایک لشکر محمد شاہ کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ محمد شاہ اس وقت تک قریب کے ایک باغ میں چھپ گیا تھا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ یہاں چھپ کر حالات پر نظر رکھے گا اور موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جائے گا۔ لیکن سلطان حسین کے لشکر نے اس باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

محمد شاہ نہایت ماہر تیر انداز تھا اور پھر باغ کے اندر گھنے پیڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ اگر اندر سے تیر چلاتا رہتا تو سلطان حسین کے لشکر کا کوئی بھی فرد زندہ نہ بچ پاتا۔ اس نے

یہی کیا بھی لیکن اس کا لشکر اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ اس کے سلاح دار نے تیروں سے پیکان جدا کر دیے تھے۔ وہ ترکش سے جو تیر نکالتا تھا بغیر پیکان کے نکالتا تھا۔ آخر کار کموار ہاتھ میں لی اور باغ سے نکل آیا۔ چند آدمیوں کو قتل کیا۔ اچانک ایک تیر کسی طرف سے آیا اور اس کے گلے میں بیوست ہو گیا۔ وہ گھوڑے سے گر ا اور ختم ہو گیا۔

سلطان حسین شرقی نے اس دباؤ کے تحت کہ جلال خاں، بہلول لودھی کی قید میں تھا صلح کر لی۔ قطب خاں کو سات ماہ کی قید کے بعد آزاد کر کے دہلی بھیج دیا۔ اس کے معاوضے میں سلطان بہلول نے شہزادہ جلال خاں کو بھی قید سے رہا کر کے حسین شرقی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

سلطان بہلول پنجاب کی مہمات کے انتظامات اور ملتان کے حاکم کی بغاوت کی وجہ سے ملتان جا رہا تھا۔ اس نے قطب خاں لودھی اور خان جہاں کو اپنی نیابت میں دہلی چھوڑا اور خود بھی دہلی چھوڑ دی۔

جون پور کے حکمرانوں کے ساتھ بہلول لودھی کی صلح ہو گئی تھی۔ چند ماہ خاموشی سے گزر بھی گئے تھے لیکن دراصل حسین شرقی نے یہ صلح اپنی عسکری طاقت کو بڑھانے کے لیے کی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی قوت میں اضافہ کرتا رہا تھا۔ اب اس کے لشکر میں ستر ہزار سوار اور ایک ہزار مست ہاتھی تھے۔ اس کے بقول وہ بہلول لودھی کو چوٹی کی طرح مسل سکتا تھا۔ سلطان لودھی ابھی راستے میں تھا کہ اسے خبر ملی۔ ”سلطان حسین ایک بڑا لشکر اور مست ہاتھیوں کو لے کر دہلی کی طرف آرہا ہے۔“

سلطان بہلول فوراً واپس ہوا اور دہلی آ گیا۔ اپنے سالاروں کی جمع کیا اور حسب سابق ان سے ضروری مشوروں کے بعد مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ چند وار کے مقام پر دونوں کا آمناسامنا ہوا۔

سلطان بہلول اپنے حریف لشکر کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ ایسا عظیم لشکر اس کے مقابلے پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے امرا کے مشورے سے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے جنگ کا آغاز کر دیا۔ سلطان حسین نے بھی اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصے کی کمان وہ خود کر رہا تھا۔ دوسرا حصہ اپنے بھائی جلال خاں کے سپرد کیا تھا۔

فوجوں کے تمام حصے بہ یک وقت آپس میں ٹکرائے تو کمواروں کی جھنکار آسمان تک پہنچی۔ مست ہاتھیوں کی دوڑ بھاگ سے زمین ہلٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

دونوں فریقوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ دن گزر گیا۔ دوسرے دن پھر اسی طرح معرکہ آرائی نے زور باندھا۔

سات دن گزر گئے تھے مگر کسی لشکر میں کمزوری کے کوئی آثار نہیں تھے البتہ سلطان حسین کی فوج کو کثرت اسلحہ و سپاہ کی بدولت غلبہ حاصل تھا اور یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ بالآخر سلطان حسین کو فتح حاصل ہو جائے گی۔

اس موقع پر قطب خاں نے اپنی کمزوری کو دیکھتے ہوئے سلطان حسین شرقی کے پاس پیغام بھیجا۔

”جس وقت میں قید میں پڑا ہوا تھا اس وقت آپ کی والدہ بی بی راجی کے مجھ پر بے حد احسانات ہیں ان کی وجہ سے میری جان بچی رہی۔ اس لیے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ سے جنگ کروں لہذا آپ اسی وقت میدان سے واپس چلے جائیں۔ اس وقت یہی مناسب ہے کہ دریائے گنگا کے اس پار کا ملک اپنے قبضے میں رکھیے اور گنگا کے دوسری طرف کے علاقوں پر بہلول لودھی کو قابض رہنے دیں۔“

سلطان حسین صلح کی اس پیشکش کو شاید ٹھکرا دیتا لیکن جب اس کے پاس یہ خبریں پہنچیں کہ اس کے لشکر کے دو حصوں کو عمر خاں اور بہاؤ الدین نے تباہ و برباد کر دیا ہے تب وہ صلح پر تیار ہو گیا۔

سلطان حسین نے اس صلح پر بھروسہ کیا اور اپنا مال و اسباب چھوڑ کر چلا گیا۔

سلطان بہلول نے سلطان حسین کے اعتماد کو دھوکا دیا اور اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس کا قیمتی مال و متاع جو اونٹوں پر لدا ہوا جا رہا تھا اپنے قبضے میں لے لیا اور بہت سے امرا کو پکڑ لیا۔ سلطان حسین کے بہت سے پرگنوں پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنے حاکم مقرر کر دیے۔

سلطان حسین تیزی سے جو پور کی طرف جا رہا تھا لیکن سلطان بہلول شکاری چیتے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ سلطان حسین نقصان اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق سفر ملتوی کیا اور لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس لڑائی کا انجام بھی صلح پر ہوا۔

حسین شاہ راہری چلا گیا اور بہلول دہلی آ گیا۔ جنگوں کا یہ سلسلہ تھکنے والا نہیں تھا۔

ایک عرصے بعد پھر سلطان حسین نے فوج جمع کر کے سلطان بہلول پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد سلطان حسین کو پھر شکست ہوئی۔ سلطان حسین راہری کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان بہلول بھی راہری پہنچ کر حسین شرقی سے ٹکرا

یہی وہ وقت تھا جب سلطان حسین حرکت میں آیا اور
کالپی پہنچ گیا۔ سلطان بہلول نے ایک لشکر اودھے پور اور
گوالیار کی فوجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھیج دیا تھا۔

بہلول نے حملہ کر کے جوہنور پر قبضہ کر لیا۔ سلطان

اب وہ بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ زندگی بھر کی کمائی اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کے لیے احکام صادر کیے۔ جو پنپور کی حکمرانی اپنے فرزند بابر بک شاہ کو دی۔ اللہ پور

سینس ڈائجسٹ 48 جولائی 2012ء

کی حکمرانی اپنے ایک اور شہزادے عالم خاں کو دی، لکھنؤ اور کالپی اپنے پوتے اعظم ہمایوں کو دی۔ نظام خاں (سکندر لودھی) کو دو آسے کے درمیان کے بہت سے ممالک عطا کیے اور اس کو اپنا جانشین بنایا۔

اب اس نے بادشاہت کی طرف سے بالکل ہاتھ اٹھالیا تھا اور باقی عمر دہلی یا لاہور میں گزارنا چاہتا تھا۔ لاہور اس کا پسندیدہ شہر تھا۔

انہی دنوں گوالیار کے راجا کی طرف سے سرکشی کی خبریں آنے لگی تھیں۔

اس کی بیوی ہیماس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا سالار عیسیٰ خاں اور امیر قمرلی خاں ابھی اٹھی اٹھ کر گئے تھے۔ غالباً وہی یہ خبر لے کر آئے تھے کہ راجا گوالیار نے اطاعت سے روگردانی کی ہے اور خراج دینے سے انکار کر دیا ہے۔

”ہیما، میری پوری زندگی میدان جنگ میں بسر ہو گئی ہے۔ تمہیں بھی کوئی سکھ نہیں دے سکا ہوں۔ اب سوچا تھا زندگی کے جتنے دن رہ گئے ہیں تمہارے پاس رہ کر بسر کروں گا لیکن راجا گوالیار نے سرکشی دکھائی ہے۔ مجھے گوالیار کی طرف جانا پڑے گا۔“

”آپ خود کیوں جاتے ہیں۔ معمولی سی مہم ہے کسی سالار کے سپرد کر دیجیے۔“

”میں نے اپنے ملک کے تمام حصے اپنی اولادوں میں تقسیم کر دیے ہیں۔ میں ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا کہ اب میرے قویٰ کمزور ہو گئے ہیں۔ شاید کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ بہلول تو اب کمزور ہو چکا ہے اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے ملک پر چڑھ دوڑے۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی میرے ہاتھوں میں دم ہے۔“

”میں تو خوش ہو گئی تھی کہ اب آپ میرے پاس رہیں گے۔“

”اس سفر میں تم بھی میرے ساتھ جاؤ گی۔“

”بھلا جنگوں میں کوئی عورتیں بھی جاتی ہیں۔“

”یہ جنگ نہیں ہے۔ راجا نے بھی یہ سمجھ لیا تھا کہ اب میرے ہاتھ کمزور اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ وہ مجھے دیکھے گا تو جنگ کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔“

اس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ گوالیار پہنچا تو گوالیار کا حاکم راجا مان مطیع ہو گیا۔ اس نے اسی لاکھ تنگے بہلول کی خدمت میں پیش کیے۔ بہلول نے اسے گوالیار پر قابض رہنے دیا۔ یہاں سے وہ اٹاؤہ گیا۔ اٹاؤہ کو سکت سنگھ سے لے لیا اور پھر واپس آ گیا۔

وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ سفر روک دیا گیا۔ خیمے لگا دیے گئے۔ اطبا جو لشکر کے ساتھ چل رہے تھے بادشاہ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

جب حالت زیادہ بگڑنے لگی تو امراء سلطنت جو اس وقت موجود تھے، آپس میں یہ مشورے کرنے لگے کہ بادشاہ کا جانشین کسے بنایا جائے۔

بادشاہ نے نظام خاں (سکندر لودھی) کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا لیکن اس وقت جو امراء وہاں موجود تھے وہ بادشاہ کے پوتے اعظم ہمایوں کے حق میں تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور چپکے چپکے بہلول کو سکندر لودھی کی طرف سے بدظن کرنے لگے۔ بہلول اس وقت مردہ بدست زندہ بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے قویٰ میں اتنی طاقت نہیں پاتا تھا کہ امراء کی مخالفت کرتا۔ کسی بڑھتی ہوئی بے چینی کے لیے ضروری تھا کہ امراء کی بات مان لی جائے لیکن سکندر لودھی کی دلداری بھی عزیز تھی۔ اس نے سکندر لودھی کو لکھ بھیجا کہ وہ فوراً اس سے آکر ملے۔

سکندر لودھی کی ماں ہیماس اپنے خیمے میں بیٹھی تھی کہ بہلول کا سالار عمر خاں دروازے پر حاضر ہوا۔ ہیماس کی لونڈی نے پردہ کرا کے عمر خاں کو اندر بلا لیا۔

”کہو عمر خاں، کیسی خبر لائے ہو۔ اچھی خبر ہو تو ضرور سناؤ۔“

”بی بی صاحبہ، سلطان معظم خیریت سے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ میں کہنے والا ہوں اسے غور سے سن لیں۔ ولی عہدی کے لیے مشورے ہو رہے ہیں۔ بعض امراء اعظم ہمایوں کے حق میں ہیں جبکہ کچھ دوسرے باربک شاہ (بہلول کا بڑا بیٹا) کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔“

”سلطان تو میرے بیٹے کے حق میں فیصلہ دے چکے ہیں اور سلطان ابھی زندہ ہیں۔ پھر ان سے کیوں نہیں پوچھ لیا جاتا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔“

”بی بی صاحبہ، ان امراء نے سلطان کو شہزادہ سکندر کی طرف سے بدظن کر دیا ہے۔ اب تو سلطان اور سازشی امراء نے یہ طے کیا ہے کہ شہزادے کو دہلی سے یہاں بلا کر قید کر لیا جائے تاکہ وہ کسی اور کو ولی عہد مقرر کرنے پر ہنگامہ نہ کھڑا کر سکے۔ میں اس وقت آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ شہزادے کو کھلو ابھیجیں کہ اسے نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے لہذا وہ ہرگز یہاں نہ آئے۔“

”ایک قاصد آپ ہی دہلی کی طرف دوڑا دیجیے۔“

”مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔ شہزادے کو روکنا میرا کام ہے۔“

ابھی جانشینی کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ سلطان بہلول
نیس سال نہایت کروفر سے حکومت کرنے کے بعد 894ھ
میں قضائے الہی سے رحلت کر گیا۔

زرنگر کی بیٹی ہیما اس کے ساتھ تھی۔

دیکھتی جاتی تھی جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی اس طرف سے نہ آجائے۔ اس کا خوف بجا تھا۔ اگر کوئی اس طرف آتا اور وہ دیکھ لیتا کہ لولیتا کیا کر رہی ہے تو اسے فوراً گولی مار دی جاتی۔

جیڈ اس وقت جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان چھپی ہوئی ایک لانگ رینج ٹرانسمیٹر سے پیغام دے رہی تھی اور یہ پیغام وہ مورس کوڈ میں دے رہی تھی۔ صرف مورس کوڈ نہیں تھا بلکہ پیغام بھی کوڈ میں تھا اور اگر کوئی سنتا تب بھی وہ نہیں جان

لو لیتا ایک طرف زمین سے سبزی توڑ رہی تھی۔ وہ ایک نوجوان اور دلکش لڑکی تھی اس کی عمر تقریباً چوبیس برس تھی۔ اس نے سفید لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا جو اس کی پنڈلیوں تک آ رہا تھا۔ اوپر اس نے بھورے رنگ کا بھداسا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ مگر کمر سے بیلٹ باندھ کر اس نے اسے کسی قدر بہتر کر لیا تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ سبزی چنتے ہوئے بار بار سر اٹھا کر جولی فارم کی عمارتوں کی طرف



کاشف زبیر

راکھ کے پھول

رقص اجل کے درمیان صنف نازک کے عزائم کی پختگی



تاریخ فرشته، محمد قاسم فرشته طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین احمد - تاریخ شاہی،

احمدیاد کاریمیم التواجیہ ملا علی محمد خان صاحب خانہ لاہور، صاحب رائے

2012

سکتا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ جیڈ تقریباً تیس تیس برس کی سخت جان نظر آنے والی عورت تھی مگر اس میں دل کشی بھی تھی لیکن یہ اس کے سخت تاثرات میں چھپ گئی تھی۔ اس نے بھی لولیتا کی طرح سفید اسکرٹ اور بھورا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس نے بال کس کر چوٹی کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ پیغام بھیجتے ہوئے وہ پوری طرح محتاط تھی اگر کوئی اس طرف آجاتا تو وہ ایک منٹ سے بھی پہلے سب چھا دیتی۔

اسے معلوم تھا اس کا پیغام نہ صرف برطانیہ بلکہ فرانس اور امریکا میں بھی سنا اور سمجھا جا رہا تھا، یہ مخصوص کوڈز تھے جو صرف برٹش اور امریکن انٹیلی جنس والے جانتے تھے۔ پیغام بھی ان کے لیے تھا۔ اپنا کام مکمل کر کے جیڈ نے نہایت پھرتی سے ٹرانسمیٹر کی بیٹری الگ کی اور اس کے تارسمیٹ کر اس بس میں ڈالے جس میں ٹرانسمیٹر پہلے سے موجود تھا۔ پھر ایریل کا تار بھی سمیٹ کر اسی بس میں ڈالا اور اسے بند کر دیا۔ بس پہلے سے زمین میں بے گڑھے میں رکھا تھا۔ یہ وائر پروف تھا۔ جیڈ نے اس پر ایک کپڑا ڈالا اور پھر آس پاس موجود پتوں کا ڈھیر اس پر بکھیر دیا۔ ایک منٹ بعد پتا بھی نہیں چل رہا تھا کہ یہاں کوئی ایسی چیز ہے۔ جیڈ کی ٹوکری پاس ہی رکھی تھی جس میں توڑی ہوئی اسٹرا بیری موجود تھی۔ وہ درختوں سے برآمد ہوئی تو لولیتا نے سکون کا سانس لیا لیکن وہ جیڈ کی طرف آنے کے بجائے جوٹی فارم کے ساتھ بہنے والی نہر کے پل کی طرف بڑھ گئی، اسے اطمینان تھا کہ جیڈ نے اپنا کام کر لیا ہے اور جلد وہ بھی آجائے گی۔

ایس سو پینتالیس کے مارچ کا آخری ہفتہ یورپ اور مغربی دنیا کے لیے نہایت ہنگامہ خیز تھا۔ نازی جنگ ہار چکے تھے لیکن وہ آخری دم تک لڑنے کا عزم رکھتے تھے۔ ایک طرف سے سوشلسٹ روسی جرمنی میں داخل ہو چکے تھے تو دوسری اطراف امریکا کی قیادت میں اتحادی افواج جرمنی میں گھس آئی تھیں۔ روسی فوج بیک وقت شمالی اور جنوبی جرمنی سے اندر داخل ہوئی تھی اور اب برلن کو کسی شکنجے کی طرح کئے کے لیے دو طرف سے بڑھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد برلن فتح کر کے اس جنگ کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی اس لیے باقی جرمنی پر ان کی خاص توجہ نہیں تھی۔

مشرقی جرمنی میں دریا کے کنارے آباد ڈریڈن شہر کے شمال مغرب میں گھنے جنگلوں پر مشتمل علاقہ تھا۔ اس میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور فارم ہاؤس تھے۔ روسی فوج شدید لڑائی کے بعد ڈریڈن پر قابض ہو گئی لیکن اب بھی کہیں کہیں جرمن دستے مزاحمت کر رہے تھے۔ ان کا مرکزی

کمان سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا لیکن وہ اپنے طور پر لڑائی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہاں کمان جنرل ویسٹر کے ہاتھ میں تھی جو کبھی ہٹلر کے قریبی حلقے میں شامل نہیں رہا۔ فوج میں وہ منہ پھٹ اور سچ بات کہنے کے لیے مشہور تھا اس لیے وہ ترقی نہیں کر سکا۔ جنرل بھی وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کی وجہ سے بنا تھا۔ اسے شاذ بنی برلن میں رہنے کا موقع ملا تھا ورنہ زیادہ تر اسے جرمنی سے باہر تعینات کیا گیا، جب دشمن جرمنی میں گھس آئے تو اسے ڈریڈن اور اس کے آس پاس کا دفاع سونپ دیا گیا تھا۔

جنرل ویسٹر حیران تھا کہ اس علاقے کی کیا اہمیت تھی جو اسے یہاں بھیج دیا گیا، اس کا خیال تھا کہ اسے کسی اہم شہر یا علاقے کا دفاع سونپا جائے گا مگر برلن سے روانگی کے وقت اسے بتا دیا گیا کہ اس علاقے کی کیا اہمیت ہے۔ جرمنوں نے پورے یورپ اور روس میں نوادرات اور قیمتی اشیاء کی جو لوٹ مار کی تھی اس کا ایک حصہ ڈریڈن کے شمال مغرب میں واقع جوٹی فارم میں محفوظ تھا اور اسے اسی خزانے کی حفاظت کرنی تھی مگر ویسٹر کے نزدیک اس خزانے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ حیران تھا کہ جب جرمنی شکست کے دہانے پر تھا تو ہٹلر کا ٹولہ احمقانہ فیصلے کر رہا تھا۔ جو تو اتنی وہ جرمنی کے دفاع پر لگا کر اتحادیوں کو جنگ بندی پر مجبور کر سکتے تھے، وہ اس قسم کے فیصلوں کی وجہ سے ضائع جا رہی تھی۔

مگر حکم تو حکم تھا اور فوج کے ڈپلن میں حکم ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جنرل ویسٹر کو جانا پڑا تھا لیکن جب وہ ڈریڈن پہنچا تو روسی شہر کو تقریباً فتح کر چکے تھے۔ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ جرمن قبضے میں رہ گیا تھا۔ جنرل ویسٹر نے اسے ہی اپنا مرکز بنا کر روسیوں کے خلاف مزاحمت شروع کر دی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ روسی فوج بلا روک ٹوک برلن کی طرف جا رہی تھی۔ جوٹی فارم کے بارے میں اتحادی تو کیا خود جرمن فوج بھی بہت کم جانتی تھی یہاں آنے سے پہلے جنرل ویسٹر بھی اس بارے میں نہیں جانتا تھا اس لیے وہ جوٹی فارم کے آس پاس کے علاقے کا دفاع کر رہا تھا لیکن اس نے جوٹی فارم کی طرف توجہ نہیں دی تھی کہ کہیں روسی بھی اس طرف متوجہ نہ ہو جائیں۔

جوٹی فارم میں جرمنوں کا ایک چھوٹا سا دستہ تھا جس کا انچارج کارپول ہینس تھا۔ اس کے ماتحت ایک درجن سپاہی یہاں پھرا دیے تھے۔ فارم کے عقب میں ایک بڑی سی ورکشاپ تھی لیکن یہ مقفل تھی اور کارپول ہینس کو سختی سے حکم تھا کہ اس میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی کسی اور کو اس طرف جانے دے۔ ان ایک درجن افراد کے علاوہ

یہاں صرف دو عورتیں تھیں۔ لولیتا اور جیڈ یہاں کھانا بنانے اور دوسرے کاموں کی ذمہ دار تھیں۔ ان کے لیے جوٹی فارم کا مرکزی حصہ مخصوص تھا وہ وہیں رہتی تھیں۔ اس حصے میں کسی جرمن سپاہی کو بغیر اجازت آنا منع تھا بلکہ وہ صرف کھانے کے وقت وہاں آ سکتے تھے۔

لولیتا پولش تھی، جب جرمن افواج نے پولینڈ فتح کیا تو وہ اس وقت ہائی اسکول کے آخری سال میں تھی۔ جرمنوں کے حملے میں اس کا گاؤں مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور وہ صرف اس لیے بچ گئی کہ ایک دن پہلے ہی اس کے ماں باپ نے اسے برابر والے گاؤں بھیج دیا تھا جہاں اس کی خالہ رہتی تھی۔ اگلے دن یہ گاؤں جرمنوں کا نشانہ بنا۔ اس کے بیشتر مکین موت کے گھاٹ اتر گئے لیکن لولیتا بچ گئی، وہ اور اس جیسی چند عورتوں نے چرچ میں پناہ لے لی تھی۔ یہاں سے جرمنوں نے انہیں گرفتار کر کے جنگی قیدی کیمن بھیج دیا۔ لولیتا کی ماں روسی نژاد یہودی تھی اور باپ پولش گیتھولک تھا مگر اس نے جھوٹ بول دیا کہ اس کے ماں باپ دونوں پولش تھے۔ اس جھوٹ نے اسے بچا لیا ورنہ گرفتار ہونے والوں میں جو ماں باپ یا کسی ایک کی طرف سے بھی یہودی ثابت ہوتا اسے فوراً آشوبز برگ روانہ کر دیا جاتا تھا۔ یہ ہولناک قید خانہ بعد میں لاکھوں انسانوں کی قتل گاہ بنا۔

لولیتا کو ڈریڈن بھیج دیا گیا جہاں وہ دو سال تک قید خانے میں رہی۔ جرمن ان قیدی عورتوں سے کام لیتے تھے اور انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ نازک عورتیں تھیں۔ وہ ان سے سخت ترین جسمانی مشقت بھی لیتے تھے۔ بہت سی عورتیں یہ مشقت برداشت نہیں کر سکی تھیں، کچھ پاگل ہو گئیں، کچھ نے خودکشی کر لی اور کچھ بھاگنے کی کوشش میں ماری گئیں۔ ان میں سے چند ایک ہی بچی تھیں۔ بچ جانے والی عورتوں کو پوپ کی درخواست پر مقامی چرچ کے حوالے کر دیا گیا۔ ان میں لولیتا بھی شامل تھی۔ اس کا خیال تھا کہ چرچ کی پناہ میں آنے سے اس کی زندگی کا مشکل دور ختم ہو جائے گا مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ چرچ کا سربراہ پادری جیکس ایک بد کردار آدمی تھا اور اس نے ان عورتوں کے لیے اذیت کا نیا سامان پیدا کر دیا تھا۔ جو اس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے راضی ہو گئیں ان کے لیے زندگی آسان ہو گئی تھی اور جو ماننے سے انکاری تھیں ان کے لیے سوائے مشکلات کے اور کچھ نہیں تھا۔ انکار کرنے والوں میں لولیتا بھی شامل تھی۔

دو سال لولیتا نے بہت مشکل میں بسر کیے، کئی بار جیکس نے اسے جاسوسی ہونے کا الزام لگا کر جرمنوں کے

حوالے کرنے کی دھمکی دی لیکن لولیتا نے جوابی دھمکی دے کر اسے باز رکھا کہ اگر اس نے اسے جرمنوں کے حوالے کیا تو وہ ان سے کہہ دے گی کہ وہ بھی اتحادیوں کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ یہ سن کر جیکس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اتحادیوں کے لیے گیتھولک چرچ کی ہمدردی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اور جرمنی میں یا اس کے مقبوضہ علاقوں میں بہت سارے چرچ اس وجہ سے تباہ کر دیے گئے تھے کہ ان پر اتحادیوں کا ساتھ دینے کا الزام آ رہا تھا۔ اس لیے جیکس نے اسے جرمنوں کے حوالے نہیں کیا لیکن چرچ میں وہ اس کی زندگی جس قدر مشکل بنا سکتا تھا بنا تا رہا۔ دو سال بعد چرچ کی عمارت اتحادی بمباری کا نشانہ بنی جب ایک بم گرا اور اس نے پورے چرچ کی عمارت کو ملیا میٹ کر دیا۔ اس حملے میں جیکس سمیت چرچ کے کئی افراد مارے گئے تھے۔

لولیتا اور دوسری عورتیں بچ گئی تھیں۔ انہیں ایک بار پھر جنگی کیمن میں منتقل کر دیا گیا لیکن اس بار ان سے نرم مشقت لی جا رہی تھی اور یہ نرم مشقت کھیتوں میں کام کرنا تھا۔ اکثر نوجوان مرد فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور باقی فوج کی ضرورت پوری کرنے والے کارخانوں میں کام کر رہے تھے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے کوئی بچا نہیں تھا۔ شروع میں مقبوضہ ممالک سے خوراک کے ذخائر جرمنی منتقل کیے جاتے رہے لیکن جلد وہاں بھی خوراک کی قلت ہو گئی۔ تب جرمنوں نے قیدی مرد اور عورتوں کو زمین پر لگا دیا۔ اب وہ فصلیں اگاتے، سبزیاں کاشت کرتے، ڈیری اور پولٹری فارم چلاتے تھے لیکن ان لوگوں کو اس میں سے بہت کم ملتا تھا، خوراک تمام کی تمام اٹھا کر گوداموں میں پہنچادی جاتی تھی۔

لولیتا اور اس کی ساتھی عورتوں کو بس اتنا ملتا تھا کہ وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کے لیے وہ چوری چھپے کچی کچی سبزیاں کھا لیتی تھیں۔ جب سبزیاں توڑ لی جاتیں تو وہ ان کے بچے کھینچے جیسے تک ابال کر یا بھون کر کھا لیتی تھیں۔ ان تمام عورتوں کو بیکر نما عمارتوں میں رکھا جاتا تھا۔ صبح سورج طلوع ہونے سے لے کر غروب ہونے تک وہ کھیتوں میں کام کرتی اور اس دوران میں جرمن فوجی کتوں کے ساتھ ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ یہیں لولیتا کی ملاقات جیڈ سے ہوئی جب آئی اسے لولیتا کے برابر والا بستر ملا تھا۔

”میں لولیتا ہوں۔“ اس نے جیڈ سے ہاتھ ملایا۔ ”تم کون ہو؟“

”یہ لوگ مجھے جیڈ کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔ اس کی صحت بہت خراب تھی اور جسم پر زخموں کے نشانات تھے۔

”یہ لوگ...؟“

”میں نہیں جانتی میں کون ہوں اور کہاں سے آئی ہوں دو مہینے پہلے مجھے ایک جنگی قیدی کیمپ میں ہوش آیا مگر اس سے پہلے کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے میرے سر پر چوٹ لگی جس نے میری یادداشت ختم کر دی ہے۔“ اس نے بال ہٹا کر سر کی چوٹ دکھائی جو اب مندرل ہو چکی تھی۔

لو لیتا کو انجانے میں اس عورت سے ہمدردی ہو گئی تھی جو اپنا ماضی تک بھول گئی تھی اس کے مقابلے میں لو لیتا کو اپنا ماضی تو یاد تھا۔ اسے ایک امید تھی کہ جب جنگ ختم ہوگی تو وہ واپس اپنے گاؤں جا سکے گی۔ لو لیتا نے نگران سے کہہ کر جیڈ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اس کی مدد کرتی اور اس کا دل بھی بہلاتی تھی لیکن کچھ عرصے بعد اس نے محسوس کیا کہ جیڈ خود بھی ایک مضبوط عورت ہے۔ وہ اس سے زیادہ محنت کرتی اور کسی بھی صورت حال میں نہیں گھبراتی تھی۔ لو لیتا نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا تھا جب کہ ان کی بیرک میں موجود ہر عورت رات سونے سے پہلے رو دھو کر اپنے دل کا غبار نکالتی خود لو لیتا بھی اکثر رو جاتی تھی۔

”تم مضبوط عورت ہو۔“ لولیتا نے اس کی تعریف کی۔
 ”ہاں نہیں، وہاں جنگی قیدی کیمپ میں بھی سب یہی
 کہتے تھے۔“ جڈ بولی۔ ”شاید میں بھی فوج میں تھی۔“

لو لیتا نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر سرگوٹی میں بولی۔ ”خدا کے لیے آئندہ یہ بات منہ سے مت نکالنا ورنہ یہ تمہیں سیدھا قافارنگ اسکو اڈ کے حوالے کر دیں گے۔“

جید خوف زدہ نہیں ہوئی لیکن اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ وہ اب دوبارہ یہ بات نہیں کرے گی۔ لولیتا نے شکر ادا کیا کہ دوسری عورتیں اس وقت سو رہی تھیں ورنہ اسے

یقین تھا کہ جرمنوں نے ان عورتوں کے درمیان جاسوس بھی چھوڑ رکھی ہوں گی جو ان پر نظر رکھتی تھیں۔ اگر کسی عورت پر شک ہو جاتا تو اسے جرمن پولیس گستاخوں کے حوالے کر دیا جاتا

ور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ اس لیے لولیتا اس کی بات سن کر گھبرا گئی تھی۔ ویسے تو جیڈ بہت ذہین تھی لیکن کبھی کبھی وہ بہت سادہ انداز میں کوئی ایسی بات کہہ جاتی جس کا کہنا

خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باتیں کرتے ہوئے سو گئیں۔ صبح اٹھ کر وہ حسب معمول ناشتا کرتے ہی کھیتوں میں کام کرنے لگیں۔

اکتوبر کا آخر تھا اور آلو کی فصل تیار تھی۔ عورتیں زمین کھود کھود کر آلو نکال رہی تھیں کہ ایک جیب اور ایک بڑی گاڑی آکر وہاں رکی۔ جس سے ایک کٹر برآمد ہوا۔ اس

نے عورتوں کا جائزہ لیا اور پھر لولیتا اور جڈ کی طرف اشارہ کیا۔ اشارے کی دیر تھی کہ سپاہی انہیں دھکیلتے ہوئے کرنل کے سامنے لے آئے۔ کرنل نے ان کا جائزہ لیا۔ لولیتا کا خوف کے مارے برا حال تھا، اسے یقین تھا کہ رات ان کی گفتگو کسی جرمن جاسوس عورت نے سن لی ہوگی اور اب انہیں گرفتار کر کے فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کرنل نے انہیں گاڑی میں بٹھانے کا اشارہ کیا اور انہیں دھکیل کر اس چھوٹے ٹرک کے عقبی حصے میں بٹھا دیا، نصف درجن سپاہی پہلے وہاں موجود تھے لیکن نہ تو ان کے ہاتھ باندھے گئے تھے اور نہ سپاہیوں نے ان پر رائفلیں تانیں۔

جیب اور ٹرک روانہ ہوئے اور کوئی تین گھنٹے بعد وہ
جسٹس فارم پہنچ گئے تھے۔ فارم تین عمارتوں اور ایک ہوائی چکی
کے ناور پر مشتمل تھا، ان کے چاروں طرف زمین تھی اور جنگل

فارم کی حالت سے لگتا تھا کہ اس کی بڑوسوں سے دیکھ بھال نہیں ہوئی تھی۔ لولیتا حیران تھی، اگر وہ انہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے تو اتنی دور لانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

تھا، یہ کام تو وہاں بھی ہو سکتا تھا اور یہ نازیوں کا کوئی جنگی کیمپ یا اذیت خانہ بھی نہیں لگ رہا تھا جہاں اتحادی جاسوسوں سے نفیثش کی جاتی ہو۔ اس کے برعکس وہاں کا ماحول بہت پر

سکون دکھائی دے رہا تھا۔ کرنل نے انہیں کارپول مینس کے حوالے کیا اور اپنے قافلے سمیت واپس چلا گیا۔ کارپول مینس ایک ادھیڑ عمر جرمن تھا جس کا جسم کسی قدر ہار ہوا تھا۔

نکرائی کا کام سوئپ دیا گیا تھا۔ جرمن ہونے کے باوجود وہ
رم مزاج شخص تھا۔ اس نے پہلے تعارف حاصل کر لیا اور

”تم دونوں کو یہاں کچن چلانا ہے۔ ویسے تو سپلائی آتی ہے لیکن سبزیاں اور مرغیوں سے انڈے حاصل کرنا تمہارا کام ہے۔“

”یہاں سبزیاں کاشت ہیں اور مرغیاں کہاں ہیں؟“
”نہیں، سبزیاں خود رو ہیں اور مرغیاں بھی جنگل میں“

لو لیتا اور جیڑ حیران تھیں کیونکہ یہ تو کوئی کام ہی نہیں تھا

رہے ہیں کیونکہ یہ ظاہر نہ تو یہ کوئی فوجی تخصیص تھی اور نہ ہی ہاں کوئی ایسی چیز نظر آ رہی تھی جس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ بند

ہے کا کام ہوتا تھا جواب پسند پڑی تھی۔ اس کے سامنے

والے فولادی دروازے پر تالا تھا۔ انہیں رہائش کے لیے کچن والی عمارت کے اوپر ایک کمرہ دیا گیا تھا۔ عمارت بہت اچھی حالت میں نہیں تھی لیکن اس بیرک سے بہت بہتر تھی جہاں وہ اب تک رہتی آئی تھیں۔ انہیں روزانہ کچھ خود روہزی اور مرغیوں کے انڈے جن کر سپاہیوں کے لیے تین وقت کا کھانا بنانا تھا۔ یہ مشکل کام نہیں تھا۔ دوسری رات جب وہ سونے کے لیے اوپر آئیں تو جیڈ کمرے کی کھڑکیوں سے فارم کا جائزہ لے رہی تھیں، انہیں بتایا گیا تھا کہ اس جگہ کو جولی فارم کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی یہ فوجی دستہ بھی چند مہینے پہلے اس جگہ تعینات کیا گیا تھا۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“ لولیتا نے خوف زدہ انداز میں کہا۔ کمرے میں کم روشنی والا بلب جل رہا تھا اس لیے روشنی کم تھی اور چیزوں کے تارک سائے زیادہ تھے۔ لولیتا اس

لیے خوفزدہ تھی کہ کہیں جرمن جان نہ جائیں کہ جیڈ اس طرح چھپ کر انہیں دیکھ رہی ہے۔ جیڈ کچھ دیر بعد اپنے بیڈ کی طرف لوٹ آئی، انہوں نے معمول کا لباس اتار دیا اور سونے

”میرا خیال ہے اس فارم کی کوئی خاص اہمیت ہے۔“

”یہ میں نہیں جانتی لیکن تم خود سوچو یہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی حفاظت کی جائے اور درجن بھر جرمن فوجی اس کے گرد گھومتے ہیں۔“

”امامِ مصرت، میرا سے بہت شاندار ہونا چاہئے تو
 ذاتی رہائش ہو؟“ کو لیتا نے خیال پیش کیا۔

اس جگہ کی حالت سے نہیں لگتا کہ یہ کسی بڑے آدمی کی ملکیت ہے۔“

روغن کب کا اتر چکا تھا اور اب ان کے تختے بھی اکٹھے رہ گئے۔ کسی امیر کی رہائش سے زیادہ یہ جگہ ورکشاپ لگتی تھی۔

کی.... مجھے ورکشاپ صرف ایک عمارت میں سی۔ چننا والا
 عمارت بہ ظاہر کوئی ہال تھا اور اس کے اوپر چند کمرے تھے۔
 دوسری عمارت جس میں درجن بھر کمرے تھے، وہ جرمینوں کی
 ورکشاپ کے لیے تھی۔

رہا سچا گاہ کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ جبکہ میری نمائندگی
 خالی پڑی تھی۔ یہ شاید کسی زمانے میں عبادت کے لیے مخصوص
 تھی یا یہاں کٹری کا کام کیا جاتا تھا کیونکہ یہاں بے شمار تختے

رہے تھے جیسے چرچ کے ہال میں رہے جاتے ہیں۔ اس ہال

یہاں ان کے کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔ انہوں نے سبزی اور انڈے جمع کرنے، سپاہیوں کو کھانا دینے، نہر اور تالاب کے کنارے کپڑے اور نہانے کے لیے وہ تقریباً پورا فارم ہی گھوم لیا تھا۔

لو لیتا اٹھ بیٹھی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے اس جگہ کی اہمیت کیوں ہے؟“

”میرا خیال ہے جرموں نے یہاں کوئی اہم چیز چھپا

رکھی ہے۔“
”اگر وہ کوئی اہم چیز ہے تو سیکورٹی اس لحاظ سے
ناکافی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یہ کیمو فلانج ہے۔“ جیڈ نے کہا۔ ”جرمنوں نے یہاں بہت کم لوگ رکھے ہیں تاکہ کسی کو احساس نہ ہو کہ اس جگہ کی بھی کوئی اہمیت ہے لیکن دوسری

طرف ایک ویران فارم کی حفاظت کا انتظام معنی خیز بات ہے۔“

اس جگہ کو چھپانا ہوتا تو یہاں کسی غیر جرمن کو نہیں آنے دیتے۔“

ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، ہمارے بارے میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اگر ہمیں مار دیا جائے تو جرموں کو کسی وضاحت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

جیڈ اپنے بستر سے اٹھ کر اس کے پاس آگئی اور پھر

سرکوی میں جوی۔ گویا ہم میں جا ہیں۔ بڑا جیت ہمارا ہے۔
ہیں، ان کی فوجیں ہر طرف سے پسا ہو رہی ہیں۔“
لو لیتا کے لیے یہ ناقابل یقین بات تھی۔ جرمن شکست
میں تھے۔ کچھ کہہ کر انہوں نے زائد قہقہے لگائے اور

مخلو موں کو ایسا ہی تاثر دے رکھا تھا۔ اس لیے لولیتا کو جیوڈ کا
بات پر یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”تم کیسے جانتی ہو؟“

تھا۔“ جیڈ نے اعتماد سے کہا۔ ”اس وقت جرموں کو ایک ایک بار سے روک دینا چاہیے۔“

سپاہی کی اشد ضرورت ہے اور وہ کی اصول جگہ کی پیوری اتنے سپاہی نہیں لگا سکتے ہیں۔“

بھی نہیں اس معاملے سے دور رہنا چاہیے۔
 ”نہیں، اس کے برعکس ہمیں جاننے کی کوشش کرنا چاہیے۔“

چاہیے لیکن بہت محتاط رہ کر۔“

لولیتا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جیڈ کس قسم کی باتیں کر رہی تھی، انہیں بھلا جرمنوں کی ٹوہ میں رہنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اگر جرمنوں نے انہیں اپنی جاسوسی کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ ان کے لیے تو شک ہی کافی ہوتا تھا اور لولیتا نے ان پانچ سالوں میں بے شمار انسانوں کو صرف شک کی وجہ سے مرتے دیکھا تھا۔ جرمن اس معاملے میں زیادہ تردد میں نہیں پڑتے تھے، اگر انہیں کسی قیدی پر شک ہو جاتا تو بلا تکلف اسے فائرنگ اسکوڈ یا گناپو کے حوالے کر دیتے تھے ان میں سے فائرنگ اسکوڈ کے حوالے کیے جانے والے خوش قسمت شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ چند سیکنڈ کی اذیت میں زندگی سے نجات پا جاتے تھے جبکہ گناپو کے ہاتھ میں جانے والے بہت اذیت سے جان دیتے تھے۔ جرمن جتنی کیپیوں میں رہنے والے قیدی جرمنوں سے موت سے بھی زیادہ ڈرتے تھے۔

شروع میں انہیں اپنی ذمے داریاں بانٹنے میں کچھ دشواری پیش آئی تھی لیکن جلد انہوں نے طے کر لیا کہ کھانا لولیتا بنائے گی۔ وہ یہ کام اچھا کرتی تھی جبکہ جیڈ برتن اور کپڑے دھوئے گی۔ سبزی اور انڈے چن کر لانے کے لیے وہ دونوں جاتی تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی جب پہلے دن وہ جنگل کی طرف روانہ ہوئیں تو کسی سپاہی نے ان کی نگرانی کی کوشش نہیں کی۔ وہ اکیلے ہی گھومتی رہیں۔ کارپول مینس کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں ملی تھی کہ انہیں کب اور کہاں تک جانا ہے یعنی ان کے لیے حدود اور وقت کی کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ لولیتا تشویش زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے سبزی چننے کے دوران جیڈ سے کہا۔

”جیسے لگ رہا ہے یہ چھپ کر ہماری نگرانی کر رہے ہیں تاکہ ہم فرار کی کوشش کریں تو یہ ہمیں شوٹ کر دیں۔“

”ہمیں شوٹ کرنے کے لیے انہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ زمین سے کھسکیاں توڑتے ہوئے بولی۔

”تب یہ نگرانی کیوں نہیں کر رہے، ہمیں آزاد کیوں چھوڑا ہوا ہے؟“

”شاید اس لیے کہ یہاں سے فرار ہو کر ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ یہ جگہ جرمنی کے اندر ہے اگر ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تب بھی جرمنی سے نہیں نکل سکیں گے۔“

ان کے پاس کپڑے نہیں تھے۔ جیڈ کو کہیں سے ایک پرانی سلاخی مشین مل گئی۔ کپڑا انہوں نے پرانے بیزر سے لیا

اور اسے اچھی طرح دھو کر انہوں نے اپنے لیے چند لباس تیار کر لیے تھے۔ اسکرٹ سفید کپڑے سے بنایا تھا اور بلاؤز بھورے کپڑے سے تیار کیا تھا۔ سلاخی دونوں کو نہیں آتی تھی مگر انہوں نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی سر کر لی۔ قیدیوں کے کیمپ کے مقابلے میں یہاں کام بہت کم تھا اور انہیں اپنے لیے وقت مل جاتا تھا۔ انہیں ایک فائدہ اور ہوا تھا۔ یہاں خوراک اچھی تھی۔ جرمن سپاہیوں کے لیے ڈبل روٹی، گوشت، پنیر اور مکھن آتا تھا۔ سبزی اور انڈے یہاں سے مل جاتے تھے۔ بہتر خوراک سے چند دنوں میں ان کی صحت نکھر آئی تھی۔ جسم بھر گئے تھے اور رخساروں پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جن جرمن سپاہیوں نے انہیں شروع میں کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ چند ہفتے بعد وہ بھی انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگے تھے۔

ابھی تک کسی سپاہی نے انہیں... ہاتھ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اعلیٰ حکام کی طرف سے جرمن سپاہیوں اور افسروں کو غیر جرمن عورتوں سے میل جول پر پابندی تھی اور جو اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے تھے انہیں سزا بھی دی جاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود جنگی قیدی کیمپ میں کوئی عورت محفوظ نہیں تھی، خود لولیتا کو کئی بار اپنے جرمن آقاؤں کی خواہشات کو پورا کرنا پڑا تھا۔ صرف چرچ میں وہ سمجھوتا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں خدا کے گھر میں گناہ کسی صورت جائز نہیں تھا۔ البتہ یہاں سپاہیوں کا رویہ حیرت انگیز تھا۔ وہ دونوں عورتیں تھیں اور اگر جرمن دست درازی پر اتر آتے تو ان کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر کارپول مینس سمیت تمام جرمن ان سے اچھے طریقے سے پیش آتے تھے۔ کسی نے ان سے بد تمیزی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جب لولیتا یہاں آئی تو اس کا خیال تھا کہ اب ان دونوں کی خیر نہیں ہے، یہاں اس ویرانے میں یہ درجن بھر جرمن سپاہی بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑیں گے، مگر جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ لولیتا اپنی عزت کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ جنگی قیدی کیمپ میں اسے مجبوری کے عالم میں دوبار جرمن افسروں کے ساتھ رات گزارنا پڑی تھی اور وہ اس کی اذیت ابھی تک محسوس کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے خود سے نفرت ہونے لگتی تھی اور اس کا دل چاہتا کہ وہ خودکشی کر لے۔ اس نے یہ بات جیڈ سے کہی تو وہ بولی۔ ”تم زیادہ ہی حساس ہو ورنہ جنگوں میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ دشمن عورتوں کو بے عزت کرنا فاتحین کا سب سے پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو

تمہارے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ میں ایسی عورتوں اور کنواری لڑکیوں کو بھی دیکھ چکی ہوں جن کے ساتھ چوہیں چھٹنے میں درجنوں بار زیادتی ہوئی۔“

”میں جانتی ہوں لیکن میں آج تک اپنی بے عزتی سے سمجھوتا نہیں کر پائی ہوں۔“

جیڈ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”میری پیاری، بعض اوقات آدمی کو حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم یاد رکھو ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی ہے اور جب تک جنگ ختم نہ ہو جائے، ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

لولیتا سہم گئی۔ ”کچھ بھی ہو سکتا ہے؟“

جیڈ نے سر ہلایا۔ ”ہمیں حوصلے کے ساتھ اس کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم زندہ رہیں۔ یاد رکھو جنگ میں واحد کامیابی زندہ رہنا ہے۔“

لولیتا نے محسوس کیا کہ یہاں آنے کے بعد جیڈ کی شخصیت خاصی بدل گئی تھی۔ وہ تجربہ کار لگنے لگی تھی جیسے اسے جنگ سے متعلق ہر چیز کا پتا ہو اور وہ جانتی ہو کہ کس صورت حال میں کیا کرنا ہے۔ دن میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ جب وہ سبزی اور انڈے جمع کرنے کے لیے نکلنے لگتیں تو جیڈ اسے روک دیتی اور کہتی کہ لولیتا کچن دیکھ لے اس دوران میں وہ جا کر سبزی اور انڈے لے آتی ہے۔ اگر اسے دیر ہو جائے تب بھی لولیتا پریشان نہ ہوا ورنہ ہی اس کی تلاش میں نکلے، وہ جلد واپس آ جائے گی۔ لولیتا بھی اس کی بات مان لیتی تھی۔ ایک دن جب وہ اسی طرح باہر نکلی تو اس کے جانے کے بعد لولیتا کو یاد آیا کہ وہ اسے ایک قسم کی پھلی کے لیے کہنا تو بھول ہی گئی تھی۔ یہ پھلی سبزیوں اور گوشت کے سوپ میں ڈالتے تھے، اس کا ذائقہ جرمن سپاہیوں کو پسند تھا۔ پھلی شروع میں ڈالتے تھے کیونکہ وہ دیر سے ملتی تھی۔ لولیتا نے سوچا کہ وہ خود جا کر لے آئے گی۔ اس نے سبزی جمع کرنے والی ٹوکری اٹھائی اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔

عام طور سے وہ اور جیڈ الگ الگ جاتے اور آتے تھے۔ جرمنوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ نہر کے پاس جنگل بہت گھنا تھا اور خود رو سبزی ملتی تھی۔ فرار ہونے والی مرغیوں نے وہیں اپنا ٹھکانا بنایا ہوا تھا۔ جیڈ نے بڑی ہوشیاری سے ان کے گھونسلے تلاش کر لیے تھے جہاں وہ انڈے دیتی تھیں۔ روز انہیں ایک ڈیڑھ درجن انڈے مل جاتے تھے۔ لولیتا جنگل میں داخل ہوئی اور اس طرف بڑھی جہاں پھلی کی پھلیں لگی تھیں۔ وہ جاکر ایک اسے سناٹے میں ہلکی سی کھٹ کھٹ کی آواز سنانی دی، جیسے کوئی

مستقل ٹائپ رائٹر پر انگلی مار رہا ہو۔ لولیتا پہلے تو ڈر گئی پھر ہمت کر کے اس طرف بڑھی۔ تب اس نے جیڈ کو دیکھا، وہ جھاڑیوں میں کھسی کچھ کر رہی تھی۔ لولیتا نے ایریل کا تار بھی دیکھ لیا اور جب ذرا آگے آئی تو اسے ٹرانسمیٹر اور موریس کوڈ والی مشین بھی نظر آ گئی۔ جیڈ نہایت مہارت اور پھرتی سے اس پر پیغام بھیج رہی تھی۔ لولیتا اس مشین سے بخوبی واقف تھی اور جیڈ جو کر رہی تھی اس سے بھی۔

مارے دہشت کے لولیتا کے ہاتھ سے ٹوکری چھوٹ گئی۔ ہلکی سی آواز آئی تو کام میں مگن جیڈ نہایت پھرتی سے گھومی اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا ٹریگر بس دبے دبے رہ گیا۔ لولیتا کو دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پاس آئی۔ ”میرے خدا... تم یہاں کیوں آئیں... میں نے منع کیا تھا تمہیں... تمہارے پیچھے کوئی اور تو نہیں آیا ہے؟“

لولیتا کانپ رہی تھی۔ ”میرے پیچھے کوئی نہیں ہے... یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

”دبی جوتم دیکھ رہی ہو۔“ جیڈ نے سرد لہجے میں کہا۔

”تم اتحادیوں کے لیے جاسوسی کر رہی ہو۔“

جیڈ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے مشین پر اپنا کام مکمل کیا اور پھر اسے نہایت تیزی اور مہارت سے پیک کر کے جھاڑیوں اور پتوں کے ڈھیر میں اس طرح چھپا دیا کہ کسی کو ایک فیصد بھی شبہ نہ ہو کہ یہاں ایک ٹرانسمیٹر چھپا ہوا ہے۔ اپنا کام کر کے جیڈ نے ٹوکری اٹھائی جس میں ساری چیزیں موجود تھیں۔ پھر اس نے لولیتا کا بازو تھاما۔ ”تم کس لیے آئی تھیں؟“

”پھلی لینے۔“ لولیتا نے نیل کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نے لے لی ہے چلو میرے ساتھ...“ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے پستول نہ جانے کہاں چھپا لیا تھا۔

”سنو...“ لولیتا نے کچھ کہنا چاہا۔

”اس بارے میں رات کو بات ہوگی، اب تم اپنے تاثرات درست کر لو، ایسا لگ رہا ہے جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔“

لولیتا کوئی بھوت دیکھ لیتی تب بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو جیڈ کو ایک جاسوس کا کردار ادا کرتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اسے معلوم تھا اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو گیا تو جرمن انہیں ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ اس لیے ان سے سبزی سے پیش آ رہے تھے کہ انہیں نی

الحال ان پر کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ لولیتا نہایت سنجیدہ بیوروکریٹ

رات کا انتظار کر رہی تھی۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور رات

ہوئی۔ وہ عام طور سے آٹھ بجے جرمنوں کو ڈنکر کے فارغ ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد خود کھانے اور صفائی کرنے میں نوبت جاتے تھے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے کمرے میں جاتی تھیں۔ لولیتا نے کھانا بھی مشکل سے کھایا تھا، کمرے میں گھستے ہی اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور جیڈ کو گھسیٹ کر اپنے بیڈ پر لے آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”پلیز مجھے سب بتا دو۔“

”کیا بتا دوں تم نے سب دیکھ لیا ہے اور سمجھ بھی لیا ہے۔“ وہ بولی۔

”نہیں میں جانتا چاہتی ہوں کہ تم نے یہ سب کیسے کیا؟“

جیڈ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ لولیتا اس سے محبت کرتی ہے اور بھی اس سے دغا نہیں کرے گی مگر وہ ایک کمزوری لڑکی تھی اگر کبھی اس پر برا وقت آتا اور اسے جرمن جلا دوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ مزاحمت نہیں کر سکے گی۔ اس لیے اس کا کم سے کم جاننا ٹھیک تھا۔ جیڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نرمی سے بولی۔ ”یہ مت سمجھنا مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ لیکن تمہارے لیے ہر چیز جاننا ضروری نہیں ہے بعد میں کبھی ایسا موقع آیا کہ جب تم سے پوچھ گچھ کی جائے گی تو تم پورے اعتماد سے انکار کر سکتی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

لولیتا نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”اس کا مطلب ہے تم مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی؟“

”بس اتنا سمجھ لو کہ میں شروع سے یہی کام کرتی آئی ہوں اور زخمی قیدی کا روپ دھارنا تاکہ مجھ سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔“

”یہ سامان تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ لولیتا کا اشارہ ٹرانسمیٹر اور پستول کی طرف تھا۔

”بس آگیا۔“ جیڈ نے اسے ٹال دیا۔ ”اب غور سے سنو، تم جان گئی ہو اس لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت بھی پڑے گی۔“

”کیسی مدد؟“

”بعض اوقات تمہیں جرمنوں کی توجہ ہٹانی ہوگی اور اس بات کو چھپانا ہوگا کہ میں فارم میں نہیں ہوں۔ بعض اوقات مجھے کچھ دیر کے لیے جانا ہوتا ہے اور میں بڑی مشکل سے چھپ کر جاتی ہوں۔“

”ہم سبزی اور انڈے لینے بھی تو جاتے ہیں۔“

”لیکن زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آتے ہیں اس سے زیادہ دیر ہو جائے تو جرمن یقیناً ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ مجھے اس سے زیادہ مزید کے لیے باہر

جانا پڑتا ہے۔“

لولیتا سوچ رہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے یہاں دوسرے اتحادی جاسوس یا ان کے ہمدرد ہیں اور تم ان سے ملنے جاتی ہو؟“

جیڈ کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی تھی پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز اب اس موضوع پر کوئی بات مت کرنا یہ بہت رکی ہے۔ کوشش کرو اسے ذہن سے نکال دو اگر غلطی سے بھی تمہارے منہ سے اس بارے میں کچھ نکل گیا تو ہماری موت بہت دردناک ہوگی۔“

یہ سن کر لولیتا سہم گئی تھی۔ اس نے جیڈ سے وعدہ کیا کہ وہ اب پوری طرح محتاط رہے گی اور اس بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالے گی۔ آنے والے چند ہفتوں میں لولیتا کو اندازہ ہو گیا کہ جیڈ کس طرح کام کرتی تھی۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار رپورٹ دیتی تھی۔ اس کے علاوہ کم سے کم ایک بار وہ کئی گھنٹے کے لیے کہیں غائب ہو جاتی تھی، اس میں دن رات کا فرق نہیں تھا۔ دن میں جب وہ جاتی تو لولیتا کو اس کی پردہ پوشی کرنا پڑتی تھی۔ اس وقت لولیتا کی جان پر بن آتی تھی۔ جب تک جیڈ واپس نہیں لوٹ آتی تھی وہ جانتی رہتی اور ڈرتی رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا اگر جیڈ پکڑی گئی تو شریک جرم کی حیثیت سے اسے بھی وہی سزا دی جائے گی جو جیڈ کا مقدر بنے گی۔ ایک رات جیڈ باہر گئی اور صبح سے کچھ پہلے واپس آئی تھی۔ اس رات وہ چھ گھنٹے سے بھی زیادہ باہر رہی تھی۔ لولیتا نے اس سے آتے ہی پوچھا۔ ”تم کہاں رہ گئی تھیں کچھ دیر میں روشنی ہو جاتی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ لولیتا نے سیاہ اور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ”یہ دسمبر کا مہینا تھا اور باہر شدید سردی تھی۔ جیڈ بہت خوش نظر آ رہی تھی اس نے لولیتا سے کہا۔ ”آج میں فارم سے باہر نہیں گئی تھی۔“

”تم اتنی دیر باہر کیا کرتی رہی تھیں؟“

”آج میں نے جان لیا ہے کہ اس فارم کی کیا اہمیت ہے۔“ جیڈ نے جوش سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہاں نازیوں نے لوٹے ہوئے نوادرات چھپا رکھے ہیں۔ ان میں تصاویر اور مجسمے ہیں۔ قدیم زیورات اور سونے چاندی سے بنے نوادرات ہیں۔ قدیم سکے ہیں جن کی مالیت لاکھوں میں ہے۔“

لولیتا حیران ہوئی تھی۔ ”یہ سب کہاں رکھا ہے اور تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”یہ سب آئرن ورکشاپ کے تہ خانے میں رکھا ہے اور مجھے یوں پتا چلا کہ ابھی یہاں کچھ ستان اور آگیا ہے۔“

جیڈ بولی اور پھر نفرت سے کہا۔ ”نازی جنگ ہار رہے ہیں لیکن چوروں کی طرح مال سمٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔“

”اب تم کیا کرو گی؟“

”میں اس کی اطلاع اتحادیوں کو دوں گی۔ یہ یورپ کا تاریخی ورثہ ہے، اس کی حفاظت کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔“ جیڈ نے فیصلہ کیا۔ ”میں کل ہی یہ کام کرتی ہوں۔“

اگلے دن جب جیڈ پہلے ٹوکری اٹھا کر روانہ ہوئی تو اس نے لولیتا سے کہا۔ ”اگر مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ جائے تو تم بھی ٹوکری لے کر آ جاؤ اور اس کے بعد جنگل کے کنارے رہ کر نگرانی کرنا، اگر کوئی جرمن اس طرف آنے لگے تو مجھے خبردار کر دینا۔ تم جانتی ہو میں کہاں ہوتی ہوں۔“

جیڈ چلی گئی اور لولیتا کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ خود بھی جنگل جانے کے لیے باہر نکلی تو اس نے ایک جیب اور ایک چھوٹا فوجی ٹرک فارم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کا دل جیسے رک گیا تھا۔ آنے والا وہی کرنل اور اس کا محافظ دستہ تھا جو انہیں یہاں لایا تھا۔ لولیتا نے جانے کی کوشش کی لیکن کارپول مہینس نے اسے روک لیا۔ ”ابھی کوئی کہیں نہیں جاسکتا۔ اندر جاؤ۔۔۔ جیڈ کہاں ہے؟“

”وہ سبزی لینے گئی ہے۔“

مہینس نے ایک سپاہی کو اشارے سے بلا کر حکم دیا۔ ”جنگل سے جیڈ کو لے آؤ فوراً۔۔۔“

سپاہی روانہ ہو گیا اور لولیتا واپس عمارت میں آ گئی اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ کرنل ورکشاپ میں جا رہا تھا پھر اس کے پیچھے جرمن سپاہی ڈائنماٹ۔۔۔۔۔ سے بھرے بکس اندر لے جانے لگے۔ سیاہ وردیوں میں کچھ لوگ تھے جو اندر گئے۔ لولیتا کی بے چینی نظریں بار بار جنگل کی طرف جاتی تھیں، اسے خوف تھا کہ آج کہیں جیڈ پکڑی نہ جائے لیکن کچھ دیر بعد وہ جانے والے سپاہی کے ساتھ ہنستے اور اٹھلاتے ہوئے واپس آئی تو لولیتا کی جان میں جان آئی تھی اس نے اندر آتے ہی جیڈ سے کہا۔

”بال بال بچے ہیں، میں نکل رہی تھی کہ کرنل آ گیا۔ وہی جو ہمیں یہاں لایا تھا۔“

جیڈ نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور تشویش سے بولی۔ ”وہ ورکشاپ میں گیا ہے۔“

”صرف وہی نہیں ہے بلکہ سپاہی ڈائنماٹ کے بکس لے گئے ہیں اور کچھ افراد ٹیکنیشنز کی وردیوں میں بھی اندر گئے ہیں۔“ لولیتا نے سبزی گائے ہوئے کہا۔

جیڈ خاموش رہی، اس نے ٹوکری سے انڈے لیے اور

سبزی نکال کر میز پر رکھی پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ”مجھے لگ رہا ہے جرمنوں کو بھی احساس ہو گیا ہے وہ جنگ ہارنے والے ہیں اس لیے وہ سب تباہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

لولیتا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”ڈائنماٹ کے بکس۔“ جیڈ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”ان کا اس جگہ کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”یعنی اگر جرمن اس جگہ سے پسپا ہونے لگے تو سب تباہ کر دیں گے؟“

”امکان یہی ہے۔“ جیڈ بولی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ ”یہ بھی ممکن ہے انہوں نے ٹریپ لگایا ہو۔“

”کوئی اور اندر جانے کی کوشش کرے تو دھماکا ہو جائے؟“

”بالکل اس طرح یہاں آنے والے جرمنوں کے دشمن بھی ہلاک ہو جائیں گے۔“

”تم نے پیغام دیدیا ہے؟“

”ہاں اور کل مجھے نیا پیغام بھی دینا ہوگا۔ اسی کی بنیاد پر اتحادی کوئی فیصلہ کریں گے۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”یہی کہ ان نوادرات کو بچانے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ یہاں حملہ کریں گے؟“

”ظاہر ہے اس کے بغیر وہ ان چیزوں اور ہمیں کیسے بچائیں گے؟ جرمن جاتے ہوئے سب تباہ کر جائیں گے جن میں ہم بھی شامل ہیں۔“ جیڈ انڈے توڑ کر پیالے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”اس میں زیادہ وقت نہیں رہ گیا ہے۔ روسی یہاں سے صرف تیس میل دور ڈریڈن پر قابض ہو چکے ہیں جبکہ امریکی اور برطانوی دستے بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔“

لولیتا زیادہ سمجھدار نہیں تھی لیکن اس وقت اسے صورت حال سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے جرمن کبھی بھی یہاں سے جانے اور ہمیں مارنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔“

”بالکل، یہ بھی ممکن ہے یہ کام آج ہی ہو جائے۔“ جیڈ باہر دیکھ رہی تھی جہاں جرمن سپاہی اور ٹیکنیشنز ورکشاپ سے باہر آ رہے تھے۔ جب سب باہر آ گئے تو اس کے دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ کرنل اور اس کے آدی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لولیتا نے اطمینان کا سانس لیا۔

”آج سب گئے۔“

جیڈ نے سر ہلایا۔ ”ہاں لیکن کسی بھی صورت حال کے

لیے تیار رہو۔“

”سنو۔“ لولیتا نے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمیں آج رات یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

جیڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”ہم کیسے جا سکتے ہیں؟ ہمیں یہاں رہ کر آنے والوں کی مدد کرنی ہے، ان کی رہنمائی کرنی ہے۔“

”جب تک وہ آئیں گے یہاں ہماری لاشیں رہ جائیں گی۔“

”اس پر بعد میں بات کریں گے۔“ جیڈ نے کارپول ہینس کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

”تم دونوں کے لیے حکم ہے، اب تم بغیر اجازت اس عمارت سے باہر نہیں جاؤ گی؟“

”اپنے کام سے بھی نہیں؟“ جیڈ نے سوال کیا۔

”کسی بھی کام سے نہیں۔“ ہینس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم پہلے اجازت لو گی اور پھر باہر جاؤ گی۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ایک گھنٹے بعد تیار ملے گا۔“

”ایک آدمی کا کچ وینڈ ٹاور میں پہنچانا ہے۔“

یہ نئی بات تھی اس سے پہلے وینڈ ٹاور میں کسی کو نہیں رکھا گیا تھا۔ ہینس کے جانے کے بعد انہوں نے اس بارے میں بات کی۔ جیڈ کا خیال تھا کہ اب یہاں کی سیکورٹی سخت کر دی گئی۔ وینڈ ٹاور میں گارڈ اسی مقصد کے تحت رکھا گیا تھا۔ لیکن

جب لولیتا اس کے لیے کھانا لے کر گئی تو اس نے وہاں عام کپڑوں میں ایک نوجوان شخص کو موجود پایا۔ اس نے سیاہ

ایس ایس جیکٹ ضرور پہن رکھی تھی لیکن نیچے عام پتلون اور قمیص تھی۔ اس کے پیروں میں لیدر شوز تھے اور ایک طرف

اسٹینڈ پر جدید اسٹائپر اٹل تھی جس پر دو درہن بھی ہوتی تھی۔

اس کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس کی سیاہ آنکھوں میں بہت چمک تھی۔ اس نے لولیتا کا تفصیل سے جائزہ لیا اور

پھر مسکرائے لگا مگر اس نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ ہی لولیتا کو روکا۔ واپس آ کر لولیتا نے جیڈ کو اس کے بارے میں بتایا تو

اس نے کہا۔

”وہ نشانچی ہے... جب جرمن کسی علاقے سے پسپا ہونے والے ہوتے ہیں یا روایتی جنگ نہیں لڑ پاتے تو وہ

ایسے نشانچی بھیج دیتے ہیں جو کہیں چھپ کر دور مار رائلوں سے دشمن سپاہیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ یہ عام طور سے غیر فوجی

لوگ ہوتے ہیں اور ان کا تعلق ہٹلر پوتھ سے ہوتا ہے۔ انہیں صرف نشانے بازی کی تربیت دی جاتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے یہ بالآخر مارے جاتے ہوں۔“

”گے؟“

”ہاں، یہ دشمن کے دس بارہ افراد کو مار دیتے ہیں اور اس کے بعد خود مارے جاتے ہیں۔“

لولیتا لرز گئی، اسے اس خوب صورت نوجوان کا خیال آیا جسے وہ ابھی کھانا دے کر آئی تھی۔ ”یہ تو خودکشی ہے؟“

”پوری جرمن قوم خودکشی کر رہی ہے۔“ جیڈ نے حقیقت بیان کی۔ ”ایک پاگل آمر پوری قوم کو مروادنے

ہے۔“

لولیتا اس سے متفق تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر اسٹائپر جیسے نوجوان کو مرنا نہیں چاہیے۔ ”وہ اس لیے یہاں آیا ہے کہ اگر اتحادی فارم پر حملہ کریں تو وہ انہیں دور سے شوٹ

کر دے؟“

”بالکل، ورنہ وہ فوجی نہیں ہے۔“ جیڈ فکر مند ہو گئی تھی۔

اگلے دن جیڈ اور لولیتا نے جنگل میں جانے کی اجازت طلب کی تو کارپول ہینس نے ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا جو

مستقل ان کے سر پر سوار رہا تھا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر اس طرح موجود رہتا تھا کہ ان پر نظر رکھ سکے۔ اگر بھی لولیتا اور

جیڈ پاس آئیں تو انہیں دھیمی آواز میں بات کرنے کا موقع مل جاتا تھا، وہ اتنی آہستہ بول رہی تھیں کہ سپاہی سن نہیں پا رہا تھا

اسے ویسے بھی ان کی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بے زاری کے عالم میں ڈیوٹی بھگتا رہا تھا اور واپس جا کر اپنے ساتھیوں

کے ساتھ رمی کھیلنا چاہتا تھا۔ واپس آنے کے بعد جیڈ نے لولیتا سے کہا۔ ”اب مجھے رات کو جانا پڑے گا۔“

”پیغام دینے کے لیے؟“

”نش...“ جیڈ نے سرگوشی میں کہا۔ ”اب یہاں ایسی کوئی بات مت کرنا، ممکن ہے انہوں نے ہماری باتیں

سننے کا بندوبست کر لیا ہو۔“

اس کے بعد وہ محتاط ہو گئیں کیونکہ جرمنوں نے ان کی نگرانی سخت کر دی تھی۔ رات کسی وقت جیڈ خاموشی سے باہر

گئی۔ عمارت میں آنے جانے کا ایک ہی دروازہ تھا لیکن جیڈ نے ایک عقبی کھڑکی کو اس طرح کھلنے کے قابل بنالیا تھا کہ بہ

ظاہر اس پر لگے تختے اپنی جگہ موجود ہوتے تھے۔ جب اسے خاموشی سے باہر جانا ہوتا تو وہ اسی کھڑکی سے نکل جاتی اور

سامنے موجود جرمن سپاہی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ جیڈ ایک گھنٹے میں لوٹ آئی۔ اس نے لولیتا کو بتایا۔ ”ممکن ہے کل

مجھے زیادہ دیر کے لیے جانا پڑے کیونکہ مجھے ہدایات بھی حاصل کرنی ہیں۔“

...

وہ بستر میں تھکی اور کھل میں سردیے آہستہ بات کر رہی تھیں جو ان کے کان بھی بہ مشکل سن پارہے تھے۔ آج پہلی بار جیڈ اسے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ جیڈ کا تعلق فرانس سے تھا لیکن اس نے جرمنی کے ایک سائنس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی تھی اس لیے جرمن اور فرانسیسی زبانیں ایک جیسی مہارت سے بولتی تھیں۔ ابھی وہ واپس فرانس گئی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ جرمنی نے فرانس پر حملہ کر دیا اور پھر اس پر قابض ہو گیا۔ جیڈ اس وقت فرانسیسی انسٹی ٹیوٹ جس کے لیے کام کر رہی تھی۔ وہ محب وطن تھی اور اسے اپنے ملک پر جرمنوں کا قبضہ گوارا نہیں تھا اس لیے اس نے حریت پسندوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ جعلی کاغذات کی بنیاد پر وہ اور اس کے ساتھی جرمنی میں داخل ہوئے اور وہاں اتحادیوں کے لیے جاسوسی کرنے لگے۔

لولیٹا نے پوچھا۔ ”تم کن کے لیے کام کر رہی ہو؟“
”اتحادیوں کے لیے۔“

”میرا مطلب ہے امریکا کے لیے یا برطانیہ کے لیے؟“

”دونوں کے لیے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے ہائر فرانس کی انسٹی ٹیوٹ جس نے کیا تھا لیکن جب جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا تو میں برٹش انسٹی ٹیوٹ جس کے لیے کام کرنے لگی۔ بعد میں امریکن نے بھی مجھ سے رابطہ کر لیا۔“

لولیٹا حیران رہ گئی تھی۔ ”تم اتنے عرصے سے کامیابی سے جرمنوں کے درمیان رہ رہی ہو؟“

”پہلے ہمارا پورا گروپ تھا لیکن وہ جرمنوں کے ہاتھ لگ گیا میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگی تھی، اسی کوشش میں زخمی بھی ہو گئی تھی۔ پھر میں نے یادداشت کھونے کی اداکاری کی۔“

لولیٹا نے اسے رشک سے دیکھا۔ ”تم نے بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ میں اتنی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔“

”ایسا نہیں ہے جب وقت آتا ہے اور انسان کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے تو وہ اس کے لیے ہر تکلیف برداشت کر لیتا ہے۔“

”تمہارا مقصد کیا ہے؟“
”یہی کہ میں بہر صورت جرمنوں کی شکست چاہتی ہوں اور اس کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بے شک میرا کردار بہت چھوٹا سا ہے لیکن مجھے فخر ہے جب جرمنی ہتھیار ڈالے گا تو اس میں میرا بھی ایک حصہ ہوگا۔“

”کاش میں بھی تمہاری جتنی بہادر ہوتی۔“

جیڈ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم بہادر ہو، اگر تم بہادر نہ ہوتیں تو اب تک زندہ نہ ہوتیں۔ تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں یہ سب کیوں بتایا ہے؟“
لولیٹا جانتی تھی۔ ”تم اس مشن میں میرا ساتھ چاہتی ہو؟“

جیڈ نے سر ہلایا۔ ”ہمارے لیے آسان کام یہ ہے کہ ایک رات چپکے سے یہاں سے فرار ہو جائیں۔ لیکن اس طرح جرمن اس خزانے کو کہیں اور لے جانے یا تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس میں بہت ساری چیزیں فرانس سے لائی گئی ہیں۔“

لولیٹا افسردہ ہو گئی۔ ”ایسی ہی لوٹ مار انہوں نے میرے وطن میں بھی کی ہے، صرف تاریخی نوادرات نہیں چرائے بلکہ عام لوگوں سے ان کی دولت اور جمع پونجی بھی چھین لی۔ چن چن کر جو ہریوں اور ساروں کو لوٹا ہے۔“

”میں نے سنا ہے جرمن اب شکست کو سامنے دیکھ کر ہیرے جواہرات اور سونے کے ذخائر چھپا رہے ہیں تاکہ یہ اتحادیوں کے ہاتھ بھی نہ لگ سکیں۔“

”ممکن ہے اس خزانے کے لیے بھی ان کا کوئی منصوبہ ہو۔“ لولیٹا نے ورکشاپ میں موجود نوادرات کی طرف اشارہ کیا۔

”مشکل نوادرات کی منتقلی آسان نہیں ہوتی۔ پھر بہ حیثیت قوم اب جرمنوں کو ان سے دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ جنگ جیت جاتے تو فاتح کے طور پر ان نوادرات کو اپنے میوزیمز میں رکھتے لیکن وہ جنگ ہار رہے ہیں اس لیے وہ انہیں تباہ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ یہ فاتحین کے ہاتھ بھی نہ لگ سکیں۔“

سن پینٹا لیس کے آغاز سے ہی واضح ہو گیا تھا کہ جرمن جنگ ہار چکے ہیں۔ اتحادی افواج چاروں طرف سے جرمنی میں داخل ہونے کے لیے پرتول رہی تھیں۔ مسلسل بمباری نے جرمنی کے تمام بڑے شہروں، تنصیبات اور کارخانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ جرمنی کے تمام مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ آنے والے وقت کی گھبراہٹ جلدی فارم میں موجود جرمنوں کے چہروں سے جھلکنے لگی تھی۔ لولیٹا اور جیڈ کے خدشات بڑھ رہے تھے، سب سے بڑا خطرہ تو اس بات کا تھا کہ اچانک ہی جرمن اس جگہ کو تباہ کرنے کا فیصلہ نہ کر لیں، اس صورت میں ان کی ضرورت بھی ختم ہو جاتی اور انہیں کوئی مار دی جاتی۔ جرمن آخری دنوں میں اپنے قیدیوں

کے ساتھ یہی سلوک کر رہے تھے۔ بنا کسی وجہ کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ جیڈ کا مسلسل اتحادی انسٹی ٹیوٹ جس سے رابطہ تھا۔ مارچ کے آخر میں اسے بتایا گیا کہ کسی وقت بھی اتحادی دستہ فارم کی طرف روانہ کر دیا جائے گا اور وہ آنے والوں کی رہنمائی کریں۔ جیڈ فارم سے متعلق ضروری معلومات بھیج رہی تھی اور جیسے ہی کوئی تبدیلی آتی وہ فوراً ٹراسمیٹر سے اطلاع آگے پہنچا دیتی تھی۔ یہ کام وہ اتنی مہارت اور چابکدستی سے کرتی کہ جرمن ابھی تک اس کی نشریات پکڑنے کے باوجود یہ نہیں جان سکے تھے کہ ٹراسمیٹر کہاں سے استعمال ہو رہا ہے۔ مارچ تک اس علاقے میں بیشتر جرمن تنصیبات بمباری سے تباہ ہو چکی تھیں اور اب جرمن اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہاں موجود جاسوسوں پر نظر رکھ سکیں۔ اس کے باوجود جیڈ بہت محتاط تھی اسے معلوم تھا کہ اس موقع پر وہ پکڑی گئیں تو ان کے ساتھ جو ہونا ہے وہ تو ہو گا لیکن جرمن اس خزانے کو بھی فوراً تباہ کر دیں گے۔

مارچ کے آغاز میں اچانک جرمنوں کے رویے میں ان کے لیے تبدیلی آئی تھی، کارپول ہینس نے ان پر سے نگرانی ختم کر دی تھی اور اب وہ اکیلے بھی جنگل کی طرف جا سکتی تھیں۔ لولیٹا کا خیال تھا کہ جرمن ان پر اعتماد کرنے لگے تھے جبکہ جیڈ کی سوچ یہ تھی کہ جرمن شاید ان پر شک کرنے لگے ہیں اور وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے جب وہ جنگل میں جاتیں اور جیڈ ٹراسمیٹر استعمال کرتی تو لولیٹا مستقل آس پاس کی نگرانی کرتی تھی۔ اگر اسے کوئی جرمن سپاہی جنگل کی طرف آتا دکھائی دیتا تو جیڈ کو خبردار کر دیتی۔ مگر اس کا موقع کم ہی آتا تھا۔ جب سے جرمنوں نے نگرانی ختم کی تھی سپاہی جنگل کی طرف بھی کم ہی آتے تھے بلکہ وہ فارم میں بھی کم سے کم نظر آتے تھے اور زیادہ تر اس عمارت میں رہتے تھے جو ان کے لیے مخصوص تھی۔

لولیٹا فکر مند تھی۔ ”جرمن اتنے بے پروا کیوں ہو رہے ہیں؟“

”شاید اس لیے کہ انہوں نے ورکشاپ میں کوئی ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ ان کے سوا کوئی اور اگر اندر جانے کی کوشش کرے گا تو سب تباہ ہو جائے گا۔“ جیڈ نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کرنل اسی کام کے لیے آیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جرمن پورے ملک میں ہر اس تنصیب یا کام کی جگہ کو ڈائنامائٹ کر رہے ہیں تاکہ وہ بعد میں فاتحین کے ہاتھ نہ آسکیں۔“
”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، نازی خود کہاں باقی رہیں

گے جو ان چیزوں کی فکر کر رہے ہیں۔“
”یہ جنگ کرنے والوں کی نفسیات ہوتی ہے جو چیز ان کے کام نہ آ سکے اور ان کے قبضے میں نہ رہ سکے وہ اسے تباہ کر دیتے ہیں۔“

مارچ کے آخر تک موسم سرما تقریباً رخصت ہو گیا تھا اور برف پگھل رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں پر نئے پتے اور کوئلیں نمودار ہو رہی تھیں۔ سرما کے دوران میں سبزی بہت کم ملتی تھی اور زیادہ تر جڑیں ہی ملتی تھیں۔ پیچھے سے سپلائی کم ہوتی جا رہی تھی اور اس میں سے گوشت اور کھن جیسی چیزیں تو نایاب ہی ہو گئی تھیں۔ انہیں زیادہ تر ڈبل روٹی اور سبزیوں یا دالوں پر گزار کرنا پڑتا تھا۔ سپلائی میں کمی ظاہر کر رہی تھی کہ علاقے پر جرمنوں کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے اور وہ شاید برلن کی طرف پسپا ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔

جیڈ جنگل سے ذرا دیر سے آئی، لولیٹا پہلے آگئی تھی۔ لولیٹا بے تاب تھی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ جیڈ نے کیا پیغام دیا ہے اور اسے کیا جوابی پیغام ملا ہے۔ پہلے اتحادی انسٹی ٹیوٹ جس دوسرے طریقوں سے ان تک پیغام پہنچاتی تھی لیکن جب سے جرمنوں کی گرفت کمزور ہوئی تھی وہ اسی ٹراسمیٹر پر اپنے پیغام بھی بھیجنے لگے تھے۔ اس طرح جیڈ کو بروقت ہدایات مل جاتی تھیں۔ انہوں نے سپاہیوں کو بچ دیا وینڈ ٹاور میں موجود اسٹائپر کاچ حسب معمول لولیٹا لے کر گئی تھی۔ اتنے عرصے میں وہ لولیٹا سے مانوس ہو گیا تھا لیکن ان میں صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا تھا کیونکہ اسے جرمن کے سوا کوئی زبان نہیں آتی تھی اور لولیٹا کو جرمن زبان بہت معمولی سی آتی تھی۔ پھر کارپول ہینس کی طرف سے انہیں سخت ہدایت تھی کہ وہ کسی جرمن سپاہی سے بلا ضرورت بات کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔

جیسے ہی وہ بچن کے کاموں سے فارغ ہوئیں اور اوپر آئیں۔ لولیٹا نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ ”کیا ہوا ہے؟“
”وہ آرہے ہیں۔“ جیڈ نے سنسنی خیز لہجے میں سرگوشی کی۔ ”کل وہ رات کے وقت یہاں اتار دیے جائیں گے اور شاید پرسوں رات وہ فارم پر حملہ کریں گے۔“
”حملہ؟“ لولیٹا سہم گئی۔ ”تو کیا وہ ہمیں بھی مار دیں گے؟“

”اس کا بھی امکان ہے کیونکہ وہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ جیڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہمیں ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے اور بہت ضروری ہے کہ وہ جرمنوں کے علم میں آئے بغیر یہاں پہنچ جائیں۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ لولیتا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسنا پھر ہر وقت چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔“ وہ سوتا تو ہوگا؟“

”وہ دن میں دو بار سوتا ہے لیکن ساری رات جاگتا رہتا ہے اس کے پاس رات میں دیکھنے والی دوربین ہے۔ کوئی اس کی نظروں میں آئے بغیر فارم میں داخل نہیں ہو سکتا۔“ لولیتا نے اسے آگاہ کیا۔ ”دن میں جب وہ سوتا ہے تو کوئی دوسرا جرمن اس کی جگہ نگرانی کرتا ہے۔“

جیڈ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”اسے کسی صورت وہاں سے ہٹانا ہوگا ورنہ اس نے پہلے دیکھ لیا تو جرمن شدید مزاحمت کریں گے اور ممکن ہے انہیں خزانہ تباہ کرنے کا موقع مل جائے۔“

”اسے نہیں ہٹایا جاسکتا۔“ لولیتا بولی۔ ”آنے والے ہی جرمنوں سے نمٹ سکتے ہیں، ہم دونوں ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟“

”ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ جیڈ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن یہ تمہیں کل بتاؤں گی کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

لولیتا جیڈ کی طرح مضبوط اعصاب نہیں رکھتی تھی اور نہ اس کے پاس تربیت تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح جیڈ کا ساتھ دے سکتی تھی۔ جیڈ کے پاس پستول تھا اور وہ اسے چلاتا جانتی تھی لولیتا کے پاس تو کوئی ہتھیار تھا اور نہ وہ آتشیں اسلحہ استعمال کرنا جانتی تھی۔ اس نے کچن سے ایک چھوٹی چھری لے کر اپنے لباس میں چھپالی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ اسے استعمال کر سکتی تھی۔ اگرچہ اسے یقین نہیں تھا کہ بھی ایسا موقع آیا تو وہ چھری بھی استعمال کر سکے گی۔ وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ رات ہوئی تو جیڈ پھر باہر گئی وہ لولیتا سے زیادہ مضطرب تھی لیکن ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ یہ اس کے کیرئیر کا سب سے بڑا مشن تھا جو اس کی ناکامی یا کامیابی کی داستان رقم کرتا۔ اسے عزت اور مان دلوانا یا ہمیشہ کے لیے کسی نامعلوم قبر میں دفن کر دینا۔ جب تک جیڈ نہیں آئی لولیتا جانتی رہی تھی۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ لولیتا نے کوٹ اتارتی جیڈ سے پوچھا۔

”میں دیکھنے گئی تھی۔ وہ شمال میں واقع ایک چھوٹے سفیدے کے جنگل میں اتریں گے۔ اگر اس طرف جرمن ہوئے تو وہ انہیں وہیں گھیر کر مار دیں گے۔“

”جرمنوں کو ان کی آمد کا پتا چل جائے گا۔“ لولیتا نے یقین سے کہا۔

”نہیں، انہیں دھوکا دینے کے لیے وہ باقاعدہ فضائی حملہ کریں گے اور اس کی آڑ میں اس دستے کو جنگل میں اتار

دیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ تیس میل کا فاصلہ طے کریں گے اور آنے والی رات یہاں پہنچ جائیں گے۔“

لولیتا حیران رہ گئی۔ ”تم تیس میل دور گئیں... کیسے؟“

”یہاں سے کچھ دور میں نے ایک موٹر سائیکل چھپا رکھی ہے جب مجھے کہیں دور جانا ہوتا ہے تو میں یہ موٹر سائیکل استعمال کرتی ہوں۔“

لولیتا نے پوچھا نہیں لیکن ظاہر تھا اسے یہ موٹر سائیکل اتحادیوں کے مقامی ایجنٹوں نے فراہم کی ہوگی۔ جیڈ تھکی ہوئی تھی وہ لیٹ گئی۔ ”ابھی تک اس علاقے میں کہیں جرمن نہیں ہیں۔“

”وہ ہوں گے لیکن چھپے ہوں گے۔“ لولیتا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب جرمن کھل کر جنگ کرنے کے بجائے چھپ کر حملے کریں گے کیونکہ وہ کھلے میدان میں آنے والی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”تم نے ٹھیک کہا ہے جرمن ایسا ہی کریں گے۔ یہاں بھی وہ انتظار کر رہے ہیں کہ دشمن آئے تو وہ اس پر حملہ کریں۔“ جیڈ نے کہا اور کہتے ہی سو گئی کچھ دیر بعد اس کے ہلکے سے خراٹے گونجے تو لولیتا کو اندازہ ہوا۔ اسے جیڈ پر رشک آتا تھا وہ مشکل ترین حالات میں بھی پرسکون رہتی تھی اور بستر پر لیٹ کر جب چاہتی سو جاتی تھی۔ وہ دو دن بھی جاگتی رہی تھی اور کبھی صرف دو گھنٹے سو کر بھی تازہ دم ہو جاتی تھی۔ اگلا دن انہوں نے معمول کے مطابق گزارا تھا۔ کچن سپلائی ایک ہفتے سے نہیں آئی تھی اس لیے لولیتا کو کھانا بنانے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ضرورت کی معمولی سی اشیاء بھی ختم ہوتی جا رہی تھیں البتہ سپاہیوں کے لیے شراب اور سگریٹوں کا کوٹہ باقاعدگی سے آ رہا تھا اور شاید اسی لیے انہیں اس کی پروا بھی نہیں تھی کہ انہیں کھانے میں کیا دیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے حال میں مگن تھے۔

رات انہوں نے اپنے کام جلد نمٹا لیے تھے۔ جیڈ کمرے میں جاتے ہی سو گئی تھی لیکن اس نے لباس نہیں بدلا تھا۔ اس نے جوتے تک پہن رکھے تھے۔ لولیتا جان گئی کہ اسے باہر جانا ہے۔ لولیتا نے سیزھیوں کا دروازہ بند کر لیا تھا نیچے کچن میں آنے والا دروازہ کھلا رہتا تھا کیونکہ سپاہیوں کو کبھی پانی یا کافی کی ضرورت پڑتی تھی تو وہ کچن تک طے آتے تھے۔ اس سے آگے آنے کی انہیں اجازت نہیں تھی مگر لولیتا اور جیڈ خطرہ مول نہیں لیتی تھیں، وہ سیزھیوں والا دروازہ بند کر لیتی تھیں۔ جیڈ دو بجے انھی اس نے کوٹ پہنا اور لولیتا کی

طرف دیکھا۔

”میں جا رہی ہوں اگر میں روشنی ہونے تک نہ آؤں تو تم بھی یہاں سے نکل جانا اور شمال مغرب کی طرف جانا، تیس میل کے دائرے میں تمہیں امریکی یا برٹش فوجی مل جائیں گے لیکن میرا حوالہ مت دینا۔ اپنے بارے میں سچ بتا دینا اور اس فارم کے بارے میں بھی بتا دینا۔“

”تب مجھے تمہارے بارے میں بھی بتانا پڑے گا۔“

”تم میرے بارے میں بتا سکتی ہو لیکن میری اصل شخصیت کے بارے میں مت بتانا۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

”کام سے۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد لولیتا لیٹ گئی۔ اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ وہ بھی یہاں سے نکل جائے لیکن وہ جیڈ کی ہدایت کے مطابق صبح سے پہلے نہیں جا سکتی تھی۔ اسے روشنی ہونے تک انتظار کرنا ہی تھا۔ صبح چھ بجے تک روشنی ہو جاتی تھی۔ لولیتا نے پانچ بجے لباس تبدیل کرنا شروع کیا تھا کہ جیڈ آگئی وہ کل کی طرح پر جوش لگ رہی تھی اس نے آتے ہی لولیتا کو گلے لگا کر کہا۔

”مبارک ہو وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔“

”یعنی جنگل میں اتر گئے ہیں؟“

جیڈ نے سر ہلایا۔ ”کل رات وہ یہاں ہوں گے۔ چار بجے وہ فارم کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔“

رات کے وقت صرف دو جرمن سپاہی پہرے پر ہوتے تھے۔ ہر چار گھنٹے بعد پہریدار بدل جاتے تھے۔ یہ پہرے دار مسئلہ نہیں تھے کیونکہ جب اتحادی دستہ فارم میں داخل ہو جاتا تب انہیں معلوم ہوتا، اصل مسئلہ وینڈ ٹاور میں موجود اسنا پھر تھا۔ وہ وہاں سے چاروں طرف نظر رکھتا تھا اور اس کے پاس رات میں دیکھنے والی دوربین بھی تھی، وہ لازمی اتحادیوں کو فارم میں داخل ہونے سے پہلے دیکھ لیتا اور پھر وہ دور سے انہیں نشانہ بھی بنا سکتا تھا۔ جیڈ مسلسل سوچ رہی تھی پھر اس نے لولیتا سے کہا۔ ”ہمیں اس کا خاتمہ کرنا ہوگا۔“

لولیتا دہل گئی تھی۔ ”خاتمہ... مگر کیوں... میرا مطلب ہے کیسے؟“

”کبھی کبھی ہم انہیں رات گئے کافی دیتے ہیں۔ آنے والی رات میں اس کے لیے کافی لے کر جاؤں گی اور اسے موت کی نیند سلا دوں گی۔“

لولیتا بے چین ہو گئی۔ ”لیکن پستول کی آواز سے باقی ہوشیار ہو جائیں گے۔“

”میں چاقو استعمال کروں گی۔“

”وہ چست اور طاقتور مرد ہے اگر ہوشیار ہو گیا تو تم کسی طرح اس پر قابو نہیں پاسکو گی۔“

”تم فکر مت کرو۔“ جیڈ کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ”مرد پر کس طرح قابو پایا جاتا ہے یہ مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ چھ سال میں، میں نے کم سے کم ایک درجن جرمن سپاہیوں کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا ہے۔“

لولیتا کے تصویروں بار بار... اسنا پھر کی صورت آرہی تھی۔ بے شک وہ دشمن تھا اور ان کے مشن میں رکاوٹ تھا لیکن اسے اس طرح ہلاک کیا جانا لولیتا کو منظور نہیں تھا۔ جیڈ کچھ دیر بعد سو گئی لیکن لولیتا جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ صبح وہ جلدی اٹھی اس روز ڈبل روٹی اور دوسرے سامان کی سپلائی آئی تھی، سپلائی لینا اس کا کام تھا۔ وہ تیار ہو کر نیچے آئی۔ ڈبل روٹی کے آخری ٹکڑے بچے تھے اور ان سے ہلکی سی بساند آنے لگی تھی بہر حال مکھن کے ساتھ یہ اب بھی کھانے کے قابل تھے۔ جب سات بجے تک سپلائی لانے والے کی موٹر سائیکل نمودار نہیں ہوئی تو اس نے اسی باسی ڈبل روٹی سے سپاہیوں کو ناشا فراہم کر دیا۔

جیڈ اوپر سے آئی، اس نے صرف کافی لی اور ٹوکری اٹھالی۔ اس نے لولیتا کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”تم یہیں رکنا میں چیزیں لے آتی ہوں۔“

لولیتا خود بھی یہی چاہتی تھی۔ جیڈ کے جانے کے بعد اس نے ناشتے کی ٹرے اٹھالی اور وینڈ ٹاور کی طرف چل پڑی۔ اسنا پھر تینوں وقت کا کھانا وہیں کھاتا تھا اور سوائے ضرورت کے وہاں سے باہر قدم نہیں رکھتا تھا۔ لولیتا سیزھیوں چڑھ کر ٹاور کے اوپری حصے میں آئی جہاں اسنا پھر دوربین لیے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لولیتا نے ناشا اس کے سامنے رکھا اور واپس جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گئی۔ اسنا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا تو لولیتا نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے کیا۔ ”میں لولیتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے پہلی بار لولیتا سے کچھ کہا۔ ”میں کارل بارٹفونگ ہوں۔“

”تم کھانے پینے کے شوقین نہیں ہو؟ تم نے کبھی کچھ خود سے نہیں مانگا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں مجھے شوق نہیں ہے۔ مجھے صرف اپنی ماں کے ہاتھ کا کھانا اچھا لگتا ہے۔“

لولیتا نے اس سے ماں کے بارے پوچھا تو وہ اس سے ذرا کھل گیا۔ کارل کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور وہ اس کا

ایک ہی بیٹا تھا۔ اسکول سے وہ ہنٹر پوتھ میں شامل تھا اور چند سال پہلے اسے لازمی خدمت کے قانون کے تحت بھرتی کر لیا گیا۔ لیکن اسے فوج میں نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ اسے نشانے بازی کی تربیت دی گئی اور پھر اسے اور اس کے گروپ کو مقبوضہ علاقوں میں بھیج دیا گیا جہاں وہ محاذ کے پاس رہ کر دشمن سپاہیوں کو نشانہ بناتے تھے۔ جواب میں اتحادی فوج نے بھی یہی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ جب جنگ کا دائرہ جرمنی کی طرف سمٹنے لگا تو کارل اور اس کے ساتھیوں کو بھی واپس بلایا گیا اور انہیں جرمنی میں ہی مختلف جگہوں پر بھیجا جانے لگا۔ پانچ مہینے پہلے کارل کو یورپ سے بلا کر جولائی فارم بھیج دیا گیا اور وہ حیران تھا کہ اس کا یہاں کیا کام تھا کیونکہ دور دور تک کوئی دشمن نظر نہیں آ رہا تھا اور پانچ مہینے سے اس نے ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔ لولیتا، جیڈ کے آنے سے پہلے وہاں سے اٹھ گئی۔

جیڈ کے آتے ہی اس نے کھانا تیار کیا، سپاہی اصل میں دن میں کھاتے تھے اور رات کو بھی انہیں یہی کھانا گرم کر کے دیا جاتا تھا۔ یعنی انہیں ایک ہی وقت کھانا بنانا پڑتا تھا۔ مگر دن میں برتن بہت جمع ہو جاتے تھے۔ انہیں بار بار دھونے کے لیے لے جانا پڑتا تھا۔ یہاں کچن میں برتن دھونے کا بندوبست نہیں تھا پھر انہیں روزانہ ایک دو وردیاں بھی دھونی پڑتی تھیں۔ کچن کے لیے پانی بھر کر لانا پڑتا تھا۔ کام کم نہیں تھے۔ وہ صبح سے شام تک مصروف ہی رہتی تھیں۔ اس روز بھی انہیں اکٹھی چار وردیاں مل گئیں۔ انہوں نے طے کیا کہ جب جیڈ برتن دھونے جائے گی تو لولیتا اس کے ساتھ ہی یہ وردیاں بھی دھولے گی۔ ونڈ ٹاور نہر کے کنارے ہی تھا۔ جیڈ نے کہا۔ ”یہ نوجوان ہے اور آسانی سے قابو میں آجائے گا۔“ لولیتا نے سر ہلایا، اس نے کچھ کہا نہیں تھا، اسے لگ رہا تھا کہ جیڈ اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھی اور بار بار اسی لیے یہ ذکر چھیڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لولیتا نے کہا۔ ”فرض کرو اگر تم نے اسے مار دیا اور اتحادی پھر بھی یہاں نہ پہنچ سکے تو کیا ہوگا؟“

”اس صورت میں ہمیں صبح سے پہلے یہاں سے نکلنا ہو گا۔“ جیڈ بولی۔ ”لیکن ایسا ہو گا نہیں، وہ دستہ یہاں پہنچ جائے گا اس طرف جرمن نہیں ہیں، وہ زیادہ تر روسیوں سے لڑنے میں مصروف ہیں۔ ان کے خیال میں ابھی امریکی اور برٹش یہاں نہیں آئے ہیں۔“

رات کے کھانے کے بعد جیڈ نے کارپول مینس سے کہا۔ ”آج بہت تھک گئے ہیں اس لیے کافی دیر سے بناؤں گے۔“

”کوئی بات نہیں تم لوگ آرام کرو، ہم خود بنالیں گے۔“

”نہیں... نہیں ہم بنا دیں گے۔“ جیڈ نے جلدی کر کہا۔ ”بس کچھ دیر آرام کریں گے۔“

کارپول مینس مان گیا تو جیڈ نے سکون کا سانس لیا۔ اگر وہ انہیں منع کر دیتا تو ان کے لیے باہر نکلنا اور ونڈ ٹاور تک جانا ممکن نہ رہتا۔ وہ اوپر آئیں۔ جیڈ نے کہا۔ ”دستہ فارم کے پاس پہنچ گیا ہو گا لیکن وہ اندر اس وقت آئیں گے جب انہیں ونڈ ٹاور سے اشارہ ملے گا۔“

”کیسا اشارہ؟“

”ٹارچ سے روشنی کر کے اشارہ دینا ہوگا۔“

”اور یہ اشارہ سپاہیوں نے دیکھ لیا تو...؟“

”یہ خطرہ مول لیتا پڑے گا۔“ جیڈ بولی۔ ”میں اپنا کام کر کے وہیں رک جاؤں گی۔ چار بجے اشارہ دوں گی۔“

”سنو میری ایک بات مانو گی؟“ لولیتا نے اچانک کہا۔ ”یہ کام مجھے دیدو۔“

جیڈ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں... تم کر لو گی؟“

”ہاں میں کر لوں گی۔“ لولیتا نے پختہ لہجے میں کہا۔ ”بہتر ہو گا تم جا کر دستے کی رہنمائی کرو، میری طرف سے اشارہ ملتے ہی تم انہیں فارم تک لے آؤ گی۔ تمہاری رہنمائی میں وہ زیادہ آسانی سے اپنا کام کر سکیں گے۔“

لولیتا کی دلیل نے جیڈ کو قائل کر لیا لیکن اس کو شبہ تھا کہ وہ اسنا پھر قتل کر سکے گی۔ لولیتا نے کہا۔ ”میں یہ کام زیادہ آسانی سے کر سکوں گی کیونکہ وہ مجھ سے مانوس ہے اور شاید مجھے پسند بھی کرتا ہے۔“

جیڈ نے سر ہلایا اور چھوٹا سا تیز دھار چاقو اس کے حوالے کر دیا۔ ”ٹھیک ہے لیکن یہ یاد رکھنا کہ اگر وہ بچ گیا تو ہمارا مشن ناکام ہو جائے گا اور ہم سب ہی مارے جائیں گے۔“

لولیتا اور جیڈ بارہ بجے کے قریب پہنچ آئیں۔ انہوں نے کافی تیاری کی۔ جیڈ نے جا کر سپاہیوں کو کافی دی جبکہ لولیتا کارل کے لیے کافی لے کر جانے لگی۔ جیڈ اس وقت واپس آ رہی تھی، اس نے لولیتا کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔ کچن والی عمارت کے سامنے موجود سپاہی بھی کافی نوشی کے لیے چلا گیا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی اب اس کی جگہ دوسرا سپاہی آتا۔ اس دوسرے سپاہی کو معلوم نہیں تھا کہ لولیتا اور جیڈ واپس آئی ہیں یا نہیں۔ لولیتا اوپر ٹاور میں آئی۔ کارل حسب معمول اپنی

ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے کافی لے کر لولیتا کی طرف دیکھا مگر وہ واپس نہیں گئی تھی۔ وہ آج کسی اور ہی ارادے سے آئی تھی۔

☆☆☆

جیڈ محتاط قدموں سے جنگل میں گھوم رہی تھی۔ اس نے خود کو نمایاں رکھا تھا تاکہ وہاں کوئی موجود ہو تو اسے دیکھ لے لیکن وہ آہٹ پیدا کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ ایک جگہ اچانک تین مسلح فوجیوں نے اسے گھیر لیا، اس نے ہاتھ سر پر رکھ لیے، وہ اتحادی فوجی تھے۔ انہوں نے اس کی تلاشی لی اور پستول برآمد کر لیا پھر اس کی شناخت پوچھی۔ جیڈ نے اپنی شناخت بتائی اور جب اس سے مخصوص کوڈ ورڈز کہے گئے تو اس نے جوابی کوڈ ورڈز دہرائے۔ اسے گرفتار کرنے والے مطمئن ہو گئے، ان کے کمانڈر نے جیڈ سے کہا۔

”تم یہاں کیوں آئیں، تمہیں فارم میں ملنا تھا؟“

”میں تمہاری رہنمائی کے لیے آئی ہوں اس جگہ کو میں بہتر جانتی ہوں، میری ساتھی ونڈ ٹاور میں موجود اسنا پھر قتل کر کے سگنل دے گی، اس کی بعد ہمیں فارم میں داخل ہونا ہے۔“

کمانڈر کو منصوبے کا علم تھا۔ اس کے ساتھ درجن بھر کمانڈوز تھے اور یہ سب اسپیشل گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے جنگل میں داخل ہو کر خود کو چھپا لیا تھا۔ چار بجے سے ذرا پہلے جیڈ اکیلی اس جگہ تک آئی جہاں سے ونڈ ٹاور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے روشنی کے سگنل کا انتقال تھا۔ ٹھیک چار بجے ٹاور سے ٹارچ کی روشنی جلتی بھتی دکھائی دی۔ تین بار جل کر وہ بجھ گئی۔ جیڈ فوراً دستے کے پاس آئی۔ ”تیار ہو جاؤ، ہمیں فارم میں داخل ہونا ہے سب سے پہلے سپاہیوں پر قابو پانا ہے۔“

کمانڈوز کے پاس سائنلر لگے ہتھیار تھے، انہوں نے جیڈ کی رہنمائی میں اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پھر سے پر موجود سپاہیوں کو نشانہ بنایا۔ یہ کام خاموشی سے ہو گیا۔ جیڈ نے سپاہیوں کی رہائش کی نشان دہی کی اور خود ونڈ ٹاور کی طرف آئی۔ دبے قدموں سے بڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آئی تو لولیتا ایک طرف دیوار سے لگی بیٹھی تھی اور سامنے کارل چت لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ شراب کی خالی بوتل بتا رہی تھی کہ اس کے سر پر ڈھول بھی بجایا جاتا تو اس کی نیند نہ ٹوٹتی۔ جیڈ نے لولیتا کا جائزہ لیا اور سمجھ گئی کہ اس نے کس طرح کارل کو اپنی ڈیوٹی سے غافل کر دیا تھا۔

☆☆☆

پانچ سال بعد جیڈ اپنے برطانوی شوہر کے ساتھ جولائی فارم میں داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اسی دستے کا کمانڈر تھا جس

نے جولائی فارم پر حملہ کر کے نو دہائیوں کے خزانے کو محفوظ رکھا تھا۔ مشن نہایت کامیابی سے مکمل ہوا تھا اور اس کے تمام سپاہی محفوظ رہے تھے۔ انہوں نے کارل کو گرفتار کر لیا تھا۔ جیڈ اور لولیتا اتحادیوں کے قائم کیے ہوئے پناہ گزین کیمپ میں بھیج دی گئی تھیں جہاں سے جیڈ برطانیہ روانہ ہو گئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد جب جاسوسوں کے اعزاز میں تقریب ہوئی انہیں انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا تو جیڈ کا نام بھی اعزاز پانے والوں کی فہرست میں شامل تھا۔ برطانیہ میں کمانڈر ریکل برنگھم اس کا میزبان تھا اور بعد میں انہوں نے شادی کر لی۔ جیڈ نے برطانیہ میں رہائش اختیار کر لی۔

پانچ سال بعد اسے جرمنی سے ایک دعوت نامہ ملا جس میں اسے جولائی فارم میں آ کر گرمیاں گزارنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن دعوت دینے والے کا نام نہیں لکھا تھا۔ کیل سے مشورہ کر کے جیڈ نے دعوت نامہ قبول کر لیا اور جوابی خط سے مطلع کر دیا کہ وہ کس تاریخ کو وہاں آ رہے تھے لیکن جب وہ جولائی فارم میں داخل ہوئے تو جیڈ دنگ رہ گئی تھی۔ یہ پانچ سال پہلے والے تباہ حال فارم سے بالکل مختلف تھا اور اس کے داخلی راستے پر لولیتا فارم کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ فارم کی پرانی عمارتیں اور ورکشاپ مسمار کر دی گئی تھی اب ان کی جگہ ایک خوب صورت دو منزلہ مکان اور نہر کے کنارے جدید قسم کا ونڈ ٹاور لگا تھا جو نہر سے پانی اٹھا کر کھیتوں کو فراہم کر رہا تھا۔ نہر کے پاس والا جنگل پہلے کی طرح بے ترتیب نہیں رہا تھا، اس میں اضافی درخت اور جھاڑیاں کاٹ کر اسے باقاعدہ شکل دی گئی تھی اور اس کے درمیان میں راستے بنا دیے گئے تھے۔ نہروں کے کنارے پختہ تھے اور مکان کے ڈرائیو دے میں ایک کار اور ایک پک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ ان کی گاڑی وہاں رکی تو اندر سے لولیتا بھاگتی ہوئی آئی اور جیڈ کے گلے لگ گئی۔ پھر اندر سے ایک جوان مرد نکلا جس نے دو جڑواں بچوں کو اٹھا رکھا تھا۔ جیڈ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا وہ کارل تھا۔ اور مسکرا رہا تھا۔

چند سال پہلے کی جنگ اور دشمنی اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ چار مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اب ایک تھے۔ وہ رشتوں اور دوستی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ جنگ نے ان سے ان کے پرانے رشتے اور گھر چھین لیے تھے لیکن اب انہیں نئے رشتے اور نئے گھر مل گئے تھے۔ ان کا ماضی ضرور بد صورت تھا لیکن حال اور آنے والا مستقبل یقیناً خوب صورت تھا۔

☆☆☆

پانچ سال بعد جیڈ اپنے برطانوی شوہر کے ساتھ جولائی فارم میں داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اسی دستے کا کمانڈر تھا جس

نے جولائی فارم پر حملہ کر کے نو دہائیوں کے خزانے کو محفوظ رکھا تھا۔ مشن نہایت کامیابی سے مکمل ہوا تھا اور اس کے تمام سپاہی محفوظ رہے تھے۔ انہوں نے کارل کو گرفتار کر لیا تھا۔ جیڈ اور لولیتا اتحادیوں کے قائم کیے ہوئے پناہ گزین کیمپ میں بھیج دی گئی تھیں جہاں سے جیڈ برطانیہ روانہ ہو گئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد جب جاسوسوں کے اعزاز میں تقریب ہوئی انہیں انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا تو جیڈ کا نام بھی اعزاز پانے والوں کی فہرست میں شامل تھا۔ برطانیہ میں کمانڈر ریکل برنگھم اس کا میزبان تھا اور بعد میں انہوں نے شادی کر لی۔ جیڈ نے برطانیہ میں رہائش اختیار کر لی۔

پانچ سال بعد جیڈ اپنے برطانوی شوہر کے ساتھ جولائی فارم میں داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اسی دستے کا کمانڈر تھا جس



زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بھروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گفتگو

انوار صدیقی

بارہویں قسط

***** گزشتہ اقساط کا خلاصہ *****

سنگول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا حلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ بھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو ذہنی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعا میں لیس، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ قام دراز قد شخص پر تاب بھونچ کر برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیوٹلا جس میں سٹکی کے گندے عمل والی جان لیوا سونیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے



کے باوجود خدا کا نام لے کر غیو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان وہاں ہی کے لیے رکشائیں لے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی جھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود جھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں مجوسی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چنگی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو تختہ تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چنگی کا ذرہ بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چنگی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دو چار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سینٹ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سینٹ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سینٹ عثمان کا رو باری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور اندر رو لڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی ”بلیک ٹائیگر“ تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی اندر رو لڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوڈا، مالوچن اور سیام قائم ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتری ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گتہ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کر کے اس کی مغرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے مخالفین کو بھی زیر کرنے کی خاطر سازشوں کے جال بٹاتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فریمین کو بھی اغوا کرنا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آ جاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آ جاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالتور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے اثر و رسوخ مرکز تک تھے جس کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ آفیسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماندار آئی جی عظیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منصور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کانٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی عظیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے ذباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی مبائیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ چکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قاتل کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غنڈے الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب مبائیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انکسپکٹر دال جس کے پاس مبائیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زر خرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے معاملے کو دال سے سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی فہمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سینٹ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوئی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی کوئی کی انکسپکٹر میں لیاقت حسین اور فریمین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کر لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پر تاب بھوشن جو شعلی کا ماہر تھا، اپنے نیپو والے ٹیل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور جہانگیر بٹ باہر ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکرٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک ہنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو بے درپے دو ہنگلے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر لودھی کو معطل کر دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوڈا شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ”بلیک ٹائیگر“ کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھوٹا ثابت ہوتی ہے۔ سراج جولیا لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود متاثر دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سینٹ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق بڑی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا سننے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چونکا ہے جو اس کے ایک آگیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور اس نووارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے

اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کنول پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق سبجکٹ کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلاب کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔

*** اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے ***

شیخ حامد نے پوش علاقے کے اس ون یونٹ ہنگلے تک پہنچنے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہنگلے پر پہنچنے کے بعد ہی اس نے قاضی اور دو گواہوں کو بھی طلب کر لیا۔ کنول سے اس کی شادی کی رسم شخص تین آدمیوں کی موجودگی میں ادا ہوئی پھر وہ تینوں رخصت ہو گئے۔ کنول کو اس کی ماں نے دعاؤں سے نواز کر پہلی منزل پر اس کے جملہ عروسی تک پہنچا دیا۔ اس خوشی کے موقع پر بھی اس کے متا بھرے دل میں لاکھوں حسرتیں تڑپ رہی تھیں۔ وہ بیٹی کو صدق دل سے دعا دے رہی تھی۔

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم و آباد رکھے۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ اللہ تمہیں زندگی کی تمام خوشیاں نصیب کرے۔“

”ماں.....“ کنول نے ماں کی پلکوں پر لرزتے آنسو دیکھے، ان میں خوشی کی جگہ ایک عورت کی بے بسی اور بے چارگی شامل تھی۔ ”کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ میں باقاعدہ نکاح میں آنے کے بعد.....“ وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کی مدد اور پر والا کرتا ہے میری بچی۔ خدا تمہارے نصیب اچھے کرے۔“

ایک طرف ماں بیٹی خوشیوں کی آس میں ایک دوسرے کو تسلی دے رہی تھیں، دوسری جانب شیخ حامد موبائل پر کسی کو مدھم لہجے میں ہدایت دے رہا تھا۔

”کام ہوش سے کرنا۔ تینوں میں سے کسی ایک کا زندہ رہنا بھی تمہاری موت ہوگا لیکن..... حادثہ اس طرح پیش آئے کہ کسی کو شک نہ ہو اور ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے۔“

”ایسا ہی ہوگا باس۔“ دوسری طرف سے جواب ملا۔

”ہم کیا کام نہیں کریں گے۔“

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟“

”ہمیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ کرید کرنا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“

”گڈ.....“ شیخ حامد نے کہا پھر احتیاطاً اس گاڑی کا نمبر، ماڈل اور کلر بھی بتا دیا جو اس نے کسی ذریعے سے کرائے پر حاصل کر رکھی تھی۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد وہ اوپر جانے والا زینہ طے کر رہا تھا جب اس نے کنول کی ماں کو

کمرے سے نکلے دیکھا۔

”مجھے بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اس نے کنول کی ماں کا راستہ روک کر ڈھٹائی سے درخواست کی۔

”خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔“ کنول کی ماں نے بھی

میں بند ایک مردانہ انگلی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کنول کے علاوہ یہ انگلی بھی میرے مرحوم شوہر کی یادگار ہے جو میں اس خوشی کے موقع پر آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔“

”ایک درخواست مجھے بھی کرنی ہے۔“ شیخ حامد نے انگلی کو تحارت سے جیب میں ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”نی الحال میں اس شادی کو دوسروں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ کاروباری وجوہات درپیش ہیں۔“

”کنول مجھے بتا چکی ہے۔ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔“ وہ کترا کر ذل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی نیچے آگئی۔

شیخ حامد فاتحانہ انداز میں جملہ عروسی میں داخل ہوا جہاں کنول سٹی سنبھائی بیٹھی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ کنول کے قریب آ کر اس کا گھونٹ پلٹتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

”میں نے جو کہا تھا وہ وعدہ پورا کر دیا۔ اب تمہاری باری ہے۔“

کنول نے نظریں اٹھا کر شیخ حامد کو دیکھا۔ نشے کے خمار سے اس کی آنکھیں بھی نشیلی ہو رہی تھیں۔ ”میں آپ کی شکر گزار ہوں جو آپ مجھے عزت سے حاصل کر رہے ہیں۔“

”یہ عزت تمہیں اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک تم مجھ سے وفادار رہو گی۔“

”وفاداری سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ شیخ حامد نے کنول کے باور قریب ہو کر کہا۔ بیڈ سوچ کے ذریعے اس نے تیز روشنیاں گلے کیں تو کمرے کا ماحول اور بھی خواب ناک ہو گیا، وہ تکلفات کا عادی نہیں تھا اس لیے کنول نے بھی کسی مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا، خود کو پوری طرح اس کے حسب مشا اس کے حوالے کر دیا۔ شیخ حامد کھیلنے کا عادی تھا اس لیے بہت جلد اپنے اصلی رنگ میں آ گیا۔

باسر مولا دھار بارش بری تھی۔ اندر پرفیسر صاحب ایک کتاب پڑھنے میں متفرق تھے۔ اچانک بوی نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بی۔ تو میں گھوم رہی ہے۔“

”اے بی؟“ انھوں نے کتاب کے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ بی کو باسر پھینک آئیے معلوم ہوتا ہے آپ کے میری بات نہیں سنی۔ بی ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔“

”بی ابھی تک کمرے میں موجود ہے؟ تعجب ہے۔ میں تو اسے باسر پھینک آیا تھا۔ پھر مگر گھبرا کر بولے۔“ ذرا دیکھنا تو بے بی پچھوئے میں ہے یا نہیں؟“

ڈاکٹر سے منے کے بعد ہی واپس بھی آگئے۔ کوئی نہ کوئی اہم بات تو ضرور ہوگی۔“

”بہت صبر کر لیا امداد علی۔“ جگا نے بل کھا کر کہا۔

”اب منہ چھپا کر بیٹھنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ کتے زیادہ بھونکنے لگیں تو ان کے گلے میں کمیٹی والے بھی آکر فٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔“

”بس میرے کہنے سے دودن اور صبر کر لے۔ اس کے بعد ہم دونوں بھی مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو جائیں گے۔“

امداد علی نے رابطہ منقطع کر دیا تو جگا بے چینی سے ٹپٹنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سراج سے مل کر اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ ذہن کے ایک گوشے میں شیخ حامد کی مناسب گوش مالی کا دھیان بھی کلبلارہا تھا۔

”تمہارے یار نے کیا خبریں سنائی ہیں استاد.....؟“

جگا کے ساتھیوں نے دریافت کیا۔ جواب میں جگا نے مختصر تفصیل دہرائی تو ایک ساتھی نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

”استاد اگر برانہ مانو تو ایک مثال میں بھی سنا دوں؟“

”کیا.....؟“ جگا نے اسے سپاٹ نظروں سے دیکھا۔

”جب تک تم کسی کی ماں کے ساتھ یا رانہ نہیں گانٹو گے وہ تمہیں باپ بھی نہیں بولے گا۔“

جگا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سراج کی خیریت معلوم کرنے کی دھن اسے بدستور بے چین کر رہی تھی۔

❖❖❖

دارا اس وقت ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اسے مجبر عاطف کی کال ریسو ہوئی۔ کمرے میں دارا کے سوار دشا بھی تھی اس لیے دارا نے چونکے بغیر دوستانہ انداز میں کال ریسو کرتے ہوئے کہا۔

زیب بھی تھے، وہ بال بال بچ گئے۔ سراج صاحب کی بھی قسمت اچھی تھی کہ بعد میں کی جانے والی دھواں دھار فائرنگ سے ان کا ایک بازو معمولی زخمی ہوا ہے، فی الحال انہیں پولیس اسپتال میں رکھا گیا ہے۔“

”اس واردات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“ جگا نے تھملا کر دریافت کیا، اس کے چہرے پر خون کی گردش بتدریج بڑھ رہی تھی۔

”ابھی اس کا کھوج نہیں ملا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نشانہ کون تھا۔“ امداد علی نے وضاحت سے کہا۔ ”اطلاع کے مطابق دو پارٹیاں ٹکرائی تھیں، ایک کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ پولیس کے سادہ لباس والے بھی ہو سکتے ہیں۔ نیا ایس بی بھی اونچی پہنچ والا بندہ ہے، اس کی بڑے شیخ سے اسی دن ٹھن گئی تھی جب اس نے شیخ کی بیگم کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی کو ٹھکانے لگانے کی خاطر جال بنا گیا ہو۔ سراج صاحب مفت میں لیٹے میں آگئے ہوں۔“

”پانی اب سر سے اونچا ہونے لگا ہے میرے یار۔“

جگا نے گڑے ہوئے انداز میں کہا۔ ”شیخ کو اب بغدادی قاعدہ پڑھانا ضروری ہو گیا ہے۔ تو نے نہ روکا ہوتا تو شاید میں.....“

”ابھی جلدی مت کرنا.....“ امداد علی نے بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک دودن اور صبر کر لے۔ میں اندر کی خبریں نکال رہا ہوں، کچھ اور حال احوال معلوم ہو تو پھر دھڑنگ تختے کا پروگرام بھی بنالیں گے۔ میں بھی تیرے ساتھ ہوں گا۔“

”کتے کی دم کی کیا خبر ہے.....؟“ جگا نے نفرت سے دریافت کیا۔

”جب تک نکل نہ فٹ کی مٹی ٹیڑھی ہی رہے گی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ سراج صاحب کو پولیس اسپتال میں کب تک رکھا جائے گا؟“

”یقین سے نہیں کچھ کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے ضروری مرہم ہٹی کے بعد کسی بڑے اسپتال میں داخل کر دیا جائے لیکن تو خاص طور پر سراج صاحب کے لیے کیوں بے چین ہے؟“

”ان کا ایک احسان ہے ہمارے اوپر..... وہ چمکا کرنا ہے۔“ جگا نے کہا پھر بات بدل کر پوچھا۔ ”دونوں افراد کہاں گئے تھے..... میرا مطلب ہے کہ حادثے سے پہلے کہیں نہ کہیں تو گئے ہوں گے۔“

”سنا ہے وہ ایک نجی اسپتال ہی گئے تھے لیکن بڑے

”گھٹنے ٹیک دینے والی بات پھیلی تو دوسرے اڈے پاڑے والے بھی چھاتی نکالنے کی کوشش کریں گے۔“

”ٹھنڈا کر کے کھانے کی عادت ڈالو.....“ جگا کسمسا کر بولا۔ ”گرم گرم نوالے لینے سے منہ بھی جل سکتا ہے۔ میں نے جو خاموشی اختیار کی ہے اس کی کچھ وجہ ہے..... بات کھل کر صاف ہو جائے تو میں دیر بھی نہیں کروں گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی..... ہم نے تمہارے ساتھ جینے مرنے کا عہد کیا ہے تو پھر تمہاری کسی مصلحت کے آڑے آنے کی غلطی بھی نہیں کریں گے۔“

جگا کوئی معقول جواب سوچ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر دائرہ روشن ہوئی۔ اسکرین پر روشن ہونے والا نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”کوئی نئی خبر.....؟“

”اس وقت کہاں ہو.....؟“ دوسری جانب سے امداد علی کی آواز ابھری۔

”کچی آبادی نمبر تین کے ٹھکانے پر..... اس وقت کیسے فون کیا؟“ جگا نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”کچھ اچھی بری خبریں ملی ہیں۔“ سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”خودکشی کرنے والے کا نام ہاشم تھا۔ پوسٹ مارٹم کے وقت اس کے چہرے کے میک اپ کا بھرم بھی مٹ گیا۔“

”وہ..... وہ خودکشی نہیں کر سکتا۔“ جگا نے بڑے یقین و حیرت سے کہا۔ ”بڑا مرد آدمی تھا۔ کسی نہ کسی نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔“

”تمہارا دھیان کدھر جاتا ہے؟“

”وہی حرام کا بیج جس کا نمبر دن گولی مار کر جہنم رسید کر دیا گیا تھا۔ میں نے تم سے اسی پر شبے کا اظہار بھی کیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ ٹھیک ہو..... میرے تجربے بتایا ہے کہ کمرے سے سوائے اس کے اور جن لوگوں کے فنگر پرنٹ ملے ہیں وہ سب پرانے ہیں اور گیسٹ ہاؤس میں کام کرنے والوں ہی کے ہیں۔“

”اور کیا خبر ہے؟“

”ایک گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔ ایک اسپتال کے قریب والی سڑک پر تیرے سراج صاحب کی کار اٹلتے اٹلتے رہ گئی۔“ امداد علی نے بات جاری رکھی۔ ”شکر ہے کہ دھماکا کچھ دور ہوا ورنہ گاڑی بھی لپیٹ میں آ جاتی۔“

”سراج صاحب تو خیریت سے ہیں۔“ جگا نے بے چینی سے سوال کیا۔

”گاڑی میں سراج صاحب کے ساتھ ایس بی اور رنگ

شیخ حامد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس وقت کوئی کمرے کی چھت پر اوندھا لیٹا روشن دان کے ذریعے ٹائٹ لینس والے پاور فل اور حساس مختصر سے مووی کیمرے کے ذریعے اس بیجانی کھیل کے ایک ایک لمحے کی منظر کشی کر رہا ہوگا جس نے وہاں تک پہنچنے کے لیے اپنے کئی ساتھیوں سے مدد لی تھی جو تھوڑی تھوڑی دور تک شیخ حامد کی گاڑی کا تعاقب اپنی کار اور موٹر سائیکلوں پر کرتے رہے تھے اور جملہ عروسی کی اس چھت تک پہنچنے والا کتنے مکانوں کی چھتوں سے گزر کر وہاں تک پہنچا تھا۔ جوزیرو، زیرو، ون فور کے کوڈ کے حوالے سے ملٹری کمانڈوز کا سب سے ذہین آدمی سمجھا جاتا تھا۔

❖❖❖

جگا اس وقت کچی آبادی کے ایک مکان میں اپنے دو خاص آدمیوں کے ساتھ بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی دوسرے کمرے میں تھے۔ اس وقت رات کے دوپہر گزر چکے تھے، اس مکان میں آئے انہیں بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا تھا۔ تینوں افراد کے چہرے پر کبھی سنجیدگی مسلط تھی۔

”استاد.....“ ایک ساتھی نے جگا کو مخاطب کیا۔ ”آخر ہم کب تک اس طرح ٹھکانے بدلتے رہیں گے۔ ہماری روپوشی کو دشمن ہماری کمزوری اور بزدلی سمجھ کر اور شیر ہو سکتا ہے۔“

”تمہارے پاس جاں نثروں کی کمی بھی نہیں ہے۔“ دوسرے نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا ایک اشارہ بھی کافی ہے۔ ہم دشمن کو اس کے گھر میں گھس کر بھی جہنم رسید کرنے میں دریغ نہیں کریں گے۔“

”سب ہی تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔“ پہلے نے بے جگری سے دوسرے کی تائید کی۔ ”تم صرف دشمن کا نام اور ٹھکانا بتا دو۔ باقی کام ہم نمٹا دیں گے۔ ایسا چوکھا کام کریں گے کہ رے نام اللہ کا.....“

”مجھے تم لوگوں کی زندگی اپنے سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے علاوہ میں زیادہ کشت و خون کا بھی عادی نہیں ہوں۔“

جگا نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”کھی اگر سیدھی انگلیوں سے نکل آئے تو.....“

”تم مثال دینے میں غلطی کر رہے ہو استاد۔“ دوسرے نے صحیح کی۔ ”سیدھی انگلیوں سے کھی نہیں نکلتا، انگلی ٹیڑھی کیے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ خالی پہلی انگلی گھسی میں ڈبوئے سے گناہ بے لذت والی بات ہوتی ہے۔“

”ہم ہمیشہ کھڑا کھیلے آئے ہیں استاد..... اس بار تمہاری مصلحت ہمارے پلے نہیں پڑ رہی..... ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں صرف تخت یا تختے کی بات کی جاتی ہے.....“

”خیریت..... آج صبح ہی صبح کیسے یاد آگئی؟“
 ”آئی سی.....“ دارا کا جواب سن کر عاطف نے سوال کیا۔ ”کیا روشنا بھی کہیں قریب موجود ہے؟“
 ”ہاں..... وہ شکایت بھی کر رہی تھی کہ تم نے بہت عرصے سے آؤٹنگ کا کوئی پروگرام نہیں بنایا۔“ دارا نے پھر بے تکلفی سے بات بنائی۔
 ”اوکے۔ تم دفتر پہنچ کر فون کر لینا، تمہارے مطلوبہ شخص کے بارے میں کچھ اہم بات سامنے آئی ہے۔“
 ”یہ تمہارا اور روشنا کا معاملہ ہے۔ ہاں، وہ میرے قریب ہی موجود ہے، میں فون اسی کو دے رہا ہوں۔“ دارا نے روشنا کو قریب بلاتے ہوئے کہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”عاطف کا فون ہے۔ کہیں آؤٹنگ کا پروگرام بنا لو۔ حالات کے سبب گھٹن ہونے لگی ہے۔“
 ”اوکے۔“ روشنا نے مسکرا کر کہا پھر ریسور لے کر اس نے شکایتی انداز میں کہا۔ ”میں نے سنا تھا اور دیکھا بھی ہے کہ ملٹری والے بات کے دھنی ہوتے ہیں لیکن آپ بہت دنوں سے پکنک کے سلسلے میں ٹال مٹول کر رہے ہیں..... جی نہیں، اب یہ ایکسکیوز نہیں چلے گا..... لوگوں کو سوچنے دیں لیکن آپ کو بہر حال حالات سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ فوجی ہونے کے ناتے آپ کو بہت سے کام لینا چاہیے۔ محاذ جنگ پر بھی بہت سے عزیز ساتھی اچانک بچھڑ جاتے ہیں لیکن جوج رہتے ہیں ان کے حوصلے پست ہونے کے بجائے اور بلند ہو جاتے ہیں۔ گھٹن کا احساس بھی جنگ جیتنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے..... فائن..... یہ ہوئی نا بات..... میں دارا سے بات کر کے آپ کو فون کر دوں گی۔“
 ”کیا کہہ رہا تھا.....؟“ دارا نے اپنی بے چینی ٹالتے ہوئے روشنا کو پیار سے بانہوں میں سیٹھ لیا۔ فی الحال وہ روشنا کو مہاجر عاطف سے اپنی ملاقات کا نہیں بتانا چاہتا تھا۔
 ”عاطف نے میری بات مان لی ہے۔“ روشنا نے شوہر کی ٹائی کی ٹاٹ درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”کل ہمیں ڈنر پر بلایا ہے۔ وہیں آؤٹنگ کا پروگرام بھی سیٹ ہو جائے گا۔“
 ”گڈ..... وہ کبھی تمہاری بات نہیں ٹالتا، کبھی تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں.....“ دارا نے شوخی سے شروع کیا جانے والا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ روشنا کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟“
 ”ڈونٹ بی جیلز۔“ روشنا نے شوہر کو پیار سے

دیکھا۔ ”میں جرمن دوسن ہوں، ایک دم اور بیکل اور جرمن عورت زندگی میں کبھی اپنے سپینڈ سے بے وفائی نہیں کرتی۔“
 ”آئی نوڈیٹ ہنی..... اینڈ پراؤڈ آف یو۔“ دارا نے روشنا کے یا قوتی ہونٹ چومے پھر بیگ اٹھا کر دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر وہ مہاجر عاطف کی کال کے سلسلے میں ہی سوچتا رہا..... دفتر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے اسی کو موبائل پر کال کیا۔ رابطہ ہونے پر بے چینی سے بولا۔ ”اب سناؤ کیا خبر ہے؟“
 ”ایک شرط پر..... اب کل کے ڈنر کے اخراجات تمہیں برداشت کرنے ہوں گے۔“
 ”ٹھیک ہے.....“ دارا نے ہائی بھر نے میں دیر نہیں کی۔
 ”تم نے جس پر شبہ کا اظہار کیا تھا وہ رنگین مزاج ہونے کے علاوہ انتہائی خطرناک بھی ہے۔“ عاطف نے مووی بنانے والی اطلاع کو مصلحت چھپاتے ہوئے کہا۔ ”شہر میں اس نے دانا چکنے کے بہت سارے ٹھکانے بنا رکھے ہیں، کل رات بھی وہ ایک پوش علاقے میں کسی کے ساتھ پوری طرح ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ایک قابل غور اطلاع اور بھی ہے۔ جس بنگلے میں اس نے رات گزاری ہے وہاں اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی تین افراد ایک سیاہ رنگ کی پرانی کرولا میں لٹکے تھے لیکن انہیں اپنی منزل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔“
 ”کیا مطلب؟.....“
 ”بنگلے سے روانگی کے تقریباً بیس منٹ بعد وہ ایک ویران علاقے سے گزر رہے تھے جب عقب سے آنے والی ایک بندوین نے قریب آ کر اس پر فائر کھول دیے تھے۔ کرولا قابو سے باہر ہو کر ایک بنگلے کی باؤنڈری وال سے ٹکرا کر الٹی تو اس سے آگ بھڑک اٹھی۔ علاقہ پولیس کو حادثے کی اطلاع شاید اسی بنگلے کے مکینوں نے دی ہوگی، بہر حال کوئی مدد بروقت پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی جل کر تباہ ہو چکی تھی۔ اندر موجود تینوں افراد گولڈ بن چکے تھے۔ پولیس کو فوری طور پر کوئی ثبوت نہیں ملا۔“
 ”کیوں؟“ دارا نے حیرت سے دریافت کیا۔ ”جس دین سے فائرنگ ہوئی تھی وہ تمہارے ایجنٹ کے کسی ساتھی نے تو دیکھی ہوگی؟“
 ”تم نے ایک عقلمندی کی بات کے ساتھ ہی ایک اہم بات کو نظر انداز بھی کر دیا۔“
 ”وہ کیا.....؟“

”وہ کمانڈوز میرے کہنے پر ون دن فور کے لیے کام کر رہے تھے۔ ایسی صورت میں وہ کوئی دوسرا پالنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری شکل میں بھی وہ صرف اپنے کمانڈنگ آفیسر کو مطلع کرتے۔“
 ”تمہارا اندازہ کیا ہے؟“ دارا نے پوچھا۔ ”مرنے والے کون تھے؟ کیا میرے مطلوبہ شخص نے انہیں کسی رقابت کی بنیاد پر راستے سے ہٹایا ہوگا۔“
 ”آم کھانے سے مطلب رکھو۔“ عاطف نے کہا۔ ”دوسری اطلاع یہ ہے کہ تمہاری ملازمہ کو خود انکل کی سفارش پر اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر انچارج نے تحریری طور پر بیگیا بیان دیا ہے۔“
 ”گلابو نے کیا تفصیل بیان کی؟“
 ”میرے کہنے پر جن انسران نے ڈاکٹر سے ملاقات کی انہوں نے گلابو سے ملنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کی گاڑی پر بھی پلاسٹک بم پھینکا گیا تھا لیکن وہ حیرت انگیز طور پر بچ گئے۔ حادثے کے بعد موقع واردات پر دو پارٹیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ بھی ہوا تھا لیکن کوئی لاش نہیں ملی۔ ممکن ہے مرنے والے کے ساتھی اسے اٹھالے گئے ہوں۔“
 ”آئی سی۔“ دارا نے کسمسا کر سوال کیا۔ ”اس حادثے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟“
 ”تفتیش بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ ایسے میں ذاتی خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی گلابو سے ملنے جلنے والوں کی نگرانی بھی ضرور کر رہا ہوگا۔“ عاطف نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ جن دو پارٹیوں کے درمیان فائرنگ ہوئی تھی ان میں سے ایک تمہارے مطلوبہ شخص کی ہو۔“
 ”پھر..... اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟“
 ”تم سامنے نہیں آنا چاہتے تو فی الحال صرف دور رہ کر تماشا دیکھتے رہو۔ میرے جن دوستوں کو ذمہ داری سونپی ہے وہ انتہائی فرض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ بکتنے والے بھی نہیں ہیں۔“
 ”لیکن ایک پریشانی اور بھی ممکن ہے۔“ دارا نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”جو دیدہ دلیر جیلے ڈیڈ کے بیڈروم تک پہنچ سکتے ہیں وہ انہیں دفتر یا کہیں راستے سے بھی اٹھا کر ہم پر دباؤ ڈالنے سے گریز نہیں کریں گے۔“
 ”فائر گٹ اٹ..... وہ تمہارے ڈیڈ ہونے کے علاوہ میرے انکل بھی ہیں۔“ عاطف نے بے پروائی سے جواب دیا پھر ڈنر کے اخراجات ادا کرنے کا وعدہ یاد دلا کر رابطہ

منقطع کر دیا۔

دارا کے ذہن میں بہت سارے سوالات گلبلا رہے تھے لیکن..... میجر عاطف نے از خود ان کی وضاحت نہیں کی تھی اس لیے دارا نے اسے کریدنا بھی مناسب نہیں سمجھا، اسے اس بات کا اطمینان ضرور ہو گیا کہ عاطف نے رسم علی آغا خانی کے تحفظ کے خیال کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

❖❖❖

سراج کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ گولی اس کے بازو کا کچھ گوشت ہی ادھیڑ سکی تھی۔ کچھ معمولی خراشیں اور رنگ زیب کو بھی آئی تھیں لیکن وہ رات بھر ایک لمحے کے لیے بھی سراج کے پاس سے نہیں ہٹا تھا۔ سراج کے پراسرار انکار کے باوجود اس کے قریب ہی رہا تھا۔ پولیس سرجن نے ضروری مرہم پٹی کے بعد مشورہ دیا تھا کہ سراج کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کر دیا جائے لیکن اورنگ زیب نے کسی وجہ سے وہ رات پولیس اسپتال ہی کے ایک سائڈروم میں گزارنا مناسب سمجھا۔ صبح وہ وجہ سراج کی سمجھ میں بھی آئی جب ڈی آئی جی کرانز آغا منظور وہاں سادے لباس ہی میں صبح دس بجے آگئے جبکہ اورنگ زیب نے سرجن کے علاوہ وہاں کے عملے کو بھی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اس حادثے کی اطلاع کسی کو نہ دی جائے۔ سراج سے بھی اس نے یہی گزارش کی تھی کہ وہ حتی الامکان زبان بند ہی رکھے۔

”یہ حادثہ کب اور کہاں ہوا؟“ ڈی آئی جی نے باری باری اورنگ زیب اور سراج کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ایک بلاسٹ ہونے کے علاوہ شدید فائرنگ بھی ہوئی تھی؟“

”آپ کو کس نے اطلاع دی؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ملحقہ تھانے کے ایس ایچ او نے کچھ دیر قبل خبر دی ہے لیکن آپ لوگ.....“

”مسٹر سراج کل رات میرے گھر پر ڈنر کرنے آئے تھے۔“ اورنگ زیب نے بدستور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ”میں نے انہیں مدعو کیا تھا۔ ڈنر کے بعد میں مسٹر سراج کے ہمراہ اسپتال ایک مریض کی مزاج پرسی کو گیا تھا۔ وہاں سے واپس ہوتے وقت گھات لگائے ہوئے لوگوں نے ہم دونوں کو بیک وقت ٹھکانے لگانے کی کوشش تھی لیکن..... کامیاب نہیں ہو سکے۔ فائرنگ کا تبادلہ میرے پرائیویٹ محافظوں اور مجرموں کے درمیان ہوا تھا۔ اگر میں نے حسب ضرورت اس کا خیال نہ رکھا ہوتا تو شاید کسی کو سکون میسر آتا۔“

”آپ کا اشارہ.....؟“

”اسی باسٹرو کی طرف ہے جو اب کم از کم میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔“ اس بار اورنگ زیب نے کھل کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

”اوہ.....“ آغا منظور نے ہونٹ چباتے ہوئے کچھ توقف سے کہا۔ ”اگر آپ دونوں کو یقین ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔“

”شکریہ سر.....“

”میرا خیال ہے کہ مسٹر سراج کو کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کر دیا جائے۔ کم از کم کچھ دن آرام کرنا ضروری ہے۔“ آغا منظور نے کہا۔

”میں نے اسپتال کا آئیڈیا ڈراپ کر دیا ہے۔“ اس بار بھی اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”سراج کو ان ہی کے گھر پر شفٹ کیا جائے گا جہاں ان کی نگرانی کی ذمہ داری بھی میں اپنے مخصوص لوگوں کو سونپوں گا۔“

”گڈ آئیڈیا.....“ آغا منظور نے تائید کی پھر اس نے گزشتہ رات چلنے والی کرولا اور ان تین لاشوں کی تفصیل دہرا دی جو ناقابل شناخت ہو چکی تھیں..... فی الحال انہیں سرد خانے میں رکھو دیا گیا تھا۔

”سر.....“ سراج نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”کیا ابھی تک کہیں کسی نے گمشدگی کی اطلاع بھی درج نہیں کرائی؟“

”میں نے ہدایت جاری کر دی ہے، جہاں بھی اطلاع درج ہوئی مجھے فوری باخبر کیا جائے گا۔“

”گاڑی کی اونر شپ کسی نہ کسی کے نام تو ضرور ہوگی؟“ اورنگ زیب نے کہا۔

”جو نمبر پلیٹ ملی ہے وہ جعلی ثابت ہوئی ہے..... بہر حال، کچھ دوسرے ٹیکنیکل اندراجات سے کوشش کی جارہی ہے۔“

ڈی آئی جی نے جاتے جاتے بھی اورنگ زیب اور سراج کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔ اس وقت اس کے کمرے میں ان تینوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آغا منظور کے جانے کے دو گھنٹے بعد اورنگ زیب نے اپنے ذرائع سے ایک پرائیویٹ ایسیولنس کے ذریعے سراج کو اس کے گھر منتقل کرادیا۔ الماس نے اورنگ زیب کا شکریہ ادا کیا تو اس نے عجیب انداز میں مگر بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔

”ابھی نہیں مسز سراج..... بادل پوری طرح چھٹ جائیں تو پھر صرف شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو باقاعدہ ٹکڑے تقسیم کرنا ہوگا۔“

کچھ دیر بعد الماس کسی کام سے اندر گئی تو اورنگ زیب نے کمرے کو اندر سے بولٹ کر لیا۔ سراج کے قریب ایک ایزی چیئر پر بیٹھے ہوئے بولا۔ ”مسٹر سراج..... آج میں آپ سے کھل کر ایک آخری فیصلہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بتا دوں کہ آپ نے لیاقت حسین کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ وہ اس سے زیادہ پراسرار..... واحد حاضر جمع غائب ثابت ہو رہا ہے۔“

”کوئی خاص بات.....؟“

”گاڑی کو بلاسٹ ہونے کے قبل اچانک اس نے خطرناک انداز میں اسٹیرنگ کا ناٹا تھا اور فائرنگ کا تبادلہ شروع ہونے کے بعد وہ آپ کے رونکنے کے باوجود باہر نکل گیا تھا لیکن اب..... وہ ان دونوں باتوں کو ماننے پر مطلق آمادہ نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے جو کچھ ہوا اس میں خدا کی مہربانی شامل تھی۔“

”اس بات کو میں پہلے بھی کئی موقعوں پر آزما چکا ہوں..... سب کچھ کرنے اور خطروں میں بلاسوچے سمجھے کود پڑنے کے باوجود اس کو جیتی ہوئی ایسی کوئی بات یاد نہیں رہتی۔“

”اس سے پیشتر ایسے جو واقعات ہو چکے ہیں کیا آپ مجھے اس کی تفصیل بتانا پسند کریں گے؟“ اورنگ زیب نے خاص انداز میں سراج کو ٹھونکنے کی کوشش کی تو سراج کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بہت سی باتیں ایسی تھیں جو وہ کھل کر زبان تک نہیں لانا چاہتا تھا۔ اورنگ زیب نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کی تو بڑے جذباتی انداز میں بولا۔

”مسٹر نہیں..... صرف سراج..... اگر تم مجھے اپنا دوست ہمدرد یا بھائی سمجھتے ہو تو آج کچھ چھپانے کی غلطی نہ کرو، پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے، اب سوائے ٹٹ فارٹیٹ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہیں کوئی تکلف ہے تو میں مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن..... میں نے اب ایک آخری فیصلہ کر لیا ہے، اس سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

سراج نے اورنگ زیب کا وہ رنگ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی باتوں میں آہنی چٹانوں کی سختی موجود تھی۔ وہ شیخ حامد کی خصلت اور اس کے اثر و رسوخ سے بھی واقف تھا۔ کل رات جو ہو سکتا تھا وہی اس بات کی دلیل تھی کہ دشمن پوری طرح گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ممکن ہے اس کا نشانہ صرف اورنگ زیب ہوتا مگر..... اورنگ زیب کے نہ ہونے کے بعد بھی بگ باس کسی قیمت پر رنگ ڈھنگ نہیں بدل سکتا تھا۔ سراج اکیلا ہو جانے کے بعد پھر بے بس ہو جاتا۔ صرف ایک رہ جاتا۔ ایک اور ایک گیارہ نہیں ہو سکتا تھا۔

شکول

”اوہ کے..... تم اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔“ اورنگ زیب نے سراج کی خاموشی محسوس کر کے بے پروائی سے کہا۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”سر..... کچھ باتیں ایسی ہیں جو.....“

”سر نہیں.....“ اورنگ زیب نے ٹوکا۔ ”جو بھی کہنا ہے دوست سمجھ کر کہو، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

سراج نے اورنگ زیب کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے لب و لہجے کی گرمی اور سچائی کو محسوس کیا تو چپ نہ رہ سکا۔ ایک ہی سانس میں اس نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دیں۔ جو کچھ اس کے علم میں تھا وہ تفصیل سے بیان کرتا چلا گیا۔ اورنگ زیب خاموش بیٹھا پوری توجہ سے ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔ میڈم ردی اور جگا کی باتیں اس حد تک نئی تھیں کہ اس نے اتنی گہرائی تک ان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سراج چپ ہوا تو اورنگ زیب کچھ دیر غور و فکر میں ڈوبا رہا پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھ پر اعتبار کر لیا۔ میں کبھی تمہارے اعتماد کو نہیں نہیں پہنچاؤں گا۔ جو باتیں اس وقت میرے علم میں آئی ہیں ان میں سے جگا میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔ میڈم ردی نے اسے تحفظ دینے والی بات کچھ غور و فکر کے بعد ہی کہی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے لیکن قانون کی نظروں میں وہ بہر حال ایک سزایافتہ مجرم ہے۔“

”جانتا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن یہ بھی نہ بھولو کہ لوہے کو لوہائی کاٹ سکتا ہے۔ آکٹوپس جن لوگوں کو مہروں کی طرح استعمال کر رہا ہے وہ بھی سب قانون کو کسی نہ کسی صورت میں مطلوب ہیں۔“

”میری ذاتی اطلاع یہ ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے جگا بھی کہیں روپوش ہے۔“ سراج نے دبی زبان میں کہا۔

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے سوچتا رہا پھر پہلو بدل کر خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے گیسٹ ہاؤس میں ملنے والی غیر ملکی لاش کو دیکھنے کے بعد ایک سوال کیا تھا۔ کیا اس کا کوئی تعلق اسپورٹس کار میں مرنے والے سے ہو سکتا ہے؟ میڈم ردی نے بھی ان ہی خطوط پر کوئی نتیجہ اخذ کیا ہوگا۔ جگا کی روپوشی بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ ہاشم کی موت میں بھی آکٹوپس کا ہاتھ ہوگا اور..... دن منٹ۔“ اورنگ زیب نے بولتے بولتے چونک کر سراج کو دیکھا۔ ”کیا تمہیں اس بات پر شبہ

نہیں ہے کہ آکٹوپس کے مکان پر ہونے والے حملے میں میڈم روٹی کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے؟“

”میڈم نے کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔“ سراج نے دبی زبان میں جواب دیا۔

”اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اتنی ہی دانش مندی کا ثبوت دیتا جتنا میڈم نے دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہاشم بھی میڈم ہی کا کوئی نمائندہ ہو۔“

”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”پہلے ایک وعدہ کرو۔“ اورنگ زیب نے اٹھ کر سراج کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اس وقت جو باتیں کی ہیں اس کی بھنک بھی ڈی آئی جی کرائمز کو نہیں ملنی چاہیے۔ اس نے ہمارے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا ہے لیکن اسے یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کی ترقی میں آکٹوپس کی سفارش کو خاص دخل تھا۔“

”آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی درخواست کرتا۔“ سراج نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”کل رات جلنے والی سیاہ کرولا اور اس میں سے برآمد ہونے والی تین ناقابل شناخت لاشوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اورنگ زیب کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ اس حادثے کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آج کل اس قسم کی وارداتیں آئے دن ہو رہی ہیں..... مقصد یہی ہوتا ہے کہ مرنے والوں کی فوری شناخت نہ ہو سکے، جب تک پولیس کوئی آخری نتیجہ اخذ کرے مجرم اس کی دسترس سے دور نکل جائے۔“

اورنگ زیب کچھ جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے موبائل پر سنگٹل ملے، اس نے کال ریسیور کرنے میں غفلت کا مظاہرہ کیا۔ جو نمبر اسکرین پر ابھرا وہ یقیناً اس کے لیے اہم ہوگا۔ ”کیا خبر ہے.....؟“ اس نے موبائل آن کر کے سنجیدگی سے سوال کیا، کچھ دیر دوسری جانب سے دیے جانے والے جواب کو پوری توجہ سے سنتا رہا پھر پر جوش انداز میں بولا۔ ”میں اسی پرانے ریفرنس پر اپنے ایک اعتماد کے آدمی کو بھیجتا ہوں، وہ تم سے مطلوبہ چیز پک اپ کر لے گا..... گڈ..... اس اہم ثبوت کے بعد ہمارے لیے کچھ مزید آسانیاں ہو جائیں گی..... ریسٹ ایسور، سب کچھ میری ذات تک محدود رہے گا۔ ہاں، ہاں سمجھ رہا ہوں..... ڈیسٹ، تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ تمہاری دوستی کی خاطر میں

نے بھی وہی کیا جو تم چاہتے تھے..... یس..... فائن..... میں تمہیں دو گھنٹے بعد تفصیل سے بتاؤں گا۔ ڈونٹ وری مائی ڈارلنگ.....“ گفتگو ختم ہونے کے بعد اورنگ زیب نے موبائل آف کیا تو اس کی آنکھوں میں بالکل ایسی ہی چمک ابھری تھی جیسی کسی شیر یا چیتے کی آنکھ میں اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے ابھرتی ہے۔ سراج نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”کس کا فون تھا.....؟“

”اسی پرانے دوست کا جس کے کہنے پر ہم کل رات اسپتال گئے تھے۔“

”لیکن اس وقت تو آپ نے.....“

”جو بھی کہا تھا وہ رازداری کا تقاضا تھا جو اب باقی نہیں رہا۔“ اورنگ زیب نے سراج کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا پھر اس نے میجر عاطف کا نام ظاہر کیے بغیر غلامی کے زخمی ہونے اور دارا رستم علی کے جن شبہات کی کہانی سنائی وہ بھی سراج کے لیے بڑی کنسنی خیز تھی۔

”آپ کا شبہ کس پر ہے.....؟“ سراج نے کسماکس سوال کیا۔

”کل کیا ثابت ہوگا اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن فی الحال میرے شبہات کے تمام پہلو اور زاویے ایک ہی نام پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں..... آکٹوپس۔“

آکٹوپس کہتے وقت اورنگ کی نگاہوں میں جو نفرت انگیز چمک ابھری، وہ بھی بے حد خوفناک تھی۔

”تم ریسٹ کرو۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک دوبارہ واپس آؤں گا اور ہاں..... اپنے پراسرار لیاقت حسین کو بلا کر اس سے مل لو، وہ کل رات سے تمہارے آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ کسی سچے جاں نثار کی طرح۔“ اورنگ زیب نے ایک بار پھر سراج کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈالا پھر اسے دس کرنا ہوا دروازہ کھول کر چلا گیا۔

اورنگ زیب کے جانے کے بعد الماس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں غمی جھلک رہی تھی۔ سراج نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”بری بات ہے..... بہادر بچے اور بچیاں رو یا نہیں کرتے۔“

”آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے۔“ اس نے شوہر کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنکھی کرتے ہوئے کہا۔ ”آج آپ کے ایس پی صاحب نے جاتے جاتے جو حرکت کی اس سے میری

آنکھیں چھلک اٹھیں۔“

”کیا ہوا.....؟“

”آج انہوں نے جاتے وقت کسی بزرگ کی طرف میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ اب آپ کا ایک بڑا بھائی اور زعمہ ہو گیا ہے اس لیے کسی بات کی فکر نہ کریں۔“

”ہاں..... آج وہ مجھے بھی مسٹر سراج کے بجائے صرف سراج کہہ کر بڑی محبت سے بات کر رہے تھے۔“

”اورنگ زیب صاحب کی بات اور ہے لیکن.....“

اس نے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”میرے علاوہ کوئی دوسری عورت اگر آپ کے خاطر زیادہ میں بے چینی کا اظہار کرے تو وہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔“

”خدا کا شکر ہے کہ میں اسپتال نہیں گیا ورنہ وہاں پولیس افسروں کو خوش رکھنے کی خاطر عام طور سے کسی خوبصورت نرس ہی تعینات کی جاتی ہے۔“

”میں نرس کی نہیں آپ کی روٹی صاحبہ کی بات کر رہی ہوں جو آپ کے گھر آنے سے اب تک تین بار آپ سے بات کرنے میں بے چینی کا اظہار کر چکی ہیں۔“ الماس نے مسکرا کر کہا۔ پھر شوخی سے پوچھا۔ ”کیا مجھے دکھانے کی خاطر یہ خفگی والا ڈراما تیار کیا گیا ہے یا آپ کا روٹی سے.....“

”اے میری ایک کھری بات بری لگی ہے۔“ سراج نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے اپنی سرکاری حیثیت کا احساس دلانے کے بعد کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی جس کا اس نے غلط مطلب نکال لیا۔ بات اسی کے بھلے کی تھی لیکن.....“

اسی وقت الماس کا فون پھر گنگنا یا تو اس نے سراج کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی ان ہی چیتکی کا فون ہے۔“

پھر موبائل آن کر کے سنجیدگی سے بولی۔ ”آئی ایم سوری روٹی لیکن ڈاکٹروں نے سراج کو ایک ہفتے مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا ہے۔ بات چیت کرنے سے بھی منع کیا ہے۔“

”انہیں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟“ دوسری طرف سے میڈم نے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ پولیس سرجن نے گولی لگنے کے بعد خدشے کا اظہار تو نہیں کیا؟..... گھر آنے کے بعد آپ کو کچھ نہ کچھ صورت حال کا علم تو ضرور ہوا ہوگا؟“

”ابھی تک ایس پی اورنگ زیب سختی سے اندر سے کمر بند کے بیٹھے ہیں۔ میں بھی اندر نہیں گئی۔“ الماس نے شرارتاً سنجیدگی برقرار رکھی۔ ”میں بھی دعا کر رہی ہوں۔ آپ سے بھی یہی درخواست کروں گی۔“ الماس نے جملہ مکمل

کشکول

کر کے موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔

”اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں آپ کے گھر آ کر انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔“ روٹی کی آواز ابھری۔ ”میں صرف دعا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ان لوگوں کے خلاف کر سکتی ہوں جنہوں نے چھپ کر ایک ایماندار افسر کو ہدف بنانے کی بزدلانہ حرکت کی ہے لیکن پلیز..... یہ بات آپ مسٹر سراج سے نہ کہیے گا ورنہ وہ.....“

”اب بھی آفیشل حیثیت میں آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا۔“ سراج نے سرسراتے لہجے میں جملہ مکمل کر دیا۔

”اوہ.....“ دوسری جانب سے سراج کی آواز سن کر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ”الماس کی اس وقت کی شرارت تو میرے ذمے ادھار رہی بہر حال، آپ کی آواز سن کر خوشی ہوئی۔ اب طبیعت کیسی ہے؟“

”خدا کا شکر ہے کہ ڈیٹھ وارنٹ ایسٹو ہوتے ہوتے رہ گیا، معمولی زخم آیا ہے، دو چار روز لوٹ پوٹ کر دوبارہ کھڑا ہو جاؤں گا۔“

”کیا میں عیادت کے لیے حاضر ہونے کی درخواست کر سکتی ہوں؟“ بڑی انکساری سے پوچھا گیا۔

”فی الحال مناسب نہیں ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کچھ اہم واقعات اور بھی رونما ہوئے ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں لیکن دشمن اس وقت پوری طرح محتاط ہوگا۔ آپ کا براہ راست مجھ سے ملنا شاید اسے گوارا بھی نہ ہو۔ یہ بات بھی آپ سے سرکاری حیثیت میں نہیں بلکہ الماس کی بہن سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔“

”شکر یہ سراج صاحب، میں اس نئے رشتے میں زیادہ فائدہ میں رہوں گی۔“ میڈم نے شوخی سے کہا۔ ”اب آپ ڈراما موبائل الماس کو دے دیں تاکہ میں اس کی خیریت بھی دریافت کر لوں۔“

سراج نے موبائل الماس کی طرف بڑھا دیا جو بڑی دیر تک اس نئے رشتے پر مکمل کر رہتی بولتی رہی۔ سراج کے ذہن میں ایک بار پھر ایس پی اورنگ زیب کے کچھ آخری فیصلے ابھرنے لگے جو قانونی اعتبار سے مناسب نہیں تھے۔ جب تک الماس فون پر بات کرتی رہی اس کا ذہن ان ہی خطوط پر سوچتا رہا جس پر اورنگ زیب نے قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ الماس فارغ ہوئی تو سراج نے لیاقت حسین کو اندر بلوایا جس کے چہرے کی اداسی اور آنکھوں کی ویرانی اس بات کی غماز تھی کہ وہ سراج کے لیے کس قدر پریشان تھا۔

”پریشان مت ہو لیاقت حسین۔“ سراج نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”تمہاری ہی دعا کا نتیجہ ہے کہ گولی زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوئی ورنہ.....“

”ایسی بات بھی زبان سے نہ نکالے صاحب۔“ لیاقت حسین نے رندھی ہوئی آواز میں تیزی سے کہا۔ ”خدا ان کو غارت کرے جو آپ جیسے نیک لوگوں کے دشمن بن گئے ہیں۔“ ”تمہاری بروقت ذہانت کام آگئی۔ اگر تم نے گاڑی کو فوری طور پر نہ موڑا ہوتا تو شاید ہم پلاسٹک بم کی زد میں آجاتے۔“

لیاقت حسین نے جواب میں کچھ نہیں کہا، اس کے چہرے پر ابھرنے والا اضطراب بتا رہا تھا کہ اسے ایسی کوئی بات یاد نہیں جس کا ذکر سراج سے پیشتر اورنگ زیب بھی کر چکا تھا۔ سراج نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے لیاقت حسین، تم کس سوچ میں گم ہو گئے؟“

”صاحب..... وہ آپ کے ایس پی صاحب.....“ اس نے رک رک کر اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ ”وہ بھی کچھ ایسی ہی باتیں بتا رہے تھے جو مجھے یاد نہیں۔ خدا جانے مجھے کیا بیماری ہو گئی ہے؟ کیا روگ ہے جو میری جان سے چمٹ گیا ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ تم کو فرحین سے بہت زیادہ پیار ہے۔“ الماس نے لیاقت حسین کی ذہنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”تم ایسا کرو، جب تک سراج گھر پر نہیں تم دو چار روز کے لیے فرحین کے پاس چلے جاؤ اس کے بعد پھر آ جانا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیگم صاحب؟ میں اپنے محسن کو ایسی حالت میں ایک ہل کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کہو تو میں بیگم عثمان سے بات کر کے فرحین کو یہاں بلواؤں۔“ الماس نے نئی پیشکش کی۔

”میں سمجھ رہا ہوں بیگم صاحب کہ آپ بھی مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن میں خدا کو گواہ بنا کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کچھ باتیں یاد نہیں رہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟“ اس نے آخری جملہ کہتے وقت سراج کی طرف غور سے دیکھا۔

”میں تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ اوپر والا تمہاری کسی نیکی کی وجہ سے تمہیں نواز رہا ہے۔ تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ جو بات تمہیں یاد نہیں رہی اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آئندہ تم ایسی کسی بات

پر غور بھی نہ کرنا۔ اسی میں بہتری ہے۔“

لیاقت حسین نے سر کی جنبش سے اقرار کیا لیکن ذہنی طور پر وہ الجھا الجھا ہی رہا۔ الماس اور سراج دونوں خاصی دیر تک اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ لیاقت حسین کے جانے کے بعد الماس نے سراج سے کہا۔

”آپ کا کیا مشورہ ہے..... میں راحیلہ سے کہہ کر فرحین کو دو تین روز کے لیے اپنے ہاں نہ بلاؤں؟“

”اس سے بات نہیں بنے گی۔ ہمیں لیاقت حسین کے معاملے میں اب درگزر سے کام لینا ہوگا۔“ سراج نے کچھ توقف سے کہا۔ ”میں شام کو اورنگ زیب صاحب سے یہی کہوں گا کہ اس موضوع پر وہ بھی زیادہ کرید نہ کریں۔“

کچھ دیر بعد الماس سراج کو آرام کا مشورہ دے کر گھریلو کام میں مصروف ہو گئی لیکن سراج کا ذہن بدستور لیاقت حسین کے بارے میں الجھا رہا۔ خاص طور پر وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ دفتر سے دس پندرہ منٹ میں واپسی کا کہہ کر لیاقت حسین ڈیڑھ پونے دو گھنٹے تک کہاں غائب رہا تھا؟ واپسی پر بھی اس نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہا مگر..... دفتر کی گھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد خود وہ بھی حیرت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ عرصہ اس نے کہاں گزارا؟ یہ سوال لیاقت حسین سے زیادہ سراج کے لیے اہم ترین تھا۔

دو تین راتوں کا خمار اس وقت بھی شیخ حامد پر ایک نشہ سا طاری کر رہا تھا۔ کنول کے ساتھ وہ خوب صورت اور حسین لمحے گزار چکا تھا جو بڑے یادگار تھے۔ وہ سل بند بوتل کی ایسی چمکتی شراب تھی جس کا تیز نشہ شیخ حامد کو ڈھلتی عمر میں بھی جوانی کی یاد دل رہا تھا۔ اگر حالات اور گرد و پیش کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس کے قرب کو مہینوں ایک ہل کے لیے بھی خود سے دور نہ رکھتا لیکن بیوی کی خودکشی کے بعد وہ اپنی چھت کے نیچے کنول کو بحیثیت بیوی بھی جگہ دیتا، تو اس کے حریف اور قانون اس کا جینا حرام کر دیتے۔ وہ موجودہ حالات میں بھی خوش تھا۔ کنول سے اس نے جو سودا کیا تھا وہ زیادہ مہنگا نہ تھا یہ کہہ کر دل کو سلی دے رہا تھا کہ جو لطف مکی کیری کو چوری چھپے، درخت سے توڑ کر کھانے میں ہے وہ بازار سے خرید کر کھانے میں کہاں؟ وہ اس کا خریدا ہوا کھرا سودا بھی پھر بھی وہ اسے چوری چھپے کھانے پر مجبور تھا۔

عام طور سے وہ ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جانے کا عادی تھا لیکن اس وقت گیارہ بجے بھی اپنی خواب گاہ میں بیٹھا کنول

کشکول

کے پیچ و خم کے خیالی تصور سے دل بہلا رہا تھا جب اس کے مخصوص موبائل نے واٹر بیٹ کیا۔ اس نے روشن اسکرین پر نظر ڈالی تو کال ریسیو کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ نمبر نو کا فون تھا جسے شیخ حامد نے وقتی طور پر بلیک ٹائیگر کی فٹے داریاں بھی سوئپ رکھی تھیں۔

”کیسے فون کیا؟“ اس نے موبائل آن کر کے خشک لہجے میں سوال کیا۔ ”کچھ اہم خبریں دینی تھیں۔“ ”کہو.....“

”مطلوبہ گاڑی کو مع لوڈ سفر پر روانہ کر دیا گیا ہے۔ ابھی تک کسی نے نہ اپنا سامان کلیم کیا ہے نہ گاڑی کے بارے میں کوئی تفتیش نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے۔“ جواب بڑے اعتماد سے دیا گیا۔ ”آئندہ بھی نتیجہ صفر ہی رہے گا، میں نے اس کی ساری شناختیں پہلے ہی کھرچ کر مٹا دی تھیں۔“

”رینٹ اے کار والوں کو کس طرح مطمئن کیا؟“ ”ان کو واجبی قیمت ادا کر دی گئی ہے۔ وہ زبان کھولنے کی غلطی کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔“

”گڈ.....“ شیخ حامد نے تعریف کی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ”مجھے اطلاع ملی ہے کہ اسپتال کے قریب ہونے والے بلاسٹ میں دو آدمی بھی ضائع ہو گئے ہیں۔“

”اپنے ہی بندے تھے۔“ فوری جواب ملا۔ ”ہم نے لاشیں اسی وقت اٹھالی تھیں جن کو رات ہی وفات دیا گیا۔“ ”فائرنگ کی حماقت کیوں کی گئی تھی؟ میں نے صرف ایک وارنگ دینے کو کہا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ نئے ایس پی کے سادہ لباس والے تھے۔ ابتدا ان ہی کی طرف سے کی گئی۔ ایک آدمی کام آگیا تو ہمیں بھی جوانی کا رروائی کرنی پڑی، ایسا نہ کرتے تو زیادہ نقصان بھی ہو سکتا تھا۔“

”تمہاری کارکردگی ابھی تک اطمینان بخش ہے لیکن جگا کا کیا بنا.....؟“

”اس کی تلاش جاری ہے۔ آخری ٹھکانا ہم نے بروقت اڑا دیا تھا لیکن وہ نہ جانے اپنے آدمیوں سمیت.....“ ”نہ کہانی پہلے ہی سن چکا ہوں۔“ اسے خشک لہجے میں وارنگ دی گئی۔ ”جگا کی روپوشی ہمارے لیے اہم ہے اسے کسی طرح بھی ٹریس کرو۔“

”رائٹ سر.....“ ”سراج کو نئے باسٹروڈ نے اسپتال کے بجائے گھر پہنچا

دیا ہے۔“ شیخ حامد ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اسی کی وجہ سے سراج بھی پر نکالنے کی پوزیشن میں آ گیا ہے۔“ ”آپ صرف اشارہ کر دیں۔ ہم پورا ٹیمین پھونک کر راکھ کر دیں گے۔“

”حماقت کی باتیں مجھے پسند نہیں..... دشمن کی دکھتی رگ اگر قابو میں آجائے تو پھر وہ اشاروں پر ناپنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک کوشش ہو چکی تھی جسے سراج نے بروقت ناکام بنا دیا ورنہ..... اس وقت وہ میرے قدموں میں پڑا ہوتا۔“

”اب کیا حکم ہے.....؟“ ”اسی جیسی ہیرے (الماس) کو دوبارہ قابو کرنے کا پلان بناؤ لیکن میں اب دوسری بار ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔“

”رائٹ باس..... کام ہو جائے گا۔“ ”نہ ہو تو تم بھی مجھے اطلاع دینے کے بجائے وہی راستہ اختیار کرنا جو گیسٹ ہاؤس میں مرنے والے نے اختیار کیا تھا۔ انتہائی سرد لہجے میں جملہ مکمل کرنے کے بعد شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا۔ کچھ دیر وہ کسی خیال میں گم رہا پھر اس نے سراج کی خیریت دریافت کرنے کا ارادہ کر کے موبائل دوبارہ آن کر لیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں کسی کوڑیالے سانپ ہی کی طرح چمک رہی تھیں۔

کالے رنگ کی وین اس عمارت سے تقریباً پانچ گز دور جا کر روک دی گئی جس میں افضل خان کا اپارٹمنٹ تھا، وین سے اترنے والے دونوں افراد خوش لباس تھے، صورت شکل سے بھی وہ مہذب ہی نظر آ رہے تھے لیکن مذکورہ بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی ایک مسلح گارڈ نکل کر ان کے راستے میں حائل ہو گیا۔

”کہاں جانا ہے جناب.....؟“ اس نے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

”کیا مطلب.....؟“ ایک نوجوان نے گارڈ سے وضاحت طلب نظروں سے کہا۔ ”کیا اس عمارت میں بغیر اجازت داخل ہونا بھی منع ہے؟“

”پہلے نہیں تھا سر، لیکن اب تمام اپارٹمنٹ کے مکینوں کا یہی حکم ہے کہ کسی بھی نئے آنے والوں کو بغیر معلومات کیے لفٹ یا سیڑھیوں تک نہ جانے دیا جائے..... میں ان کا ملازم ہوں صاحب اس لیے اپنی ڈیوٹی سے مجبور ہوں۔“

”گڈ.....“ دوسرے نوجوان نے گارڈ کی فرض شناسی کو

سرہا۔ ”ہمیں افضل خان سے ملنا ہے جو آج ہی دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں آگئے ہیں۔ شاید ان کے ساتھ جو حادثہ گزر چکا تھا اسی کی بنیاد پر تمہاری خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے سر.....“ گارڈ نے کہا۔

”آپ اپنا نام بتادیں، میں انٹرکام کے ذریعے ان سے معلوم کیے لیتا ہوں۔“

”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم خود انٹرکام پر اپنے دوست سے بات کر لیں۔“

”تشریف لائیں صاحب.....“ گارڈ انہیں لفٹ کے قریب بنے ایک مختصر کمرے میں لے گیا جہاں سے عمارت کے تمام اپارٹمنٹ والوں سے گفتگو کی جاسکتی تھی۔ یہی اس کی غلطی بھی تھی۔ وہ آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ پھر اس سے پیشتر کہ گارڈ انٹرکام پر رابطہ قائم کرتا پشت پر موجود نوجوان نے نہایت مہارت سے جیب میں رکھا ہوا رومال نکال کر گارڈ کے منہ اور ناک پر جمادیا۔ رومال میں لگی مہک خاصی زود اثر تھی، گارڈ نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن خود کو نوجوان کی آہنی گرفت سے آزاد نہ کر سکا۔ اسے بے ہوش ہونے میں بہ مشکل تیس سیکنڈ لگے تھے۔ دوسرے نوجوان نے باہر نکل کر ادھر ادھر جھانکا پھر دونوں نے مل کر گارڈ کو اس کی کرسی تک لے جا کر اس طرح نکال دیا کہ دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر دونوں لفٹ میں داخل ہوئے پھر مطلوبہ منزل کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ کے حرکت میں آتے ہی ایک نوجوان نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اس بات کا خیال رکھنا کہ ہمیں حتی الامکان دنگ فساد سے پرہیز کرنا ہے۔“

”جانتا ہوں۔“ دوسرے نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس کے بعد ان کے درمیان کوئی اور بات نہیں ہوئی۔

لفٹ کے رکنے اور خود کار دروازے کے کھلنے کے بعد وہ اس راہداری میں آگئے جس میں خوبصورت کارپٹ ڈالا ہوا تھا، ہر دو اپارٹمنٹ کے درمیان پیتل کے جگمگاتے گلوں میں مینی پلانٹ نظر آرہے تھے۔ دونوں خاموشی سے قدم اٹھاتے افضل خان کے فلیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے، ایک کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ریگ گئے، دوسرے نے جیب سے ایک تار کا ٹکڑا نکال کر چابی کے سوراخ میں ڈالا، پل بھر میں کلک کی آواز سنائی دی، دوسرے ہی لمحے وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک نے جیب سے جرمن ساخت کا آٹو میک پستول نکال کر افضل خان اور شبیم پر تان لیا جو سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے انہیں بھی ششدر کر دیا تھا اور اب وہ پھٹی پھٹی نظروں سے

دونوں نوجوانوں کو دیکھ رہے تھے۔ شبیم ٹائٹ گاؤن میں ملبوس بھی سامنے میز پر کافی کے دو گنگ نظر آرہے تھے۔

”کون ہو تم.....؟“ افضل خان نے دونوں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”اس وقت تک دوست ہی سمجھو جب تک تم کوئی حماقت کا ثبوت نہیں پیش کرو گے۔“

”کیا چاہتے ہو؟“ شبیم نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”پلیز میڈم.....“ پستول والے نے شبیم کو وارننگ دی۔ ”اپنا خوب صورت ہاتھ جیب سے دور ہی رکھیں، ہم کوئی رسک لینے کے عادی نہیں ہیں۔“

شبیم کا ہاتھ رک گیا، اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ موبائل آن کرنے کی کوشش کی بھی جس کی آوازیں غالباً کہیں دور بھی سنی جاتی تھیں۔

”میرا خیال ہے کہ تم غلط جگہ آگئے ہو؟“ افضل خان نے بے جگری سے کہا۔

”یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ تم اپنی چونچ بند ہی رکھو ورنہ بلاوجہ لپیٹے میں آ جاؤ گے۔“ دوسرے نے افضل خان کو وارننگ دی۔ ”پہلے ہی تم ایک لمبی سزا بھگت چکے ہو۔“

”تم.....“ شبیم کسمانے لگی۔ ”ہم سے کیا چاہتے ہو؟ ہم..... آج ہی اس اپارٹمنٹ میں آئے ہیں۔“

”معلوم ہے.....“ پستول والے نے مطلب کی بات کی۔ ”تمہیں اب خاموشی سے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔ انکار کی صورت میں ہم دوسرا راستہ بھی اختیار کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔“

”ون منٹ.....“ افضل خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ باہر ہمارے بھی کچھ آدمی ہو سکتے ہیں۔“

”وقت مت ضائع کرو۔“ پستول والے نے یہ دستور۔

شبیم کو گھورتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ہم تمہیں صرف دو منٹ اور دے سکتے ہیں۔“

شبیم ہونٹ چباتے ہوئے صوفے سے اٹھی، اسی لمحے افضل خان نے جو اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا، نہایت پھرتی سے دوسرے نوجوان پر چھلانگ لگا دی اور اسے اپنی جھونک میں رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا، پستول والے نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، وہ بہ دستور شبیم پر نظر جمائے کھڑا تھا۔

دوسرا نوجوان جو افضل خان کے اچانک حملے سے وقتی طور پر لڑکھڑا گیا تھا اچانک ایکشن میں آ گیا۔ اس نے افضل خان کو زور لگا کر جھکائی دی پھر تیزی سے مارشل آرٹ کا

ککشول

مظاہرہ کرتے ہوئے فلائنگ کلک لگائی تو افضل خان اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، اس کے ہونٹ سے خون کی دھار نکلی تو وہ بھی وحشی بن گیا۔ ایک بار پھر اس نے جوابی حملہ کیا پھر دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جوش میں زور آزمائی کرتے ہوئے فرش پر گر پڑے، افضل خان نوجوان کے اوپر تھا وہ ریوالور والے کی پروا کیے بغیر اپنے مقابل کے ساتھ موت اور زندگی کی بازی کھیلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے نوجوان کے فرش پر گرتے ہی تابڑ توڑ اس کے چہرے پر دو چار بیچ مارے پھر اس کی گردن پر ہاتھ کا شکنجہ لگا کر پوری قوت صرف کرنے لگا۔

شبیم پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ پستول والے نے افضل خان اور اپنے دوسرے ساتھی کے درمیان آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”ایک منٹ دس سیکنڈ گزر چکے ہیں میڈم۔“ اس نے شبیم کو مطلع کیا۔ ”تمہارے پاس فیصلہ کرنے کا زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”تمہارا ساتھی.....“

”اس کی فکر مت کرو.....“ وہ شبیم کو لاحق پریشانی کو ٹالتے ہوئے بہ دستور سفاک لہجے میں غرایا۔ ”ہم ون ٹو ون کے اصول کے قائل ہیں۔ ون بائی ٹو کا مظاہرہ نامردوں کا شیوہ ہے۔ تم اپنی فکر کرو.....“

شبیم نے بے بسی سے افضل خان کی طرف دیکھا، اسے ایک مبہوم سی امید تھی کہ شاید آنے والوں کی خود اعتمادی افضل خان کے ہاتھوں قائم نہیں رہ سکے گی لیکن پھر جو کچھ ہوا وہ حیرت انگیز ہی تھا۔ دوسرا نوجوان جو افضل کے نیچے دبا ہوا تھا اس نے اپنے گھٹنے جوڑ کر دوبارہ مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے افضل خان کی پیٹھ پر ضرب لگائی تو وہ قلابازی کھاتا ہوا دوسری جانب گرا۔ اس کے بعد دوسرا نوجوان ربر کی گیند کی طرح حیرت انگیز پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے اپنے بوٹ کی ٹھوکر افضل خان کے چہرے پر ماری تو افضل خان کے منہ سے گاڑھا گاڑھا خون ابلنے لگا۔ بے درپے تین جارٹھوکروں نے افضل خان کو دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر کر دیا، شبیم کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔

”اب تمہارا کیا فیصلہ ہے..... جو وقت دیا گیا تھا وہ بھی گزر چکا۔“ ریوالور والے نے شبیم کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تت..... تت..... تم نقصان میں رہو گے۔“ اس

نے ایک آخری کوشش کی۔ ”ہمارے ساتھی بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ جو چوہے کے بل میں چھپے بیٹھے ہیں وہ کھل کر سامنے آ جائیں۔“

ریوالور والے نے دوسرا قدم بڑھایا تو دوسرا نوجوان اس کے اور شبیم کے درمیان آ گیا۔ اس نے شبیم کے جسمانی نشیب و فراز پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

”تم نے اس خوبصورت بوجھ کو اٹھانے کی فتنے داری مجھے سونپی تھی۔“

”مم..... مجھ..... مجھے ہاتھ مت لگانا ورنہ بڑے نقصان میں رہو گے۔“ شبیم نے بوکھلا کر کہا۔

”ہاتھ نہیں خوب صورت فاختہ..... میں تمہیں گلے لگا کر لے جاؤں گا۔“

شبیم نے وحشت زدہ انداز میں بچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی، دوسرے نوجوان نے لپک کر دونوں ہاتھ اس کی کنپٹیوں پر جمائے پھر کسی ایسی رگ کو مسلا کہ وہ بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ دوسرے ہی لمحے نوجوان نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے گرتے بوجھ کر سنبھالا پھر اس حسین بوجھ کو کاندھے پر ڈال کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دوسرے نوجوان نے پستول واپس جیب میں ڈال لیا۔

واپسی کے وقت دونوں ہی پر سکون تھے، شبیم کو ساتھ لے جانے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے ایمر جنسی کی حالت میں کسی قریبی اسپتال میں طبی امداد کے لیے لے جا رہے ہوں۔ دین تک پہنچنے کے دوران انہیں کسی مزاحمت کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔

وہ کتنی دیر بے ہوشی سے دو چار رہی اسے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ ہوش آنے پر اس نے خود کو ایک نرم و گرم بستر پر پڑا پایا تھا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دتی گھڑی پر نظر ڈالی تو یہ تصور بھی اس کے وجود کو ڈسنے کے لیے کافی تھا وہ رات بھر کی دوسرے کی دسترس میں گزار چکی ہے۔ اس نے ارد گرد نظر ڈالی۔ وہ ایک مختصر کمرہ تھا جہاں ایک بیڈ، دو ایزی چیئر اور ایک میز کے علاوہ اور کوئی فرنیچر نہیں تھا، بستر سے اتر کر کمرے کے واحد دروازے کو آزمایا جو حسب توقع باہر سے بند تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک چار بائی چار کا ہاتھ روم بھی موجود تھا۔ کمرے کی ساخت بتا رہی تھی کہ وہ کسی بنگلے کا بیسمنٹ ہے یا پھر تہ خانہ بھی ہو سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں کے بعد دیگرے مختلف سوال گردش

کرنے لگے۔ وہ اس وقت کس کی قید میں تھی..... کیا اس کی کوئی ذاتی ملائکت کسی طور بگ باس تک پہنچ گئی جس نے اسے زیر عتاب کر دیا تھا..... اگر ایسا نہیں تھا تو پھر اسے اغوا کرنے والے کون تھے.....؟ ان کا مقصد کیا تھا اور افضل خان کو چھوڑ دینے کا رسک کیوں لیا گیا تھا۔ ہوش آنے پر وہ بگ باس کو ان دو آدمیوں کی تفصیل مع حلیہ بتا سکتا تھا جنہوں نے شبیم کو اغوا کیا تھا۔ کیا اغوا کرنے والوں کو اس کا کوئی خدشہ نہیں تھا؟ کیا اغوا کرنے والوں کو اس بات کا انتظار تھا کہ اس کے اور افضل کے آپارٹمنٹ میں منتقل ہوتے ہی کارروائی عمل میں لائی جائے؟“

بڑی دیر تک وہ خود اپنے سوالات کا جواب تلاش کرتی رہی پھر دروازے پر ابھرنے والی آہٹ محسوس کر کے دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی۔ فوری طور پر وہ اس بات کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ کسی ذہنی کشمکش سے دوچار ہے۔ دروازہ تیزی سے کھولا گیا، ایک درمیانہ قد اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک بڑی ہوشیاری سے سامنے آیا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا، اس کا کوئی ساتھی بھی پیچھے موجود تھا جس نے اندر داخل ہونے والے کے اشارے پر دروازہ دوبارہ باہر سے بند کر لیا۔

”مجھے توقع تھی کہ تم اب تک پوری طرح ہوش میں آچکی ہو گی۔“ آنے والے نے اطمینان سے کہا پھر ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہاں فی الحال کوئی تکلیف تو نہیں ہو گی؟“

”مجھے یہاں کیوں اور کس مقصد سے لایا گیا ہے؟“ شبیم نے اپنے اوسان بحال رکھتے ہوئے انجیدگی سے دریافت کیا۔

”مقصد نیک ہی ہے..... براہوتہ تو تم اس حال میں نہ ہو تیں۔“ سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب ملا۔

”تم کون ہو؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”تمہارا کیا اندازہ ہے.....؟“

”میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے مجھے اغوا کر کے اپنے ہیروں پر کلہاڑی مار لی ہے۔“ شبیم نے اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر کہا۔ ”اب تک میرے واقف کاروں کو بھی اطلاع مل چکی ہو گی۔“

”اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ ہمارے آدمیوں کو بھی حالات کی بھنک مل چکی ہے۔“

”ہم بھی یہی چاہتے تھے.....“ نووارد نے مسکرا کر کہا پھر یکلخت بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو ہم بلاوجہ تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک بھی نہیں کریں گے۔“

”کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟“

”فی الحال تمہیں ایک تصویر دیکھ کر یہ بتانا ہے کہ وہ کون ہے؟“ نووارد محتاط انداز میں اٹھا پھر اس نے ایک بند لفافہ شبیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ تم لفافے میں موجود تصویر کو دیکھ کر کوئی اداکاری نہیں کرو گی۔“

شبیم نے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا، وہ بہ دستور خود کو پرسکون ظاہر کر رہی تھی لیکن لفافے سے برآمد ہونے والی تصویر کو ایک نظر دیکھتے ہی اس طرح چونکی جیسے کسی زہریلے بچھونے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ تصویر کنول کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔ بگ باس کی منظور نظر جس کے ملازمت چھوڑنے کے بعد سب ہی کے ذہنوں میں مختلف سوالات ابھر رہے تھے، کسی نے زبان کھولنے کی جرأت تک نہیں کی تھی۔ اب اسی کنول کی تصویر اسے شناخت کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ آخر کیوں؟ کیا تصویر حاصل کرنے والے اس کی حقیقت سے واقعی ناواقف تھے یا اس میں بھی ”ٹریپ“ کی کوئی صورت شامل تھی۔ تصویر میں کنول کا صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس چہرے کو غالباً کسی گروپ وغیرہ سے علیحدہ کیا گیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو.....؟“ نووارد نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ جب تم لوگوں نے یہ تصویر حاصل کی ہے تو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات بھی ضرور رکھتے ہو گے۔ پھر مجھ سے کس بات کی تصدیق چاہتے ہو؟“

”میں اپنا سوال ایک بار پھر دہرا رہا ہوں۔“ نووارد کے لہجے میں پہلے سے زیادہ کڑھکی آگئی تھی۔ ”یہ کس کی تصویر ہے؟“

”میری معلومات کے مطابق اس کا نام کنول ہے۔“ شبیم نے محتاط انداز اختیار کر لیا۔ ”ہم دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے لیکن کچھ دنوں پیشتر اس لڑکی نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی ذاتی پرابلم ہو۔“

”اب یہ کہاں ہے.....؟“

”مجھے نہیں معلوم.....“

”ہمیں علم ہے کہ تمہارے بگ باس کا نام شیخ حامد ہے۔ یہ بھی علم ہے کہ کسی خوب صورت اور حسین لڑکی کے لیے وہ کسی درندے سے کم بھی نہیں ہے، پھر یہ لڑکی اس کے چنگل سے کس طرح نکل گئی؟“

”اس کا جواب بگ باس یا پھر یہ لڑکی ہی دے سکتی ہے۔“ شبیم نے شانے اچکا کر بے پردائی سے جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارے اندر بھی جنس مخالف کے لیے خاصی کشش موجود ہے۔“ نووارد نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تم کو بگ باس کی طرف سے خاص مراعات حاصل نہیں ہیں؟“

”یہ..... یہ میرا قطعی نجی اور ذاتی معاملہ ہے.....“

”ہے نہیں..... بلکہ اس وقت تک تھا جب تک تم اپنے قلیٹ میں تنہا رہتی تھیں اور اب..... تم افضل خان کے ساتھ اس کے آپارٹمنٹ میں منتقل ہو چکی ہو..... کیا تمہیں افضل خان کی سابقہ سٹری اور چال چلن کا علم نہیں ہے؟“

”میں غیر ضروری سوالات کے جواب دینا پسند نہیں کرتی۔“ شبیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”فی الحال میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گا۔“ نووارد نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”مگر، اتنا بتا دوں کہ تمہاری یہاں سے رہائی کی صرف ایک ہی صورت ہے..... یا تم اپنی پسند کے مطابق خودکشی کر لو..... یا جو پوچھا جائے اس کا کھل کر جواب دو۔ بگ باس یا اس کے شکاری کتے تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے؟ یہ خیال بھی دل سے نکال دو۔“

نووارد نے اپنا جملہ مکمل کر کے تصویر شبیم کے ہاتھ سے واپس لی پھر دروازہ کھولا کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد شبیم کی کھوپڑی میں پھر سوالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

راحیلہ خاتون اس وقت فرحین کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب سیٹھ عثمان باہر سے آئے اور خاموشی سے فرحین کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔ راحیلہ خاتون نے شوہر کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے تھے اس لیے وہ فرحین کو کچھ دیر میں واپس آنے کا کہہ کر شوہر کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”خیریت تو ہے؟“ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے شوہر سے پوچھا۔ ”سراج بھائی کیسے ہیں؟ ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟“

”سراج کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن دوسرے حالات مجھے خاصے سمجھ نظر آ رہے ہیں۔“

”دوسرے حالات..... میں سمجھی نہیں؟“ راحیلہ بیگم شوہر کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”ایس پی اورنگ زیب نے سراج کو اسپتال میں داخل کرانے کی تجویز مسترد کر کے اسے گھر پر منتقل کرنا زیادہ مناسب خیال کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے گاڑی کو ٹارگٹ بنایا تھا وہ دوبارہ پھر کوئی خطرناک قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ایک دو واقعات اور بھی ایسے رونما ہوئے ہیں جو پولیس کے لیے سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔“ سیٹھ عثمان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”کل شیخ حامد نے بھی فون کر کے سراج کی خیریت دریافت کی تھی۔ اورنگ زیب اسے منافقانہ کال قرار دے رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان کی کار پر ہونے والا حملہ بھی شیخ حامد ہی کے اشارے پر ہوا ہوگا۔“

”ان حالات میں..... سراج کا بھی الماس کو ساتھ لے کر دو تین مہینوں کے لیے باہر چلے جانا مناسب نہ ہوگا۔“

”میں نے اس کی تجویز دی تھی لیکن سراج کے علاوہ اورنگ زیب نے بھی اس سے اتفاق نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ معاملات میں ایس پی اورنگ زیب کی ذاتی شخصیت کو زیادہ دخل ہے۔“

”کیا مطلب؟“ راحیلہ بیگم نے چونک کر شوہر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ جواب میں سیٹھ عثمان نے اورنگ زیب کے اثر و رسوخ کے حوالے سے جو تفصیل بتائی وہ بھی اس خیال کی تائید کرتی تھی کہ شیخ حامد نئے ایس پی کو پسند نہیں کرتا تھا اور سراج ان کی رسہ کشی کے درمیان لپیٹ میں آ گیا تھا۔

”اب کیا ہوگا.....؟“

”قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے سراج اور اورنگ زیب کی باتوں سے جو اندازہ لگایا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں نے کسی مشترکہ فیصلے پر پہنچ کر اس پار یا اس پار کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ”آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ گاڑی پر کیا جانے والا بلاسٹ بھی لیاقت حسین کی وجہ سے زیادہ موثر نہیں ثابت ہوا۔ اس نے بروقت اسٹیرنگ کو اس عجلت میں گھمایا تھا کہ وہ اٹلتے اٹلتے رہ گئی لیکن..... حسب دستور لیاقت حسین کو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔“

راحیلہ بیگم پہلو بدل کر کچھ کہنے کے لیے پرتول رہی تھیں جب فون کی گھنٹی بجی۔ شوہر کے اشارے پر وہ کال ریسیو کرنے کی خاطر اٹھ گئیں۔ ایک منٹ کی مختصر کال سننے کے بعد ان کے چہرے پر..... کچھ نئی پریشانیاں ابھرنے لگیں۔

راحیلہ بیگم پہلو بدل کر کچھ کہنے کے لیے پرتول رہی تھیں جب فون کی گھنٹی بجی۔ شوہر کے اشارے پر وہ کال ریسیو کرنے کی خاطر اٹھ گئیں۔ ایک منٹ کی مختصر کال سننے کے بعد ان کے چہرے پر..... کچھ نئی پریشانیاں ابھرنے لگیں۔

راحیلہ بیگم پہلو بدل کر کچھ کہنے کے لیے پرتول رہی تھیں جب فون کی گھنٹی بجی۔ شوہر کے اشارے پر وہ کال ریسیو کرنے کی خاطر اٹھ گئیں۔ ایک منٹ کی مختصر کال سننے کے بعد ان کے چہرے پر..... کچھ نئی پریشانیاں ابھرنے لگیں۔

”کس کا فون تھا.....؟“

”فرحین کے گھر والوں کا.....“ راحیلہ بیگم نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ”فرحین کی ایک قریبی عزیزہ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ سیٹھ عثمان نے کہا۔

”ہمیں لیاقت حسین کی فوری روائی کا بندوبست کرنا ہوگا۔“

”کیا لیاقت حسین کا جانا مناسب ہوگا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کئی موقعوں پر حیرت انگیز طور پر ہماری جان بچا چکا ہے۔ سراج بھی اسی خیال سے اسے دس بارہ روز کے لیے لے گیا تھا، آپ ابھی بتا رہے ہیں کہ گاڑی پر ہونے والا حملہ بھی لیاقت حسین کی کسی غیبی مدد پر بروقت حرکت سے جان لیوا ثابت نہیں ہوا، ایسی صورت میں.....“

”بہر حال، ہمیں لیاقت حسین کو اطلاع تو دینی ہے۔ ہم اتنی اہم خبر کو چھپا کر کسی خود غرضی کا ثبوت بھی نہیں دے سکتے۔“ سیٹھ عثمان نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں سراج سے بات کرتا ہوں۔“

”میں فرحین کو.....“

”ابھی اتنی جلدی نہ کریں۔ لیاقت حسین کو آ لینے دیں، وہ ہوگا تو فرحین کو زیادہ مناسب طریقے سے دلا سکتا ہے۔“

”سکے گا۔“

سیٹھ عثمان نے پہلے سراج کو اطلاع دی پھر لیاقت حسین سے بھی براہ راست بات کی۔ آدھے گھنٹے کے اندر لیاقت حسین بھی آ گیا۔ سیٹھ عثمان اسے پرسہ دینے کی خاطر باہر گئے تو لیاقت حسین نے بڑی متانت سے درخواست کی۔

”صاحب..... آپ یا بیگم صاحب میرے فرحین کے ساتھ جانے پر اصرار نہ کریں تو مہربانی ہوگی۔ میں سراج صاحب کو ان حالات میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”تم پہلے بھی نہیں گئے تھے۔“ سیٹھ عثمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”فرحین کے علاوہ تمہارے گھر والے بھی کیا سوچیں گے؟“

”آپ پریشان نہ ہوں صاحب، میں فرحین کو ساری باتیں سمجھا دوں گا۔“ لیاقت حسین نے بڑی خوب صورتی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ بعد میں فرحین کو لینے چلا جاؤں تو باقی سب کے گلے شکوے بھی دور کر دوں۔“

”میں زبردستی نہیں کروں گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسے موقع پر تمہاری وہاں فرحین کے ساتھ موجودگی زیادہ مناسب ہوگی۔“

”ٹھیک ہے..... میں فرحین سے بات کرتا ہوں۔ جیسا

وہ مشورہ دے گی ایسا ہی کروں گا۔“

راحیلہ بیگم نے فرحین کو لیاقت حسین کی آمد کی اطلاع دی تو وہ کسی پھول کی طرح خوشی سے کھل اٹھی۔ اسی وقت لیاقت حسین کے ساتھ اپنی انکیسی میں چلی گئی لیکن اس کے کچھ دیر بعد لیاقت حسین نے دوبارہ سیٹھ عثمان سے مل کر بتا دیا کہ فی الحال فرحین تنہا جائے گی۔ بعد میں وہ ہو سکتا ہے کہ اسے لینے چلا جائے۔ سیٹھ عثمان نے زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا، فوری طور پر فرحین کو روانہ کرنے کا سارا بندوبست کر دیا لیکن..... ان کے ذہن میں ایک بار پھر یہ خیال رہ رہ کر ابھر رہا تھا کہ لیاقت حسین نے کسی وجہ سے اپنے پورے گھریلو حالات کھل کر پہلے بھی نہیں بتائے تھے۔ اب بھی اس نے فرحین کو میت میں تنہا شرکت کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ مگر کیوں؟ آخر وہ کیا راز تھا جو لیاقت حسین کھل کر صاف صاف بیان کرنے سے گریز کر رہا تھا؟

شیخ حامد نے اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے والی نرس کو بھوکے نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت یونیفارم میں نہیں تھی، غیر ملکی ہونے کے سبب اس نے جو سادہ لباس پہن رکھا تھا وہ بھی اتنا تنگ تھا کہ بے لباس ہونے کی صورت میں شاید وہ اتنی پرکشش نظر نہ آتی جتنی اس وقت نظر آرہی تھی۔ مٹی اسکرٹ نے نچلے جسم کی ٹھوس ساخت کو بھی اجاگر کر رکھا تھا۔

کنول سے شادی کرنے کے بعد شیخ حامد کا پرانا واقف کار ڈاکٹر برلاس اس کے کہنے پر دوبارہ نرسوں کو اضافی طاقت کے انجکشن لگانے کی خاطر اس کے گھر بھیج چکا تھا۔ پہلے جو نرس آئی تھیں وہ زیادہ پرکشش نہیں تھیں اس لیے شیخ حامد نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن موجودہ بدلیسی نرس کے جسمانی نشیب و فراز اتنے ہیجان انگیز تھے کہ شیخ حامد انہیں نظر انداز نہیں کر سکا تھا۔

”تمہارا نام؟“ اس نے نرس کی مخاطب کیا۔

”جولیانہ.....“ نرس نے پیشہ وارانہ انداز میں جواب دیا پھر سرنج میں دوا بھرنے لگی، اس کی نظریں سرنج پر مرکوز تھیں لیکن شیخ حامد اس انداز کو خاص طور پر محسوس کر رہا تھا۔

اس کے نقوش خوبصورت نہیں لیکن جھکے اور نمکین بلاشبہ تھے، وہ انجکشن تیار کرنے کے بعد شیخ حامد کے قریب آئی تو اس نے نرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے بے باک انداز میں پوچھا۔

”جانتی ہو یہ انجکشن کس کام آتا ہے؟“

”ایکسٹرا اسٹریٹھ (Extra Strength) حاصل

کشکول

کرنے کے لیے۔“ جولیانہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔

شیخ حامد نے آستین اوپر اٹھا کر بازو کھول دیا، جولیانہ انجکشن لگانے کی خاطر اور قریب آئی تو اس کے جسم اور لباس پر لگے سینٹ کی سوندھی سوندھی خوشبو شیخ حامد کو بے چین کرنے لگی۔ اس وقت اگر اسے کنول کے پاس نہ جانا ہوتا تو شاید وہ کسی آدم خور کی طرح جولیانہ کو بلا تکلف دیوچ لیتا لیکن وہ بہر حال اس قابل نہیں تھی کہ اسے کنول جیسی تازہ چمکتی کلی پر ترجیح دی جاتی۔

”ڈاکٹر برلاس کے ہاں شاید نئی آئی ہو؟“

”ہاں.....“ جولیانہ نے انجکشن لگاتے ہوئے یہ دستور بے نیازی سے کہا۔ ”عام طور سے میں کسی کے گھر پر وزٹ نہیں کرتی لیکن ڈاکٹر برلاس نے آپ کے لیے خاص طور پر میری ڈیوٹی لگا دی۔ اس لیے کہ آج نائٹ ڈیوٹی کی نرس کسی وجہ سے نہیں آئی تھی۔“

”میں آئندہ تم ہی کو طلب کیا کروں گا۔“ شیخ حامد نے فراخ دلانہ انداز میں کہا۔ ”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”آپ کو اس وقت شاید کہیں اور جانا ہے؟“ جولیانہ نے پہلی بار قدرے بے تکلفی سے شیخ حامد کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔“ شیخ حامد نے پھریری لیتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا تو جولیانہ نے شانے اچکا کر دبی زبان میں کہا۔

”آپ جو انجکشن لیتے ہیں یہ انسان کو صرف عارضی قوت بخشتا ہے جو زیادہ دیر پائ نہیں ہوتی۔ عادی ہو جانے کے بعد انسان اسی کا محتاج ہو جاتا ہے۔“

”تم شاید ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس کے بغیر مرد کو اگر کبھی شرمندگی اٹھانی پڑے تو وہ بھی اس کے لیے بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ایسا وہاں ہوتا ہے جہاں انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو۔“ جولیانہ نے کھل کر جواب دیا۔ ”ورنہ، آپ کا بائزر اگر باڈی مساج کے فن سے واقف ہو تو آپ زیادہ انجوائے کر سکتے ہیں۔“

”تت..... تم کو باڈی مساج آتا ہے؟“ شیخ حامد کی آنکھوں میں خمار جاگنے لگا۔

”آپ کی ضرورت پر منحصر ہے لیکن میں صرف باڈی مساج کے دس ہزار لیتی ہوں۔“ جولیانہ نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ ”صرف باڈی مساج کے۔“

”اور..... اس کے بعد.....“

”نہیں تھا ڈرنڈ پلس..... لیکن آپ اس کے لیے ڈاکٹر برلاس سے نہیں کہیں گے۔“ جولیانہ نے اپنا وزیننگ کارڈ

نکال کر شیخ حامد کی طرف بڑھاتے ہوئے رازدارانہ انداز اختیار کیا۔ ”اس پر میرا موبائل نمبر درج ہے۔ آپ جب چاہیں دن و یک پشتر تک کر سکتے ہیں۔“

”پروفیشنل ہو؟“ شیخ حامد نے چبھتے ہوئے انداز میں اسے سر سے پاؤں تک گھورا۔

”نہیں..... پروفیشنل ہوتی تو ڈاکٹر کے ہاں سر دس نہ کرتی۔ باڈی مساج میں دو ماہ میں صرف ایک بار کرتی ہوں جو میری ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ نین تھا ڈرنڈ پلس والی بات میری مرضی پر منحصر ہے۔“

شیخ حامد کو اچانک کنول کا خیال آ گیا اس لیے اس نے بات آگے نہیں بڑھائی لیکن، یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اسے کبھی بہ وقت ضرورت..... خدمت کا موقع دے سکتا ہے۔ جولیانہ کے جانے کے بعد وہ بن سنور کر تیار ہوا۔ اس وقت ساڑھے نو کا عمل تھا، اس نے اپنے خاص ڈرائیور اور ایک بااعتماد گن مین کو ساڑھے دس کا وقت دیا تھا۔ وہ دونوں اس کے آزمائے ہوئے آدمی تھے۔ زبان ہوتے ہوئے بھی گونگا بنا رہتا ان کی سرشت میں شامل تھا، نہ ہوتا تو بہت پہلے موت کی ابدی نیند سو چکے ہوتے۔ دس بجے کنول نے اسے فون کیا۔

”مجھے آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار ہے۔“ اس کے لہجے میں گھریلو عورت کی محبت تھی۔ ”آخر ہم کب تک اس طرح دور دورہ کر چوری چھپے ملتے رہیں گے؟“

”ڈونٹ وری مائی سوٹ ہارٹ، میں تمہیں لے کر باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں جہاں ہمارے اوپر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ ہم دو تین مہینے تک دل بھر کر انجوائے کریں گے۔“

”اور اس کے بعد.....؟“ کنول نے دبی زبان میں پوچھ ہی لیا۔

”اس کے بعد.....“ شیخ حامد نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں اپنی تمہاری شادی کو سب پر ظاہر کر دوں۔ ابھی وعدہ نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“

”میں بس دس منٹ میں نکل رہا ہوں۔“ شیخ حامد نے کنول کو دلا سادے کرکال منقطع کر دی پھر وہ اپنی منخوس اور مرحوم بیوی صبا بیگم کو بے نقط گالیاں بکنے لگا جس کی خودکشی نے اسے محتاط رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد ایس بی اورنگ زیب کی شخصیت بھی اس کے آڑے آرہی تھی جس کی وجہ سے اس نے اوپاش لڑکیوں کو بھی گھر بلانا بند کر دیا تھا۔ وہ فرنٹ فٹ کا کھلاڑی تھا لیکن حالات نے اسے بیک فٹ پر

جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پندرہ منٹ تک وہ صبا بیگم اور اورنگ زیب دونوں کو دل ہی دل میں گالیاں بکتا رہا پھر ٹھیک دس بج کر بیس منٹ پر اس نے واش روم میں جا کر قد آدم آئینے کے سامنے اپنا آخری جائزہ لیا۔ باہر آ کر اس نے موبائل پر گیٹ والے گارڈ سے رابطہ قائم کر کے معلوم کرنا چاہا کہ اس کی مخصوص گاڑی آئی یا نہیں لیکن تین چار منبرج کرنے کے بعد اس نے خود کو تیزی سے فرش پر گرا دیا اور اپنے بستر تک پہنچنے کی خاطر کسی چوٹ کھائے مگر چھ کی طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگا جہاں اس کی چھوٹے دستے کی رائل رکھی تھی۔

اچانک ہونے والا دھماکا اتنا ہی خطرناک تھا کہ بیڈروم کے در و دیوار بھی لرز اٹھے تھے، اس کے ساتھ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجنے لگی تھی۔ رائل حاصل کرنے کے بعد اس نے دیوار کے ساتھ بڑی پھرتی سے اٹھ کر خواب گاہ کی تمام روشنیاں گل کر دیں۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ ایک کھڑکی کی طرف قدم اٹھا رہا تھا جب اس کے موبائل پر سنگٹل ملے۔ کال نمبر نوے کی تھی۔

”یہ کون حرام کے پلے ہیں؟“ اس نے بڑے خونخوار لہجے میں نمبر نوے سے سوال کیا۔

”فکر نہ کریں باس..... ہم انہیں گھیر رہے ہیں۔ آج انہیں زندہ نہیں جانے دیں گے۔“

”سب کو بھون ڈالو۔“ وہ گرجنے لگا۔ کسی کی پروا نہ کرنا۔ دیکھ لوں گا، باقی لوگوں کو بھی بلا لو۔“

”میں روشنیاں بند کر رہا ہوں باس۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”اندھیرے میں انہیں گھیرنا زیادہ آسان رہے گا۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بیٹکے کی بیرونی روشنیاں بھی بند کر دی گئیں۔ شیخ حامد اچانک رائل لے کر خواب گاہ سے باہر نکلا۔ اس کے لیے پوزیشن تبدیل کرنی ضروری تھی، وہ راہداری سے گزرتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا پھر اس نے ایک کھڑکی کے قریب دیوار سے چپک کر پوزیشن سنبھال لی۔ کھڑکی کو ذرا سا کھول کر اس نے باہر کی جانب دیکھا جہاں رائل گولیوں کے ساتھ ہی شعلے بھی اگل رہی تھیں۔ رائل پر ایک ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے اس نے دوسرے ہاتھ سے موبائل نکالا اور ڈی آئی جی کرائمز آغا منظور کے نمبر پر کال کرنے لگا۔

”ہیلو۔ شیخ حامد صاحب۔“ دوسری جانب سے ڈی آئی کرائمز کی آواز ابھری۔ ”اس وقت کیسے یاد.....“

”میرے بیٹکے پر کچھ حرامیوں نے دوسری بار حملہ کر

دیا ہے۔“ شیخ حامد نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا وہ نیا ایس پی کہاں مرا ہوا ہے؟“

”پریشان نہ ہوں سر..... میں ابھی دیکھتا ہوں۔“ اس بار دوسری طرف سے بھی پریشانی کا اظہار کیا گیا۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو..... اس بار بھی اگر مجرم گرفتار نہ ہوئے تو پھر مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔“ شیخ حامد نے کال منقطع کر دی اسی لمحے اسے شبیم کا خیال آیا۔

کنول کی طرف جانے کے خیال نے اسے اس قدر محو کر رکھا تھا کہ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے دوبار شبیم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں بار گھنٹی بجتی رہی لیکن..... کال ریسیو نہیں کی گئی تو اس نے کسی خطرے کے پیش نظر شبیم والا موبائل خاص تکنیک سے جلا کر تار کار کر دیا تھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کا عادی نہیں تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ شاید وہ اور افضل خان نئے سرے سے اپارٹمنٹ ملنے کی خوشی کو انجوائے کر رہے ہوں گے۔ ایسی کسی صورت کے انکشاف کے بعد وہ شبیم کو اس ”غفلت“ کی مناسب سزا دینے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا لیکن..... اب اس کا ذہن کچھ نئے امکان پر غور کر رہا تھا۔ شاید حملہ کرنے والوں نے شبیم کو بھی اغوا کر لیا ہو؟ ورنہ وہ موبائل کو امیٹڈ کرنے میں دیر نہ کرتی۔ اس خیال نے شیخ حامد کے غصے کو اور ہمیز کر دیا۔ باہر تاریکی میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ جاری تھی۔ وہ دوسرے کمرے سے نکل کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھا۔ رائل کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی، اسے یقین تھا کہ اس کے کارندے جو ایک لمحہ بھی غافل رہنے کے عادی نہیں تھے، حملہ کرنے والوں سے پوری مستعدی سے برسر پیکار ہوں گے۔ دل ہی دل میں وہ حملہ کرنے والوں کو بھی مغالطات بک رہا تھا جنہوں نے اضافی قوت والے انجکشن اور کنول کے ساتھ ہونے والے پروگرام کا ستیاناس کر دیا تھا۔

وہ ابھی آدھے زینے طے کر پایا تھا جب ایک مسلح کارندہ اس کے قریب آیا اور فکر مندی سے بولا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں باس..... باہر..... تو.....“

”سن رہا ہوں سب کچھ لیکن تم لوگ کس مرض کی دوا ہو.....؟“ اس نے قریب آنے والے کو تحارت سے جواب دیا۔ ”دفع ہو جاؤ..... جا کر حملہ کرنے والوں کو گھیرنے کی کوشش کرو۔ کب تک حرام کی کھاتے رہو گے؟“

آنے والا جس تیزی سے آیا تھا۔ اسی تیزی سے لوٹ گیا۔ شیخ حامد وہیں بیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ گھپ اندھیرے میں

کشکول

باہر کھلے میں جانا اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ کوئی سنسناتی ہوئی گولی اس کے وجود کو بھی چاٹ جانے سے گریز نہ کرتی۔ اسی وقت موبائل پر سنگٹل ملے، اسکرین پر کنول کے نمبر روشن تھے۔ اس نے موبائل آن نہیں کیا۔ اندر ہی اندر جھلس کر رہ گیا۔ سارا پروگرام ستیاناس ہو گیا تھا، اضافی طاقت کا انجکشن بھی ضائع گیا۔ اس نے لائن آف کر کے دوبارہ آن کی اور شبیم کے نمبروں کے بجائے افضل خان کے نمبر پر کال کرنے لگا۔

”ہیلو..... افضل بول رہا ہوں باس.....“ دوسری جانب سے افضل خان کی جھجکی جھجکی آواز ابھری۔

”شبیم کہاں مری ہوئی ہے.....؟“ اس نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔

”وہ..... اسے دو افراد گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ کل رات کی بات ہے۔“

”تت..... تم..... باسٹرڈ۔“ شیخ حامد کا پارہ ایک دم ہی چڑھ گیا۔ ”تم نے مجھے فوری اطلاع کیوں نہیں دی۔ اب تک کس کا انتظار کر رہے تھے؟“

”میں نے شبیم کو بچانے کی خاطر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا تھا لیکن وہ دو تھے اور.....“

”کہانیاں مت سناؤ..... میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے کیا کیا میں اس کی بات نہیں کر رہا۔“

”میں ابھی کچھ دیر قبل ہی ہوش میں آیا ہوں۔“ اس بار مختصر جواب دیا گیا۔

”وہ کون ہو سکتے ہیں.....؟“

”میں نے انہیں پہلی ہی بار دیکھا تھا، بہ ظاہر وہ پروفیشنل نہیں لگتے تھے۔“

”تم نے پولیس کو انفارم کرنے کی حماقت تو نہیں کی؟“

”آپ کی اجازت کے بغیر میں نے کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔“

”اچھا کیا.....“ شیخ حامد نے مل کھاتے ہوئے جواب دیا پھر بڑے سرد لہجے میں حکم دیا۔ ”میری بات غور سے سنو۔ تم اپنا سامان لپیٹ کر جتنی جلدی ممکن ہو اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ کر کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤ۔ کوئی سراخ چھوڑنے کی حماقت نہ کرنا اور..... شبیم کے سلسلے میں اپنی زبان پر تالے ڈال لو۔ کسی سے کچھ کہنے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔“

”رائٹ باس.....“

”اپارٹمنٹ دس پندرہ منٹ کے اندر اندر چھوڑ دو..... چوکیدار کا منہ بھی اپنے سلسلے میں بند کرنا تمہاری

ہماری

ہی ذمہ داری ہوگی۔ کوئی غلطی کی تو اس کی سزا بھی جانتے ہو..... کہیں شفٹ ہونے کے بعد مجھے دوبارہ کال کرنا۔“

موبائل بند کر کے شیخ حامد ہونٹ چبانے لگا۔ شاید اس وقت کوٹھی پر حملہ کرنے والے بھی وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے شبیم کو اغوا کیا ہوگا۔ ایک کامیابی حاصل کرنے کے بعد ان کی موت ہی نے انہیں ورغلا یا ہوگا۔ اس نے رائل پر اپنی گرفت جما کر دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن پے در پے ہونے والے تین دھماکوں نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ بیڑھیوں سے لڑکھڑاتا ہوا نیچے فرش پر آ گیا۔ تینوں دھماکے بیٹکے کے تین حصوں میں کیے گئے تھے۔ گیٹ کی طرف بھی فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا لیکن پھر اس کی تیزی میں بتدریج کمی کی آنے لگی، شاید کوئی ایک پارٹی پسپا ہو کر میدان چھوڑ رہی تھی۔

شیخ حامد لباس جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جنونی کیفیت سے دوچار تھا لیکن اس کیفیت کے باوجود فی الحال کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ وہ جھلایا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔ اس بار اس نے براہ راست مرکزی حکومت میں اپنے نمک حلالوں کو فون کرنے کی ٹھانی تھی لیکن پھر پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیوں کی آوازیں کر رہی گئیں۔ فائرنگ بھی ختم ہو رہی تھی۔ وہ جھلاتا ہوا دروازے کے قریب آ گیا۔ گیٹ کا ایک مسلح چوکیدار دوڑتا ہوا سامنے آ گیا۔

”صاحب..... پولیس کی گاڑیاں آگئی ہیں۔“

”جا کر دیکھو کون ہے.....“ اس نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ ”لائٹ جلا دو اور..... کوئی فتنے دار آفیسر ہو تو اسے اندر آنے دینا، چھوٹا موٹا آدمی ہو تو باہر ہی سے دھتکار دینا۔“

چوکیدار اگلے قدموں واپس چلا گیا، بیٹکے کی روشنیاں دوبارہ آن ہو گئیں۔ شیخ حامد ہونٹ چباتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ پانچ سات منٹ بعد ڈی آئی جی کرائمز علاقے کے انسپکٹر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ان کے کچھ کہنے سے پیشتر ہی وہ غیر ارادی طور پر رائل ہاتھ میں لیے کھڑا ہو گیا۔ انتہائی تحارت سے علاقے کے انسپکٹر کی طرف خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا۔

”اب تک تم اور تمہارے عملے کے لوگ کہاں مرے ہوئے تھے؟“

”کام ڈاؤن سر.....“ ڈی آئی جی نے آگے بڑھ کر شیخ حامد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”علاقے کی پولیس غافل نہیں تھی لیکن ایک ہی وقت میں پولیس کی نفری ہر مکان پر.....“

”یو..... گیٹ لاسٹ! شیخ حامد نے انسپکٹر کو تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا۔ ”وہ ڈی آئی جی کا اشارہ پا کر ہونٹ

ہماری

کاٹا لٹے قدموں باہر نکل گیا تو اس نے آغا منظور کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”تم شاید بھول گئے کہ تمہاری ترقی میں بھی میرا ہاتھ تھا۔“

”میں نے کبھی اس سے انکار بھی نہیں کیا لیکن.....“

”حملہ کرنے والے کون تھے؟“ شیخ حامد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”تھانہ انسپکٹر اور اس کے عملے نے کیا تیر مارا؟“

”ہم نے چار آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ ان کی زبان کھولنے کی خاطر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کریں گے۔“ آغا منظور نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے ہدایت کر دی ہے کہ آئندہ سے سادہ لباس والوں کا ایک دستہ باقاعدہ جینکے کے ارد گرد نظر رکھے۔“

”جینکے میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اسے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ٹھیک کرانا بھی تمہاری فتنے داری ہوگی۔“

”سب کچھ آپ کے حسب منشا ہو جائے گا۔“ ڈی آئی جی نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک گزارش میں بھی کروں گا۔ ماتحتوں کی موجودگی میں اگر آپ.....“

”پھر کسی وقت تمہاری درخواست پر غور کروں گا۔“ اس نے بہ دستور بھرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ پھر ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا وہ نیا ایس پی کہاں مرا ہوا ہے۔ کیا اسے حملے کی اطلاع نہیں ملی یا.....“

”وہ بھی آن ڈیوٹی ہے۔ جو افراد گرفتار ہوئے ہیں انہیں اسی نے گھیرا تھا۔“

”کس پارٹی کے لوگ ہیں.....؟“

”ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بہ ظاہر صورت شکل سے جرائم پیشہ ہی نظر آتے ہیں۔“

شیخ حامد جواب دینے کے لیے پرتول رہا تھا کہ جب اس کے دوسرے موبائل پر کال ریسیو ہوئی۔ اسکرین پر روشن ہونے والا نمبر نیا تھا پھر بھی اس نے موبائل آن کر لیا۔ خشک اور کرجت لہجے میں سوال کیا۔

”کون ہے.....؟“

”آج جو کچھ ہوا اسے پہلی اور آخری وارنگ سمجھو۔“ دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔ ”ہم چاہتے تو براہ راست تمہاری خواب گاہ کو بھی ٹارگٹ بنا کر تمہیں روست کر دیتے لیکن ہم جیو اور دوسرے کو جینے دو کے اصول کے قائل ہیں۔ تم سے بھی آئندہ اسی کی توقع ہے۔“

”لڑکی کو کس جرم میں اغوا کیا گیا ہے؟ کیا اسے بھی تم مردانگی ہی کا نام دو گے؟“ شیخ حامد نے اسے کریدنے کی

خاطر سوال کیا۔

”کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟ ہم تمہاری طرح لڑکیوں پر رال ٹپکانے کے عادی نہیں ہیں۔“

”ہنگامہ کرنے کا مقصد کیا تھا؟“

”صرف تمہیں یہ یاد کرانا چاہتے ہیں کہ تم ہی حرف آخر نہیں ہو۔“ انتہائی سفاک لہجے میں جواب ملا۔ ”ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ پہلا ثبوت آج تمہیں مل چکا ہے۔“

”اپنے اس باپ کا نام بھی بتا دو جس کی ناجائز اولاد ہونے کے سبب تم اپنی اوقات بھول رہے ہو.....؟“ شیخ حامد کا پارہ ایک دم ہی چڑھ گیا۔

”انتظار کرو..... اس کا جواب بھی تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔“ دوسری جانب سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ شیخ حامد مل کھا کر رہ گیا۔

”کون تھا جناب.....“ آغا منظور نے دبی زبان میں پوچھا۔

”فضول ہے..... اس نے ڈی آئی جی کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”جو سم استعمال کی گئی ہے وہ ان رجسٹرڈ ہی ہوگی۔“

”کیا بکواس کر رہا تھا؟“

”یہی کہ وہ پولیس کی کارکردگی کو آئندہ بھی ضرور آزمائے گا۔“ شیخ حامد نے تملاکر جواب دیا پھر اس نے شبیم کے اغوا کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”کل رات کسی نے اسے بھی اسی اپارٹمنٹ سے اغوا کر لیا ہے جو پہلے افضل خان کی تباہی کا سبب بن چکا تھا۔ میں نے باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کرائی لیکن..... اسے بازیاب کرانے کی فتنے داری بھی تمہیں سونپ رہا ہوں۔“

”آپ کا شبہ کس پر ہے.....؟“

”احتمالاً سوال ہے..... اس نے نفرت کا اظہار کیا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا تو اب تک میرے کارندے اغوا کرنے والوں کو موت کی نیند سلا کر اسے بازیاب کراچکے ہوتے..... تم بھی رازداری سے کام لینا۔ میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ اخبارات کو میرے کاروبار پر ہنسنے کا کوئی موقع ملے۔ شبیم میری خاص ورکر بھی اس کا خیال رہے.....“

”وہ اس نئے اپارٹمنٹ میں کب شفٹ ہوئی تھی.....؟“ ڈی آئی جی نے دریافت کیا۔

”دو روز پہلے کی بات ہے۔“

”ویری سیڈ۔“ آغا منظور نے کسمسا کر ایک خیال کا

کشکول

اظہار کیا۔ ”اغوا کرنے والے کیا اس بات کے انتظار میں تھے کہ اس کو شفٹ کرنے کے بعد ہی اغوا کیا جائے..... میرا مطلب ہے کہ وہ اسے.....“

”یہ معلوم کرنا بھی پولیس کا کام ہے۔“

”او۔ کے سر..... میں اس معاملے کو بھی دیکھتا ہوں۔“

ایک بار پھر کنول کی کال مخصوص موبائل پر موصول ہوئی۔ شیخ حامد نے اس بار بھی اسے اینڈ کرنے کے بجائے لائن کاٹ دی۔ دس سیکنڈ بعد دوبارہ موبائل گنگنا یا تو اس نے جھلا کر روشن اسکرین کی طرف دیکھا لیکن نمبر نو کی کال دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”کوئی خاص بات.....؟“

”باس..... پولیس نے جن چار افراد کو حراست میں لیا ہے ان میں تین اپنے آدمی بھی شامل ہیں۔“

شیخ حامد نے موبائل آف کر کے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔

”تمہارے ایس پی نے جو تیر مارے ہیں اس کی رپورٹ بھی مجھے مل گئی ہے۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں؟“

”جن چار آدمیوں کو اس نے حراست میں لیا ہے اس میں تین میرے آدمی تھے جو جینکے کی حفاظت پر تعینات تھے۔“

”اوہ.....“ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں یہاں سے سیدھا پولیس اسٹیشن ہی جا رہا ہوں۔ آپ اپنے کسی آدمی کو بھیج دیں۔ میں صرف چوتھے آدمی کی زبان کھلوانے کی ہدایت کروں گا۔ آپ کے کارندوں سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی البتہ..... ہو سکتا ہے کہ انہیں دس بارہ گھنٹے تک روکا جائے..... کچھ خانہ پری تو کرنی ہوگی۔“

ڈی آئی جی کے جانے کے بعد اس نے سب سے پہلے کنول کو فون کر کے مختصر صورت حال سے آگاہ کیا پھر نمبر نو سے رابطہ قائم کر کے آئندہ کے لیے اپنی رہائش گاہ کی حفاظت کی خاطر ضروری ہدایتیں دینے لگا۔ یہ بھی کہا کہ وہ خاص طور پر رستم علی کو بھی چیک کرے، کہیں اس حملے کی پشت پر اس کا ہاتھ تو نہیں۔

❖❖❖

لیاقت حسین اس وقت سراج کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ فرحمن کے جانے کے بعد اسے کسی بات کی فکر نہیں تھی، اس نے خاص طور پر الماس سے درخواست کی تھی کہ اسے سراج کی خدمت کا پورا پورا موقع دیا جائے چنانچہ جب الماس دوپہر کام میں مصروف ہوتی تو لیاقت حسین سراج کے آس پاس ہی

منڈلاتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی سراج کے بے حد سمجھانے کے بعد ہی اس نے کرسی پر بیٹھنا مناسب سمجھا تھا۔

”اب آپ کی طبیعت کیسی ہے صاحب؟“ حسب معمول اس نے سراج سے پہلا سوال یہی کیا۔

”خدا کے کرم سے بالکل ٹھیک ہوں، بس دو روز اور مسہری توڑنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوں گا۔“

”اتنی جلدی کیا ہے صاحب..... دنیا کے دھندے تو چلتے رہتے ہیں۔“

”فرحمن کا کوئی فون آیا.....؟“ سراج نے موضوع بدل کر دریافت کیا۔

”وہ خیریت سے پہنچ گئی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ پچھلی بار بھی تم ٹال گئے تھے۔“

”آپ کو اس حال میں چھوڑ کر چلے جانا میرے بس میں نہیں تھا۔“ لیاقت حسین نے بڑی عقیدت سے کہا پھر

لیکھت اسے ایک بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر پہلو بدل کر بولا۔ ”صاحب، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، لیکن اس شرط پر کہ آپ میری بات کا بھرم رکھ لیں گے۔“

”سب خیریت تو ہے؟“ سراج نے اسے ٹوٹی نظروں سے دیکھا۔

”ہمارے صاحب نے ماربل کا کاروبار بھی شروع کر دیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے۔“ لیاقت حسین نے بڑی خوبصورتی سے بات گھما پھرا کر

کہی۔ ”ایک روز میں بنے صاحب کو فون پر کسی سے بات کرتے سن لیا تھا۔“ اس نے سنی ہوئی تفصیل دہرا کر کہا۔

”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ وہ پارٹی کون ہے جس نے وقت پر صاحب کو مال سپلائی نہیں کیا تھا۔“

”تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟“

”صاحب کے پانچ لاکھ کا معاملہ ہے۔“ لیاقت حسین نے جواب دیا۔ ”میں بھی اسی علاقے کا ہوں، دو چار کاروباری لوگوں کو بھی جانتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ جس نے مال

سپلائی کرنے میں دیر کی ہو اسے بھی جانتا ہوں، کبھی کبھی پرانی واقفیت بھی کام آجاتی ہے۔“

”کیا وہ تمہارے کہنے سے آئندہ مال وقت پر سپلائی کر دے گا۔“

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے صاحب۔“

”تم یہ بات براہ راست عثمان سے بھی دریافت کر سکتے

تھے؟“ سراج نے کہا۔ ”اس میں تکلف کی کیا بات تھی۔“
 ”میں نے مناسب نہیں سمجھا صاحب۔۔۔۔۔۔“ لیاقت
 حسین نے پھر منت کی۔ ”آپ کسی طرح اس پارٹی کا نام
 معلوم کر دیں لیکن میرا نام نہ لیں۔ یہ میری درخواست ہے۔“
 سراج کے جواب دینے سے پیشتر ہی الماس آگئی۔
 وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے سراج کو
 اپنے پروگرام سے باخبر کرنے کے بعد لیاقت حسین سے بھی
 سراج کا خیال رکھنے کی تاکید کی پھر جانے کے ارادے سے
 پلٹی تھی جب اسے دوبارہ رکنا پڑا۔
 ”بیگم صاحب۔ آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے
 ساتھ چلوں۔“ لیاقت حسین نے خلاف توقع بڑی سنجیدگی سے
 کہا۔ ”ایک دو چیزیں مجھے بھی خرید کر فرصین کو بھجوانی ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔“ سراج نے کہا پھر بے تکلفی سے
 بولا۔ ”ایک شرط پر تمہیں جانے کی اجازت دے سکتا ہوں کہ
 تم الماس کے کسی حکم سے انکار نہیں کرو گے۔“
 ”میں ایسی جرات بھی نہیں کر سکتا صاحب۔۔۔۔۔۔“

سراج کو جواب دینے کے بعد لیاقت حسین بھی الماس
 کے ساتھ باہر آ گیا۔ الماس نے اپنے ڈرائیور کو گھر پر رہنے کی
 ہدایت کر دی۔ اسٹیمپرنگ لیاقت حسین نے سنبھال لیا۔ الماس
 کی ہدایت پر لیاقت حسین نے گاڑی شہر سے دوڑا تو ایک
 بڑے شاپنگ مرکز کے گیٹ پر روکی۔ الماس کے اترنے کے
 بعد وہ گاڑی کو پارکنگ میں لے گیا۔ الماس نے کہا تھا کہ وہ
 شاپنگ سے فارغ ہو کر اسے فون پر مطلع کر دے گی۔ اس نے
 لیاقت حسین سے راستے میں پوچھا بھی تھا کہ اسے فرصین کے
 لیے کیا چیزیں لینی ہیں۔ جواب میں لیاقت حسین نے کہا تھا کہ
 وہ واپسی میں صدر کے علاقے سے لے لے گا۔

الماس گاڑی سے اتر کر چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے
 لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کا رخ اختیار کیا جہاں بیشتر اشیا
 تھوک کے داموں فروخت ہوتی تھیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے
 تک وہ مطلوبہ اشیا خرید کر ٹرائی میں رکھتی رہی پھر لفٹ کی
 طرف جانے لگی تو شاپنگ مرکز کے یونیفارم میں ملبوس
 نوجوان نے قریب آ کر اسے اپنی خدمت پیش کی۔ الماس
 نے سامان سے بھری ٹرائی اس کے حوالے کر کے سکون کا
 سانس لیا لیکن ایک کم مصروف سیکشن کے راستے میں پہنچ کر
 اس کا سکون برقرار نہ رہ سکا۔

”میڈم۔۔۔۔۔۔“ یونیفارم میں ملبوس نوجوان نے اسے
 سرسراتے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”ہمارے آس پاس تین آدمی
 اور بھی موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو اطمینان کر لیں لیکن۔۔۔۔۔۔ اگر

آپ نے شور مچانے کی کوشش کی تو پھر ہم آپ کو آخرت کے
 سفر پر روانہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی نہیں محسوس کریں
 گے۔۔۔۔۔۔ خیریت اسی میں ہے کہ آپ خاموشی سے ہمارے
 کہنے پر قدم اٹھاتی رہیں۔“

الماس نے تیزی سے نظریں گھما کر دیکھا، یونیفارم
 والے نے غلط نہیں کہا تھا، تین افراد جیبوں میں ہاتھ ڈالے
 تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آس پاس موجود تھے جو اسے
 گھور رہے تھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی الماس کے جسم
 میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی بیوی تھی اس
 لیے یہ بھی جانتی تھی کہ شور مچانے کی صورت میں اس کے ساتھ
 کیا ہو سکتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ ایسی ہی صورت حال سے
 دوچار ہو چکی تھی۔ اسے اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ لفٹ کی
 طرف جانے سے پیشتر اس نے لیاقت حسین کو فون بھی نہیں کیا
 تھا شاید اس لیے کہ اسے نیچے پہنچ کر کاسٹیک کی دو چار چیزیں
 اور بھی لینی تھیں۔

”تم کیا چاہتے ہو۔۔۔۔۔۔؟“ الماس نے سچویشن کو محسوس
 کرتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔

”ایک ہی درخواست ہے کہ آپ کوئی ہوشیاری
 دکھانے کی حماقت نہ کریں ورنہ اس بار ہمیں اوپر سے خطرے
 کی صورت میں وسیع اختیارات دے دیے گئے ہیں، ہم اس
 پر عمل کرنے میں دیر بھی نہیں کریں گے۔“

”کوئی اور صورت ممکن نہیں ہے۔۔۔۔۔۔؟“
 ”غلط اندازے نہ قائم کریں۔“ خشک لہجے میں
 جواب دیا گیا۔ ”ہم بکا ڈال نہیں ہیں۔“

”مجھے مارنے کی صورت میں تم لوگ بھی نہیں بچ سکو
 گے۔۔۔۔۔۔“ الماس نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔
 ”معلوم ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت کچھ
 نامعلوم لوگ ہماری نقل و حرکت کی بھی نگرانی پر مامور ہیں،
 دوسروں نے چھوڑ دیا تو وہ ہمیں زیادہ اذیت ناک انجام سے
 دوچار کر دیں گے اس لیے کسی ناقابل برداشت ہارچہ سے
 بچنے کی خاطر ہم بھی آسان موت کو ترجیح دینا پسند کریں گے۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔۔۔۔۔۔؟“ الماس
 نے ایک اور ٹرمپ کارڈ استعمال کرنے کی کوشش کی۔
 ”ڈی ایس پی مسٹر سراج کی بیگم۔“ سپاٹ اور بے
 پروا انداز میں جواب دیا گیا۔
 ”یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ایک بار خطرے سے دوچار
 ہونے کے بعد میں نے احتیاطی تدابیر نہ اختیار کی ہوں گی۔“
 ”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔۔“

قابل تعریف

لارڈ ارون ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے، ان کا دایاں ہاتھ جنگ میں کٹ چکا تھا۔ مختلف اخبارات نے اس تقرر پر مخالفانہ انداز میں لکھا لیکن مولانا سالک نے ”افکار و حوادث“ میں جس طریقے سے لکھا، وہ قابل تعریف ہے، لکھتے ہیں۔

”ہندوستان پر حکومت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

چاند کے مہینے

علامہ محمد مغربی نے لکھا ہے کہ قمری کیلنڈر میں چار مہینوں تک مسلسل تیس کا چاند ہو سکتا ہے مگر اس کے بعد نہیں اور 29 کا چاند مسلسل تین ماہ تک ہو سکتا ہے اس کے بعد نہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ کسی رمضان کی پانچ تاریخ جس دن ہو، اگلے رمضان کا پہلا روزہ لازماً اسی دن ہوتا ہے۔ علامہ مغربی کہتے ہیں کہ اس قاعدے کو 50 سال آزمایا گیا ہمیشہ صحیح نکلا لیکن ظاہر ہے ان تمام حسابات کی حیثیت اندازے سے زیادہ نہیں۔ احکام شریعت میں اعتبار رویت بلال ہی کا ہے۔

جس مفتی تقی عثمانی کی کتاب ”تراشے“ سے اقتباس مرسلاً تفسیر عباسی، بابر، اذکارہ

نہیں آرہے تھے اس لیے کہ وہ اس قسم کی باتیں سننے کے عادی ہو چکے تھے۔ اورنگ زیب ان کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے بے حد سردمہری سے انہیں مخاطب کیا۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”یہی سوچ رہے ہیں کہ کیا جواب دیں۔“ ایک دراز قد والے نے شانے اچکا کر کہا۔ ”ہمیں کس جرم میں یہاں لایا گیا ہے ہم یہ بھی نہیں جانتے۔“

”تمہارے قبضے سے جو بغیر لائسنس کا اسلحہ ملا ہے اس کے لیے کیا کہو گے؟“

”آپ کس اسلحہ کی بات کر رہے ہیں؟“ دوسرے

نہیں کیا؟ ایسی کیا مصلحت تھی جس نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا یا..... اسے بھی الماس کے انگوٹھے کا علم بعد میں کسی اور ذریعے سے ہوا..... وہ ذریعہ کیا تھا.....؟

نقصان مار چرسل کے ساؤنڈ پروف کمرے میں وہ تمام خطرناک اور ضروری سامان موجود تھا جو کسی مجرم کی زبان کھلوانے کے لیے بہت موثر ہو سکتا تھا۔

کمرے میں ایس بی اورنگ زیب اور دو دیگر اہلکاروں کے علاوہ چاروں مجرم بھی تھے جنہیں شیخ حامد کے بیٹے کے باہر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ چاروں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے، دوسرے کار کے اہلکار بھی ان کی پشت پر موجود تھے جو افسران ڈیوٹی کے احکامات پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے کے عادی تھے، مزمان کی چیخ و پکار اور دم توڑتی سکیوں پر بھی وہ ہمیشہ گونگے اور بہرے خاموش کمرے رہتے تھے، وہ موت اور زندگی کے اس ہولناک کھیل کو دیکھتے دیکھتے اس کے عادی ہو چکے تھے۔

اورنگ زیب کی خوشنظریں ان چاروں کو باری بار دیکھ رہی تھیں جو بے ظاہر بے پروائی نظر آرہے تھے۔ دس منٹ تک ان کے درمیان ایک خاموش اور اعصاب شکن جنگ جاری رہی پھر اورنگ زیب نے ان چاروں کو بیک وقت انتہائی سفاک لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اس حقیقت سے ضرور واقف ہو گے کہ تمہیں کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے اور..... اس مہمان خانے میں کس مقصد کے تحت لایا گیا ہے؟ ایک بات اور بھی کان کھول کر سن لو..... میں کسی کے رعب میں آنے والا آفسیر نہیں ہوں۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں، یا تو شرافت سے کھل کر میرے سوال کے جواب دو۔ تعاون کی صورت میں تمہارے ساتھ نرم سلوک بھی ہو سکتا ہے۔ کسی کی پشت پناہی کے ٹھمنڈ میں رہے تو دردناک موت تمہارا مقدر بھی بن سکتی ہے۔ فی الحال کسی کے پاس کوئی دستاویز ثبوت بھی نہیں ہے کہ تمہیں حراست میں لیا گیا تھا۔ اس لیے کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہونا۔ تمہیں پوچھنے والوں کو تمہاری قبر کا نشان بھی نہیں ملے گا۔ میں مردوں کی طرح کھل کر تم سے دونوں بات کروں گا۔ تمہاری عافیت بھی اسی میں ہے کہ کسی آنا کانی سے کام نہ لینا، تعاون کرنے کی صورت میں، میں تمہارے کسی کام آنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ یہ کی پولیس آفسر کا نہیں، ایک مرد کا وعدہ ہے۔“

وہ چاروں اس کی بات توجہ سے سنتے رہے، انہوں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا، بے ظاہر وہ ہراساں یا خوفزدہ بھی نظر

گیا، گولی اس کی گردن کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی، تیسرے سادہ لباس والے نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا، اس کے گرتے ہی سیاہ پک اپ حرکت میں آ کر تیزی سے موقع واردات سے فرار ہو گئی، الماس گم صم کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی جب شاہنگ مرکز کے ڈیوٹی گارڈز کے علاوہ پولیس کی ایک موبائل بھی سائرن بجاتی سامنے آ گئی۔ شاید کسی نے اس موبائل کو خطرے کی اطلاع دے دی تھی۔

الماس نے سکون کا سانس لیا لیکن اسی وقت دوسرا ڈیوٹی گارڈز لیاقت حسین کو تشدد کا نشانہ بناتے مھیش کر پولیس کی طرف لے آئے۔ اسے پولیس کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

”یہ ہے وہ..... جو بے گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہا تھا.....“ پولیس والوں نے سب سے پہلے لیاقت کو مھیش کر موبائل میں ڈالا، اس کے پستول کو قبضے میں لیا پھر الماس سے بولے۔

”آپ کو ہمارے ساتھ ملحقہ تھانے تک چلنا ہوگا۔“ الماس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ وہ اپنا تفصیلی تعارف کراوے لیکن اس نے مجمع میں اپنی تشہیر مناسب نہیں سمجھی، خاموشی سے قدم اٹھاتی اگلی نشست پر موبائل کے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لیاقت حسین نے بھی گرفتاری کے بعد کوئی احتجاج نہیں کیا تھا، اس کو قابو کرنے والوں نے اس کا لباس پھاڑ ڈالا تھا، جو گت بنائی تھی وہ بھی قابل رحم تھی مگر اس نے بھی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالا تھا۔

موبائل کے حرکت میں آتے ہی الماس کا ذہن بھی تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس کے دماغ میں کئی پرسرار سوالات ابھر رہے تھے۔ لیاقت حسین کو اس کے انگوٹھے جانے کی اطلاع کس طرح ہوئی.....؟ اس نے اچانک ان چاروں انگوٹھ کرنے والوں کو موت کے گھاٹ کیوں اتار دیا؟ ایک بھی زندہ ہاتھ آ جاتا تو پولیس اس کو زبان کھولنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ پشت پر کام کرنے والا ہاتھ بھی بے نقاب ہو جاتا۔ کیا لیاقت حسین اتنا ہی دیوانہ ہو گیا تھا کہ اس نے اس اہم نکتے پر بھی غور نہیں کیا..... پہلی بار بھی الماس کو انگوٹھ کرنے والوں سے بچانے میں لیاقت حسین کا ہاتھ تھا..... اس بار بھی یہی کام آیا..... اس نے عین وقت پر الماس کے ساتھ جا کر فرحین کے لیے سامان خریدنے والی بات یوں کی تھی؟ کیا اسے پہلے سے علم تھا کہ کیا سچویشن پیش آ سکتی ہے؟ اگر ایسا تھا تو اس نے قبل از وقت اس خدشے کا اظہار کیوں

”جس گاڑی میں آئی ہوں اس کے ساتھ ایک دوسری کار بھی میری حفاظت کے لیے موجود تھی۔“ الماس نے قدرے دہنگ لہجے میں کہا۔ ”نیچے پہنچ کر کیا صورت پیش آئے گی۔ اس کا اندازہ ابھی سے لگا لو۔“

”تمہارا طریقہ اختیار کرنے کا دور گزر چکا ہے میڈم۔“ ٹرائی چلانے والے نے سادگی سے کہا۔ ”آپ کے گھر سے نکلنے کے بعد ہمارے آدمی آپ کی نگرانی کرتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔ پھر بھی، اگر آپ کا خواب سچا ہوا تو ہم بھی اس کا بندوبست کر چکے ہیں۔“

باتیں کرتے ہوئے وہ لفٹ تک آ گئے۔ الماس کے ستارے شاید گردش ہی میں تھے کہ لفٹ میں اس کے ٹرائی والے اور اس کے تین سادہ لباس والوں کے ساتھ صرف دو خواتین اور ایک بچہ ہی سوار ہوا تھا، ان سے کچھ مدد کرنے کی درخواست ان کے حق میں بھی جان لیوا ہو سکتی تھی۔ نیچے پہنچ کر ٹرائی والے نے وہ راستہ اختیار کیا جس کو صرف یونیفارم والے ملازم ہی کسی مخصوص کسٹر کے ساتھ اختیار کر سکتے تھے، باقی تین سادہ لباس والے بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

دو پہر کا وقت ہونے کے سبب باہر زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ لیاقت حسین کی موجودگی بھی صرف اسی صورت میں ممکن تھی جب الماس نے اسے اپنی واپسی کی اطلاع دی ہوتی۔ شاہنگ مرکز سے ان کے باہر نکلنے ہی ایک سیاہ رنگ کی پک اپ ان کے قریب آ کر رکی۔

”آپ کی سواری حاضر ہے میڈم۔“ ٹرائی والے نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”آپ تشریف رکھیں۔ ہم ٹرائی کا سامان اتارتے ہیں۔“

الماس نے حیرت بھری نظروں سے دیکھا، سیاہ پک اپ کو دیکھ کر اب اسے اپنا انجام بھی تاریک ہی نظر آرہا تھا۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا کہ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ ایک لمحہ تامل کرنے کے بعد اس نے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ قریب موجود تین سادہ لباس والوں میں سے ایک کراہتا ہوا گرا۔ اس کی بائیں کتہی سے خون کا فوارا ابل رہا تھا، دوسرے ساتھیوں کے چوکتے ہی ایک اور کسی بے آواز اسلحہ سے چلائی جانے والی گولی کا شکار ہو کر اوندھے منہ ڈھیر ہو گیا۔ جو کسٹر باہر موجود تھے، ان کو دو آدمیوں کے مرنے کا احساس ہوا تو ان کے درمیان بھکڑ مچ گئی۔ ٹرائی والا لپک کر الماس کے قریب آیا۔ الماس کا ہاتھ تمام کراس نے پک اپ کی جانب جانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی ڈکراتا ہوا موت کے منہ میں چلا

نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”ہم اس وقت آپ کے قبضے میں ہیں، آپ جو چاہے الزام ہمارے سر چھو دیں لیکن عدالت میں ہمارا بیان یہی ہوگا کہ.....“

”شٹ اپ.....“ اورنگ زیب نے گرج کر جواب دیا۔ ”پرانے اور مجھے بڑے ہتھکنڈوں کو بھول جاؤ۔ شرافت کی زبان نہیں سنو گے تو تمہارا عدالت تک جانے کا خواب بھی تمہارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب.....“ تیسرے نے بھی اپنے دو ساتھیوں کی طرح بے جگری سے کہا۔ ”پھر..... آپ بولتے رہیں، ہم سنتے رہیں گے۔“

”کیا تمہارا بھی یہی جواب ہے؟“ اورنگ زیب نے چوتھے کو سفاک نظروں سے گھورا۔

”میں تسلیم کرتا ہوں سر کہ میں نے گولیاں چلائی تھیں لیکن کسی کو مارنا نہیں، صرف خوفزدہ کرنا مقصود تھا۔“

اس کے جواب پر اورنگ زیب کے علاوہ باقی تین بھی چونکے تھے۔ چوتھے آدمی کو ان تینوں نے بڑی حقارت سے گھورا تھا۔ اورنگ زیب کو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ چوتھا شخص جو درمیانہ قد اور دہرے جسم کا مالک تھا اس کا تعلق باقی تینوں میں سے نہیں تھا۔

”تم نے کس کو خوفزدہ کرنے کی خاطر گولیاں چلائی تھیں.....؟“

”ابھی نمود کو جس نے سب کا جینا حرام کر دیا ہے۔“ اس بار بھی تلخ لہجے میں جواب دیا گیا۔ اس نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن اورنگ زیب سمجھ گیا کہ نمود کے حوالے سے اس کا اشارہ شیخ حامد ہی کی طرف تھا۔ ساتھ کھڑے ہوئے باقی تینوں بہ دستوراً سے نفرت سے دیکھ رہے تھے۔

”تمہارا تعلق کس گروپ سے ہے.....؟“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ اس بار انداز جارحانہ نہیں تھا۔

چوتھے فرد نے باقی تینوں کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ اورنگ زیب نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر اس نے ایک اہلکار کو اشارہ کیا کہ چوتھے شخص کو سائڈ روم میں منتقل کر دیا جائے۔ اورنگ زیب کے حکم کی تعمیل کرنے کے بعد وہ دوبارہ واپس آگیا۔

”اب تم تینوں کیا کہو گے.....؟“ ”ہم نے ان حرامیوں کو مارنے کی کوشش کی تھی جو بچلے پر حملے کے ارادے سے آئے تھے۔“ تینوں میں سے ایک نے تلخ انداز میں کہا۔

”کس کے بچلے کی بات کر رہے ہو؟“

”یہ تم بھی جانتے ہو..... پھر ہم سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“ دوسرے ساتھی نے چمک کر کہا۔ ”ہماری زبان پر اس کا نام مرتے دم تک نہیں آئے گا۔ تم بھی اپنے دل کی حسرت نکال کر دیکھ لو۔ تم سے پہلے جو افسران چھاتی ٹھونک کر سامنے آئے تھے۔ ایک تجربے کے بعد وہ بھی بھیگی ملی بن گئے تھے۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ”مجھے اب تمہارا جواب پسند آیا۔ تمہارے مشورے کے مطابق ایک تجربہ میں بھی ضرور کروں گا۔ بھیگی ملی کون بتا ہے اور شیر کون؟ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہو جائے گا اور تمہیں پھیلی لگانے والے کو بھی۔“

پھر اورنگ زیب کے حکم پر ان تینوں کو زندہ کر کے چھت سے لنگتی زنجیروں میں باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ خود وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بڑے سکون سے بولا۔ ”جب انتڑیاں باہر آنے لگیں تو بتا دینا۔ رعایت کی گنجائش تمہاری زبان کھولنے سے مشروط ہوگی۔“

”پھر سوچ لو آفیسر.....“ ایک نے تمللا کر کہا۔ ”تمہیں یہ کارروائی بہت مہنگی پڑے گی۔“

اورنگ زیب نے اس کے جواب میں سادہ لباس اہلکاروں کو دوسرا حکم دیا جس کے بعد ان کے سروں کے نیچے گیس کے برز آن کر دیے گئے۔ ”ہم نے زبان کھول دی تب بھی تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے ہم جس کے لیے کام کرتے ہیں۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”پریشان مت ہو.....“ اورنگ زیب نے اپنی دہائی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”ہر پندرہ منٹ بعد آگ کی توتیز اور تمہاری زنجیریں نیچے ہوتی رہیں گی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم فر فر بولنے لگو گے۔“

تینوں نے زبانیں بند رکھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ ان کے فضا میں معلق جسموں اور بھڑکتی آگ کی لپٹوں کا فاصلہ کم ہوتا رہا، تین منٹ بعد ان کے چہرے سرخ ہونے لگے، انہوں نے اپنا منہ بند کر رکھا تھا لیکن حالت بتدریج غیر ہوتی جا رہی تھی پھر پندرہ منٹ بعد ایک چیخنے لگا۔ ”بگ باس کو خبر ہوگئی تو تمہارا انجام ہم سے بھی بھیا نک ہوگا۔ اب بھی وقت ہے تمہارے پاس۔“

”پر دامت کرو، میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے تو تینوں ہی کی حالت غیر

ککشول

ہونے لگی، ان کے منہ شدت تکلیف سے کھل گئے، کھایا پیا باہر آنے لگا تو ایک نے چیخ کر کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“ ”مجھے بھیگی بلایا یاد آ رہی ہیں..... تم بھی اپنے آدم خور کو پکارو۔“

”ہم مر جائیں گے لیکن زبان نہیں کھولیں گے۔“ دوسرا تڑپتے ہوئے بولا۔

”تم مرد کے بچے ہو تو اپنے پالتو کتوں سے کہو کہ ہمیں گولیاں مار دیں۔“ تیسرا بلبلانے لگا۔

اورنگ زیب نے زبان نہیں کھولی، بھڑکتی آگ اور تین لٹکے ہوئے مجرموں کے درمیان کشمکش جاری تھی جب ڈی آئی جی کمرے میں داخل ہوا، اس نے تینوں مجرموں پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالی پھر سادہ لباس والوں کو عمل روکنے کا اشارہ کر کے اورنگ زیب کو لے کر باہر چلا گیا۔

”چوتھا مجرم کہاں ہے؟“ اس نے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

”اس نے زبان کھول دی ہے۔ میں اس کا بیان بعد میں لوں گا۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تینوں حرامزادے جو فضا میں پھل رہے ہیں..... شیخ حامد کے ذاتی پہرے دار ہیں جو گھر کی حفاظت پر مامور تھے، میں اس کے ایک آدمی کو ساتھ لایا ہوں، وہ ان کی شناخت کر لے گا۔“ ڈی آئی جی ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ سب پولیس کی وائٹ لسٹ پر بھی ہیں لیکن.....“ ”آپ انہیں چھوڑنا چاہتے ہیں؟“ اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ اس کے تیر بد لنے لگے تھے۔

”مصلحت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“ ڈی آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم میں کسی ایک کو یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ وہ ابھی تک اس باسٹرڈ کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے۔ اس طرح ہم اندر کی باتیں بھی معلوم کر سکیں گے۔ پلیز، مجھے غلط نہ سمجھیں۔ میں نے آپ لوگوں سے جو وعدہ کیا ہے اس پر بھی قائم رہنے کو تیار ہوں لیکن یہ بھی نہ بھولیں کہ میری اور سراج کی پہنچ وہاں تک نہیں ہے جہاں تک اس کی اور آپ کی ہے..... اب فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے، میں آپ پر ان تینوں کو چھوڑنے کی خاطر زور نہیں دوں گا۔“

اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کے انداز مخاطب کو اپنے تجربوں کی روشنی میں تولیا۔ وہ ہمار تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آغا منظور کو ہٹا کر کوئی دوسرا ڈی آئی جی مرکز سے تبدیل ہو کر آگیا تو اسے ایک دہشت گرد کی محاذ پر زور آزمائی کرنی پڑے گی۔ سراج کے

ساتھ بھی ایسی ہی کوئی صورت پیش آنے کے بعد وہ بالکل تنہا رہ جاتا۔ کچھ دیر غور و خوض کرنے کے بعد اس نے ڈی آئی جی سے کہا۔

”آپ چاہتے ہیں تو ان تینوں کو چھوڑ دیں، میں چوتھے مجرم کو لے کر جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لیے کارآمد ہو۔“

ڈی آئی جی نے سکون کا سانس لے کر اس کی تجویز منظور کر لی۔ اورنگ زیب نے دوبارہ ٹارچر روم میں قدم نہیں رکھا۔ چوتھے مجرم کو دوسری جانب سے بلا کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر تھانے کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر اس کا ذاتی گارڈ سادہ لباس میں موجود تھا۔

”تم کس کے آدمی ہو.....؟“ دس منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے چوتھے مجرم سے سوال کیا جو..... اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔

”آپ نے جگا کا نام ضرور سنا ہوگا۔“

”آئی۔ سی“ اورنگ زیب جگا کا نام سن کر چونکا پھر اس نے دوبارہ خشک لہجے میں سوال کیا۔

”کیا تمہیں صرف شیخ حامد کو ہراساں کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا؟“

”آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے صاحب۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”میرے ساتھ کچھ دوسرے ساتھی بھی تھے جو پولیس کے آنے سے پہلے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں بھاگتا تو شاید وہ تین، جو آپ کے قبضے میں ہیں مجھے زندہ نہ جانے دیتے۔“

”کیا تم ان کو جانتے ہو.....؟“

”ایک سے بہ خوبی واقف ہوں جو تینوں میں سب سے اہم ہے، اسے تین افراد کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا لیکن شیخ حامد کے خاص آدمیوں نے اسے دودھ کی کھٹی کی طرح قانون کے شکنجوں سے صاف بچالیا۔ اصل واروات کی فائلیں بھی غائب کر دی گئیں۔“ اس نے کچھ توقف سے پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ”شیخ حامد نے ایسے قاتلوں اور دہشت گردوں کی ٹیم بنا رکھی ہے، کچھ اور لوگ بھی میری نظر میں ہیں۔“

”جگا کہاں ہے؟ میں نے سنا ہے کہ وہ بھی کسی وجہ سے روپوش ہے۔“

”آپ نے غلط نہیں سنا صاحب..... وہ روپوش نہیں ہے لیکن قتل و غارت گری کے خلاف ہے اس لیے سامنے نہیں آ رہا۔ جس دن آگیا تو شیخ حامد کو بھی دن میں تارے نظر

سہولتوں کی فراہمی میں انسان ایسے آلات ایجاد کر بیٹھا ہے کہ جرائم کی دنیا میں حالات کے گرداب سے نکل ہی نہیں پاتا۔ یہ اور بات کہ کچھ لوگ مشق کے تسلسل سے مسائل کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔ اس کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ جو قانون کی مدد کرنے کے لیے غیر قانونی کام بھی بڑے قاعدے سے کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔ یہی انفرادی خوبی اس کی شہرت کا باعث بنی۔۔۔

شرعی

پیشہ کس چورس



نام نہاد فلاحی اداروں کی قلعی کھولتی ایک پراثر تحریر

فرسٹ سٹی سیونگ بینک کا ہیڈ کوارٹر لیکز ٹکسن ایونیو کی ایک عالیشان بلند و بالا عمارت میں واقع تھا۔ تیز رفتار لفٹ میں 56 ویں منزل پر جاتے ہوئے تک ویلوٹ سوچ رہا تھا کہ اس کی نوعمری کے زمانے کے مقابلے میں آج کل بینک اور ان کا انتظام کتنا بدل گیا ہے اور غالباً اسی کے ساتھ بینک لوٹنے کے طریقے بھی جس وقت وہ سیکریٹری کے ساتھ ایک کمپیوٹر روم سے گزر رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ اس مشینی دور میں اگر کوئی ان کمپیوٹروں کو دھوکا دے سکے تو اس کے لیے

”اور کون سے تمہاری کیا مراد ہے.....؟“
”مجھے اس کا نام نہیں معلوم جناب لیکن سنا ہے وہ کوئی بیوہ عورت ہے۔ وہ بھی سچ حامد سے کوئی پرانا حساب چکاتا کرتا چاہتی ہے۔ استاد کے آدمی اس عورت کے لیے بھی کام کرتے رہتے ہیں۔“

اورنگ زیب بیوہ عورت کے حوالے پر چونکا لیکن اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اکرم سے پوچھا۔
”اب تم کیا چاہتے ہو؟ قانون نے بہر حال تمہیں غیر قانونی حرکت میں ملوث پا کر گرفتار کیا ہے۔“

”آپ کے رحم و کرم پر ہوں صاحب..... چاہیں تو اندر کر دیں یا چھوڑ دیں۔ میں پھر پھر بھی نہیں کروں گا۔“
اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک سنان راستے کے درمیان روک دی، اکرم سے اترنے کو کہا تو وہ نیچے اترنے کے بعد ہاتھ باندھ کر بولا۔

”صاحب..... اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرا موبائل نمبر نوٹ کر لیں، کبھی ضرورت پڑے تو یاد کر لیجیے گا۔ میں آپ کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔“

اورنگ زیب نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر ڈیش بورڈ پر پڑے پیڈ کو اٹھا کر وہ کیٹینتھر کا موبائل نمبر نوٹ کر لیا۔
”میں آپ کا احسان بھی نہیں بھولوں گا صاحب۔“
اس نے اورنگ زیب سے کہا۔ ”کم از کم ایک بار اس خادم کو خدمت کا موقع ضرور دیجیے گا۔“
”تم نے کہا تھا کہ تم ان تینوں میں سے ایک کو جانتے ہو، جو سب سے اہم ہے؟“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا صاحب۔ اسی واقفیت کی وجہ سے اس نے مجھے جہنم رسید نہیں کیا۔ اب بھی پہلی فرصت میں وہ مجھے تلاش کر کے استاد تک پہنچنے کی کوشش ضرور کریں گے۔“
”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ اورنگ زیب نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”تم ان تینوں کے پتے ٹھکانے کا کھوج لگا کر مجھے بتاؤ گے۔ اس کے بعد باقی کام میرے ذمے ہوگا۔“
”آپ کا موبائل نمبر.....“

”میں خود تم سے ایک دوروز میں رابطہ قائم کروں گا۔“
اورنگ زیب نے سپاٹ آواز میں کہا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

آجائیں گے۔“
اورنگ زیب بہت دیر تک اس سے بڑی کارآمد باتیں معلوم کرتا رہا پھر بولا۔

”تمہارا نام کیا ہے.....؟“
”کبھی اکرم تھا صاحب لیکن اب وہ کیٹینتھر کے نام سے مشہور ہوں۔“ اکرم نے لمبی سانس لے کر جواب دیا۔
”مجھے بھی قانون کی نظروں میں مفرد سمجھا جا رہا ہے جو گاؤں سے بھاگ کر ادھر شہر میں آ گیا۔ جگانے پناہ نہ دی ہوتی تو شاید فاقوں سے تنگ آ کر مجرم بھی بن جاتا۔“
”کیا جرم تمہارے نام پر لگا تھا؟“

”گاؤں میں میری ایک پڑوس کی جوان لڑکی کا چکر تھا صاحب جسے زمیندار کے آدمی اغوا کر کے لے گئے تھے، میرا نام بلاوجہ لکھوا دیا گیا میں صاف انکاری ہو گیا تھا، جب اغوا میں ملوث نہیں تھا تو پھر ڈر بھی نہیں تھا لیکن..... آٹھ دس روز بعد اس لڑکی کی ادھڑی ہوئی اور روندی گئی لاش میرے گھر کے قریب کھیتوں میں ملی تو میں گرفتاری کے ڈر سے فرار ہو گیا۔“
”تمہارے گھر والوں کا کیا بتا ہوگا؟“ اورنگ زیب نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”گھر میں میرا رونے والا کون تھا صاحب، ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی تھی، وہ بھی مجھے اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود بھی اچلی نہیں تھی۔ زمیندار کے لڑکوں سے بھی اس نے چکر چلا رکھا تھا۔ اسی کے اشارے پر پڑوس کی لڑکی کو بھی اٹھوا لیا گیا تھا، میں فرار نہ ہوتا تو وہ میرا نام لینے سے دریغ نہ کرتی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا جگانے کے ہراساں کرنے کے بعد شیخ حامد اس کا پیچھا چھوڑ دے گا؟“
”کتے کی دم بھی سیدھی نہیں ہوئی جناب۔“ اکرم نے کسمسا کر کہا۔ ”یہی بات میں نے اور دوسرے ساتھیوں نے بھی استاد کی کھوپڑی میں بٹھانے کی کوشش کی تھی ایک بار تخت یا تختہ والا کھیل کر لیں۔ جو جیتے وہی سکندر۔ لیکن استاد نے ہماری بات نہیں مانی۔“

”پھر تم لوگوں نے بلاوجہ خود کو خطرے میں ڈالنے کی غلطی کیوں کی؟“ اس بار اورنگ زیب نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا صاحب۔“ اکرم نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”سچ کیا ہے یہ اوپر ہی والے کو معلوم ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ استاد نے یہ ہراساں کرنے والا قدم کسی اور کے مشورے پر اٹھایا ہے۔“

کسی ہتھیار اور تشدد کے استعمال کے بغیر بڑی سے بڑی رقم چرانا کس قدر آسان ہوگا۔ بینک کی طرح بینک کے صدر فلپ نارٹن کا دفتر بھی پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ فلپ نارٹن دورِ حاضر کا ایک کامیاب بینکر ہی نہیں سیاست کے میدان میں تیزی سے ترقی کرتا ہوا ایک ذہین و خوبصورت سیاستدان بھی تھا۔ اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا وہ خاصا نمایاں اور ممتاز نظر آ رہا تھا۔

”تمہارا نام نک ویلوٹ ہے؟“ اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ”تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا ہے۔“

نک مسکراتے ہوئے پیش کردہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ تم نے کس سے سنا ہوگا مجھے معلوم نہیں کہ اب میری شہرت بینکاروں کے حلقوں تک بھی پہنچ چکی ہے۔“

”آج کل بینکروں کو ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے“ نارٹن نے کہا۔ ”ہر وہ شخص جس کے پاس کچھ دولت ہے کسی نہ کسی انداز میں بینک سے متعلق ضرور ہوتا ہے اور پھر ہم تو اس بارے میں بھی بہت سے سوالات نہیں کرتے کہ جو روپیہ جمع کرایا جا رہا ہے وہ کہاں سے آیا۔ لیکن یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ میں نے تمہیں ایک خاص مشورے کے لیے زحمت دی ہے اور میں تمہارے وقت کی پوری قیمت دینے کے لیے آمادہ ہوں۔“

”مشورہ!“ نک نے چونک کر پوچھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس بات کی توقع کی جا رہی ہے۔

”میں اپنی خدمات معاوضے پر دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور جب تم نے مجھے بلایا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں میری خدمات کی نوعیت بھی معلوم ہوگی؟“

”جانتا ہوں۔“ نارٹن بولا ”تم معمولی اور بے قیمت چیزیں چراتے ہو اور اس کے لیے تمہاری فیس بیس ہزار ڈالر ہے۔“

”اب میری فیس پچیس ہزار ہے۔ گرانی اور زندگی کی بڑھتی ہوئی قدروں نے آخر کار مجھے بھی اپنی فیس میں اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”فیس کچھ بھی ہو مجھے تمہاری خدمات کی نہیں تمہاری ماہراندہ رائے کی ضرورت ہے۔ میری ایک چیز چرائی گئی ہے۔ ایک بے قیمت شے..... اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟“

”میں کوئی جاسوس یا سراغ رساں نہیں ہوں مسٹر نارٹن۔“

”لیکن اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی طویل مدت میں تمہیں ایسی بے شمار وجوہات سے سابقہ پڑا ہوگا جو معمولی اور بے حقیقت چیزیں چرانے کا مقصد رہی ہوں۔“

”چرایا کیا گیا ہے؟ نک نے پوچھا۔

”میری میز پر رکھی رہنے والی شیشے کی ایک بھاری ایش ٹرے۔“

”کچھ معلوم ہے کہ اسے کس نے چرایا؟“

”ہاں۔ مگر میں یہ نہیں جانتا۔ کہ کیوں چرایا۔ وہ اس وقت غائب ہوئی جب میں ایک مذہبی شخصیت پادری فیلکس میبی سے گفتگو کر رہا تھا۔ صرف وہ ہی اسے چرا کر لے جاسکتا تھا۔“

”ایش ٹرے کس طرح کی تھی؟“

”اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس طرح کی ایش ٹرے عام ملتی ہے۔ شفاف شیشے کی مربع نما جس میں راکھ جھاڑنے کے لیے دائرہ نما گڑھا بناتا تھا۔ وہ اندازاً پانچ انچ چوڑی اتنی ہی لمبی اور دو انچ موٹی تھی۔“

”کچھ پادری میبی کے بارے میں بتاؤ۔“

”اس کا پورا نام فیلکس میبی ہے۔ وہ دن ٹرو ہوپ نامی چرچ کا منتظم اعلیٰ ہے۔ یہ چرچ لاٹک آئی لینڈ پر واقع ہے۔ پادری میبی ایک دوسرا چرچ بنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں بینک سے قرضہ لینے کے لیے آیا تھا۔“

”تم بینک کے صدر ہو کیا قرض وغیرہ جیسے معاملات نمٹنے کے لیے بینک میں کوئی علیحدہ افسر نہیں ہے؟“

”دراصل میرے ایک دوست نے سفارش کی تھی کہ میں اسے ملاقات کا موقع دوں۔“ نارٹن نے جواب دیا۔ ”شاید میری غلطی تھی۔ آخر میں نے اسے بینک کے قرض منظور کرنے والے افسر کے پاس بھجوا دیا لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اسے قرض نہیں دے سکیں گے۔“

”اس نے کتنے قرض کی درخواست کی تھی؟“ نک نے پوچھا۔

”ڈھائی لاکھ ڈالر، جب کہ اس کے پاس چرچ کے نام کے علاوہ کوئی ضمانت بھی نہیں۔ اس کی درخواست ہرگز منظور نہیں ہوگی۔“

”کیا وہ ایش ٹرے اپنے کوٹ کے اندر چھپا کر لے گیا؟“

”ایسا ہی ہوا ہوگا۔ میں سگریٹ نہ بھی پی رہا ہوں تب بھی باتیں کرتے ہوئے عموماً اس سے کھیلتا رہتا ہوں۔ جیسے ہی وہ گیا میں نے دیکھا کہ ایش ٹرے غائب ہو چکی ہے۔“

”اس وقت ٹرے میں راکھ وغیرہ تو ہوگی؟“

”ممکن ہے ایک آدھ ٹوٹا پڑا ہو۔ آج کل میں سگریٹ کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ سگریٹ پیتا ہی نہیں۔“

”راکھ کے علاوہ کوئی چیز مثلاً کوئی پھٹا ہوا کاغذ کی بینک کا ٹکڑا وغیرہ؟“

”نہیں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔“

”کیا اس پر بینک کا نام یا نشان کندہ تھا؟“

”نہیں۔“

”اس واقعے کو کتنا وقت گزر چکا؟“

”تین دن۔ گزشتہ پیر کا واقعہ ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس معاملے میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ نک نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ شاید وہ چیزیں چرانے کی بیماری میں مبتلا ہوگا۔“

”تمہارے تجربے میں ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا؟“

”بالکل نہیں۔“

”مجھے تو امید تھی کہ تم سے اس معاملے میں مفید مدد مل سکتی ہے۔“ نارٹن نے کچھ مایوسی سے کہا۔

”کاش میں کچھ کر سکتا۔“ نک نے کہا۔ ”لیکن جیسا کہ میں نے بتایا میں کوئی سراغ رساں نہیں ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”ممکن ہے کبھی کوئی ایسی بات پیش آئے جس کا میری لائن سے کوئی تعلق ہو تب میں بڑی خوشی سے تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ نارٹن بھی کھڑا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر ہچکچا رہا ہو۔

نک ویلوٹ دروازے تک گیا۔ ابھی اس کا ہاتھ ہینڈل تک ہی پہنچا تھا کہ نارٹن کی آواز سنائی دی وہ بہت آہستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اگر تم پادری میبی سے وہ ایش ٹرے چرا کر لا دو تو میں تمہیں پچیس ہزار ڈالر زینے کے لیے تیار ہوں۔“

☆☆☆☆

نک ویلوٹ کبھی اپنے موٹوں سے ان کے مقصد کے بارے میں سوالات نہیں کرتا تھا اور نہ اس نے نارٹن سے ہی پوچھا کہ اسے اس بے حقیقت ایش ٹرے کی ایسی کیا ضرورت ہے کہ اس کے لیے اتنی رقم خرچ کرنے کے لیے آمادہ ہے۔

نک نے اس کام کو بھی اسی طرح قبول کر لیا جس طرح وہ پہلے بھی اس نوعیت کے کام لیتا رہا تھا۔ مطلوبہ چیز لانے کا وعدہ کیا اور پادری فیلکس میبی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا جو کوئی ایسا دشوار کام ثابت نہیں ہوا۔ چرچ دن ٹرو ہوپ کو فون کرنے ہی سے اس کا کام بن گیا اور پادری میبی نے اسی سہ پہر اسے ملاقات کے لیے وقت دے دیا۔

لیکن جب نک ویلوٹ دو بجے دن کے قریب چرچ پہنچا تو اسے توقع سے زیادہ معلومات ہاتھ آ گئیں۔ ایک سرخ بالوں والی لڑکی اپنے کندھے سے ایک ٹیپ ریکارڈر لٹکائے چرچ کے چوکیدار سے اندر جانے کے لیے الجھ رہی تھی۔

”تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرا نام لارنس ہے۔ میرا تعلق ایک ٹی وی چینل نمبر چھ کی خبروں کے شعبہ سے ہے اور میں یہاں انٹرویو لینے آئی ہوں۔“

”آج کوئی انٹرویو نہیں ہوگا۔“ چوکیدار نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی قدم پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ نک نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری جانب ایک ٹی وی کیمرا میں اپنا کیمرا اٹھائے۔ یہ سارا منظر محفوظ کرنے میں مصروف ہے۔

چوکیدار نے دروازہ بند کر لیا اور اسی کے ساتھ کیمرا بھی رک گیا۔ نک لڑکی کی طرف بڑھا۔

”یہاں کے لوگوں کا رویہ کچھ زیادہ دوستانہ نہیں کیوں؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے لٹکے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو سنبھالا۔ اور پھر بڑی سست مسکراہٹ چہرے پر لیے نک کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کیا تم پادری میبی کے پاس کسی کام سے آئے ہو؟“ اس نے کہا اور جواب ریکارڈ کرنے کے لیے مائکروفون آگے بڑھا دیا۔ نک جو اپنے ایک حالیہ کیس میں ایک کالم نگار عورت سے الجھ چکا تھا۔ پھر دوبارہ کسی ایسی ہی ٹکر کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

”نو کمنٹ۔ کوئی تبصرہ نہیں۔“ اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

”کیا تم پادری میبی سے چرچ کو دی جانے والی ٹیکس کی چھوٹ کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہو؟“ لارنس نے دوسرا سوال کیا نک کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے پر اندر چلا گیا۔ چوکیدار نے سیٹریوں کی طرف اشارہ کیا۔

”بالائی منزل۔ دائیں جانب پہلا کمر پادری صاحب کا آفس ہے۔“ وہ بولا۔

پادری فیلکس میبی نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے نک کا استقبال کیا اور ایک آرام دہ کرسی پیش کی۔ نک

سسپنس ڈائجسٹ جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ جولائی 2012ء

نے بیٹھے ہوئے سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھا۔ دفتر میں ایک جانب ایک کوریم میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔
”تم نے فون پر ہمارے پاکیزہ مقصد کے لیے کسی ممکنہ امداد کے بارے میں کچھ کہا تھا۔“ پادری میبی نے گفتگو شروع کی۔

نک نے میز پر دیکھا لیکن وہاں نارٹن کی ایشن ٹرے نظر نہیں آئی۔

”میں ایک ایسے فرد کی نمائندگی کر رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”جو اس سلسلے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن دروازے پر ایک جھگڑا ہو رہا تھا جو مجھے کچھ پسند نہیں آیا۔ آخر کیا معاملہ تھا؟“

”کوئی خاص بات نہیں تھی۔ رپورٹر مجھے ہمیشہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں یہ لوگ دن ٹرو ہو پ چرچ کو بھی مغربی ساحل پر واقع ان اداروں کی طرح قیاس کرتے ہیں جہاں ہر قسم کی بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں ہے۔“

”تمہارے اس چرچ سے کتنے لوگ وابستہ ہیں؟“ نک ویلوٹ نے پوچھا۔

”اس علاقے میں کم و بیش دو سو اور قومی پیمانے پر لگ بھگ سات سو افراد۔“ پادری میبی نے جواب دیا۔

”یہ تو کچھ زیادہ نہیں۔“ ”مگر ہمارے ممبر تبلیغی جذبے سے سرشار ہیں۔“

پادری میبی نے کہا ”ہمیں امید ہے کہ ہم سب اپنی مشترکہ جدوجہد سے آئندہ دس سال میں دس لاکھ افراد کو مسیحیت کے دامن میں لے آئیں گے؟“

نک نے بڑے سرسری انداز میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

”کیا تمہارے پاس کوئی ایشن ٹرے نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”براہ کرم سگریٹ نہ پینا۔“ پادری میبی نے جلدی سے کہا۔ ”یہ ہمارے چرچ کے اصول کے خلاف ہے۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ نک نے پیکٹ واپس جیب میں رکھ لیا وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایشن ٹرے اسی اصول کی وجہ سے چرائی گئی ہو۔ مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ کوئی لوگوں کو سگریٹ نوشی سے روکنے کے لیے ان کی ایشن ٹرے نہیں چرایا کرتا۔

”ہم نے اپنے چرچ کے لیے کئی مفید اور عظیم منصوبے بنائے ہیں۔“ پادری میبی کہہ رہا تھا۔ ”اور ہمیں اس عظیم مقصد

کے لیے لوگوں کے عطیات کی ضرورت ہے۔“

”اگر تمہارے ممبران کی اس تیز رفتاری سے بڑھنے کی توقع ہے تب تو یہ موجودہ چرچ تمہارے لیے چھوٹا پڑے گا۔“ نک نے کہا۔

”یقیناً۔“ پادری میبی نے جوش میں کہا ”ایک نئے چرچ کی تعمیر ہمارے ایجنڈے پر سب سے پہلا کام ہے مگر سوال اخراجات کا ہے۔“

”تم نے قرض لینے کو شش نہیں کی؟“

”ہاں مگر بینک قرض دینے میں ہچکچاہٹ ہے۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرسٹ سٹی سیونگ بینک کی پالیسی ایسے قرضہ جات کے سلسلہ میں کافی نرم ہے۔“

”ہم نے وہاں بھی قرض کی درخواست دے رکھی ہے مگر کامیابی کی زیادہ امید نہیں۔ میں خود اس ہفتے کے شروع میں بینک کے صدر سے ملا تھا۔ مجھے وہ کوئی ایسا آدمی محسوس نہیں ہوا جو خدا کی خوشنودی کے لیے کوئی کام کرنے پر تیار ہو جائے۔“

نک ویلوٹ کے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ یہ پادری اپنے مقصد میں کس حد تک سنجیدہ ہے۔ اپنے زمانے میں اسے بہت سے فریبی اور جلسا ساز افراد سے سابقہ پیش آیا تھا اور ان میں یقیناً اے لے لوگ بھی تھے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں شکار کھیلا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ممکن تھا کہ پادری میبی ان سے مختلف ہو ممکن ہے اس نے نارٹن کی ایشن ٹرے اپنی مذہبی مجالس کے دوران لوہان واگر سلگانے کے لیے چرائی ہو۔ مزید کچھ دیر کی گفتگو کے بعد نک اس وعدے کی ساتھ رخصت ہو گیا کہ وہ اس ممکنہ عطیہ کے سلسلے میں جلد ہی دوبارہ رابطہ قائم کرے گا۔ پادری بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ وہ دروازے تک نک کو چھوڑنے گیا۔

چرچ سے باہر نکلنے کے بعد نک ویلوٹ کا سامنا ایک بار پھر اسی لڑکی لان لارنس سے ہو گیا۔ اور اسے اس پر کوئی حیرت بھی نہیں ہوئی کہ لان لارنس اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”دیکھو؟“ وہ اپنے دونوں ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی مائکروفون نہیں ہے۔“

”کیا تم اب مجھ سے گفتگو کرنا پسند کرو گے؟“ ”کس بارے میں؟“ نک نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”پادری میبی کے بارے میں۔“ لان لارنس نے جواب دیا۔ ”تم اس کے پاس کس کام سے آئے تھے؟“

”یہ ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔“

”وہ ایک چھٹا ہوا جلسا ساز آدمی ہے۔ تم جانتے ہو؟“ ”اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھا جائے تب تو وہ کوئی ولی معلوم ہوتا ہے۔“ نک نے جواب دیا۔

”اس طرح میرا ظاہری حلیہ تو غالباً تمہیں کسی سوسائٹی گرل کی طرح نظر آ رہا ہو گا لیکن میں ایسی نہیں ہوں۔“ لان لارنس نے کہا۔ ”حکومت کے چھ سے زیادہ ادارے فیکٹس میبی کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ چرچ کو دی گئی ٹیکس کی چھوٹ واپس لے لی جائے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ چرچ کو ملنے والے چندے اور عطیات کا بڑا حصہ پادری میبی کی اپنی جیب میں جاتا ہے۔“ ”اگر ایسا ہے تو وہ کوئی پہلا فرد نہیں ہو گا۔“ نک نے کار میں بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حکام ہمیشہ مذہبی اداروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہچکچاتے ہیں خواہ مالی اعتبار سے وہاں کیسی ہی بدعنوانیاں کیوں نہ ہو رہی ہوں۔“

”یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد اور اداروں کو بے نقاب کرنے کا فرض پریس پر عائد ہوتا ہے۔“

”میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔“ نک نے مسکراتے ہوئے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔

☆☆☆☆

گلو یا مکان کے عقبی باغیچے میں کچھ پودے لگا رہی تھی نک کو دیکھ کر وہ اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”کہو اپنے موکل سے ملاقات کیسی رہی؟“ اس نے پوچھا۔

”جیسی ہمیشہ رہتی ہے۔“ نک نے بتایا۔ ”وہ ایک بینکر ہے، میں نے تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی فیس میں پانچ ہزار ڈالر کا اضافہ کر دیا ہے۔“

”بہت اچھا کیا۔ کوئی خطرناک کام تو نہیں ہے۔“ ”بالکل نہیں۔“ نک نے اطمینان دلایا۔

جب سے گلو یا کو نک کے حقیقی بیٹے کا پتا چلا تھا وہ کبھی زیادہ سوالات نہیں کرتی تھی لیکن کبھی وہ یہ اطمینان کرنا ضروری سمجھتی تھی کہ نک کسی خطرناک مہم میں تو نہیں الجھا ہوا ہے۔ نک نے اندر جا کر ڈاک دیکھی لیکن اس میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ ایک لفافہ اسٹار سکیورٹی سسٹم کی جانب سے تھا۔ اپنے بیٹے کے تقاضے کے مطابق نک قتل اور الارم سازی کی صنعت میں تازہ ترین جدت سے باخبر رہنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اسے اس

بارے میں مختلف اداروں کی جانب سے لٹریچر ملتا رہے۔ اس لفافے میں جو پمفلٹ ملفوف تھا، اس کے مطابق ایسے قتل بنائے گئے تھے جو چابی کے بجائے مقناطیسی نوعیت رکھنے والے کارڈ سے کھلا کرتے تھے نک نے یہ معلومات پڑھنے کے بعد کچھ دیر غور کیا اور پھر پمفلٹ میں دیے ہوئے فون نمبر کو ڈائل کیا جو کہ جری کا تھا۔

رابطہ قائم ہونے پر نک نے سیلز منیجر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب وہ فون پر آیا تو نک نے ایک فرضی نام سے اپنا تعارف کرایا۔

”میں ابھی تمہارا پمفلٹ دیکھ رہا تھا۔“ اس نے بتایا ”خاص طور سے وہ قتل جو مقناطیسی کارڈ سے کھل جاتے ہیں۔“

”درست ہے۔“ سیلز منیجر نے جواب دیا۔ ”آج کل ان تالوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔“

”مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کہیں ایک الیکٹرانک قتل کے بارے میں پڑھا تھا جو کہ صرف نشان انگشت سے ہی کھل سکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟“

”یقیناً۔ دستخط یا پھر انگلی کا نشان۔ اس کا اصول بہت سادہ ہے۔ جب دو ایک جیسے نشانات مل جاتے ہیں تو قتل کھل جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں انگلی کا نشان دستخط سے زیادہ مفید اور کارآمد رہتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص

ایک ہی طرح کے دو دستخط نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو لوگ دستخط کو ترجیح دیتے ہیں انہیں نمونے کے دستخط کا ایک کارڈ اپنے پاس رکھنا پڑتا ہے اور یہ صورت تحفظ کے نقطہ نظر سے زیادہ بہتر نہیں۔“

”کیا تم انگلی کے نشانات والے قتل تیار کرتے ہو؟“ ”نہیں۔ یہ بہت زیادہ مہنگے ہوتے ہیں اور چند خاص

کہنیاں ہی تیار کرتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہیں ایک فرم کا پتا دے سکتا ہوں۔ اس وقت دیر ہوئی ہے پھر بھی شاید ان کے دفتر میں کوئی موجود ہو۔“

مزید تین فون کالیں اور نصف گھنٹا خرچ کرنے کے بعد نک کو مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں۔ ایسے بتایا گیا کہ ایک ایسا ہی انگلی کے نشان سے کھلنے والا قتل فرسٹ سٹی سیونگ بینک نیویارک کو فروخت کیا گیا ہے، جواب دینے والے نے کہا کہ اسے افسوس ہے مگر اس شخص میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ مگر نک کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے ریسورر کھ دیا۔ اگلی صبح وہ ایک بار پھر بینکر فلپ نارٹن کے آفس میں موجود تھا۔ نارٹن اسے دیکھ

کر خوش ہوا اور فوراً ہی موضوع پر آگیا۔

”کیا تم میری ایٹھ ٹرے لے آئے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ نک نے جواب دیا۔ ”مگر میں نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اسے کیوں چرایا گیا تھا؟“

”کیا واقعی؟“ نارٹن نے اسے مشکوک نظروں سے گھورا۔

”کل تم نے بتایا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے تم عموماً اس سے کھیلے رہا کرتے تھے۔ پادری میبی نے یقیناً تمہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے ایٹھ ٹرے تمہاری انگلیوں کے نشانات کے لیے چرائی ہے۔“

”میری انگلیوں کے نشانات.....“

”اس عمارت میں کہیں کسی جگہ کوئی دروازہ یا کوئی والٹ ایسا موجود ہے جس میں الیکٹرانک قفل لگا ہوا ہے جو صرف تمہاری انگلی کے نشان سے ہی کھل سکتا ہے۔“ نک نے بتایا۔

نارٹن کا چہرہ ایک دم سنا ہوا نظر آنے لگا۔

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا کام ہی ایسی باتیں معلوم کرنا ہے۔ تم نے میری خدمات حاصل کی ہیں یا نہیں؟“

”میں نے تمہاری خدمات ایٹھ ٹرے واپس لانے کے لیے حاصل کی ہیں۔ تمہیں بینک کے حفاظتی انتظام کی ٹوہ لگانے کا کوئی اختیار نہیں۔“

”میں گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے کام نہیں کرتا۔“

نک افسوس کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے نارٹن سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا کہ جو بات بھی معلوم ہوا سے بتانے دوڑا جائے۔ باہر نکل کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر رواں دواں ٹریفک کو دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اب اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ بہ ظاہر نارٹن نے اسے اس لیے برطرف کر دیا تھا کہ اس نے نارٹن کے کسی ایسے اسٹرانگ روم کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا تھا جس میں انگلی کے نشان سے کھلنے والا قفل لگا ہو۔ نارٹن نک کے قبضے میں ایسی معلومات کے آنے سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ شاید یہ سوچ کر کہ نک ایک چور ہے اور کہیں وہ ان معلومات کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہ کرے۔ لیکن نک ویلوٹ جیسے آدمی کو اس آسانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے نارٹن نے اپنی ایٹھ ٹرے چرانے کے لیے مامور کیا تھا اور وہ یہ کام پورا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆☆

اس نے اتوار کی صبح تک انتظار کیا جب پادری میبی ایک کرائے پر لیے ہوئے ہال میں مٹھی بھر افراد کے سامنے وعظ کر رہا تھا۔ نک اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ چرچ کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں عقبی دروازے سے بہت ہی آسانی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پادری میبی حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں کچھ دوراندیش واقع نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں قدم رکھتے ہی نک پادری کے بالائی آفس میں داخل ہوا اور تلاشی شروع کر دی۔ الماری میں کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ ایک فائل کینٹ میں بے شمار پتے موجود تھے میز کے خانوں میں صرف ایک تعجب خیز شے ملی۔ اعشاریہ 38 بور کا ایک ریوالور نہایت حفاظت سے چھپی دراز میں پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اگر خانے میں کوئی بائبل ملتی تو بھی شاید نک کو اتنی حیرت نہ ہوتی۔

پندرہ منٹ کی ناکام تلاش کے بعد نک کچھ مایوس ہو کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ گھومتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ چونکہ پادری میبی نے ایٹھ ٹرے ذاتی طور پر چرائی تھی اس لیے نک کا خیال تھا کہ وہ عمارت میں کہیں اور رکھی جانے کے بجائے پادری کے اپنے ذاتی آفس میں ہی ہو سکتی ہے کہیں اور رکھنے سے دوسروں کی نگاہ پڑ سکتی تھی، جب کہ یہاں دفتر میں وہ ہر طرح محفوظ تھی۔ پھر پادری ایک ایسا آدمی معلوم ہوتا تھا جو اسے کسی ایسی جگہ

رکھنا پسند کرے گا جو ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہے اور ایٹھ ٹرے ایسی چیز ہے جو کہیں بھی رکھی جاسکتی ہے لیکن شاید ایک ایسے شخص کے دفتر میں نہیں جس کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتا۔ اس لیے اسے چھپانے کے لیے کوئی ایسی جگہ چاہیے جو نظروں کے سامنے بھی ہو پھر بھی عام افراد کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکے۔ اور تب اس وقت نک کی نظر ایک بار پھر پھیلیوں کے ایکوریٹ پر پڑی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پھر اس نے بلا تکلف اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور وہ اس کے ہاتھ میں آگئی۔ ٹینکر نارٹن کی شفاف شیشے کی ایٹھ ٹرے پھیلیوں کے ایکوریٹ میں سب کے سامنے اور پھر بھی سب سے پوشیدہ موجود تھی۔ نک نے بڑی حفاظت سے اسے نکالا۔ اسے صاف کیا۔ وہ اس کے کوٹ کی جیبوں کے لیے بڑی تھی چنانچہ اس نے اسے ایک اخبار میں لپیٹا اور بغل میں دبایا۔ نہایت مطمئن انداز میں وہ جس طرح اندر داخل ہوا تھا اسی طرح عقبی دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آ گیا۔

پھر وہ اس جگہ پہنچا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ وہاں اس نے ایک جانے پہچانے مینی ٹرک کو کھڑے دیکھا۔ ٹی وی چینل چھ کی ٹیم مصروف کار تھی۔

”ہیلو، لان لارنس نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔ کیا پادری میبی کا وعظ سننے آئے تھے؟“

”نہیں خاص طور پر اس لیے نہیں آیا تھا۔“

”تمہیں آج کا وعظ ضرور سننا چاہیے تھا۔“ لان لارنس بولی۔

”پندرہ منٹ انتظار کرو۔ مسٹر نارٹن تمہیں بلا لیں گے۔“

ایک مختصر انتظار کے بعد نک دفتر میں داخل ہوا تو نارٹن نے بڑی سرد مہری سے استقبال کیا۔

”اب کیا بات ہے ویلوٹ؟“ اس نے پوچھا۔ ”میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

نک نے بریف کیس کھول کر ایٹھ ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”جیسا کہ تم نے ہدایت کی تھی۔ ایٹھ ٹرے حاضر ہے۔“

اس نے کہا۔ نارٹن مبہوت سا بنا اسے دیکھتا رہا۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملی؟“ آخر اس نے پوچھا۔

”جہاں پادری میبی نے اسے چھپایا تھا۔ پھیلیوں کے ایکوریٹ میں جو کہ اس کے دفتر میں رکھا ہے۔“ نک نے جواب دیا۔

”ایکوریٹ میں؟“ نارٹن نے حیرت سے دہرایا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم خود بھی وہاں جا کر دیکھ چکے ہو۔“

”ہاں، میں وہاں گیا تھا۔“

”یہ برا ہوا کہ میرے ایٹھ ٹرے لانے سے پہلے ہی بینک نے اسے قرض دینا منظور کر لیا۔“ نک بولا۔ نارٹن کے چہرے پر سرخی آگئی۔

”اسے دیے جانے والے قرض کا میری ایٹھ ٹرے کی چوری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”وہ کون سا دروازہ ہے جس کا قفل تمہاری انگلیوں کے نشان سے کھلتا ہے؟“ نک نے پوچھا۔ ”اور اس میں کیا رکھا ہوا ہے؟“

”گڈ ڈے مسٹر ویلوٹ۔“ نارٹن نے ناگواری سے کہا۔ ”ہمارا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“

”ابھی مکمل طور پر نہیں۔“ نک نے کہا۔ ”تمہیں ابھی میری فیس کے پچیس ہزار ڈالر ادا کرنا ہیں۔“

”میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ہمارا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ تم نے چیز برآمد کر کے واپس لانے میں دیر کر دی۔“

”واپس لانے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں لگائی گئی تھی۔“ نک نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے ایک ہفتے سے بھی کم وقت میں لا کر دے دیا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے ویلوٹ۔“

”میں اپنی فیس لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ نک بولا۔

لیکن نارن نے یقیناً پہلے سے اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا تقریباً فوراً ہی کسی پوشیدہ الارم کا اشارہ پا کر ایک مسلح گارڈ کمرے میں داخل ہوا۔

”مسٹر ویلوٹ کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔“ نارن نے گارڈ سے کہا مگر تک خود ہی کھڑا ہو گیا۔

”میں تمہیں مل بھیج دوں گا۔“ اس نے کہا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

لفٹ میں عمارت سے باہر نکلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔ یہ صورت حال پرانے ناولوں سے مختلف نہیں تھی۔ ایک خفیہ کمرہ کی بے نام راز کا حامل جسے پوشیدہ اور مقفل رکھنا ضروری نہیں ہو۔ فرق یہ تھا کہ یہ کمرہ کسی قدیم حویلی میں نہیں ایک ماڈرن بلڈنگ میں تھا۔ تک سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے پادری میبی کو یہ راز معلوم ہو گیا تھا یا کم سے کم اسے اس راز کی خبر تھی۔ اس کے بل بوتے پر اس نے ڈھائی لاکھ ڈالرز کا قرضہ منظور کر لیا۔ تک کے ذہن میں اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ پادری میبی یقیناً ایک جلسہ ساز اور فراڈ آدی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آیا نارن بڑا بد معاش ہے یا پادری میبی۔ مگر خواہ کوئی بھی ہو وہ اپنی فیس کیسے حاصل کرے؟ اس کے لیے ظاہر تھا کہ اسے بھی کوئی چالاکی کرنا پڑے گی۔ اس نے سوچا ممکن ہے لان لارنس کی مدد سے وہ کوئی ایسی ترکیب بروئے کار لانے میں کامیاب ہو جائے۔

☆☆☆☆

لان لارنس نے بڑی توجہ سے تک کی باتیں سنیں۔ ”مجھے واضح طور پر سمجھنے دو۔“ آخر وہ بولی۔ ”تم یہ چاہتے ہو کہ میں فرسٹ سٹی سیونگ بینک کے صدر فلپ نارن سے انٹرویو لوں۔“

”ہاں اور بینک کی عمارت میں اس کے آفس کے اندر“

مجھے امید ہے کہ تم یہ کام کر سکتی ہو۔“

”اس میں میرے ہاتھ کیا آئے گا؟“ لان لارنس نے پوچھا۔

”ایک بہترین کہانی۔“ تک نے جواب دیا۔ ”اگر میرے شبہات درست ثابت ہوئے تب۔ یوں بھی چونکہ تم آج کل پادری میبی کے پیچھے لگی ہوئی ہو اس لیے اسے اس کی ایک کڑی سمجھ کر کام کر سکتی ہو کیونکہ بہر حال پادری کو نارن کے بینک نے قرضہ دیا ہے۔“

”چلو منظور ہے۔“ لان لارنس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس میں کہاں فٹ ہوتے ہو؟“

”میں تمہارے ساتھ انٹرویو لینے چلوں گا۔“ تک مسکرا کر بولا۔ ”اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم میزے لیے جگہ پیدا کرو۔“

”یہ ناممکن ہے۔ ہماری یونین.....“

”کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔“ تک نے بات کاٹ دی۔

بدھ تک لان لارنس نے انٹرویو کا انتظام کر لیا۔ اور اسی روز سہ پہر کو وہ نارن کے دفتر پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ ایک کیرا مین اور ایک ساؤنڈ ٹیکنیشن بھی تھے۔ آخری آدمی کا کردار تک ویلوٹ ادا کر رہا تھا۔ اس نے ایک دگ اور مصنوعی موچھیں لگا رکھی تھیں۔ یہ کوئی اچھا اور معیاری میک اپ نہیں تھا لیکن تک کو یقین تھا کہ کمرے میں لان لارنس کی موجودگی میں نارن کی اور طرف متوجہ نہیں ہوگا۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مس لارنس! نارن نے کہا۔“ آخر تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

”میں اس قرضے کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں جو آپ نے پادری میبی کو نئے چرچ کی تعمیر کے لیے دیا ہے؟“ لان نے جواب دیا۔

”میں شعبہ قرضہ جات کے فیصلے کو زیر بحث نہیں لاسکتا۔“

”لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آپ نے ذاتی طور پر قرضے کی درخواست منظور کی ہے۔“

”چرچ ایک ایسا مذہبی ادارہ ہے جسے حکومت کی طرف سے فنکس کی چھوٹ دی گئی ہے اور جب تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہتی ہے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے لیے قرضہ منظور نہ کیا جائے۔“

”کیا یہی بات کمرے کے سامنے کہہ سکیں گے؟“ لان نے پوچھا۔ نارن نے ناگواری سے کیرا مین کی طرف دیکھا۔

”یقیناً۔“ وہ بولا ”مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

کمرے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تک ساؤنڈ وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور اس وقت بھی جب وہ مائکروفون کوچ زاویہ پر رکھنے کے لیے میز پر جھکا، نارن نے اس کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ پھر جب تک انٹرویو مکمل ہوا اور وہ لوگ رخصت ہوئے تو نارن کی ایش ٹرے بڑی صفائی سے اس بکس میں منتقل ہو چکی تھی جس میں ایلچی فائر وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

ایش ٹرے پر قبضہ کرنے کے بعد تک کو چین کہاں آتا اس نے اسی سہ پہر نارن کو فون کیا۔

”تم میری فیس ادا کرنے کے بعد اپنی ایش ٹرے واپس لے سکتے ہو۔“ تک نے کہا۔ ”رقم کی مالیت یاد نہ رہی ہر تو بتا دوں کہ وہ پچیس ہزار ڈالر ہے۔“

”ویلوٹ! نارن کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔“ تم اسے کس طرح.....؟“

”اصولاً تو مجھے دگنی فیس کا مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ اسے مجھے دوسرے چرانا پڑا ہے۔“ تک نے بات کاٹی۔

”اس لختی ایش ٹرے کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔“ نارن نے کہا۔ ”وہ اب مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“

”یہ بات اتنے یقین سے مت کہو۔“ تک نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

اگلی صبح وہ پھر پادری میبی سے ملاقات کرنے پہنچ گیا۔ پادری نے حسب سابق مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

”تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسٹر ویلوٹ۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تم نے اپنے موکل سے عطیہ کے بارے میں بات کی؟“

جواب دینے کے بجائے تک اٹھ کر اکیوریم کے پاس آکھڑا ہوا۔

”آج اس میں پانی کی سطح اس روز سے کچھ کم معلوم ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا؟“ پادری نے حیرت سے پوچھا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس میں سے کوئی چیز نکال لی گئی ہے۔“ تک نے گویا جواب دیا۔ ”میں ہی وہ آدمی ہوں جس نے فلپ نارن کی ایشن ٹرے تمہارے اکیوریم سے نکالی ہے۔“ تک نے بتایا۔

پادری میبی کا ہاتھ اپنی میز کی دراز کی طرف بڑھا لیکن تک اس سے کہیں زیادہ پھرتا تھا۔ اٹھانے لات مار کر دراز بند کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پادری کا ہاتھ دراز کی زد میں آ گیا۔ اس کے منہ سے ایک دہی سی چیخ نکلی۔

”تمہیں ریوالور نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ تک بولا۔ ”میں تمہارے نہیں نارن کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔“

”تم چاہتے کیا ہو؟“ پادری میبی نے اپنا ہاتھ نکال کر کٹائی ملتے ہوئے پوچھا۔

”معلومات۔“ تک نے جواب دیا۔ ”تم نے ایشن ٹرے کو نارن سے زبردستی قرضہ حاصل کرنے کے لیے

استعمال کیا تھا۔“

”تو پھر۔“

”میں پوری داستان سننا چاہتا ہوں اور اگر تم نے انکار کیا تو جو کچھ مجھے معلوم ہے اسی کے ساتھ پولیس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ٹی وی رپورٹر لان لارنس اس خفیہ والٹ کے بارے میں یقیناً دلچسپی لے گی جو صرف نارن کی انگلی کے نشان سے ہی کھل سکتا ہے۔“

”تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟“

”میرا کام ہی ایسی باتیں معلوم کرنا ہے۔“

”کیا تم مجھ پر کسی بد عنوانی کا الزام لگا رہے ہو؟“

پادری میبی نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”صرف حقائق بیان کر رہا ہوں۔ اگر بلیک میلنگ کوئی بد عنوانی ہے تو پھر شاید میں تمہیں اسی کا مرتکب قرار دے رہا ہوں۔“

”تو پھر تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا ہوں کہ نارن مجھ سے کہیں زیادہ بڑا مجرم ہے۔“ پادری میز پر جھکتے ہوئے بولا۔

”مثلاً کس بات کا؟“ تک نے فوراً پوچھا۔

”گزشتہ سال ایک عورت، ایک بوڑھی بیوہ۔ ہمارے چرچ کی ممبر بنی۔ کافی مالدار تھی۔ اگر میں یہ کام کیلیفونیا میں کر رہا ہوتا تو وہاں دولت مند گھرانوں کے لڑکوں لڑکیوں کو پھانسا مفید ہوتا۔ لیکن یہاں نیویارک میں ہمیں امیر بوڑھی عورتوں کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن اس عورت کے معاملے میں مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مجھ سے پہلے ہاتھ صاف کر چکا ہے۔“

”فلپ نارن؟“ تک نے پوچھا۔

”ہاں۔“ پادری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ اس کا بیٹکر تھا اور ایک خوبصورت شیطان بھی۔ اس نے عورت سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے۔ عورت کا مرحوم شوہر اس کے لیے کئی چیزیں چھوڑ گیا تھا۔ جن میں سب سے قیمتی چیز پرانے نایاب سکوں اور نمکٹوں کا ایک ذخیرہ تھا جس کی قیمت ادنیٰ اندازے کے مطابق ایک لاکھ ڈالر سے کہیں زیادہ تھی۔ عورت چاہتی تھی کہ یہ ذخیرہ اس کی موت کے بعد اس کے بچوں کو ملے اس سے پہلے نہیں۔ سوال یہ تھا کہ وہ اس کا کیا کرے۔ گھر میں وہ چوروں کی دسترس سے محفوظ نہ رہتا اور اگر بینک میں رکھتی تو یقینی طور پر اس کا علم حکومت کو ہو جاتا اور پھر اس کی موت کے بعد ورثہ میں تقسیم ہونے سے پہلے اس پر اتنے فنکس غامد ہو جاتے کہ وارثوں کو معقول حصہ نہ ملتا۔ اس

مشکل کا حل اس کے بینکر فلپ نارن نے پیش کیا۔ اس کا دوست اور مالی مشیر ہونے کی حیثیت سے اس نے مشورہ دیا کہ اس ذخیرے کو بینک میں اس کے ذاتی والٹ میں محفوظ کر دیا جائے۔ اس کے بارے میں بینک کو یا حکومت کو اس ذخیرے کا پتا نہیں لگے گا۔ اور وہ عورت کے مرنے کے بعد جوں کا توں اس کے وارثوں کے سپرد کر دے گا۔ عورت کو اس پر مکمل اعتماد تھا اس نے اپنا ذخیرہ نارن کے حوالے کر دیا۔ نارن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس بارے میں ایک علیحدہ تحریر لکھ کر اپنی فائل میں لگا دے گا تاکہ اگر اتفاق سے اس کا انتقال عورت سے قبل ہو جائے تو اس کا وکیل اس ذخیرے کو عورت یا اس کے وارثوں کو واپس کر دے۔ لیکن اس نے یہ چالاکی، کی کہ عورت کو اس تحریر کی کوئی نقل نہیں دی تاکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہ رہے۔ عورت نے مجھے بتایا کہ اس نے کبھی یہ نقل مانگی بھی نہیں۔

”تم ایٹش ٹرے پر بنے ہوئے اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے؟“ نک نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں یہ توقع تھی کہ اتنے حفاظتی انتظامات کے باوجود بینک میں موجود اس کے ذاتی والٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

”نہیں۔“ پادری میبی نے جواب دیا۔ ”ظاہر ہے کہ میں انگلی کا نشان حاصل کرنے کے باوجود والٹ تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ نارن کو معلوم ہو جائے کہ میں اس خفیہ والٹ کی موجودگی سے واقف ہوں اور اس بات سے بھی کہ اس کے اندر کیا کچھ رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے ایٹش ٹرے چرائے جانے سے اندازہ لگالیا۔ سمجھ گیا کہ میں اس کا راز جانتا ہوں یہی وجہ تھی کہ اس نے میری قرضے کی درخواست منظور کرنے کی اجازت دے دی۔“

”کیا صرف اس بوڑھی بیوہ کے سکوں اور ٹکٹوں کے ذخیرے کی وجہ سے؟“ نک نے پوچھا۔

”صرف وہ ہی ایک نہیں تھی۔ مجھے ایک دوسری بیوہ عورت کے بارے میں بھی معلوم ہے جس نے اسے اپنے تمام چاندی کے برتن اور زیورات والٹ میں رکھنے کے لیے دے دیے تھے اور یہ سب آف دی ریکارڈ تھا۔“ گویا یہ ایک بینک کے اندر دوسرا پرائیویٹ بینک قائم تھا اور بھی معلوم نہیں کتنی عورتیں ایسی ہوں گی۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ نارن کا والٹ روم کی بڑے خزانے سے کم نہیں ہوگا۔“

”حکومت کے نزدیک یہ حرکت یقیناً ناپسندیدہ ہوگی

اور اسی طرح بینک کے اسٹاک ہولڈروں کے لیے بھی۔“ نک نے کہا۔ ”بات کھل جائے تو نارن ایک لمحے کے لیے بھی اپنے عہدے پر برقرار نہیں رہ سکتا۔“

”چنانچہ میری حرکت بلیک میلنگ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔“ پادری پہلی مرتبہ مسکرایا۔ ”اس کا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟“

”تم دونوں جلساز اور فراڈیے ہو۔“ نک بولا۔

”جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ لیکن نارن کے بارے میں پھر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ ممکن ہے وہ عورت کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو وہ ذخیرہ دے ہی دے۔“

”اس کا انتقال ہو چکا ہے۔“ پادری میبی نے بتایا۔ ”اور نارن نے ذخیرہ واپس نہیں کیا۔“

”وہ مر چکی ہے؟“ نک نے چونک کر پوچھا۔

”ایک ماہ ہوا۔ اور نارن نے اس کے وارثوں کو ذخیرے کی ہوائ تک نہیں لگنے دی۔ میں اس لیے جانتا ہوں کہ میں نے ان سے پوچھا تھا۔“

”پھر تم نے پوگیس میں رپورٹ کیوں نہیں کی؟“

”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مجھے یہ ہی مناسب معلوم ہوا کہ میں اس معاملے سے اپنے طور پر نمٹوں۔“

”میری بات سنو۔“ نک نے دفعتاً کہا۔ ”میں نے ایٹش ٹرے دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ میں نے اسے نارن کو دیا تھا مگر اس نے میری فیس ادا نہیں کی۔ چنانچہ میں نے پھر چرائیا۔ ہم دونوں مل کر اسے نارن کے والٹ میں داخل ہونے کا ذریعہ بتائیں گے۔“

”اب اس پر نارن کی انگلی کے نشانات نہیں ہونگے۔“ پادری میبی نے کہا۔ ”وہ اتنا احمق بھی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے مجھے بھی اس کی امید نہیں ہے۔“

”تب پھر ہم والٹ میں کیسے داخل ہو سکیں گے؟“

”فلپ نارن خود ہمارے لیے والٹ کھولے گا۔“

نک نے جواب دیا۔

☆☆☆☆

نک کو سب سے پہلے جو بات معلوم کرنا تھی وہ یہ تھی کہ نارن کا ذاتی والٹ بینک میں کس جگہ واقع ہے۔ اس سلسلے میں اسے نیویارک کنسٹرکشن کمپنی سے مدد ملی جس نے بینک کی عمارت تعمیر کی تھی۔ کمپنی کی فائلوں میں بینک کی عمارت کا نقشہ اب بھی موجود تھا۔ اس نے متعلقہ فرد کو مناسب رشوت پیش کی اور اسے اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ ایک گھنٹہ تک تنہا اس فائل کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ نک نے نقشے میں دیکھا کہ

عمارت کی 56 ویں منزل پر جہاں نارن کا آفس تھا کوئی والٹ نہیں دکھایا گیا تھا البتہ ایک الماری کے جتنے سائز کا ایک اسٹرائٹ روم اس سے چلی منزل یعنی 55 ویں فلور پر ضرور موجود تھا۔ عمارت کی ڈائریکٹری دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس فلور پر تمام متعلقہ شعبہ جات کی سیکریٹری کام کرتی تھیں اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ انہیں کسی اسٹرائٹ روم کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لیے لازمی تھا کہ یہ ہی نارن کا ذاتی والٹ ہو۔

اس سے اگلی صبح حسب پروگرام نک پادری میبی سے بینک کی عمارت کے باہر ملا۔

”تمہیں پتا ہی ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟“ نک نے پوچھا۔

”جانتا ہوں۔ مگر یہ مجھے پسند نہیں۔ تم مجھے بہت گہرائی میں لیے جا رہے ہو۔“

”تم پہلے ہی کافی گہرائی اتر چکے ہو۔ اگر اس ترکیب سے تمہیں لان لارنس سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ تو تمہیں میرا ممنون ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ پادری میبی نے جواب دیا۔ ”وہ ہے کہاں۔ میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ وہ بھی اس پلان میں شامل ہے؟“

”جب اس کی ضرورت ہوگی وہ بھی آجائے گی۔“

نک نے جواب دیا۔

وہ لفٹ کے ذریعے 55 ویں منزل تک پہنچے۔ نک نے نقشے کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ الیکٹریکل فیوز بکس کس جگہ ہے۔ وہ سیدھا وہیں پہنچا۔

”الارم سسٹم کا تعلق لازماً اس فیوز بکس سے بھی ہوگا۔“ اس نے پادری سے کہا۔

”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ نارن کے پرائیویٹ والٹ میں الارم بھی لگا ہے؟“

”ایک ایسے بینک میں ہر مقفل دروازے میں کوئی نہ کوئی الارم فٹ ہوگا۔“

”اگر تم نے فیوز بکس کو چھیڑا تو عین ممکن ہے کہ والٹ کا الارم بجنے لگے۔“

”میں بالکل یہی کرنا چاہتا ہوں۔“ نک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆☆

فلپ نارن اس وقت مختلف شعبہ جات کے منجروں کے اجلاس میں مصروف تھا۔ اچانک اس کی سیکریٹری نے

سسپنس ڈائجسٹ



زندگی کی دل فریبیاں سچائی میں مضمر ہیں...

جھوٹ مکڑ فریب سے اسے بے ثبات بنائے

فلے چہرہ لوگوں کی عکاس محسن الدین نواب کی تحریر

مغربی ماحول در آمد جرم اور محبت کی نا قابل فراموش کہانیاں

مسلسل ایک نئی منزل کی جانب رواں

دواں اسما قادری کی سلسلے وار کہانی

نئے امتحانات سے دو چار تالش اور عمران کے

کارنامے طاہر جاوید مغل کا سلسلہ

سرورق کی کہانیاں

ایک نوجوان کو پیش آنے والے پے در پے سنسنی خیز

واقعات سلیم فاروقی کے جادو قلم سے

اجل شناس

دوستی سے دشمنی کے سفر پر گامزن اجل شناسوں کا

عبرت انگیز احوال ڈاکٹر عبدالرب بھٹس کا انداز

آکر بتایا۔

”55 ویں منزل پر الارم بج رہا ہے۔ کوئی آپ کے والٹ میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”پھر مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔“ نارٹن نے ناگواری سے کہا۔

”سیکیورٹی گارڈ کو لے جاؤ۔“

سیکیورٹی کچھ دیر کے بعد پھر واپس آئی۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے جناب۔“ وہ بولی۔ ”کہ کوئی آپ کے والٹ میں بند ہو گیا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔ کوئی شخص والٹ میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک.....“ نارٹن کہتے کہتے رک گیا۔

اس نے میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے افراد کی طرف دیکھا۔

”میں معذرت خواہ ہوں حضرات۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”ایک ضروری کام میری فوری توجہ چاہتا ہے۔“ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

سیکیورٹی اس کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے 55 ویں منزل پر آئے۔

یہاں تمام سیکیوریٹیوں میں بوکھلاہٹ مچی ہوئی تھی۔ الارم کی گھنٹی بجنے کی آواز آرہی تھی۔ نارٹن مختلف دفاتر سے گزرتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں اس کا نجی والٹ واقع تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں پادری فیلکس میبی کے ساتھ ہی دو سیکیورٹی گارڈ بھی کھڑے ہیں۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ نارٹن نے پادری سے پوچھا۔

”ویلوٹ والٹ کے اندر بند ہو گیا ہے۔“ پادری میبی نے فرش پر پڑی ہوئی ایش ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے تمہاری انگلی کا نشان ایش ٹرے سے حاصل کر کے اس سے والٹ کھول لیا ہے۔“

یہاں الارم کی گھنٹی کا شور زیادہ تھا۔ نارٹن سیکیورٹی گارڈز کی طرف گھوما۔

”اس الارم کو بند کر دو۔“ اس نے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے اندر آتے جاتے دیکھا تھا؟“

گارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

”جب ویلوٹ نے گارڈ کو آتے دیکھا تو اس نے اندر سے والٹ کا دروازہ بند کر لیا۔“ پادری بول اٹھا۔ ”معلوم نہیں اس سے کیا گڑبڑ ہو گئی کہ جب اس نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔“ نارٹن نے جیسے بڑا بڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں والٹ کھولنا ہی پڑے گا۔“ ایک گارڈ اپنا ریوالتور نکالتے ہوئے بولا۔

”بڑی خوشی سے۔“ نارٹن نے کہا۔ ”میں خود اس حرکت کے لیے ویلوٹ کو جیل میں سزائے بغیر نہیں مانوں گا۔ کوئی وکیل اسے بینک میں ڈاکا ڈالنے کے الزام سے بری نہیں کر سکتا۔“

نارٹن نے والٹ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اوپر لگے ہوئے ایک چھوٹے سے چوکور شیشے پر رکھ دیا۔ اس کے انگوٹھا رکھتے ہی قفل کا الیکٹرانک سسٹم حرکت میں آیا۔ نارٹن کے انگوٹھے کا عکس الیکٹرانک سسٹم میں محفوظ عکس سے ملتے ہی قفل کھل گیا۔ نارٹن نے دروازہ کھول دیا مگر اسٹرانگ روم بالکل خالی تھا۔

☆☆☆☆

”کیا مجھے تلاش کر رہے ہو؟“ پیچھے سے نک کی آواز آئی۔

”تم کہاں تھے؟“ نارٹن نے تیزی سے پلٹ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

”میں برابر کے کمرے میں چھپا ہوا تھا۔“ نک نے جواب دیا۔ ”یہ محض تمہیں والٹ کھولنے پر آمادہ کرنے کی ایک ترکیب تھی ظاہر ہے کہ میں خود یہ حرکت کر کے کسی جرم کا مرتکب ہونا پسند نہیں کرتا۔“

نارٹن نے گھوم کر پادری میبی کی طرف دیکھا۔

”تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔“ اس نے کہا۔ ”تم کہہ رہے تھے کہ یہ اندر ہے۔“

”ممکن ہے میرے الفاظ نے تمہیں کوئی ایسا تاثر دیا ہو۔“ پادری نے جواب دیا۔

نارٹن نے خود کو سیکیورٹی گارڈز اور بینک کے دوسرے عملے کے درمیان گھرا پا کر سنہلنے کی کوشش کی۔

”اچھی بات ہے ویلوٹ۔“ اس نے کہا۔ ”تم خود دیکھ سکتے ہو کہ میرے پاس کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے میں چھپانے کی کوشش کروں۔ میرا یہ نام نہاد والٹ اندر سے بالکل خالی ہے۔“

نک نے والٹ میں داخل ہو کر دیکھا۔ نارٹن بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ والٹ میں کئی کھلی الماری نما خانے بنے ہوئے تھے مگر وہ سب خالی تھے۔

”ٹھیک ہے میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔“ اور یہ کہتے ہوئے اس نے بلند آواز سے لان لارنس کو پکارا۔

اور دفعتاً پتا نہیں کہاں سے نکل کر لان لارنس مع اپنے

غیر ضروری

طاہر جاوید نسل

بعض لمحات انسان کے شعور میں ایسے نقش ہو جاتے ہیں کہ مٹائے نہیں جاسکتے۔۔۔ بالخصوص جن کے باعث کسی بہت کڑی آزمائش سے گزرنا پڑ جائے، وہ لمحات نہ چاہتے ہوئے بھی یادوں کے دروازے پر دستک دینے آ جاتے ہیں۔۔۔ اس کائنات میں بے شمار چہروں میں مماثلت پائی جاتی ہے مگر۔۔۔ تقدیر کی تفریق یہ ثابت کر دیتی ہے کہ ہر ایک دوسرے سے جدا ہے۔۔۔ لیکن انسان ہے کہ اپنی خوشیوں کی خاطر کتنے ہی لوگوں کے لیے اذیت کا نشان بن کر بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔

بند مٹھی سے ریت کے مانند بکھرتی یادوں کا قصہ



اسکول میں اسپورٹس ڈے تھا۔ میں اپنی بیوی عارفہ اور آٹھ سالہ بیٹے ندیم کے ساتھ اسکول میں تھا۔ دفتر سے آدھے دن کی چھٹی ملی تھی۔ میں بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں ندیم بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ”پاپا می! آئیں، میں آپ کو ایک نیچر دکھاؤں۔“ اسکول کی دوسری رانچ سے آئی ہیں۔ ان کی شکل چھوٹی چھوٹے بہت زیادہ

ہوئی۔ ”مگر پھر بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ اس نے تو سچ مچ تمہیں رقم ادا کر دی۔“

”ہاں وہ فیس جو ایک کاروباری معاہدے کے سلسلے میں کئی دن سے واجب تھی۔“

”ممکن ہے بعد میں وہ پولیس میں رپورٹ کر کے یہ دعویٰ کرے کہ اسے تم نے چرایا ہے۔“

”کیسے کر سکتا ہے۔ اس نے کئی گواہوں کی موجودگی میں خود اپنے ہاتھوں سے رقم دی ہے۔“

”کیا وہ یہ تو نہیں سمجھ رہا ہے کہ تمہیں فیس ادا کر کے اس نے مجھے یہ داستان استعمال کرنے سے بھی روک دیا ہے۔“

”ممکن ہے اس نے یہی تاثر لیا ہو۔“ نک نے جواب دیا۔ ”غلط نتائج اخذ کرنے میں وہ بہت تیز ہے۔“

”اس کیس میں پادری میسی کہاں فٹ ہوتا ہے؟“

لان لارنس نے پوچھا۔

”وہ تمہیں اس بارے میں بتائے گا کہ حقیقت میں اس والٹ کے اندر کیا ہونا چاہیے تھا۔“ نک نے کہا۔ ”ایک ایسا خزانہ جسے نارٹن نے کئی دولت مند بیوہ عورتوں کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جمع کیا تھا۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنے بڑے بینک کا صدر فراڈ کا مرتکب ہو سکتا ہے؟“

”کوئی اس پر یقین نہیں کر سکتا تھا اور اس لیے وہ ابھی تک بڑی کامیابی سے دوسروں کی دولت پر ہاتھ صاف کرتا آ رہا تھا! اس کی نجی زندگی کو چیک کرنا ممکن ہے تمہیں پتا چلے کہ وہ مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ ممکن ہے وہ بینک کے اثاثے کو بھی اپنے ذاتی قرض ادا کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ہو۔ کچھ بھی سبھی اس نے غالباً وہ تمام چیزیں فروخت کر دی ہیں جو بیوہ عورتوں نے امانتاً اس کے سپرد کی تھیں۔ نارٹن جیسے آدمی پر شبہ کرنے کے لیے پادری میسی جیسے جلسہ ساز کا ذہن ہی کام کر سکتا تھا۔“

”اور اسے شکست دینے کے لیے تم جیسے ایک چور کی ضرورت تھی۔“ لان لارنس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شاید۔“ نک نے اعتراف کیا۔ ”لیکن اپنی کہانی میں میرا نام شامل مت کرنا۔ میں پہلی قطعی پسند نہیں کرتا۔“

نک ویلوٹ اسے بینک کے سامنے چھوڑ کر رخصت ہو گیا لیکن گھر جاتے ہوئے اس کے ذہن کو یہ خیال پھر بھی پریشان کر رہا تھا کہ اس کیس میں اس نے ایک چیز دو مرتبہ چرائی مگر اسے فیس صرف ایک مرتبہ کی وصول ہوئی۔

کیمرائین وغیرہ کے سامنے آگئی۔

”ہمیں کس شے کی منظر کشی کرنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک خالی والٹ کی۔ اس کی منظر کشی کرو اور اسے چھ بجے کی خبروں میں ٹیلی کاسٹ کرنے کا انتظام کرو، میں اس کے ساتھ بیان کرنے کے لیے تمہیں ایک دلچسپ کہانی فراہم کر دوں گا۔“

فلپ نارٹن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”تم ایک خالی والٹ کی فلم کیوں بنانا چاہتے ہو؟“

”اس سے بالکل برعکس جو میں اور پادری میسی کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔“ نک نے جواب دیا۔ ”اسے ایٹل ٹرے کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ تمہارے انگوٹھے کے نشان کی مدد سے اس والٹ میں داخل ہو کر وہ خزانہ چراسکے جو اس کے خیال میں یہاں پوشیدہ تھا۔ یا اگر چہ نہ سکے تو چرانے کی دھمکی دے کر تم سے اپنا کام کرائے۔ اور میں اس کے برعکس صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس والٹ میں اب کوئی خزانہ موجود نہیں ہے۔ ٹی وی پر اس خالی والٹ کی فلم بہت سی بیوہ عورتیں دیکھیں گی اور حیرت و تعجب سے سوچیں گی کہ ان کے زیورات ان کے چاندی کے برتنوں، قدیم سکوں اور ٹکٹوں کا کیا بنا جو انہوں نے تمہیں اس والٹ میں رکھنے کے لیے دیے تھے۔ یقین کرو کہ کل صبح تمہیں بہت سی معزز خواتین کے سامنے اس کی کوئی معقول وضاحت پیش کرنا پڑے گی۔“

نارٹن جس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا، بہت ہی آہستہ آواز میں بولا۔

”لغت ہو ویلوٹ۔ اس عورت اور اس کے کیمرا مین کو روک لو۔ میں تمہیں تمہاری فیس ادا کر دوں گا۔“

”دے نہیں دوں گا۔ بلکہ ابھی دو۔ اور وہ بھی نقد۔“

”منظور ہے۔“ نارٹن کو کہنا پڑا۔

نک ویلوٹ مسکرایا اور لان لارنس کی طرف دیکھا۔

”بس کافی ہے لان۔ اب فلم نہیں بنائی جائے گی۔“

اس کے بیس منٹ بعد نک بینک سے اس حال میں رخصت ہوا کہ اس کی جیب میں اس کی مطلوبہ فیس موجود تھی پچیس ہزار ڈالرز کے بالکل نئے اور کرارے نوٹ جو نارٹن نے اسی وقت اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے نکلوا کر دیے تھے۔ اس اداکاری کے وقت لان لارنس بھی موجود تھی اور رقم کی وصولیابی کے بعد اس کے ساتھ ہی باہر جا رہی تھی۔

”میں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ

ملتی ہے، ان جیسے بال، انہی جیسی آنکھیں..... آئیں.....
میں دکھاؤں آپ کو۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
ندیم نے ایک عام سی بات کہی تھی۔ اس میں غصہ
کرنے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے غصہ
آگیا۔ پورے جسم میں ایک طیش آمیز لہری دوڑ گئی۔ میں
نے ندیم سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز لہجے میں کہا۔ ”کیا
فضول بات ہے شکل ملتی ہے تو ہم کیا کریں۔ تم اپنے کام
سے کام رکھو۔ میرے پاس اب بیس چالیس منٹ سے
زیادہ نہیں ہیں اور بیس منٹ دفتر جاتے جاتے لگ جاتے
ہیں۔ بس جلدی سے فارغ ہو کر آؤ۔“

حیران ہوا۔ لاہور سے سیکڑوں میل دور بہاولپور کے اس چھوٹے سے بس اسٹینڈ سے بس میں سوار ہونے والا یہ لڑکا اتنی نوے فیصد انجم سے ملتا تھا۔ شکلوں میں مشابہت میں مجھے ہمیشہ سے بہت دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ میں دیر تک اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز، اس کے ہنسنے کا اسٹائل۔ مجھے یہ ایک دلچسپ محسوس ہوا۔

بہاولپور سے لاہور تک کا سفر خاصا طویل تھا، ہمیں بارہ تیرہ گھنٹے لگ جانے تھے۔ لب سڑک ہماری بس ایک ریسٹورنٹ کے سامنے ”لچ“ کے لیے رکی۔ وہ ڈانگ ہال میں اکیلا ہی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ یہ میرے اندر پایا جانے والا وہی اضافی تجسس تھا جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ لڑکے کے ساتھ علیک سلیک ہوئی۔ میں نے اسے وجہ بتائی کہ میں اس کے پاس کیوں بیٹھا ہوں۔ وہ کچھ حیران ہوا اور کچھ خوش بھی۔ اس کا نام عبدالرحمان تھا۔ وہ ہمیں بہاولپور شہر کا رہنے والا تھا۔ والد کا نام امتیاز علی تھا۔ وہ سروسوں کے نیچوں کا کام کرتے تھے۔ سروسوں کی فصل اٹھا کر اپنے گوداموں میں اسٹور کرتے تھے بعد ازاں اسٹور کیے ہوئے نیچوں کو دیے ہی فروخت کر دیتے تھے یا پھر ان کا تیل وغیرہ نکال کر کھوک فروشوں کو دیتے تھے۔ ان کے ایسے دو گودام ساہیوال میں تھے اور ایک ملتان میں۔ عبدالرحمان آئی کام کر رہا تھا جبکہ اس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی پڑھ رہے تھے۔ عبدالرحمان کی والدہ بڑھی لکھی خاتون تھیں اور بہاولپور کے ایک اسکول میں ٹیچر تھیں۔

عبدالرحمان نامی اس سادہ سے نوجوان کے ساتھ مل کر مجھے اچھا لگا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ انجم کو سر پرانزدوں بلکہ انجم کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والوں کو بھی۔ ایک دم عبدالرحمان کو ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں..... اور دیکھوں کہ ان کا ری ایکشن کیا ہوتا ہے۔ یہ تو خیر فلمی بات تھی کہ وہ عبدالرحمان کو انجم سمجھیں گے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ مشابہت انہیں ایک دفعہ ضرور چونکاے گی۔

میں نے عبدالرحمان سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ اس نے بتایا۔ ”ایک ڈومیسائل بنوانا تھا۔ راولپنڈی سے بنتا ہے۔ جانا تو ابو کو تھا لیکن وہ مصروفیت کی وجہ سے جا نہیں سکے۔“

”یہ بس تو ہوا ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں سے پنڈی کے لیے بس پکڑوں گا۔ سفر تو کافی زیادہ ہو جائے گا لیکن مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے۔“

میں نے اسے اپنا ایڈریس اور فون نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر کبھی لاہور آؤ تو مجھ سے ضرور رابطہ کرنا۔ پھر میں تمہیں تمہارے ”ہمزاد“ سے بھی ملواؤں گا۔“ وہ مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کی شکل انجم سے اور زیادہ ملنے لگتی تھی۔ بس کے سفر کے دوران میں میرے اور عبدالرحمان کے درمیان گاہے بگاہے گفتگو ہوتی رہی۔ عبدالرحمان نے بھی مجھے اپنا فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ دیا۔ مجھے امید تھی کہ مستقبل قریب میں ہم ملیں گے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ اتنی جلدی ملیں گے۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ میں انارکلی بازار سے گزر رہا تھا۔ یہاں میں آغا انکل اور کشور خالہ کی شادی کی سالگرہ کے سلسلے میں ہی آیا تھا۔ تحفہ بھی کوئی اچھا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اپنی امی کے ساتھ جا کر میں نے کشور خالہ کے لیے تو ایک شاندار شولڈر بیگ لے لیا تھا۔ اب میں آغا انکل کے لیے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر ایک زبردست قسم کی ریڈی میڈ پینٹ شرٹ مجھے ان کے لیے پسند آگئی۔ میں گارمنٹس شاپ سے باہر نکل رہا تھا جب اچانک میری نظر عبدالرحمان پر پڑ گئی۔ وہ غالباً ونڈو شاپنگ میں مصروف تھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکا۔ پھر مسکرا کر میرے گلے لگ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم نے تو جلدی واپس جانا تھا بھی؟“

”یہاں کوئی کام جلدی نہیں ہوتا اور دفتری کام کی تو بات ہی کیا ہے، جس بندے سے مل کر کام کرانا تھا، اسے اپنے کسی ضروری کام سے اچانک چکوال جانا پڑ گیا ہے۔ اب وہ کل واپس آ رہا ہے۔ آج رات کو دوبارہ بس میں بیٹھوں گا اور صبح راولپنڈی پہنچوں گا۔“

”اب کہاں ٹھہرے ہو؟“

”اسٹیشن کے پاس ایک ہوٹل میں۔“

”اچھے بندے ہو یا! تمہیں کہا بھی تھا کہ کوئی مسئلہ ہو تو رابطہ کرنا۔ تم میرے گھر میں ٹھہر سکتے تھے۔“

”نہیں مجھے اچھا نہیں لگا۔ ابھی ایک ہی تو ملاقات ہوئی تھی ہماری۔“

ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسے رات کو بارہ بجے بس پر بیٹھنا تھا۔ تب تک وہ غائب ہی تھا۔ میرے

ذہن میں پھر وہی خیال کلبلیا۔ میں نے کہا۔ ”چلو پھر آؤ، تمہیں انجم سے ملائیں۔ ایک دوسرے کو دیکھو اور اندازہ لگاؤ کہ کتنے فیصد ملتے ہو اور کتنے فیصد نہیں۔“

وہ پہلے تو متذبذب نظر آیا۔ پھر میرے اصرار پر راضی ہو گیا۔ میں اسے لے کر اپنی موٹر بائیک تک آیا اور ہم سیدھے انجم کے گھر پہنچ گئے۔

انجم گھر میں ہی تھا۔ کنول آپنی اور کشور خالہ بھی موجود تھیں۔ میں نے انہیں تھوڑا سا بتایا اور پھر عبدالرحمان کو ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کیا۔ انجم کا ری ایکشن تو خیر اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن آپنی اور خالہ کشور واقعی حیران رہ گئے۔

”واقعی کتنی شکل ملتی ہے اس کی انجم سے۔“ خالہ نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا۔

”اور قد کا ٹھہ بھی۔“ آپنی نے تائید کی۔

”اسی لیے تو اسے بہاولپور کے ایک بس اسٹینڈ سے ڈھونڈ کر یہاں لایا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر انجم کوئی اہم شخصیت ہوتا..... کوئی ایکٹریا سیاست دان وغیرہ تو ہم عبدالرحمان کو اس کے ”ڈپٹی کیٹ“ کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ مزہ آ جاتا۔ اخباری نمائندے عبدالرحمان کو انجم سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے اور انجم صاحب گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر اپنی منزل پر پہنچ جاتے۔“

”ہاں جی..... کون اپنی منزل پر پہنچ رہا ہے؟“ صدر دروازے کی طرف سے آغا انکل کی آواز آئی۔ وہ ابھی ابھی کہیں سے آئے تھے۔

انہوں نے عبدالرحمان کو دیکھا..... عبدالرحمان نے انہیں دیکھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ آغا انکل کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ سکتہ زدہ سے عبدالرحمان کو دیکھتے چلے گئے۔ دوسری طرف عبدالرحمان کے تاثرات بھی عجیب تھے۔ وہ یک ٹک آغا انکل کو دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے اپنی نگاہوں پر بھروسہ ہی نہیں رہا تھا۔ آغا انکل کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا..... عبدالرحمان نے سرسراہٹ کی آواز میں کہا۔ ”ابو آپ یہاں؟“

آغا انکل نے دوسری شادی کر رکھی تھی۔ ان کی دوسری بیوی اور تین بچے لاہور سے سیکڑوں میل دور بہاولپور کی ایک الگ تھلگ رہائشی کالونی میں رہتے تھے۔ آغا انکل اور کشور خالہ میں بہت محبت تھی لیکن اس محبت میں وہ طویل سرکاری دورے بھی شامل تھے جو آغا صاحب ہر

ماہ کرتے تھے۔ شاید یہ راز..... راز ہی رہتا اگر میں بہاولپور کے اس چھوٹے سے بس اسٹینڈ پر انجم سے مشابہت رکھنے والے عبدالرحمان کو نہ دیکھتا اور پھر اپنے بے جا تجسس کے سبب اس سے بات چیت شروع نہ کرتا۔ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ کشور خالہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کا نام لے لے کر جیتی تھیں۔ وہ ان کی آن بان شان تھے اور جب ذی شان تاج محل چکنا چور ہوتے ہیں تو پھر ان کے بلے میں جان لیوا دکھ کی کرچیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ جس روز آغا انکل اور خالہ کشور کی شادی کی سالگرہ تھی۔ اس روز صبح سویرے خالہ کمرے میں مردہ پائی گئیں۔ ”انہیں شدید ہارٹ ایٹک ہوا تھا۔ وہ بیمار نہیں تھیں۔ ہر لحاظ سے صحت مند تھیں اور زندگی سے بھرپور بھی۔ کسی کو یقین نہیں آیا کہ وہ اچانک چل بسی ہیں..... ہاں جب بلند وبالا تاج محل لڑکھڑاتے ہیں تو اپنا ہی بوجھ انہیں چکنا چور کر دیتا ہے۔“

اس واقعے کے ایک ماہ بعد آپنی کنول کی مفتی بھی ٹوٹ گئی۔ اس صدمے نے انہیں بستر سے لگا دیا۔ پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ انجم اور آپنی کنول کو ان کے ماموں اپنے پاس کوئٹہ لے گئے ہیں۔ تین چار ماہ بعد آغا انکل نے بھی لاہور والا گھر چھوڑ دیا اور مستقل طور پر بہاولپور شفٹ ہو گئے۔ (جہاں وہ بہت عرصے سے امتیاز علی کے نام سے رہائش پذیر تھے) ایک ہفتا بستا گھر اجڑ گیا۔ ایک گلشن تھا جو دیران ہوا۔ اب بہت عرصہ ہوا ہے انجم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تقریباً دو سال پہلے آخری بار اس کی آواز سنی تھی۔ آہ..... آغا انکل، آپ جیسے کردار ہیں جنہوں نے اس دنیا کی خوبصورتی کو گہنایا ہوا ہے۔ ایک کھلکھلاتا، مسکراتا ہمدرد چہرہ آپ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے مٹی میں ادھل ہو گیا۔ میں کہاں ڈھونڈوں اب وہ کھلنڈرے دن، وہ رنگین شامیں، وہ آخر شب کے قہقہے..... اور..... اور وہ مولی والے پرائیڈ جن میں ماں جیسی محبت کی خوشبو ہوتی تھی۔

ماضی کے درتے بند ہوئے۔ میں سوچوں کی دنیا سے نکلا۔ چند گھنٹے پہلے میں نے اپنے بیٹے ندیم کو بری طرح جھاڑ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور نہ میری بیوی کی سمجھ میں کہ میرا موڈ یکدم کیوں اتنا بگڑا ہے..... اس کی وجہ یہی تھی۔ مجھے بے جا تجسس اور غیر ضروری روابط سے نفرت ہو چکی ہے۔



سرزا امجد بیگ

سازشی کردار

منگل کے روز جو شخص سب سے پہلے میرے چیمبر میں داخل ہوا، اس نے نہایت ہی سادہ مگر صاف ستھرا لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کی نفاست کو ظاہر کرتا تھا۔ لباس سستا سا ہو یا بیش قیمت، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کی تراش خراش، پاکیزگی اور پہننے کا سلیقہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ تمام خصوصیات آنے والے کی شخصیت میں نظر آرہی تھیں۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر میری ٹیبل کی

روپ بھروپ بدلنا... نئے نئے رنگوں میں ڈھلنا تو اس دنیا کی ریت ہے... قدرت کی سرزنش کے باوجود بہت سے سازشی کردار نئی نئی کہانیوں کو جنم دیتے رہتے ہیں... وہ بھی اس ڈرامائی صورت حال کا ایک اہم کردار تھا جس نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار قائم کیا ہوا تھا مگر وہ بھول گیا کہ وہی حصار ایک دن اس کے لیے کس قدر خطرناک جال بن جائے گا۔ اگرچہ اس باریک صاحب کو حقائق اگلوانے کے لیے لوہے کے چنے چبانے پڑے مگر انہوں نے لا حاصل کچھ نہ جانے دیا... اور یہی ان کا کارنامہ تھا۔

جیتے جاگتے کرداروں سے کھیلنے بیگ صاحب

کا منفرد انداز..... اور عدالت کا منظر نامہ

”میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے کس الزام میں پکڑا ہے؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”پولیس نے حنیف پر قتل کا الزام عائد کیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

ظاہر ہے، حنیف اس کے اسی بیٹے کا نام تھا جسے پولیس پکڑ لے گئی تھی۔ میں نے پیڈ پر قلم گھمتے ہوئے استفسار کیا۔

”حنیف پر کس کوئی کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟“ اس شخص کا نام ڈاکٹر سلیم ہے۔“ ارشاد حسین نے جواب دیا۔

”مقتول کس چیز کا ڈاکٹر تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”میرا مطلب ہے، وہ کسی شعبے کا اسپیشلسٹ تھا یا جنرل فزیشن.....؟“

”جناب! وہ نہ تو جنرل فزیشن تھا اور نہ ہی اس نے کسی شعبے میں اسپیشلائزیشن کر رکھا تھا۔“ اس نے برا سامنے بتاتے ہوئے بتایا۔

دوسری جانب بیٹھ گیا۔ رکی علیک سلیک کے بعد میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام ارشاد حسین ہے۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”اور میں اپنے بیٹے کے لیے سخت پریشان ہوں۔“

اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔

ارشاد حسین جتنا نفیس طبع دکھائی دیتا تھا، اتنا ہی خوش کلام اور شائستہ گفتار بھی تھا۔ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کے بیٹے کو ہوا کیا ہے.....؟“

”میرے بیٹے کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کس جرم میں؟“

”میرے بیٹے نے کوئی جرم نہیں کیا وکیل صاحب.....“

”یہ تو بالکل اصولی بات ہے ارشاد صاحب!“ میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”اگر میں نے قانون نہیں پڑھ رکھا اور وکالت کے پیشے میں میرا تجربہ نہیں ہے تو پھر آپ مجھے وکیل کر کے اپنا ہی نقصان کریں گے۔“

”میں بھی یہی کہنا چاہ رہا ہوں وکیل صاحب۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ڈاکٹر سلیم کو کچھ بھی نہیں آتا تھا اور وہ ماہر بنا بیٹھا تھا ٹیلی پیٹھی، پناٹزم، مسمریزم اور جانے کون کون سے علوم کا.....“ اس نے دو سینکڑا کا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

”میری نگاہ میں ڈاکٹر سلیم ایک نمبر کا فراڈ اور دھوکے باز شخص تھا۔ پتا نہیں، کس دیکھے ہوئے دل کی آہ اسے کھا گئی ہے۔“

”چلیں جناب..... اچھے یا برے، وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔“ میں نے واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتائیں کہ پولیس نے حنیف کو کتنے بجے اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟“

”ٹھیک آٹھ بجے رات۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس وقت وہ گھر پر موجود تھا بلکہ چند منٹ پہلے ہی وہ گھر پہنچا تھا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”اسی دن..... جب ڈاکٹر سلیم قتل کیا گیا تھا۔“

”میرا مطلب ہے، کس تاریخ کو.....؟“

”سترہ اپریل کو۔“ ارشاد حسین نے جواب دیا۔

”آج اٹیس اپریل ہے۔“ میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، پولیس نے اگلے روز یعنی اٹھارہ اپریل کو حنیف کو عدالت میں پیش کر دیا ہوگا۔“

”جی ہاں، اس وقت وہ عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹی میں ہے۔“

”ٹھیک.....!“ میں نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، عدالتی چارہ جوئی اب ریمانڈ کی مدت پوری ہو جانے کے بعد ہی کی جاسکے گی۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔

”کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وقوعہ کے روز مقتول کے کلینک پر کیا واقعات پیش آئے تھے؟“ میں نے ارشاد حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اس بارے میں، میں آپ کو تفصیلاً کچھ نہیں بتا سکتا۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”بہتر ہوگا، آپ

ہی مجھ سے باغی ہوتا چلا گیا اور پھر یہ دن دیکھنا پڑا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آج کل کی اولاد کو کوئی بات سمجھنا کتنا مشکل ہے.....؟“

”جی ہاں، بہت مشکل ہے۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کی غرض سے کہہ دیا۔ ”یہ لوگ کوئی جملہ سننے کو تیار ہی نہیں ہوتے، سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے۔“

یہ مسئلہ صرف آج کل کی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، یہی سنتا آیا ہوں بڑے بزرگوں کی زبان سے کہ آج کل کی اولاد کچھ سنتی ہی نہیں اور اس نوعیت کا شکوہ کرتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے وہ بھی کسی کی اولاد تھے اور ان کے بزرگوں کو بھی ان سے یہی شکایت تھی کہ ان کی کوئی بات سمجھ کر نہیں دیتے اور اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ آج جو اولاد اپنے والدین کی بات پر کان نہیں دھرتی، کل ان کی اولاد بھی یہی سلوک کرے گی۔

میری تائیدی رائے نے ارشاد حسین کو قدرے مطمئن کر دیا تو میں نے معلومات اخذ کرنے کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”حنیف نے مقتول کو کس شے کا استاد بنالیا تھا؟“

”وہ ڈاکٹر سلیم سے ٹیلی پیٹھی سیکھ رہا تھا۔“

ارشاد حسین کے جواب نے مجھے چونکا دیا اور میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا واقعی ڈاکٹر سلیم، آپ کے بیٹے کو ٹیلی پیٹھی سکھا رہا تھا؟“

”حنیف تو یہی سمجھ رہا تھا جناب۔“

”کیا آپ نے اپنے بیٹے کے اندر اس علم کے کوئی آثار وغیرہ دیکھے تھے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”کوئی نہیں جناب.....“ اس نے مایوسی سے گردن کو نفی میں جنبش دی اور برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اس قسم کی چیزوں کو خرافات سے تعبیر کرتا ہوں۔ پتا نہیں، حنیف ان لٹے سیدھے چکروں میں کیوں پڑ گیا تھا۔“

”نہیں صاحب! ٹیلی پیٹھی کا علم تو ایک سائنس اور ٹھوس حقیقت ہے۔“ میں نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ”آپ اسے خرافات میں شامل نہیں کر سکتے۔“

”وکیل صاحب! میں نے ساری زندگی حساب کتاب اور اعداد و شمار میں گزاری ہے۔“ ارشاد حسین نے کہا۔ ”میں دو اور دو چار..... کی فلاسفی پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ آپ جس بھی شخص سے جو بھی سیکھنا چاہیں، پہلے یہ چیک کر لیں کہ وہ کام اس شخص کو خود بھی آتا ہے یا نہیں.....“

”ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ تمام تر معاشرتی حقائق دل جلانے کا سامان ہیں۔ عوام ان کے سدھار کے لیے کچھ نہیں کر سکتی..... آپ مجھے ڈاکٹر سلیم کے بارے میں بتا رہے تھے جواب مرحوم بلکہ مقتول کے درجے پر فائز ہو چکا ہے۔“

”جی ہاں، وہ بھی ایک ایسا ہی فراڈ شخص تھا۔“ وہ ایک بوجھل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”وہ اپنی دانست میں بہت پہنچا ہوا بندہ تھا۔ اب نہ وہ باقی رہا اور نہ ہی اس کی دانش..... سب کچھ پہنچ گیا ہے..... بہت دور۔“

”اور اسی ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں پولیس نے آپ کے بیٹے کو گرفتار کر لیا ہے۔“ میں نے واپس اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”ارشاد صاحب! کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آخر پولیس نے آپ ہی کے بیٹے کو کیوں گرفتار کیا ہے۔ آپ کے بیٹے حنیف اور ڈاکٹر سلیم کے درمیان کیا دشمنی تھی؟“

”کوئی دشمنی نہیں تھی جناب.....“

”دشمنی نہیں تھی تو پھر دوستی رہی ہوگی؟“

”ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی وکیل صاحب۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”نہ دوستی تھی اور نہ ہی دشمنی!“ میں نے قدرے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”پھر کس تعلق اور کن وجوہات کی بنا پر پولیس نے حنیف پر ہاتھ ڈالا ہے۔ آخر ملزم اور مقتول میں کوئی تو رابطہ یا واسطہ رہا ہوگا۔“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے وکیل صاحب۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”حنیف اور ڈاکٹر سلیم میں استاد اور شاگرد کا تعلق تھا۔“

”ان میں سے استاد کون تھا اور کون شاگرد؟“ میں پوچھتے بنانہ رہ سکا۔

”ڈاکٹر سلیم کو حنیف نے اپنا استاد جن لیا تھا۔“ ارشاد حسین نے بتایا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ میں نے خفگی آمیز نظر سے ارشاد حسین کی طرف دیکھا۔ ”جب آپ مقتول ڈاکٹر سلیم کو ایک فراڈ شخص تسلیم کرتے ہیں تو پھر آپ نے اپنے بیٹے کو اس کی شاگردی میں کیسے جانے دیا؟“

”حنیف مجھ سے پوچھ کر اس کے چکر میں تھوڑا ہی پھنسا تھا۔“ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ ”مجھے تو جب خبر ہوئی، پانی سر سے اوپر جا چکا تھا۔ بہر حال، میں نے حنیف کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اسے جتنا سمجھاتا، وہ اتنا

”پھر وہ کس قسم کا ڈاکٹر تھا ارشاد صاحب؟“ میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

وہ بہ دستور بیزاری سے بولا۔ ”وکیل صاحب! میرے خیال میں تو سلیم سرے سے ڈاکٹر تھا ہی نہیں.....“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!“ میری حیرت میں خفیف سا طنز بھی شامل ہو گیا۔ ”جب آپ اسے ڈاکٹر ہی نہیں سمجھتے تو پھر ڈاکٹر کہہ کیوں رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ ”ڈاکٹر“ کا لفظ لگا ہی کیوں رکھا تھا۔ یہ تو سراسر جرم ہے۔“

”بے شک یہ جرم ہے بلکہ ڈاکٹر سلیم کے کیس میں تو یہ جرم تھا کیونکہ وہ اب باقی نہیں رہا۔“ ارشاد حسین میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن جناب! یہاں کون پوچھتا ہے۔“

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے کہا۔ آپ کے اس ”کون پوچھتا ہے“ سے میں کیا مطلب اخذ کروں؟“

”میرا کوئی خاص مطلب نہیں تھا وکیل صاحب!“ وہ بڑی بددلی سے بولا۔ ”میں دراصل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی شخص اپنے نام کے ساتھ کچھ بھی جوڑ لے، کون پوچھتا ہے۔ ہر فراڈ شخص نے اپنے نام کے ساتھ مختلف قسم کے ساتھ کچھ بھی جوڑ لے، کون پوچھتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر، پروفیسر، حاجی، علامہ وغیرہ وغیرہ.....“ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اصل ڈاکٹر یا پروفیسر یا حاجی یا علامہ یا شاہ جی ہوتے نہیں ہیں مگر دھوکا زیادہ ہے۔“

”جب ”طوطا فال“ نکالنے والا پروفیسر اور بسوں میں سرمہ منجن بیچنے والا آکی اسپیشلسٹ اور ڈیٹنٹ ہو سکتا ہے تو پھر ہمارے معاشرے میں دیگر لوگوں کے لیے بھی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”میرا اشارہ بھی ایسے ہی نام نہاد ماہرین کی جانب تھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اب یہی دیکھ لیں جناب..... کیسی دلچسپ بات ہے۔ فال والا لاف تو طوطا اپنی چونچ میں پکڑ کر باہر نکالتا ہے اور ”پروفیسر“ اس شخص کے نام کے ساتھ لگا ہوتا ہے جو شخص اس طوطے کو آپریٹ کر رہا ہوتا ہے۔“

”ہاں، بات دلچسپ ہی نہیں بلکہ عجیب و غریب بھی

سرگرداں رہتا تھا پھر کسی میگزین میں اس نے ٹیلی پیٹھی کے حوالے سے کوئی مضمون پڑھ لیا۔ اس مضمون کی اثر پذیری نے حنیف کے ذہن اور سوچ کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس نے حتیٰ فیصلہ کر لیا..... چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ ٹیلی پیٹھی سیکھ کر ہی رہے گا۔

اس محکمہ ارادے کے بعد اس نے کسی ایسے مرد میدان کی تلاش شروع کر دی جو اسے ٹیلی پیٹھی کا علم سکھائے۔ جلد ہی اس کی مراد برآئی۔

ایک روز وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا کہ ماورائی علوم کا ذکر نکل آیا، پھر ان علوم کے ماہرین کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ حنیف ان دنوں چونکہ ٹیلی پیٹھی سیکھنے کے جنون میں مبتلا تھا لہذا الیاس کی بات نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”یار، سننے میں آیا ہے کہ ادھر ناتھ میں کوئی صاحب بہت پہنچے ہوئے ہیں۔“ الیاس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ان کے پاس ایسے علوم کا خزانہ ہے۔“

حنیف، شیخ احمد، الیاس اور مختار اکثر رات میں ”منظور“ نامی اس ہوٹل میں آ بیٹھتے تھے۔ مذکورہ ہوٹل کے مالک کا نام منظور حسین تھا جو کافی عرصہ پہلے اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا، یہ اپنے علاقے کا ایک خوش ذائقہ ہوٹل سمجھا جاتا تھا جو لگ بھگ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔

الیاس کی بات سن کر حنیف کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”ناتھ کا علاقہ تو خاصا وسیع و عریض ہے۔ تم کہاں کی بات کر رہے ہو؟“ ”میں ناتھ ناظم آباد کی بات کر رہا ہوں۔“ الیاس نے جواب دیا۔ ”وہ صاحب شادمان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔“

”ان کا نام کیا ہے؟“ حنیف نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر سلیم فاروقی.....“ الیاس نے بتایا۔ اب گفتگو کا دائرہ سمٹ کر الیاس اور حنیف تک محدود ہو گیا تھا۔ شیخ احمد اور مختار بڑی دلچسپی سے انہیں سن رہے تھے۔ حنیف نے سوال کیا۔

”یار الیاس! کیا تم مجھے ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس بتا سکتے ہو۔ مجھے ان سے کسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔“

حنیف نے دانستہ یہ بات ظاہر نہیں کی تھی کہ وہ ٹیلی پیٹھی کا علم سیکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چپٹی تشویش اور تجسس نے الیاس کو بتا دیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے لیکن گڑبڑ کہاں واقع ہے، ایسا بات کا اسے اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ

کوشش کر رہا تھا۔ اشتیاق بڑی ریکل اسٹیٹ ایجنٹ تھا اور کراچی کے علاقے ایف بی ایریا میں اس کی خوب چلتی ہوئی ایجنسی تھی۔

ارشاد حسین نے بینک کے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے پاس مال بنانے کے بہت مواقع تھے۔ اس کے ساتھ کے لوگ کہاں سے کہاں چلے گئے تھے لیکن ارشاد حسین کے اندر رجحانی ایسا انداز میں اسے کبھی کوئی غلط کام نہیں کرنے دیا جب ہی وہ زندگی بھر کی جمع پونجی سے ایک مکان ہی بنا سکا تھا۔ بہ صورت دیگر، اگر وہ چاہتا تو کسی بھی پوش علاقے میں عايشان بنگلا بنانا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ اپنی اولاد کو رزق حلال کھانا چاہتا تھا اور اس مقصد میں اسے صد فیصد کامیابی ہوئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی پریشانی تھی کہ اس کا جوان بیٹا نقل کے ایک کیس میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

ارشاد حسین کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی سلمیٰ کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ سلمیٰ کی شادی ایک بینکر فیضان سے ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔

سلمیٰ سے چھوٹے دوڑ کے تھے۔ حنیف اور عمران۔ حنیف کی عمر چوبیس، پچیس سال کے درمیان تھی اور عمران اس سے چار سال چھوٹا تھا۔ ارشاد حسین نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی بینکر بنانے کے بارے میں سوچا تھا لیکن حنیف نے اس کی ساری آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ البتہ عمران ابھی تک اپنے مقصد پر جما ہوا تھا۔ وہ ان دنوں بی کام کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی حنیف سے تعلیمی میدان میں آگے نکل گیا تھا۔ ارشاد حسین کو توقع تھی کہ وہ عمران کو ضرور کسی بینک میں فٹ کر دے گا۔

حنیف انٹرنیشنل میں تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر میزاسرار توتوں کے حصول کی طرف نکل گیا تھا۔ اس کا ذہن کچھ اس قسم کا تھا کہ آج کی دنیا میں تعلیمی استاد انسان کو صرف کلرک ہی بنا سکتی ہیں، اچھا یا برا کلرک۔ اس کی نظر میں کسی بینک کا چہرہ ای بھی ایک کلرک تھا اور اسی بینک کا وہ بی بھی کلرک۔ اس کے خیال میں معاشرے کا تنخواہ دار طبقہ کلرک ہی شمار ہوتا تھا چاہے اس کی تنخواہ ایک ہزار ہو یا ایک لاکھ۔

ان اونچے خیالات کے ساتھ وہ کیا تعلیم حاصل کرتا اور کیا ارشاد حسین کی، اس کی بینک جاب کے سلسلے میں کوششیں بار آور ہوتیں۔ وہ بس، دن رات ماورائی علوم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھا کرتے، میں

اسی وقت آپ میرے دفتر آ کر اپنی امانت لے جائیے گا۔“ ”اور اگر آپ نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے تنکے لگا۔

”اس صورت میں بھی آپ کو میرے دفتر تو آنا ہی ہوگا۔“ میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ”تاکہ اس کیس کے حوالے سے آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کی جاسکے۔“ ”ٹھیک ہے۔“ وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ”تو پھر مجھے اجازت دیں۔“

اور میں نے اسے رخصت کی اجازت دے دی۔

عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں پھنسے ہوئے کسی ملزم سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

اس رات میں نے لگ بھگ آدھا گھنٹا ملزم حنیف کے ساتھ حوالات میں گزارا، اس طرح کہ وہ آہنی سلاخوں کے اس طرف ایک قیدی کی حیثیت سے موجود تھا اور میں اس جانب ایک آزاد شہری کے مانند۔ میرے مختلف سوالات کے جواب میں حنیف نے مجھے بے حساب حقائق کے بارے میں بتایا۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں اس کا کیس لینے کا حتیٰ فیصلہ کر چکا تھا۔ تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں وہ نو جوان مجھے بے قصور و بے گناہ نظر آیا تھا۔

میں نے وکالت نامے، درخواست ضمانت اور دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لیے اور اسے تسلی دینے کے بعد تھانے سے واپس آ گیا تھا۔

حنیف بھاری بدن کا مالک ایک گندی رنگت کا بینڈسم اور پُرکشش نو جوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس کے آس پاس تھی۔ اس سے حاصل ہونے والی قیمتی معلومات کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں اور عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی مرحلے پر آپ کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہو۔ یہاں پر یہ بھی واضح کرنا چلوں کہ اس تفصیل کے اندر سے بعض باتیں میں نے دانستہ چھپائی ہیں جنہیں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر ظاہر کروں گا۔

ارشاد حسین اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ گلشن اقبال کے علاقے میں رہتا تھا۔ اس کے پاس دو سو گز کا ذاتی گھر تھا جو اس نے زندگی بھر کی محنت سے بنایا تھا۔ اس کی ساری زندگی بینک کی ملازمت کرتے گزری تھی اور حال ہی میں وہ اس جاب سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ آج کل وہ اپنے ایک دوست اشتیاق بڑی کی ایجنسی پر بیٹھ کر کاروباری امور اور روزمرہ سیکھنے کی

حنیف سے ایک بھرپور ملاقات کر لیں۔“ ”وہ تو میں آج رات کسی وقت کر لوں گا۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”وہ کس تھانے میں زیر تفتیش ہے؟“

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتانے کے بعد سوال کیا۔ ”میں مطمئن رہوں تاکہ آپ نے حنیف کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے؟“

”اس بات کا حتیٰ فیصلہ تو میں حنیف سے ملاقات کے بعد ہی کروں گا۔“ میں نے پُرسوج انداز میں کہا۔ ”لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ میں آپ کی بھرپور مدد کے لیے تیار ہوں۔“ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ”یہ آپ کی ”حتیٰ فیصلہ“ والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب.....؟“

”بڑی سیدھی اور صاف سی بات ہے۔“ میں نے وضاحت ضروری جانی۔ ”عدالت تو کسی کیس کا فیصلہ اس کیس کے اختتامی مراحل میں تمام تر ثبوت، شواہد، گواہان کے بیانات اور دونوں جانب کے وکلاء کے دلائل کی روشنی میں کرتی ہے لیکن میں.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے ارشاد حسین کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں کسی کیس کو لینے یا نہ لینے کا فیصلہ ملزم سے ایک بھرپور ملاقات کے بعد کرتا ہوں۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کسی بھی حوالے سے ملزم اس کیس میں ملوث ہے تو پھر میں معذرت چاہتے ہوئے اس کیس سے بینڈس آپ ہو جاتا ہوں۔“

”یہ آپ کا بہت ہی زبردست اصول ہے۔“ وہ تعریفی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”انشاء اللہ! حنیف سے ملاقات کے بعد آپ کو کسی قسم کا شک نہیں گزرے گا۔“ ”پھر تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

اس کے بعد ارشاد حسین نے مجھ سے میری فیس کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اسے اپنی فیس بتادی اور اس پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میں فیس ایڈوانس میں لیتا ہوں۔ اس نے فوراً میری مطلوبہ فیس ادا کر دی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رقم ایک امانت کی طرح میرے پاس ہے۔ اگر خدا نخواستہ، میں نے آپ کے صاحبزادے کے کیس میں ہاتھ نہ ڈالا تو کل

حنیف کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

”کس سلسلے میں؟“ اس کے استفسار میں بڑی معنی خیزی تھی۔

”بس، ہے کوئی سلسلہ!“ حنیف نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”بتانا نہیں چاہ رہے ہوتا.....“ الیاس کے لبوں پر شکایت ابھر آئی۔ ”ہم دوستوں سے چھپاؤ گے یا..... کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے تو بتا دو..... ڈاکٹر صاحب بڑا مجرب تعویذ بھی دیتے ہیں ایسے معاملات کے لیے.....“

”میرا ایسا کوئی چکر نہیں جو تم دوستوں سے پوشیدہ ہو۔“ حنیف نے حقیقی آمیز انداز میں کہا۔ ”ہمارے ایک دور کے رشتے دار ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے سے بیمار چلے آ رہے ہیں، میں ان کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر میری بات کا یقین آجائے تو مجھے ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس بتا دینا ورنہ تمہاری مرضی ہے۔“

حنیف نے اب بھی اصل بات نہیں بتائی تھی۔ شیخ احمد نے کہا۔ ”یار حنیف! ہم تو پراسرار اور ماورائی علوم کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور الیاس نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کا ذکر کر دیا۔ بیچ میں تمہارے کسی عزیز کی بیماری کہاں سے آگئی؟“

”بتائے گا..... یہ ضرور بتائے گا۔“ مختار نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”ہم کیا اس کی عادت سے واقف نہیں ہیں..... اسے مشرق کی طرف جانا ہوتا تو یہ شمال کی جانب سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور جنوب کے قریب سے گزر کر بالآخر اپنی منزل مطلوب تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ جانتے نہیں ہو، شیرازی صاحب نے اس کے لیے کون سا ٹائٹل منتخب کر رکھا ہے.....؟“

شیرازی صاحب ان کے علاقے کے ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے لیکن نہایت ہی زندہ دل اور خوش مزاج۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر جوانوں اور نوجوانوں کے ساتھ ہوتا تھا اور وہ نئی نسل کے اندر بڑی آسانی سے گھل مل جاتے تھے۔ مختار نے انہی شیرازی صاحب کا حوالہ دیا تو الیاس پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔

”شیرازی صاحب نے حنیف کو کیا ٹائٹل دے رکھا ہے؟“

”چپ چھٹال.....!“ مختار نے ڈرامائی انداز میں بتایا۔

حنیف نے کسی زبانی یا عملی برہمی کا اظہار نہیں کیا بلکہ شاکی نظر سے مختار کو گھور کر رہ گیا۔ شیخ احمد نے پوچھا۔

”ہاں تو یار حنیف، اب تم اپنی زبان ہی سے ہمیں یہ دو کہ کسی عزیز کی بیماری سے شروع ہونے والا معاملاتی سزا کہاں جا کر ختم ہونے کا نام لے گا؟“

”آپ لوگوں نے اگر آج میری بھد اڑانے کا پروگرام بنایا ہے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ حنیف کی آواز میں حقیقی کاغذ بڑھ گیا۔ ”آپ لوگ بڑے شوق سے اپنا رانجھارا مٹی کر سکتے ہیں۔“

”ہم تو اپنے رانجھے کے ساتھ ساتھ تمہاری بہر کو بھی راضی کرنا چاہتے ہیں یار!“ الیاس نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن پتا تو چلے کہ وہ ہے کون؟ اس کا نام کیا ہے؟ مقام کیا ہے؟ اور تم دونوں کے ملاپ میں گھسان کیا ہے.....؟“

”کر لو..... جتنی بھی بکواس کرنا ہے۔“ حنیف نے تیز آواز میں کہا۔ ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ جب ایسا کوئی معاملہ ہے ہی نہیں تو خواہ مخواہ میں کیوں چڑوں؟“

”ارے بے وقوف! ایسے معاملات پر چڑا نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔“ شیخ احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”تم اس دنیا کی ساری لڑکیوں کو مجھ سے منسوب کر کے دن بھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہو، میں تمہارا شکر گزار ہوں گا اور تمہیں اپنی جیب سے مرغی فراہم کھلاؤں گا، دودھ پتی اس کے علاوہ ہے.....“

حنیف یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”اپنی بات سے پھر وگے تو نہیں؟“

شیخ احمد یہی سمجھا کہ حنیف کا اشارہ مرغی فراہمی اور دودھ پتی کی جانب ہے۔ وہ بڑی کشادہ دلی سے بولا۔

”زبان سے جو کہہ دیا، سو کہہ دیا یار! میں اپنی بات سے نہیں پھروں گا۔ یہ دونوں گواہ بھی ہیں اور اگر پھر بھی تمہیں میرا یقین نہ آئے تو میں تمہاری ضمانت کے بل کی رقم نکال کر ابھی میز پر رکھ دیتا ہوں۔“

”ہاں، ٹھیک ہے..... یہ بھی کر دیکھو۔“ حنیف نے معنی خیز انداز میں کہا۔

شیخ احمد نے بڑے جوش سے جتلون کی ہپ پاکٹ میں سے بٹوانکالا اور پھر اس بٹوے میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ برآمد کر کے میز پر دے مارا جیسے تاش کے گھیل میں تروپ کا پتا دوسرے پتوں کے اوپر پٹخا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے بڑے حاتم طائی کے انداز میں کہا۔

”آج سب لوگ میری جیب سے مرغی فراہم کھائیں گے۔“

خیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج سے چالیس

پینتالیس سال پہلے پچاس روپے میں چار افراد بہ آسانی مرغی فراہم کھا لیتے تھے اور ان کی چائے یا کولڈ ڈرنک وغیرہ کا آسرا بھی ہو جاتا تھا۔ آج کل پچاس روپے میں مرغی کی ایک ٹانگ بھی دستیاب نہیں ہوتی..... اللہ اللہ، کیا انقلاب زمانہ ہے۔

”اب شروع ہو جاؤ تم جلدی سے۔“ شیخ احمد نے کہا۔

”میں نے اپنی زبان پوری کر دی ہے۔“

”میں سب سے پہلے دو لڑکیوں کا ذکر کروں گا۔“ حنیف نے کبھیر انداز میں کہا۔ ”اگر یہ ذکر تم ہضم کر پائے تو پھر میں آگے بھی کوشش کروں گا ورنہ یہ سلسلہ یہیں ختم سمجھو.....“

شیخ احمد نے ٹٹولنے والی نظر سے حنیف کو دیکھا اور سوال کیا۔ ”تم کن دو لڑکیوں کی بات کر رہے ہو؟“

”ان کے نام ہیں.....“ حنیف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”سحرش اور نازنین.....!“

”اے یار..... اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے.....“ مختار نے بے ساختہ کہا۔

الیاس بے اختیار بولا۔ ”اس نے تو شیخ احمد کی بہنوں ہی سے ابتدا کر دی.....“

شیخ احمد اس دوران میں لال بھوکا ہو چکا تھا۔ چیخ سے مشابہ لہجے میں اس نے حنیف سے کہا۔ ”میری بہنوں کا اگر دوبارہ نام لیا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی.....؟“

”یہ ہمت تو مجھے آپ ہی نے دلائی ہے شیخ صاحب!“ حنیف نے نہایت ہی مہذب، بھبرے ہوئے انداز میں کہا۔

”آپ نے ایسی تو کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ آپ کی بہنوں کو میچ نہیں کرنا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اس دنیا کی ساری لڑکیوں کو آپ سے منسوب کر سکتا ہوں۔ اب یا تو آپ سارا غصہ تھوک کر اپنے کبے پر شرمندہ ہو جائیں یا پھر یہ ثابت کریں کہ سحرش اور نازنین اس دنیا کی نہیں بلکہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہیں.....“ وہ بڑے جذباتی انداز میں متوقف ہوا

پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”افسوس کہ ہم دوسری لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی کسی کی بہنیں یا کسی کی بیٹیاں ہوں گی۔ ہم اپنے نفس کی تسکین اور ذہن کی تفریح کے لیے اپنے پسندیدہ زاویوں پر انہیں فٹ کر کے حلقہ اٹھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور جب کوئی دوسرا شخص ہماری چال ہم پر لوٹا کر ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو مار گت کرتا ہے تو

ہمارے لبوں میں ڈیڑھ ہزار ڈگری سنٹی گریڈ کا ابال آ جاتا ہے۔ کیوں..... آخر کیوں..... کیا ہمارا خون صرف اپنی عزت کے لیے جوش مارتا ہے، دوسروں کی عزت تفریح طبع کا سامان ہے بس.....“

”مجھے پتا نہیں تھا یار! کہ تمہارے اندر کوئی مولوی چھپا بیٹھا ہے۔“ شیخ احمد نے اٹھ کر بازو آگے کر دیے۔ ”مجھے معاف کرو حنیف! تم نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ آئی ایم ریلی ویری سوری۔“

اگلے ہی لمحے وہ دونوں بغل گیر ہو چکے تھے۔

آئندہ دس منٹ میں سب کچھ نارٹل ہو گیا۔ دوستوں میں روٹھنا اور مان جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ ویسے حنیف نے جتنی بڑی حقیقت کو شیخ احمد کے سامنے اجاگر کیا تھا، ان میں سے کسی کو بھی اس سے اختلاف نہیں تھا۔ مختار نے شیخ احمد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر ان پچاس روپے کی مرغی فراہم منگوالی جائے؟“

”میری طرف سے پوری اجازت ہے۔“ وہ نخل سا ہو کر بولا۔

”میرا خیال ہے، اس سلسلے میں ہمیں حنیف کا مشورہ ماننا چاہیے۔“ الیاس نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔

”کیونکہ ان پچاس روپے کا فائدہ تو یہی ہے نا!“

سب نے الیاس کی بات سے اتفاق کیا تو حنیف سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرے خیال میں مرغی ٹھیک نہیں۔ وہ تو اور بلند پربشر بڑھائے گی۔ یہاں پہلے ہی خاصی گرما گری ہو چکی ہے لہذا اس رقم کی ہم آکس کریم کھائیں گے لیکن ایک شرط ہے.....“

حنیف نے جملہ نامکمل چھوڑا تو الیاس نے فوراً پوچھا۔

”کیسی شرط؟“

”منطور سے اٹھنے سے پہلے تم مجھے ڈاکٹر سلیم فاروقی کا ایڈریس بتاؤ گے۔“ حنیف نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

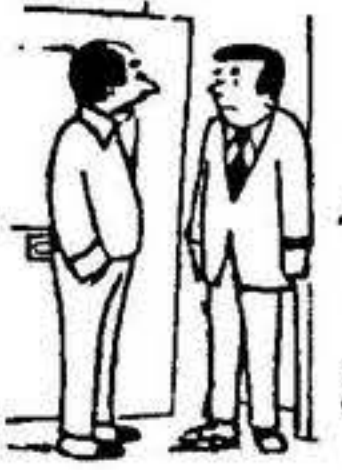
”جی بات تو یہ ہے حنیف..... کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلینک کا ایڈریس معلوم نہیں ہے۔“ الیاس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھ سے بھی ایک دوست نے ذکر کیا تھا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ شادمان کے علاقے میں ہوتے ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے، پھر تم اپنے اس دوست ہی سے پوچھ کر بتا دینا۔“ حنیف نے کہا۔ ”لیکن یار، میرے اس کام کو یاد رکھنا۔“

میرا تے جاوے

دو چیزیں انسان کی کمزوری
ظاہر کرتی ہیں۔ جہاں بولنا
ہو، وہاں خاموش رہنا اور جہاں
خاموش رہنا ہو، وہاں بولنا۔
فارسی کہادت

شادی ہر صورت میں فائدہ مند ہے۔ اگر آپ کو
اچھی بیوی ملی تو آپ خوش نصیب ہوں گے نہ
مفسر بن جائیں گے۔ ”سقطراط“



دوسری سیلزمین بہت
عرصے بعد ملے۔ ایک نے
حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔
”آج کا دن تو بہت ہی بُرا
گزرا۔ کہیں ڈانٹ پھسکا رہنے
کو ملی۔ کہیں گالیوں، کہیں
لوگوں نے منہ بنا کر دروازہ بند کر لیا، کہیں گرجے برسے
لگے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔“

”کیا بیچ رہے ہو آج کل؟“ دوسرے نے پوچھا۔
”اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔“ پہلے نے جواب دیا۔

انداز میں کہا۔ ”لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں کرتا ہوں کچھ.....“
”وہ میری طرف راغب ہو جائے گا نا.....؟“ بیوی
نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔
”بالکل ہو جائے گا!“ سیانا یقین سے بولا۔ ”میرا عمل
خطا نہیں جاتا لیکن.....“
”لیکن کیا بابا جی؟“ سیانے کے ادھر سے جملے پر اس
بیوی نے تڑپ کر پوچھا۔

”لیکن یہ کہ.....“ سیانا گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے
اس عمل کے لیے شیر کی گردن کا ایک بال چاہیے ہوگا۔ میں
چاہوں تو وہ بال کسی سے بھی منگوا لوں لیکن اس عمل کا تقاضا یہ
ہے کہ جس کا کام ہو، بال بھی اسی کو لانا ہوگا.....“
”لیکن قبلہ!“ بیوی جزیب ہوتے ہوئے بولی۔ ”شیر تو
بہت ہی خطرناک جانور ہے۔ میں اس کی گردن میں سے کوئی

حاضریاں دینے لگا۔
حنیف لگ بھگ تین ماہ تک ٹیلی پتھی سیکھنے کے شوق
میں ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک جاتا رہا۔ ٹیلی پتھی کا تو ”ٹ“
بھی اس کے دماغ میں نہیں پایا تھا، البتہ اس نے اس دوران
میں کلینک پر عجیب عجیب کلائنٹس کو دیکھا اور ان کے مسائل کو
سنا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ کیس عورتوں کے ہوتے تھے
جن میں سے بیشتر اپنے شوہروں کو سیدھا کرنے کے لیے
ڈاکٹر سے مختلف قسم کے تعویذات اور بندشیں وغیرہ بنا کر
لے جاتی تھیں۔ ایسی احمق عورتیں اگر اس سے آدمی تو جہ بھی
اپنے شوہروں پر مرکوز کرتیں جتنی وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے بچا
کر رکھتی ہیں تو انہیں کسی تعویذ یا بندش کی ضرورت ہی محسوس
نہ ہوتی۔ ان کے بگڑے ہوئے شوہر نہ صرف یہ کہ سیدھے
ہو جاتے بلکہ ان کے مطیع و فرماں بردار بھی بن جاتے۔

کیونکہ وہ محبت کے بھوکے، رومانس کے متلاشی اور
پرسکون گھریلو ماحول کے پیاسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو
ہر رات ایک مٹی سنوری دلہن کے روپ میں دیکھنے کے بھی متمنی
ہوتے ہیں لیکن دوسری جانب معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اسے باہر والوں کے ”دیکھنے“ کا اتنا زیادہ خیال اور
اس خیال کا ایسا شاندار اہتمام کا احساس ہوتا ہے مگر جس شخص کو
انہیں دیکھنا چاہیے جب یہ اس کے قریب جاتی ہیں تو بچن والا
پسینے میں بسا ہوا لباس ان کے بدن پر سجا ہوتا ہے جس میں سے
لہن پیاز کے علاوہ مختلف چٹنیوں کی مہک اٹھ رہی ہوتی ہے۔
ان کے اس حسن سلوک کی تاب نہ لاتے ہوئے اگر
کوئی شوہر گھر سے باہر ”سکھ چین“ کے لیے نگاہ دوڑانے کی
کوشش کرے یا ایسی کوشش کے دوران پکڑا جائے تو سب
سے پہلے تو گھر کے اندر ایک فساد عظیم برپا کیا جاتا ہے۔ اس
کے بعد ڈاکٹر سلیم فاروقی جیسے عامل کامل فراڈ لوگوں کے
آستانے پر شوہروں کو سیدھا کرنے کے لیے تعویذات اور
بندشیں وغیرہ لینے پہنچ جاتی ہیں۔

ایک بیوی کسی سیانے کے پاس پہنچی اور عرض کیا۔
”حضرت! کوئی ایسا عمل کریں کہ میرا شوہر سدھر جائے.....“
”اس میں ایسی کیا خرابی ہے؟“ سیانے نے گہری
سنجیدگی سے پوچھا۔

”سرکار! وہ مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا۔“ اس
بیوی نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ ”مجھے گھر کی مرغی اور گھڑے کی
چھٹی سمجھتا ہے۔ اس کی ساری توجہ اور محبت باہر کی رنگین تیلیوں
پر بچھا رہی ہے۔ میں سخت پریشان ہوں۔“
”بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔“ سیانے نے گہرے

پر موجود رہتے ہیں۔“ حنیف نے اپنی تسلی کے لیے پوچھ لیا۔
”دراصل، میں ایسے وقت میں ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا
ہوں جب انہیں ذرا فرصت ہوتا کہ میں اپنے معاملے پر ذرا
تفصیلاً ان سے بات کر سکوں.....!“

”بس، تو پھر آپ شام میں ہی آئیں تو اچھا ہے۔“
طارق شاہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”صبح کے وقت تو زیادہ
رش عورتوں ہی کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مسائل سنا سنا کر سرکار کا
دماغ خالی کر دیتی ہیں۔ سرکار چار بجے سے پانچ بجے تک
آرام فرماتے ہیں۔ پانچ بجے فریش ہو کر دوبارہ بیٹھ جاتے
ہیں اور اس وقت سائیکلن کا سب سے کم ہجوم ہوتا ہے بلکہ میں
نے تو دیکھا ہے کہ پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان تو
کلینک خالی ہی پڑا ہوتا ہے۔ سرکار ہوتے ہیں، میں ہوتا ہوں
یا پھر آصف جو کلینک میں ادھری کام کے لیے رکھا گیا ہے۔
کلائنٹس وغیرہ چھ بجے کے بعد ہی آنا شروع ہوتے ہیں۔“

”بس تو جناب، میں کل ٹھیک پانچ بجے کلینک پر حاضر
ہو رہا ہوں۔“ حنیف نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر
صاحب سے ملاقات کرانا آپ کا کام ہے.....“

”میں سرکار سے آپ کی ملاقات ضرور کرادوں گا۔“
طارق شاہ نے یقینی لہجے میں کہا۔ ”بلکہ میں دن ہی میں ان
سے آپ کا ذکر کر دوں گا۔“
”یہ تو آپ کا بڑا احسان ہوگا مجھ پر!“ حنیف نے
منونیت بھرے انداز میں کہا۔

وہ دس پندرہ منٹ مزید طارق شاہ کے فلیٹ پر رہے،
چائے بسکٹ سے معدے کو محفوظ کیا پھر صاحب خانہ سے
پرجوش مصافحہ کر کے واپس آگئے۔

آئندہ روز سے حنیف نے فاروقی کلینک پر جانا
شروع کر دیا۔ ڈاکٹر سلیم فاروقی نے پہلی ہی ملاقات میں
اسے سرتاپا متاثر کر لیا تھا۔ ڈاکٹر کو ٹیلی پتھی آتی تھی یا نہیں
اور مجھے یقین ہے..... بالکل نہیں آتی تھی! ورنہ وہ ایسی بے بسی
اور بے کسی کی موت ہرگز نہ مرتا۔ بہر حال، تو میں آپ کو بتا رہا
تھا کہ وہ شخص مختلف ماورائی علوم کے بارے میں گہری
معلومات ضرور رکھتا تھا۔ شعور، لاشعور، تحت الشعور، حواس
خمسہ، چھٹی حس، مچیوٹری گلیٹنڈ، تھرڈ آئی اور دیگر ایسی ہی
درجن بھر دماغی و نفسیاتی اصطلاحات کی مار، مار کر ڈاکٹر نے
حنیف کو اپنا مرید بنالیا بلکہ اس کے دماغ میں یہ خیال
جاگزیں کر دیا کہ وہ اسے بہت عزیز رکھتا ہے اور اس احساس
نے حنیف کے اندر اس کی اوقات سے زیادہ ہوا بھردی اور
وہ بعض اوقات تو دن میں بھی ”سرکار“ کی خدمت میں

”تم بے فکر ہو جاؤ۔“ الیاس نے تسلی بھرے انداز
میں کہا۔
اور حنیف..... واقعی بے فکر ہو گیا۔

اگلے روز الیاس نے حنیف کو اپنے ساتھ لے جا کر
اس دوست سے ملوایا جس کا اس نے ”منظور“ میں ذکر کیا
تھا۔ اس شخص کا نام طارق شاہ تھا اور وہ ایف سی ایریا کے
ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ حنیف کو یہ جان کر بڑی خوشی
ہوئی کہ طارق شاہ، ڈاکٹر سلیم فاروقی کے ساتھ ہی ہوتا تھا بلکہ
کلینک کے معاملات میں وہ ڈاکٹر صاحب کا اسسٹنٹ تھا۔
طارق شاہ ایک گورا چٹا اور درمیانہ قد شخص تھا۔ جسم
مائل بہ فرہبی اور چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی موچھیں۔ وہ اپنے
سر پر ہر وقت ٹوپی لگائے رہتا تھا۔ طارق شاہ نے بڑی محبت
اور اخلاص سے ان کا استقبال کیا۔ راستے میں حنیف نے
الیاس کو اپنے مقصد سے تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا کہ ڈاکٹر سلیم سے
ملنے کے لیے اتنا بے تاب کیوں ہے۔

”میں علیک سلیک کے بعد الیاس نے حنیف کا تعارف
کرانے کے بعد طارق شاہ سے کہا۔ ”شاہ جی! یہ میرا بہت
اچھا دوست ہے۔ یہ آپ کے ڈاکٹر صاحب سے ٹیلی پتھی
سیکھنا چاہتا ہے۔“

”بڑی خوشی سے جناب۔“ طارق شاہ نے دوستانہ
انداز میں کہا۔ ”ہم بیٹھے کس لیے ہیں آخر.....“ وہ پھر براہ
راست حنیف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
”آپ سرکار سے ملاقات کے لیے کبھی کلینک پر
تشریف لائیں۔“

”سرکار!“ سے اس کی مراد یقیناً ڈاکٹر سلیم ہی سے
تھی۔ حنیف نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔
”آپ مجھے کلینک کی لوکیشن بتا دیں میں حاضر
ہو جاؤں گا۔“

طارق شاہ نے نہایت سہل انداز میں اسے ”فاروقی
کلینک“ کی لوکیشن سمجھا دی تو حنیف نے اثبات میں گردن
ہلائی اور پوچھا۔

”کلینک کی کوئی مخصوص ٹائمنگ ہے یا.....؟“
”بالکل ٹائمنگ ہے بھائی۔“ طارق شاہ اس کی بات
مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”دن میں گیارہ بارہ سے
لے کر چار بجے تک اور شام میں پانچ بجے سے لے کر رات
دس بجے تک کلینک کھلا رہتا ہے۔ ان اوقات میں آپ کسی
وقت بھی آ سکتے ہیں۔“
”کیا اس دوران میں تمام وقت ڈاکٹر صاحب کلینک

بال.....؟

”مجھے یقین ہے، تم یہ کام کر سکتی ہو!“ سیانے نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ”مجھے تمہارے اندر چھپی ہوئی وہ صلاحیت صاف نظر آرہی ہے جس کو بروئے کار لا کر تم ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہو۔ جاؤ..... شیر کی گردن کا صرف ایک بال لے آؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

وہ بیوی سیانے کے آستانے سے واپس آگئی اور اگلے ہی روز سے اس نے باقاعدگی کے ساتھ چڑیا گھر جانا شروع کر دیا جہاں ایک پنجرے میں شیر بھر بھی بند تھا۔ اس کے سامنے چونکہ ایک مقصد آن کھڑا ہوا تھا لہذا وہ پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے میں لگ گئی۔ وہ ہر قیمت پر شیر کی گردن کا بال حاصل کر کے، سیانے کے طلسماتی اور کرشماتی عمل سے اپنے شوہر کو قابو کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

ابتدا میں اس نے اپنے ساتھ گوشت کا ایک پارچہ لے جانا شروع کیا۔ وہ شیر کے پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور گوشت کے ٹکڑے کو پنجرے کے اندر پھینک کر شیر کو اس جانب متوجہ کرنے کے لیے اشاروں اور سیٹیوں کی ترکیب آزمانے لگی۔ دوسری یا تیسری کوشش پر ہی شیر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا..... وہ شیر بھر کو گوشت کی جھلک دکھا کر آنکھوں سے مخصوص اشارہ کرتی تو وہ اس کی دعوت پر فوراً گوشت سے فیض یاب ہونے کے لیے لپک پڑتا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ شیر اس بیوی سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ گوشت سے لذت آشنا ہونے کے بعد وہ اسی کے قریب بیٹھ جاتا اور وہ بیوی اس کی گردن کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اسے مزے دلاتی رہتی..... پھر ایک روز اس نے موقع دیکھ کر شیر کی گردن سے ایک بال نوج ہی لیا۔

اپنی اس کامیابی پر بے حد شاداں و فرحاں وہ بھاگتی ہوئی اس سیانے کے پاس پہنچی اور مذکورہ بال اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”حضرت! یہ لیں بال۔ میں نے تو اپنا کام کر دیا۔ اب آپ بھی اپنا عمل شروع کریں.....“

سیانے نے حیرت بھری نظر سے اس بیوی کو دیکھا پھر پوچھا کہ اس نے یہ بال حاصل کرنے کے لیے کیا ترکیب آزمائی ہے۔ بیوی نے اپنی کوشش کو پوری تفصیل سے بیان کر دیا۔ سیانے کی حیرت دو چند ہو گئی، وہ چرمی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”اللہ کی بندی! سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اب میرے کسی عمل کی کوئی ضرورت

باقی نہیں رہی۔“

”آپ عمل نہیں کریں گے تو میرا کام کیسے ہوگا؟“ وہ تعجب خیز لہجے میں بولی۔

”میں نے کہا نا، تمہارا کام ہو گیا۔“ سیانے نے اصراری لہجے میں کہا۔ ”بس، اب تمہیں میری ایک بات دھیان سے سننا ہوگی۔ اگر تم نے میری بات کو پوری توجہ سے سن کر اپنے ذہن میں بٹھالیا تو سمجھو کہ تمہارا بیڑا پار ہو گیا۔“

وہ بیوی ہمت نہ کوش ہو گئی۔ سیانے نے اس کے انہماک اور سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اوجھلیے..... جتنی مہارت اور عقل مندی سے تم نے گوشت دکھا دکھا کر جنگل کے بادشاہ کو رام کر لیا تھا، اگر تم خلوص تن من سے..... اس سے آدھی محنت بھی اپنے شوہر پر کرو تو وہ ساری زندگی تمہارے قدموں میں پڑا رہے گا۔ پھر تمہارے سارے گلے شکوے جاتے رہیں گے۔“

تو..... میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم حنیف کو ٹیلی فنی سیکھنے کی غرض سے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک پر جاتے ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہوئے تھے کہ ایک روز اسے اسی ڈاکٹر سلیم کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔



ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی اور اپنے موکل کی ضمانت کے لیے دلائل دینا شروع کر دیے۔

قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل سے ہوتی ہے بلکہ یہ کام ناممکن کی حدود کو چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کروں گا کہ میں اپنے موکل کی ضمانت کروانے میں قطعی ناکام رہا تھا۔

پولیس نے اپنی تفتیش کی روشنی میں میرے موکل کو ڈاکٹر سلیم فاروقی کا قاتل نامزد کیا تھا اور اسی رپورٹ کو استغاثہ کہا جاتا ہے۔ یہ رپورٹ کئی صفحات پر مشتمل تھی جس کے اہم مندرجات گاہے بے گاہے آپ کی نظروں سے گزرتے رہیں گے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی کی موت سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے کلینک کے آخری یعنی تیسرے اور عقبی پورشن میں مردہ حالت میں پایا گیا تھا۔ اس کی موت کا سبب ایک آہنی سلاح بھی جس کی خطرناک ضرب

سازشی کردار

نے مقتول کی کھوپڑی کے پچھلے حصے کو بڑی بے دردی سے ”پاش پاش“ کر دیا تھا یعنی وہ حصہ بری طرح چٹخ گیا تھا۔ اس کاری وارنے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔

رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں یہ بھی درج تھا کہ مقتول کو حالت نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کلینک کا وہ عقبی پورشن اس نے اپنے آرام کے لیے مختص کر رکھا تھا جہاں فرش پر ایک گداز بستر بچھا دیا گیا تھا۔ مقتول کے معمول میں یہ بات شامل تھی کہ وہ روزانہ سہ پہر میں چار بجے سے لے کر پانچ بجے تک اسی پورشن میں لیٹ کر ایک آرام دہ نیند لیا کرتا تھا جس کے بعد وہ فریش ہو کر دوبارہ اپنے کلینک پر آ بیٹھتا تھا۔ اس کی پیٹھک کلینک کے دوسرے یعنی وسطی پورشن میں ہوا کرتی تھی جہاں وہ اپنے پاس آنے والے مصیبت زدہ لوگوں کے مسائل سناتا تھا اور ان کے مسائل کے لیے مختلف ماورائی اور غیر ماورائی حل تجویز کیا کرتا تھا اور ظاہر ہے، یہ کام وہ مفت میں یا فی سبیل اللہ نہیں کرتا تھا۔

مقتول ڈاکٹر نے اپنی کوئی مخصوص فیس مقرر نہیں کر رکھی تھی۔ اس کے پاس معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کلائنٹس آیا کرتے تھے جن میں ایسے بھی ہوتے تھے کہ جنہیں تعویذ کے علاوہ کھانے کے پیسے بھی دینا پڑتے تھے اور بعض ”پارٹیاں“ ایسی بھی تھیں جن سے وہ ”بندش“ کرنے یا ”بندش“ کاٹنے کی مدد میں ہزاروں وصول کر لیا کرتا تھا۔ اس نے حصہ یہ قدر جیش کے مصداق ایک ایسی نادیدہ چھری ہاتھ میں پکڑ لی تھی یہ موقع محل دیکھ کر کلائنٹس کو کاٹتی تھی اور وہ ہر صورت میں فائدے ہی میں رہتا تھا۔ وہ جن سے رقم وصول نہیں کرتا تھا، ان سے کچھ اور وصول کر لیا کرتا تھا اور یہ ”کچھ اور“ فرد بہ فرد بدلتا رہتا تھا۔ اس معاملے میں وہ مرد اور عورت میں تمیز کرنا خوب جانتا تھا۔

مقتول کے کلینک کا پہلا یعنی ابتدائی پورشن ریسپشن کی حیثیت کا حامل تھا جہاں مقتول ڈاکٹر کا اسسٹنٹ طارق شاہ براجمان ہوا کرتا تھا۔ طارق شاہ کی مخصوص نشست کے علاوہ سالکین کے لیے دو تین صوفے ڈال دیے گئے تھے جہاں بیٹھ کر وہ اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ گویا وہ ابتدائی پورشن بیک وقت طارق شاہ کا کمرابھی تھا اور کلائنٹس کے لیے انتظار گاہ بھی جہاں پر موجود ضرورت مند طارق شاہ کی مرضی ہی سے مقتول ڈاکٹر کے پاس شرف باریابی پاتے تھے۔

جب ملزم کی درخواست ضمانت مسترد ہو چکی تو عدالت کی جانب سے اسے جیو ڈیٹل ریمانڈ بر جیل بھیج دیا گیا تھا۔ ابتدائی چند پیشیوں پر کوئی بھی قابل ذکر عدالتی

کارروائی نہ ہو سکی۔ اس ٹیکنیکل تفصیل کو بیان کر کے میں آپ کو بور نہیں کروں گا۔ لگ بھگ دو ماہ کے بعد، عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس دوران میں، میں مختلف پہلوؤں سے، ڈھیروں اہم نکات جمع کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا گویا، میں اس کیس سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

آئندہ پیشی پر جب اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی جس کے جواب میں، میرے موکل نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔

ملزم نے معزز عدالت کے سامنے کم وبیش وہی بیان دیا تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ وکیل استغاثہ نے جج کی اجازت کے بعد ملزم پر کڑی جرح کی لیکن ملزم میری ہدایات کی روشنی میں بڑی ثابت قدمی سے وکیل مخالف کی جرح کے سامنے ڈٹا رہا۔

اپنی باری پر میں ایکوز ڈبا کس کے قریب چلا گیا۔ پھر ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ تم مقتول کے کلینک پر اکثر جایا کرتے تھے؟“

”جی ہاں..... یہ بات سچ ہے۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”یہ سلسلہ کب سے جاری تھا؟“

”لگ بھگ تین ماہ سے۔“

”تمہارا مطلب ہے.....“ میں نے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔ ”مقتول کی بھیانک موت سے، تین ماہ پہلے سے؟“

”جی ہاں، میرا یہی مطلب تھا.....“

”کیا تم پر کوئی جن وغیرہ آتا تھا یا کسی بندش کو کٹوانے تم مقتول کے کلینک پر جایا کرتے تھے۔“ میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ”سنائے، مقتول بہت ہی پہنچا ہوا ماہر عامل تھا.....؟“

”سناتو میں نے بھی یہی تھا جناب.....“ وہ بددلی سے بولا۔ ”لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ..... دور کے ڈھول سہانے..... تو میرے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا تھا اور جہاں تک آپ کے سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے نا تو.....“ اس نے لمحائی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”مجھ پر تو کوئی جن آتا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ بندش جیسا کوئی معاملہ تھا۔ جن اس لیے نہیں آسکتا تھا کہ میں

کوئی حسین و جمیل دو شیزہ نہیں تھا اور بندش کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا تھا کہ دور دور تک میرا کوئی دشمن نہیں تھا۔
”تم مقتول ڈاکٹر کے ساتھ رہ کر کافی ٹیکنیکل ہو گئے ہو!“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”جب تمہارے ساتھ کوئی عارضہ نہیں تھا تو پھر تم مقتول کے کلینک پر کیوں جایا کرتے تھے؟“
”ٹیلی پیٹھی سیکھنے کے لیے!“

”اوہ، ٹیلی پیٹھی.....“ میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ”کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ یہ ٹیلی پیٹھی کیا بلا ہوتی ہے؟“
”جناب! یہ بلا نہیں بلکہ ایک سائنٹفک علم ہے۔“ وہ بڑے مدبرانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جسے خیال خوانی اور مینٹل کیوٹیویشن بھی کہا جاتا ہے۔“
”اچھا تو مقتول ڈاکٹر نے تمہیں ٹیلی پیٹھی کے حوالے سے بہت کچھ پڑھا رکھا ہے؟“ میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ساری معلومات تو ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے ہی مجھے حاصل تھیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔ ایک ٹیلی پیٹھی جاننے والا انسان کسی دوسرے انسان کی سوچ تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔“
”کیا مقتول ڈاکٹر کے پاس تمہاری بیان کردہ ٹیلی پیٹھی کی یہ صلاحیت موجود تھی.....؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور کیا اس نے تمہیں بھی اس حیرت انگیز صلاحیت سے روشناس کرایا تھا؟“

”میں سمجھتا ہوں، وہ ٹیلی پیٹھی نہیں جانتا تھا۔“ وہ خاصے جرات مندانہ انداز میں بولا۔ ”اور جب وہ خود کچھ نہیں جانتا تھا تو بے چارہ بھلا مجھے کہاں سے سکھاتا!“
”اس کے باوجود بھی تم اس کے پاس ٹیلی پیٹھی یا تھاٹ ریڈنگ سیکھنے لگ بھگ تین ماہ تک جاتے رہے.....؟“
”مجھے یہ احساس بہت بعد میں ہوا تھا کہ ڈاکٹر سلیم اس معاملے میں عملی طور پر بالکل کور ہے۔“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔ ”وہ مجھے اٹو بنانے کے لیے موم بتی اور آئینے کی مختلف مشقیں بتاتا رہتا تھا۔ کبھی میں رات میں شمع بجی کر رہا ہوتا اور کبھی آئینے کے سامنے بیٹھ کر اور پشت پر چراغ روشن کر کے آئینے میں اپنے عکس کو گھورا کرتا۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں ڈاکٹر کے پاس حاضریاں لگا کر محض اپنا وقت برباد کر رہا ہوں تو میں نے اس سلسلے کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وقوعہ کے روز میں مقتول کو اپنے اسی فیصلے سے آگاہ کرنے گیا تھا کہ

مصیبت میں پھنس گیا.....“
”تم وقوعہ کے روز مقتول کے کلینک پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“
”کم و بیش سوپانچ بجے۔“ ملزم نے جواب دیا۔
”کیا تم ہمیشہ اسی وقت وہاں جایا کرتے تھے؟“
”میں عموماً پانچ اور ساڑھے پانچ کے درمیان وہاں جایا کرتا تھا۔“

”وقوعہ کے روز تم وہاں کتنی دیر کے تھے؟“
”زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔“
”یعنی تم پانچ بجیں پر کلینک سے نکل گئے تھے؟“
”جی ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔“
”گویا وقوعہ کے روز تم نے مقتول کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور وہاں سے واپس آ گئے۔“ میں نے دانستہ چند زمینی حقائق کی نقاب کشائی کے لیے یہ سوال کیا تھا۔ ”تم نے وہاں زیادہ دیر رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی.....؟“
”جناب! یہ بات تو درست ہے کہ میں وقوعہ کے روز مشکل دس منٹ کلینک پر رہا تھا۔“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اس روز مقتول سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔“

”کیوں..... کیا وہ اپنے کلینک پر موجود نہیں تھا؟“
”موجود تو تھا لیکن خلاف معمول وہ دیر تک آرام کمرے میں سوتا رہا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے اس کے اٹھنے کا انتظار نہیں کیا اور واپس آ گیا۔“
”کیا تم نے کلینک کے تیسرے اور آخری پورشن یعنی بہ قول تمہارے آرام کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا کہ مقتول وہاں سو رہا ہے؟“

”جی نہیں، میں نے اندر تو نہیں جھانکا تھا۔“
”پھر تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ وقوعہ کے روز مقتول آرام کمرے میں خلاف معمول زیادہ دیر تک سو رہا تھا؟“ میں نے کرید جاری رکھی۔
”یہ بات مجھے شاہ جی نے بتائی تھی۔“
”شاہ جی..... مطلب طارق شاہ؟“

”جی ہاں، میں طارق شاہ ہی کی بات کر رہا ہوں۔“
”معزز عدالت کو مختصر الفاظ میں بتاؤ کہ وقوعہ کے روز جب تم مقتول کے کلینک پر پہنچے تو وہاں دس منٹ کے وقفے میں حالات کس ترتیب سے پیش آئے تھے۔“ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ”مختصر الفاظ میں حالات بیان کرنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ تم کسی اہم واقعے ہی کو

مکمل کر دو۔ معزز عدالت چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کو بھی جانتا چاہتی ہے..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“
”جی، میں سمجھ رہا ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلانے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اس روز میں پانچ پندرہ پر یعنی سوپانچ بجے مقتول ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچا تھا۔ میں پچھلے تین ماہ سے وہاں جا رہا تھا۔ ہفتے میں دو تین بار تو جانا ہوتا ہی تھا لہذا میں ڈاکٹر سلیم کے معمولات سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ روزانہ سہ پہر چار بجے سے پانچ بجے تک آرام کرتا تھا پھر تروتازہ ہو کر دوبارہ کلینک کرنے لگتا تھا اس حساب سے اسے کلینک میں بیٹھے ہونا چاہیے تھا لیکن جب میں سوپانچ بجے وہاں پہنچا تو ڈاکٹر کی سیٹ خالی تھی.....“
”سیٹ خالی تھی.....!“ میں نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ اپنی کرسی پر موجود نہیں تھا۔“
”کرسی پر نہیں تھا تو پھر کہاں تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”جناب! میں وہی تو آپ کو بتانے جا رہا تھا۔“ وہ ایک مضحکہ خیز سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”جب میں نے ڈاکٹر سلیم کو اس کی سیٹ پر نہ پایا تو طارق شاہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ طارق شاہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اندر ہی ہوں گے۔ میں نے کہا۔ اندر تو میں دیکھ چکا ہوں۔ ان کی سیٹ خالی ہے، اس پر طارق شاہ بولا۔

”تو پھر وہ ابھی تک آرام ہی کر رہے ہوں گے۔“
میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔ ”ابھی تک وہ کیسے سو سکتے ہیں۔ وہ تو ٹھیک پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں اور اس وقت سوپانچ بج رہے ہیں.....؟“

میری وضاحت کے جواب میں طارق شاہ نے بڑی عجیب سی بات کی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”کیا ڈاکٹر صاحب تمہیں اس کمرے میں کہیں نظر آرہے ہیں؟“

”نہیں.....“ میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تو وہ نہیں ہیں۔“
”اور وہ اپنے کلینک والے کمرے میں بھی نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بات ابھی تم نے ہی مجھے بتائی ہے۔“

”ہاں.....!“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔
”اب باقی رہ جاتا ہے ایک ہی کمرہ.....“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جہاں ڈاکٹر صاحب روزانہ آرام کیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں کلینک سے باہر جاتے ہوئے تو

دیکھا نہیں۔ جب وہ دو کمروں میں نہیں ہیں تو یقیناً وہ آرام کمرے میں ہوں گے اور آرام کر رہے ہوں گے.....“ وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
”اگر تمہیں زیادہ جلدی ہے تو انہیں سوتے سے اٹھا دو یا پھر تم بعد میں آ جانا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرو.....“

اس روز میرا عجیب سا موڈ ہو رہا تھا۔ میں تو صرف ڈاکٹر سے یہ کہنے گیا تھا کہ اب میں وہاں نہیں آیا کروں گا۔ جب وہ ابھی تک سویا پڑا تھا تو پھر میں وہاں بیٹھ کر کیا کرتا۔ میں نے یہ سوچ کر وہاں سے واپس ہی آ جانے کا فیصلہ کیا کہ بعد میں کسی وقت فون کر کے ڈاکٹر کو بتا دوں گا۔

”تو تم وقوعہ کے روز سوپانچ بجے مقتول کے کلینک پہنچے تھے۔“ میں نے ضروری حقائق کو تازہ کرتے ہوئے ملزم سے تصدیق چاہی۔ ”لگ بھگ دس منٹ تک تم کلینک میں رکے، طارق شاہ سے بات چیت کی اور پھر کم و بیش پانچ بجیں پر تم کلینک سے واپس آ گئے۔“ میں نے رک کر سانس لی پھر اپنا استفسار مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ان دس منٹ کے دوران میں تم نے مقتول کی جھلک دیکھی اور نہ ہی اس کے آرام کمرے میں داخل ہو کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ وہاں موجود بھی ہے یا نہیں اور..... اگر موجود ہے تو وہ..... سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”جی ہاں..... آپ بجا فرما رہے ہیں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”بالکل یہی ہوا تھا جو آپ نے بیان کیا ہے۔“

”وقوعہ کے روز تم پانچ بجیں پر مقتول کے کلینک سے باہر آ گئے تھے۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔
”کیا اس کے بعد تم سیدھے گھر چلے گئے تھے یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟“

”میں سیدھا گھر نہیں گیا تھا جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے بتایا ہے نا، اس روز میری طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں اپنے علاقے گلشن اقبال میں پہنچا تو گھر سے قریبی پارک میں چلا گیا۔ وہاں اپنے ہی علاقے کے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں بھی دل بہلانے کے لیے ان کے کھیل میں شامل ہو گیا۔ پھر جب اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نے کھیل چھوڑ دیا اور ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں پارک سے نکلا اور اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔“
”وقوعہ کے روز تم کتنے بجے گھر پہنچے تھے؟“ میں نے

”لگ بھگ پونے آٹھ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔
”اور پولیس نے تمہیں کتنے بجے گھر سے گرفتار کیا تھا؟“

”اس وقت آٹھ یا آٹھ پانچ ہوئے ہوں گے۔“ اس نے بتایا۔ ”بس، یوں سمجھیں کہ میں نے آکر منہ ہاتھ دھویا، لباس تبدیل کیا اور پولیس آدھمکی۔“

”جب پولیس کی زبانی یہ پتا چلا کہ وہ لوگ تمہیں ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رہے ہیں تو کیسا لگا تھا؟“

”ایک دم شاک لگا تھا۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ یہی محسوس ہوا کہ وہ لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔“

”لیکن یہ ان کا مذاق نہیں تھا۔“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے تمہیں نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا بلکہ اس سلسلے میں سخت ترین سزا دلوانے کے لیے تمہیں حوالہ عدالت بھی کر دیا۔“

”جی ہاں، یہ تلخ حقیقت تو آپ سب کے سامنے ہے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”ایک آخری سوال.....!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دینا ہوگا.....!“

”جی، میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے.....“

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ وقوعہ کے روز تم نے سہ پہر چار بجے سے لے کر پانچ بجے تک کا وقت کہاں گزارا تھا.....؟“

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول سلیم فاروقی کی موت چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ نیند کی حالت میں اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر، آہنی باریکی طوفانی ضرب لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس حوالے سے میرا یہ سوال نہایت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ آپ اسے حاصل جرح بھی کہہ سکتے ہیں۔

مطمئن نے اس اہم سوال کے جواب میں بتایا۔ ”جناب! اس روز میں کوئی سوا تین بجے گھر سے نکلا تھا۔ باہر آیا تو شیخ احمد سے ملاقات ہو گئی اور ہم ”منظور“ پر چائے پینے بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان گپ شپ بھی ہوئی رہی اور ہم

چائے وغیرہ بھی نوش کرتے رہے۔ الیاس کی زبانی مختار اور شیخ احمد کو بھی خبر ہو گئی تھی کہ میں آج کل ٹیلی پیٹھی سیکھنے ڈاکٹر سلیم فاروقی کے کلینک پر جایا کرتا ہوں۔ شیخ احمد نے اسی حوالے سے پوچھ لیا۔

”اور سناؤ یار..... تمہارا وہ ٹیلی پیٹھی والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“

”بس، یوں سمجھو کہ بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔“ میں نے بدولی سے بتایا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ شیخ احمد نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ یار..... کچھ ہو ہی نہیں رہا.....“

”میں نے تو تمہیں شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ اس چیز کے پیچھے مت بھاگو جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔“ شیخ احمد نے کہا۔ ”یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں میری جان۔“

”نہیں یار!“ میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”ٹیلی پیٹھی قصے کہانیوں کی بات نہیں۔ یہ ایک باقاعدہ اور مستند علم ہے، ایک سائنس ہے۔“

”اگر یہ ایک سائنس ہے تو پھر اس کے مروجہ اصول اور قاعدے بھی ہوں گے۔“ وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ”جو بھی شخص سائنس کے قانون، قاعدے اور اصولوں کو اپناتا ہے، وہ سائنس کی روح کو پالیتا ہے..... پھر ٹیلی پیٹھی کے سلسلے میں تم پچھلے تین ماہ سے جھک کیوں مار رہے ہو؟“

”میں سمجھتا ہوں، اس میں بے چاری ٹیلی پیٹھی کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے استاد ہی میں سیکڑوں آنچوں کی کمی ہے.....“

”تو ایسے استاد کو تم چولہے میں کیوں نہیں ڈال دیتے جہاں وہ اپنی آنچوں کی کمی پوری کر کے کندن بن جائے!“

شیخ احمد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جان چھڑاؤ یار، تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟“

”آج میں جان چھڑانے ہی تو جا رہا ہوں۔“ میں نے دلولہ انگیز انداز میں کہا۔ ”میں ڈاکٹر سلیم کو صاف صاف بتا دوں گا کہ اب میں اس کے پاس نہیں آیا کروں گا۔“

”شاباش!“ شیخ احمد نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا۔ ”یہ تم ایک نیک کام کرنے جا رہے ہو۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“

میں تھوڑی دیر مزید شیخ احمد کے ساتھ بیٹھا اور پھر ایک بس پر سوار ہو کر ڈاکٹر سے ملنے اس کے کلینک کی جانب چل پڑا تھا۔

”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں تم

”منظور“ سے کتنے بجے اٹھے تھے؟“ میں نے اپنی جرح کو داندباہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس وقت چار بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔“

”تو گویا اس روز تم سہ پہر تین، تیس سے لے کر چار پینتالیس تک ”منظور“ میں بیٹھے چائے پیتے اور گپ شپ کرتے رہے تھے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔“

”اور شیخ احمد اس حقیقت کا چشم دید گواہ ہے؟“

”جی بالکل۔ میں اسی کے ساتھ تو ”منظور“ میں بیٹھا ہوا تھا۔“

”کیا تمہارا دوست شیخ احمد اس امر کی گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے کہ وقوعہ کے روز سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک تم اس کے ساتھ بیٹھے منظور میں گپ شپ کر رہے تھے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور تم نے اس کے سامنے ان خیالات کا بھی اظہار کیا تھا کہ آج تم آخری مرتبہ مقتول ڈاکٹر کے کلینک پر جا رہے ہو؟“

”جی ہاں، سو فیصد!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”شیخ احمد اس حقیقت کو بیان کرنے ضرور عدالت میں حاضر ہو سکتا ہے۔“

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر روئے سخن جج کی طرف پھیر کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہان کی گواہی اور ان پر ہونے والی جرح کا ہی ذکر کروں گا۔

✦✦✦

میں نے پچھلی پیشی پر بڑے مفصل انداز میں اپنے مؤکل کی پوزیشن صاف کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول کی موت کا جو وقت متعین کیا گیا تھا اس دوران میں میرا مؤکل ناتھ ناظم آباد سے کافی فاصلے پر گلشن اقبال کے ایک معروف ہوٹل ”منظور“ میں

اپنے ایک دوست شیخ احمد کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا لہذا اس کا کسی بھی زاویے سے قتل کی اس واردات میں ملوث ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں اپنی پیشہ وارانہ کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

لیکن یہ ایک طرف کا یعنی ڈیفنس کا اسٹینڈ تھا اور عدالت کوئی فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے استغاثہ اور صفائی دونوں کا موقف سنتی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دوسری جانب سے میری پچھلی محنت کا کیا جواب آتا ہے۔

اس پیشی پر میں نے کسی گواہ کے کٹہرے میں آنے سے پہلے ہی جج سے درخواست کر کے کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنے کی اجازت لے لی۔

تفتیشی افسر یا آئی۔ او کو ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک آپ تمام عدالتی امور و نکات سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں اور میں وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی ہوں اور غلطی و انسان لازم و ملزوم ہیں لہذا آپ بھی مجھے اور میری غلطیوں کو معاف کر دیا کریں۔

تفتیشی افسر عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ ”آئی۔ او صاحب! آپ کو کب اور کس نے اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟“

”پولیس کے روزنامے کے مطابق اس افسر سناک واقعے کی اطلاع سترہ اپریل کی شام چھ بجے دی گئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور یہ اطلاع مقتول کی بیوی فریدہ خانم نے فون کے ذریعے دی تھی۔“

”فریدہ خانم!“ میں نے معنی خیز انداز میں دہرایا پھر اپنی تحقیق کی روشنی میں آئی۔ او سے پوچھا۔ ”یعنی مقتول کی پہلی بیوی.....؟“

”یہ تو آپ ہی کو پتا ہوگا کہ وہ مقتول کی پہلی بیوی ہے یا آخری بیوی!“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے ابھی تک اس سلسلے میں تفتیش نہیں کی۔ فریدہ خانم نے فون پر بتایا تھا کہ وہ مقتول سلیم فاروقی کی بیوی ہے، بس.....!“

”اگر آپ نے مقتول کی بیویوں کے حوالے سے ابھی انوسٹی گیشن نہیں کی تو یہ نیک کام کیس کے فیصلے سے پہلے مکمل کر لیجئے گا۔“ میں نے طنز کا جواب طنز ہی میں دیا۔ ”آپ کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی.....!“

اس نے مجھے گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”فریدہ خانم نے یہ فون اپنی رہائش

گاہ سے کیا تھا یا.....؟“
میں نے جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔
”نہیں، اس نے کلینک سے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا یعنی
جائے وقوع سے۔“

”آپ جائے وقوع پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“
”ساڑھے چھ بجے!“
”کیا اس وقت بھی مقتول کی بیوی فریدہ خانم جائے
حادثہ پر موجود تھی؟“
”جی ہاں، وہ وہیں موجود تھی۔“ اس نے ٹھہرے
ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”آپ نے جائے وقوع پر پہنچ کر کیا دیکھا تھا؟“ میں
نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔
”جب ہم جائے وقوع پر پہنچے تو.....!“
”ہم کیا مطلب؟“ میں نے اسے شروع ہی میں ٹوک
دیا۔

”میں اور دو کانسٹیبل۔“ آئی او نے بتایا۔
”ٹھیک ہے۔“ میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”آگے
کیا ہوا؟“

”جائے وقوع پر بہت سے لوگ جمع تھے۔“ وہ اپنے
بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن مقتول کی بیوی
فریدہ خانم اور اس کا اسسٹنٹ طارق شاہ سب سے نمایاں
تھے اور انہی دونوں افراد کی راہنمائی میں، ہم کلینک کے سب
سے آخری کمرے میں پہنچے تھے جہاں مقتول ڈاکٹر سلیم
فاروقی ایک بستر پر مردہ پڑا تھا۔“

”آپ نے پہلی نظر ہی میں اندازہ لگایا تھا کہ ڈاکٹر
سلیم اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہو چکا ہے یا کوئی معائنہ
وغیرہ بھی کیا تھا اس کا؟“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں
دریافت کیا۔

”کسی معائنے یا جائزے کی ضرورت تو نہیں تھی۔“ وہ
بڑی سادگی سے بولا۔ ”لیکن پھر بھی میں نے مقتول کی لاش کو
الٹ پلٹ کر موقع کی کارروائی کا تقاضا نہ کیا تھا۔“
”کسی معائنے یا جائزے کی ضرورت تو نہیں تھی۔“ میں
نے تلخی بھرے انداز میں انکواری آفیسر کے جملے کو دہرایا اور
پھر پوچھا۔ ”ایسا کیوں آئی۔ اوصاحب۔ کیا مقتول کی لاش
پکار پکار کر اپنی موت کا اعلان کر رہی تھی؟“

”ہاں، ایسا ہی سمجھ لیں.....“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
”ضرور سمجھ لوں گا۔“ میں نے بڑی سعادت مندی سے
کہا۔ ”لیکن اگر آپ اپنے مضمون کی تھوڑی وضاحت کر دیں تو

بڑی نوازش ہوگی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ کوئی لاش
کس پیرائے میں اپنی موت کا اعلان کر سکتی ہے.....؟“
”بہ زبان خاموشی!“ وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے
ہوئے بولا۔

”قبلہ!“ میں نے فرماں برداری کی اداکاری جاری
رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو وضاحت کرنے کے بجائے
معاملے کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔“
”لگتا ہے، آپ کو بچوں کی طرح سمجھانا پڑے گا؟“
وہ جھنجھلا گیا۔

میں نے اس کی جھنجھلاہٹ میں پٹنگ لگاتے ہوئے کہا۔
”جی ہاں، بالکل۔ آپ مجھے اس وقت منشیوری یا نرسری کا
کوئی بچہ ہی تصور کریں اور ”اے باکا ڈا.....“ کے لیول
پر اس سمجھیر معاملے کی وضاحت فرمائیں۔“

وہ میری اس چوٹ پر تمللا کر رہ گیا پھر خاصے جارحانہ
انداز میں بتانے لگا۔ ”مقتول اپنے بستر پر مردہ پڑا تھا اور وہ
اس طرح کہ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو کسی ناریل کے
مانند چٹخا کر رکھ دیا گیا تھا۔ سر سے خارج ہونے والے خون
نے بستر کے بیشتر حصے کو بھی آلودہ کر دیا تھا۔ اس حالت میں
بے حس و حرکت پڑے ہوئے کسی شخص کو دیکھ کر کوئی بھی
بڑے یقین سے یہ اندازہ قائم کر سکتا ہے کہ اس کی موت واقع
ہو چکی ہے.....“ وہ ایک ہی سانس میں وضاحت کی بیشتر
منازل طے کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر
بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”لاش کے قریب ہی ہمیں آلہ قتل بھی پڑا ہوا مل گیا تھا
جو کہ ایک آہنی بار تھی اور جس کے ایک سرے پر مقتول کا تازہ
بہ تازہ خون بھی چمک رہا تھا.....!“

”آلہ قتل..... آہنی بار.....“ میں نے معنی خیز انداز
میں دہرایا پھر اس چولی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں ایک
سیلفین بیگ میں آلہ قتل محفوظ حالت میں رکھا نظر آ رہا تھا۔
میں نے مذکورہ آہنی بار والے سیلفین بیگ کو بڑی
احتیاط سے اٹھالیا پھر چلتے ہوئے آئی۔ او کے قریب پہنچا اور
مذکورہ سیلفین بیگ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے
کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

”آپ اسی آہنی بار کی بات کر رہے ہیں نا؟“
”جی ہاں!“
”آپ کے خیال میں یہی آلہ قتل ہے؟“
”جب اسی آہنی بار کی ضرب سے مقتول کی کھوپڑی کو
چٹخا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو پھر قانون کی

سازشی کردار

زبان میں اس آہنی بار کو آلہ قتل ہی کہا جائے گا۔“ وہ خاصے
کٹیلے انداز میں بولا۔ ”مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ آپ تو مجھ
سے زیادہ قانون جانتے ہیں.....؟“

”اس میں کیا شک ہے!“ میں نے بے ساختہ کہا۔
وہ خفیف سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جرح
میں تندی بھرتے ہوئے سوال کیا۔

”آئی۔ اوصاحب! آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ اس آہنی
بار کی مدد سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟“
”آلہ قتل کے لیبارٹری ٹیسٹ سے۔“ وہ محتمل لہجے
میں بولا۔ ”اس بار کے ایک سرے پر پایا جانے والا
خون، مقتول کے خون سے میچ کر گیا تھا۔ پھر بار کے خون آلود
حصے پر چند انسانی بال بھی چپکے ہوئے ملے تھے۔ لیبارٹری
ٹیسٹ کی رپورٹ میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ وہ
بال مقتول ہی کے سر کے تھے۔“

”دیری گڈ!“ میں نے سراہنے والے انداز میں
تفتیشی افسر کو دیکھا اور پھر پوچھا۔ ”یہ اندازہ آپ نے کس بنا
پر قائم کیا کہ میرے مؤکل ہی نے اس آہنی بار کی مدد سے
مقتول کی جان لی تھی؟“

”اس بنا پر کہ آہنی بار کے دوسرے یعنی صاف سرے
پر ملزم کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات پائے گئے
تھے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”کیا کسی شے پر کسی شخص کے منکر پرنش کا پایا جانا
اسے ملزم قرار دینے کے لیے کافی ہوتا ہے؟“

”نہیں جناب، ہمیں اس سلسلے میں اور بھی بہت سی
چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”مثلاً؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
”مثلاً، سب سے اہم پوائنٹ تو ایف بی (منکر
پرنش) کی میچنگ ہوتی ہے۔“ وہ اپنی بات واضح کرتے
ہوئے بولا۔ ”ہمیں آلہ قتل پر ملنے والے انگلیوں کے نشانات
اور ملزم کے منکر پرنش کو آپس میں ملا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس
کے بعد ہی ہم کسی ختمی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔“

”تو میرے مؤکل کے سلسلے میں آپ حتمی نتائج تک
پہنچ گئے تھے؟“

”جی ہاں، ہم نے پرنیکٹ ایف بی میچنگ کر لی تھی۔“
”یہ کام تو ملزم کی گرفتاری کے بعد ہی ممکن ہوا ہوگا؟“
”ظاہر ہے، اس سے پہلے کیسے ہو سکتا تھا۔“
”گویا جب آپ جائے وقوع پر پہنچے، آپ نے
مقتول کی لاش کو دیکھا اور آلہ قتل آپ کے قبضے میں آ گیا اس

وقت آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ڈاکٹر سلیم فاروقی کو
میرے مؤکل ہی نے قتل کیا ہوگا؟“
”ظاہر ہے، یہ وثوق تو ایف بی میچنگ کے بعد ہی
حاصل ہوا تھا۔“

”کیا آپ ملزم کو اس واقعے سے پہلے بھی جانتے
تھے؟“
”ہرگز نہیں!“ اس نے قطعیت سے نفی میں گردن
ہلائی۔

”اس کے گھر کا پتا تو آپ کو معلوم ہوگا؟“
”جب میں ملزم ہی کو نہیں جانتا تھا تو پھر اس کے گھر کا
پتا کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”آپ کس قسم کی
باتیں کر رہے ہیں جناب.....؟“

”میں اس قسم کی باتیں کر رہا ہوں جناب.....“ میں
نے اسی کے انداز میں کہا۔ ”کہ آپ تو پولیس والے ہیں۔
ملزم کے گھر کا پتا ٹھکانا تو بہت معمولی بات ہے۔ آپ تو ان
چیزوں کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتے ہیں جو دنیا
میں موجود ہی نہیں ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب!“ وہ خفگی آمیز نظر
سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ وکیلوں نے ہم پولیس
والوں کو کچھ زیادہ ہی بدنام کر رکھا ہے۔“

”چلیں اس ”کچھ زیادہ کو ذرا کم کر لیتے ہیں۔“ میں
نے اس کے دغموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن
آپ یہ تو مانیں گے نا کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے۔ یہ تو آپ کو
ماننا ہی پڑے گا کہ.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں بات
ادھوری چھوڑ کر آئی۔ او کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا
پھر دوستانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”چلیں چھوڑیں ان تلخ اور ترش باتوں کو۔ میں آپ
کی بات ہی رکھ لیتا ہوں کہ آپ ملزم کے گھر ٹھکانے سے
بالکل واقف نہیں تھے۔ اب ذرا میری معلومات میں
اضافے کے لیے اتنا بتا دیں کہ ملزم کی گرفتاری کے لیے اس
کے گھر کی جانب آپ کی راہنمائی کس نے کی تھی؟“

”فریدہ خانم نے..... طارق شاہ نے.....!“ وہ
الجھن زدہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”ایک جواب دیں
آئی۔ اوصاحب؟“
”فریدہ خانم نے.....!“
”پھر آپ نے طارق شاہ کا نام کیوں لیا؟“
”وہ بھی جائے وقوع پر موجود تھا۔“ وہ گڑبڑائے

ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس نے بھی مجھے ملزم کے بارے میں بتایا تھا، بلکہ.....“ وہ ذرا دیر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”بلکہ ملزم کے گھر کا ایڈریس مجھے مقتول کے اسسٹنٹ طارق شاہ ہی نے دیا تھا.....“

”تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دراصل آپ طارق شاہ کی نشاندہی پر ملزم کے گھر پہنچے تھے اور اسے گھر سے گرفتار کر لیا تھا؟“

”جی ہاں..... بالکل.....!“ اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔

”دیش آل یور آنر.....!“ میں نے تیز آواز میں کہا۔

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا.....“

میں نے اس کیس کے تفتیشی افسر پر اپنی جرح موقوف کرنے کا اعلان کیا تو استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پیشی پر دو ایسے گواہوں کو شہادت کے لیے وٹنس باکس میں لایا گیا جن کے بیان اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو اس کیس میں کسی حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہو۔ ان دو گواہوں میں ایک ”فاروقی کلینک“ میں چیراسی کی حیثیت سے کام کرنے والا آصف محمود تھا اور دوسرا ڈاکٹر سلیم فاروقی کا پڑوسی دکان دار امتیاز حسین۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات سے صرف یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں ملزم حنیف ”فاروقی کلینک“ پر آیا تھا۔

اگلی گواہی مقتول کی بیوی فریدہ خانم کی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک اہم گواہی تھی۔ فریدہ خانم وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوئی اور اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ سوالات کے لیے فریدہ خانم کے قریب چلا گیا۔

فریدہ خانم ایک دراز قامت اور قبول صورت عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ فریدہ خانم کا رنگ سانولا تھا تاہم اس کی شخصیت میں جنس مخالف کے لیے ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ وکیل استغاثہ نے چند ایک رسمی اور سرسری نوعیت کے سوالات کے بعد گواہ کو فارغ کر دیا۔

اس کے بعد میں اپنی باری پر سچ کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ فریدہ خانم کی اس کیس میں دہری حیثیت تھی۔ وہ اس کیس کی مدعی بھی تھی اور

جائے وقوعہ پر موجود تھیں.....“ لہجائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جائے وقوعہ پر آپ کی موجودگی کی بات میں نے اس..... لیے کی ہے کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کے مطابق آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور جب پولیس وقوعہ پر پہنچی تو آپ پہلے سے وہاں موجود تھیں.....؟“

”تفتیشی افسر نے آپ کو غلط نہیں بتایا وکیل صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”میں نے واقعی ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے تھانے فون کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ پولیس کی آمد کے وقت میں کلینک میں موجود تھی بلکہ موقع کی تمام تر کارروائی کے دوران میں، میں کلینک پر ہی تھی لیکن جب طارق شاہ نے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی اس وقت میں اپنے گھر پر تھی۔“

”اپنے گھر پر.....“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟“

”ناگن چورنگی کے قریب۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”آپ کو طارق شاہ نے کتنے بچے اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟“

”اس وقت پانچ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”طارق شاہ نے آپ کو کیا بتایا تھا؟“

”اس نے کہا تھا، ڈاکٹر صاحب کو ان کے عقیدت مند نے قتل کر دیا ہے۔“

”کیا طارق شاہ نے مذکورہ عقیدت مند کا نام بھی لیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”مجھے قاتل کا نام ”حنیف“ بتایا گیا تھا۔“

”یعنی.....“ میں نے اکیوزڈ باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ حنیف جو اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا ہے؟“

”جی ہاں..... بالکل یہی۔“ اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

”کیا آپ ملزم کو پہلے سے جانتی تھیں؟“ میں نے چہچہے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ عقیدت مند ان کے پاس کس غرض سے آیا کرتا تھا؟“

”جی نہیں۔“ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے

اسی کیس میں استغاثہ کی ایک گواہ بھی۔ ان لمحات میں وہ خاصی محتاط نظر آرہی تھی۔

”فریدہ صاحبہ.....!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ ”مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو واپس تو نہیں لاسکتا لیکن ان کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔“

”بے نقاب.....“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس نے کوئی برقع وغیرہ تو نہیں پہنا ہوا جو آپ اسے بے نقاب کریں گے؟“

”میں نے ”ڈاکٹر فاروقی“ کے قاتل کو بے نقاب کرنے کی بات کی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”نہ بے چارہ تو اس کیس کا ملزم ہے جسے میں بہت جلد باعزت بری کروالوں گا۔“

”اگر یہ اس کیس کا ملزم ہے تو پولیس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اسے گرفتار کیا ہوگا نا!“ وہ غلطی آمیز لہجے میں بولی۔

”میری معلومات کے مطابق اسی بد بخت نے میرے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

ملزم کے لیے فریدہ خانم کے لب و لہجے سے زہر ٹپکتا تھا اور آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی صاف محسوس ہورہی تھیں۔ میں نے بڑے تحمل سے استفسار کیا۔

”فریدہ صاحبہ! کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟“

”کیا مطلب.....؟“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے تنکے لگی۔

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو ملزم کے قاتل ہونے کے بارے میں کس نے بتایا تھا۔ پولیس نے یا.....!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ ”طارق شاہ نے۔“

”طارق شاہ!“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں دہرایا۔ ”آپ کا مطلب ہے، ڈاکٹر صاحب کے اسسٹنٹ طارق شاہ نے؟“

”جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”طارق شاہ نے آپ کو یہ اطلاع کس طرح دی تھی؟“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کے پاس آکر یا آپ کو فون کر کے یا آپ اس وقت

ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس نے بھی مجھے ملزم کے بارے میں بتایا تھا، بلکہ.....“ وہ ذرا دیر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”بلکہ ملزم کے گھر کا ایڈریس مجھے مقتول کے اسسٹنٹ طارق شاہ ہی نے دیا تھا.....“

”تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دراصل آپ طارق شاہ کی نشاندہی پر ملزم کے گھر پہنچے تھے اور اسے گھر سے گرفتار کر لیا تھا؟“

”جی ہاں..... بالکل.....!“ اس نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔

”دیش آل یور آنر.....!“ میں نے تیز آواز میں کہا۔

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا.....“

میں نے اس کیس کے تفتیشی افسر پر اپنی جرح موقوف کرنے کا اعلان کیا تو استغاثہ کی جانب سے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پیشی پر دو ایسے گواہوں کو شہادت کے لیے وٹنس باکس میں لایا گیا جن کے بیان اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو اس کیس میں کسی حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہو۔ ان دو گواہوں میں ایک ”فاروقی کلینک“ میں چیراسی کی حیثیت سے کام کرنے والا آصف محمود تھا اور دوسرا ڈاکٹر سلیم فاروقی کا پڑوسی دکان دار امتیاز حسین۔ ان دونوں گواہوں کے بیانات سے صرف یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وقوعہ کے روز سہ پہر میں ملزم حنیف ”فاروقی کلینک“ پر آیا تھا۔

اگلی گواہی مقتول کی بیوی فریدہ خانم کی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک اہم گواہی تھی۔ فریدہ خانم وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوئی اور اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ سوالات کے لیے فریدہ خانم کے قریب چلا گیا۔

فریدہ خانم ایک دراز قامت اور قبول صورت عورت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ فریدہ خانم کا رنگ سانولا تھا تاہم اس کی شخصیت میں جنس مخالف کے لیے ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ وکیل استغاثہ نے چند ایک رسمی اور سرسری نوعیت کے سوالات کے بعد گواہ کو فارغ کر دیا۔

اس کے بعد میں اپنی باری پر سچ کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ فریدہ خانم کی اس کیس میں دہری حیثیت تھی۔ وہ اس کیس کی مدعی بھی تھی اور

”آجکلشن یور آزا“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وکیل استغاثہ نے مداخلت کی۔ ”مقتول کے پاس کون کون سے پراسرار علوم تھے اور اس نے یہ علوم کہاں سے حاصل کیے تھے، اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے فاضل دوست خواجہ فریدہ خانم سے اگلے سیدھے سوال کر کے انہیں ہر اس بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ان پراسرار علوم کا زیر سماعت کیس سے بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی۔“ میں نے وکیل استغاثہ کے حملے کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ملزم کو ٹیلی پتھی سیکھنے کا شوق تھا اور یہی شوق اسے مقتول کے کلینک تک لے آیا تھا لیکن تین ماہ کی خواری کے بعد جب ملزم کو محسوس ہوا کہ مقتول اسے بے وقوف بنا رہا ہے تو اس نے مقتول کو خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کیا تھا چنانچہ وقوعہ کے روز جب وہ یہی بات کہنے مقتول کے کلینک پر پہنچا تو مقتول سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی کیونکہ مقتول خلاف معمول اس روز دیر تک سوتا رہا تھا چنانچہ مقتول کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ملزم واپس لوٹ آیا اور..... پھر اسی رات کو آٹھ بجے کے قریب ملزم کو اس گھر سے گرفتار کر لیا گیا.....“ میں نے تھوڑا وقفہ کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”جناب عالی! یہ تمام تر تفصیلات گزشتہ پیشیوں پر معزز عدالت کے سامنے دہرائی گئی ہیں اور عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔“

”فریدہ بی بی!“ جج نے مقتول کی بیوہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تو آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ یہ تمام علوم آپ کے مقتول شوہر نے اپنی مدد آپ کے تحت سیکھ رکھے تھے؟“

”جی..... جی سر!“ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”بالکل، میرا یہی مطلب تھا۔“

”بیگ صاحب.....“ جج میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پلیز پروسیڈ۔“

”فریدہ خانم صاحبہ!“ میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔ ”آپ جائے وقوعہ یعنی اپنے شوہر کے کلینک پر کتنے بجے پہنچی تھیں؟“

”پونے چھ بجے۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”طارق شاہ نے پانچ بجیں پر مجھے اس واقعے کی اطلاع دی تھی اور یہ خبر سنتے ہی میں فوراً گھر سے نکل پڑی تھی۔ ناگن چورنگی سے شادمان زیادہ دور نہیں اس لیے میں بیس منٹ میں بڑی آسانی سے کلینک پر پہنچ گئی تھی۔“

”فریدہ صاحبہ! ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی کہ

کوئی بلاوجہ کسی کو قتل نہیں کر ڈالتا۔“ میں نے مقتول کی بیوہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گی کہ ملزم کی آپ کے شوہر کے ساتھ ایسی کون سی دشمنی تھی جس کی بنا پر اس نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟“

”میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”طارق شاہ نے آپ کو اس بارے میں کچھ تو بتایا ہوگا؟“

”جی بالکل نہیں!“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”آپ نے پہلی مرتبہ ملزم کو پولیس کی تحویل میں اس وقت دیکھا جب اسے آپ کے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے آپ نے بھی اس کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتی تھیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا فریدہ صاحبہ؟“

”جی نہیں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”لیکن ملزم نے آپ کو پہلے بھی ایک مرتبہ دیکھ رکھا ہے۔“ میں نے حنیف سے حاصل ہونے والی کارآمد معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”جب دو ماہ پہلے آپ نے..... میرا مطلب ہے، وقوعہ سے دو ماہ پہلے آپ نے کلینک پر تابندہ نامی ایک حسین و جمیل عورت کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ ان دنوں ملزم نے نیا نیا کلینک آنا شروع کیا تھا.....؟“

”دیکھا ہوگا!“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”یہ کون سی خاص بات ہے۔ میں تو اکثر و بیشتر کلینک کا چکر لگاتی ہی رہتی ہوں۔“

”خاص بات آپ کے کلینک پر چکر لگانے کی ہے اور نہ ہی ملزم کے آپ کو دیکھنے کی فریدہ صاحبہ!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اصل معاملہ تابندہ سے جھگڑا کرنے کا ہے..... آپ کا کسی خوب صورت اور دلکش عورت سے مقتول کے کلینک پر جھگڑا ہوا تھا یا نہیں؟“

”ہوا ہوگا.....“ ایک مرتبہ پھر اس نے بے پروائی کا انداز اختیار کرنا چاہا تاہم اس کا لہجہ چغلی کھارہا تھا کہ وہ دانستہ کسی بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہوا ہوگا نہیں فریدہ صاحبہ..... ہوا تھا!“ میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

”مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا.....“ وہ ٹالنے والے انداز

میں بولی۔

”میں یاد دلاؤں گا تو سب یاد آجائے گا۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے نعرہ مستانہ بلند کیا۔ ”میرے فاضل دوست غیر متعلقہ معاملات کو اجمال کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کے تاخیری حربے استعمال کرنے سے روکا جائے۔“

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے وقوعہ سے دو ماہ پہلے، فریدہ خانم کے کسی عورت سے جھگڑے کا جو ایشوا اٹھایا ہے، کیا اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق لگتا ہے؟“

”یس سر.....“ میں نے سرکوا ثباتی جنش دی۔

”آپ اپنی جرح جاری رکھیں!“ جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جی فریدہ صاحبہ!“ میں نے دوبارہ مقتول کی بیوہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کو کچھ یاد آیا یا اس سلسلے میں، میں آپ کی مدد کروں؟“

جب میں نے تھانے جا کر اپنے موکل حنیف سے ملاقات کی تھی تو دیگر تفصیلات کے ساتھ ہی اس نے مجھے مقتول کی بیوہ اور تابندہ نامی ایک پری ویش کے جھگڑے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ بعد ازاں میں نے اس حوالے سے کچھ تحقیقات خود بھی کی تھیں جو اس وقت جرح کے دوران میں کام آ رہی تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ قدرے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں..... کچھ یاد تو آ رہا ہے.....!“

”جی..... کیا یاد آ رہا ہے؟“ میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں نے کلینک پر پہنچتے ہی براہ راست ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جانا چاہا تھا۔“ وہ مکاری سے بولی۔

”تابندہ اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہوں اسی لیے وہ مجھ سے الجھ پڑی تھی کہ میں اپنی باری کا انتظار کیے بغیر ڈائریکٹ کیسے اندر جا رہی ہوں۔ اسی بات پر ہمارے درمیان جھگڑا ہو گئی تھی لیکن جب اسے حقیقت کا پتا چلا تو معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔“

”آپ کو جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آ رہی.....!“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”مم..... میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے.....؟“ وہ لڑکھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”کون سا جھوٹ بولا ہے۔“ میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ کو تابندہ اور مقتول کے باہمی، تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جھگڑا آپ نے اسی سلسلے میں کیا تھا۔ کلینک سے کسی نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ اس وقت تابندہ آپ کے شوہر سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ آپ آن واحد میں وہاں پہنچیں اور خوب ہنگامہ آرائی کی..... کی کہ نہیں؟“

”ہاں..... یہ سچ ہے!“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب تابندہ نامی اس چڑیل سے شادی کرنے والے ہیں۔ وہ ہنگامہ آرائی میں نے اسی سلسلے میں کی تھی۔ میں نے جو بھی کیا اس پر مجھے ایک ذرا سی بھی ندامت نہیں ہے۔ ایک بیوی اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

”تو اس ہنگامہ آرائی سے آپ اپنے سہاگ کو بچانے میں کامیاب ہو گئی تھیں؟“ میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، بالکل.....“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اس دن کے بعد سے تابندہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر نظر نہیں آئی تھی۔“

”کلینک پر وہ اس لیے نظر نہیں آئی تھی کہ پھر وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں نظر آنے لگی تھی، دوسری بیوی کی حیثیت سے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب نے تابندہ کو گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں آباد کر دیا تھا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وکیل صاحب.....؟“ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”نہی بچی بننے کی کوشش نہ کریں فریدہ صاحبہ!“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اس معاملے کی کوئی بھی بات آپ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ کلینک میں آپ کا کوئی ایسا جاسوس ضرور موجود تھا جو آپ کو تابندہ اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات کی خبریں پہنچاتا تھا۔ جس دن آپ نے کلینک پر جا کر تابندہ سے پھنڈا کیا اس روز بھی آپ کے جاسوس ہی نے آپ کو تابندہ کے کلینک پر آنے کی اطلاع دی تھی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے، اس روز آپ کس کی اطلاع پر، تابندہ سے دو، دو ہاتھ کرنے کلینک پر پہنچی تھیں؟“

وہ ایک دم برسوں کی بیمار نظر آنے لگی پھر کٹہرے کی

رینگ کو تمام کر اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

”وہ اطلاع مجھے طارق شاہ نے دی تھی.....!“

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ طارق شاہ کھڑا تھا۔ طارق شاہ کی حیثیت مقتول کے اسسٹنٹ ایسی تھی۔ وہ ”فاروقی کلینک“ کے تمام معاملات کا نگران بھی تھا۔ طارق شاہ مائل بہ فریبی ایک درمیانہ قد اور گورا چٹا شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی اور مونچھیں بھی رکھ چھوڑی تھیں اور سر پر ٹوپی لگا رکھی تھی۔

طارق شاہ نے بڑے نستعلیق انداز میں سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کر دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔ وکیل استغاثہ نے مختلف زاویوں سے چند ایسے سوالات کیے جن کے جواب سے ملزم کا تاثر خراب ہوتا تھا مثلاً یہ کہ ملزم ایک آوارہ، غیر سنجیدہ اور کھسکا ہوا نوجوان تھا۔ مقتول نے کئی بار اسے اپنے پاس سے بھگانے کی کوشش کی تھی تاہم وہ جھپٹی پھر چلا آتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کی تو میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”شاہ جی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ مقتول کے قابل اعتماد ساتھی، اس کے دست راست اور اسسٹنٹ تھے؟“

”جی ہاں، یہ درست ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھے ڈاکٹر صاحب کی موت کا دلی صدمہ ہے.....!“

”افسوس کہ میں آپ کے اس صدمے کو کم کرنے کے لیے کسی قسم کی مرہم کاری نہیں کر سکتا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا یہ بات بھی درست ہے کہ آپ مقتول کے اسسٹنٹ ہونے کے علاوہ فریدہ خانم کے لیے بھی کام کرتے تھے..... ایک جاسوس کی حیثیت سے؟“

”یہ جھوٹ ہے.....“ وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ ”مجھ پر الزام ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔“ میں نے غیر محسوس انداز میں طارق شاہ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ جھوٹ ہے کہ آپ فریدہ خانم کے لیے جاسوسی کیا کرتے تھے تو پھر آپ معزز عدالت کو بتائیں کہ سچ کیا ہے.....“ میں نے چند لمحے رک کر اسے تیز نظر سے گھورا اور ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”شاہ جی! کوئی بھی جواب دینے سے پہلے ایک بات

ذہن میں رکھیے گا کہ پچھلی پیشی پر فریدہ خانم عدالت کو بتا چکی ہے کہ اس روز آپ ہی نے فون کر کے انہیں تابندہ کی کلینک پر آمد کے بارے میں بتایا تھا.....؟“

”اس فون کی حد تک تو یہ بات درست ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”بیگم صاحبہ کو تابندہ کے حوالے سے کس قسم کا شک تھا، یہ بات انہوں نے مجھے پہلے نہیں بتائی تھی۔ انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ جب تابندہ کلینک پر آئے تو مجھے بتانا اور میں نے فون کر کے انہیں تابندہ کے بارے میں بتا دیا تھا پھر جب کلینک پر ان دونوں کے بیچ جھگڑا ہوا تو یہ بات سامنے آئی کہ بیگم صاحبہ کو شک تھا کہ ڈاکٹر صاحب تابندہ سے شادی کرنے والے ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ میں بیگم صاحبہ کے لیے کسی جاسوس کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔“

”آپ کی یہ بات بھی میں نے مان لی۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ”اب یہ بتائیں کہ آپ کی ڈاکٹر صاحب اور تابندہ کے بارے میں کیا رائے تھی۔ کیا ان کے بیچ شادی کے حوالے سے کسی قسم کی کھچڑی پک رہی تھی؟“

”جی..... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اپنی موت سے چند ماہ پہلے ڈاکٹر سلیم فاروقی نے تابندہ سے شادی کر لی تھی اور اسے گلشن اقبال کے ایک فلیٹ میں رکھا تھا۔ کیا یہ بات بھی آپ کے علم میں نہیں؟“

”جی نہیں..... بالکل نہیں!“ وہ پوری قطعیت سے بولا۔

”کمال ہے..... آپ تو ان کے رازدار اسسٹنٹ تھے۔ آپ کے علم میں لائے بغیر مقتول یہ کام کیسے کر سکتا تھا!“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”جب مجھے اس دلچسپ حقیقت کا علم ہے تو آپ کیسے بے خبر ہو سکتے ہیں۔“

”جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔“

”اوکے..... اگر آپ کے بیان کی تصدیق کے لیے مجھے تابندہ کو عدالت تک لانا پڑا تو میں یہ کام ضرور کروں گا.....“ میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ”فی الحال، ہم دوسری طرف چلتے ہیں۔“

تابندہ کو عدالت میں حاضر کرنے والی بات پر طارق شاہ خاصا نروس دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ

سارسی کردار

سسپنس ڈائجسٹ 143 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 142 جولائی 2012ء

اس نے مقتول اور تابندہ کی شادی کے حوالے سے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ وہ اس شادی کے حوالے سے اول آخر سب کچھ جانتا تھا۔

”شاہ جی! کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول ڈاکٹر سلیم فاروقی کی موت کا وقت کیا ہے؟“

”سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”اور یہ وہی وقت ہے جب مقتول ایک گھنٹے کے لیے اپنے کلینک کے تیسرے پورشن یعنی آخری عقبی حصے میں آرام کیا کرتا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مقتول کی لاش بھی کلینک کے اسی حصے میں بیڈ پر پڑی ملی تھی۔ قاتل نے آہنی وزنی راڈ کا وارکر کے مقتول کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو بری طرح چٹخا دیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اوندھے سونے کے عادی تھے اس لیے قاتل کا وارن کے سر کے عقبی حصے پر پڑا اور کھوپڑی چٹخ گئی۔ آپ نے جس آہنی راڈ کا ذکر کیا ہے اس کے ایک سرے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسی بدبخت نے ڈاکٹر صاحب کو قتل کیا ہے۔“

”گویا آپ کو یقین ہے کہ ملزم ہی نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو قتل کیا ہے؟“

”جی..... بالکل.....!“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اس یقین کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

”دیکھیں جی..... سیدھی اور سچی بات ہے۔“ وہ تھوک نلکتے ہوئے بولا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور اس رپورٹ کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی موت سترہ اپریل کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے اور اس دوران میں صرف ایک ہی شخص ان کے آرام کمرے میں گیا تھا اور وہ شخص ہے..... ملزم حنیف!“

”وقوعہ کے روز حنیف کتنے بجے کلینک پہنچا تھا؟“ میں نے طارق شاہ کی عالمانہ تقریر کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ساڑھے چار بجے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”کیا اس وقت آپ کلینک پر موجود تھے؟“

”جی ہاں۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔“

”یعنی کلینک کے پہلے حصے، ریسپشن والے کمرے میں؟“ میں نے تصدیقی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اور آخری حصے میں ڈاکٹر صاحب اس وقت آرام فرما رہے تھے۔ درمیان والا حصہ ڈاکٹر صاحب اپنے پاس آنے والے لوگوں سے ملاقات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ جس آہنی راڈ سے انہیں قتل کیا گیا ہے وہ ان کے کمرے میں میز پر رکھی رہتی تھی۔ دراصل، ڈاکٹر صاحب اس راڈ کو اپنے کلاسٹ کے سر پر رکھ کر کچھ عمل وغیرہ پڑھا کرتے تھے جس سے یہ پتا چل جاتا تھا کہ کسی نے اس شخص پر کچھ کیا ہوا تو نہیں.....“

”یہ..... کچھ کیا ہوا ہے آپ کی کیا مراد ہے شاہ جی؟“

”مطلب یہ کہ.....“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر اس شخص پر کسی ہوائی مخلوق کے اثرات ہوتے یا کسی نے سفلی یا بندش وغیرہ کرائی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کو فوراً پتا چل جاتا تھا۔ اس طرح مریض کے علاج میں بہت آسانی ہو جاتی تھی۔“

”اچھا اچھا، میں سمجھ گیا۔“ میں نے اس طرح گردن ہلائی جیسے اس کی بیان کردہ خرافات سے اتفاق کر رہا ہوں۔ لہذا اپنے مقصد پر ثابت قدم رہتے ہوئے میں نے استغاثہ کے گواہ طارق شاہ سے استفسار کیا۔ ”ملزم ساڑھے چار بجے کلینک پر پہنچا۔ اس نے کلینک کے ابتدائی حصے میں آپ سے ملاقات کی..... اس نے آپ سے کیا کہا تھا؟“

”جناب! اس وقت ملزم خاما گھبرایا ہوا تھا۔“ وہ مجھے تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ”اس نے مجھ سے کہا کہ یہ فوری طور پر ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب تو سو رہے ہیں اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ چار سے پانچ بجے کے درمیان آرام کرتے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا، کچھ بھی ہے۔ مجھے اسی وقت ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے لہذا میں انہیں جگا دوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں تو نہیں جگا سکتا۔ اگر اتنا ہی ضروری کام ہے تو خود جا کر انہیں جگا لو۔“

”پھر کیا ہوا؟“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”یہ برا سامنہ بناتے ہوئے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈاکٹر صاحب آرام کر رہے تھے۔“ طارق شاہ نے بتایا۔ ”تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ واپس آیا اور بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سے بات ہو گئی ہے..... پھر یہ کلینک سے واپس

چلا گیا تھا۔“

”ذرا سوچ کر بتائیں شاہ جی۔“ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے خیال میں ملزم زیادہ سے زیادہ کتنی دیر کلینک پر رکھا ہوگا؟“

”بہ مشکل پانچ منٹ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”زیادہ سے زیادہ چھ، سات منٹ۔“

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! وقوعہ کے روز ملزم نے سہ پہر ساڑھے تین بجے سے لے کر پونے پانچ بجے تک کا وقت اپنے ایک دوست احمد شیخ کے ساتھ جائے وقوعہ سے پانچ کلومیٹر دور گلشن اقبال کے ایک ریسٹورنٹ میں گزارا تھا لہذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ساڑھے چار بجے سے لے کر چار پینتیس یا چار چالیس پر ”فاروقی کلینک“ میں موجود رہا ہو۔ احمد شیخ عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔ میں گواہی کے لیے اسے اندر بلانا چاہتا ہوں۔“

”اجازت ہے.....!“ جج نے اپنے مخصوص بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔

آئندہ دس منٹ کے اندر احمد شیخ نے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہو کر حقیقت حال بیان کر دی۔ ملزم نے وقوعہ کے روز جو سوا گھنٹے کا وقت اپنے دوست احمد شیخ کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے گزارا تھا۔ شیخ احمد نے اس کی تفصیل بڑے جامع انداز میں پیش کر دی۔ شیخ احمد کی گواہی مکمل ہونے کے بعد میں دوبارہ طارق شاہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”جی شاہ صاحب..... اب آپ کیا کہیں گے؟“

”جو سچ تھا، وہ میں نے بتا دیا۔“ وہ حلقی آمیز انداز میں بولا۔ ”یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔“

میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”تو آپ کے خیال میں صفائی کے گواہ شیخ احمد نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔“

”جی ہاں..... سو فیصد!“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”آپ کو کب پتا چلا کہ ڈاکٹر سلیم کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے؟“ میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”ڈاکٹر صاحب پانچ بجتے سے دس منٹ پہلے خود ہی اٹھ جایا کرتے تھے اور ٹھیک پانچ بجے وہ فریش ہو کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو جاتے تھے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جب تک وہ فریش ہوتے، میں ان کے کمرے کی کرسیوں اور ٹیبل وغیرہ کو سیٹ کر دیا کرتا تھا لیکن وقوعہ کے روز جب وہ مقررہ وقت پر بیدار نہیں ہوئے تو مجھے تشویش

ہوئی، ملزم تھوڑی دیر پہلے بتا کر گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے اس کی بات ہو گئی ہے۔ اس وقت تو ڈاکٹر صاحب کو بیدار ہی ہونا چاہیے تھا پھر وہ سامنے کیوں نہیں آئے؟ اسی سوال کے جواب کے لیے میں نے جا کر کلینک کے اس حصے میں جھانکا جہاں وہ آرام کیا کرتے تھے اور اسی وقت مجھ پر حقیقت آشکار ہوئی کہ انہیں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا.....“

”آپ نے کتنے بجے ان کے آرام کمرے میں جھانکا تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”اس وقت پانچ بجتے میں پانچ منٹ باقی تھے۔“

”ڈاکٹر سلیم فاروقی کے قتل کا انکشاف ہونے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام کون سا کیا تھا؟“ میں نے لہجے میں درشتی کو شامل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے فوراً بیگم صاحبہ کو فون کیا تھا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”پہلی بیگم صاحبہ یا دوسری بیگم صاحبہ؟“

”پہلی بیگم صاحبہ..... فریدہ خانم کو..... آں.....!“ وہ اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر ایسی نظر سے مجھے تنکے لگا جیسے اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہو۔

”بہت خوب شاہ جی!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تو آپ بڑے دعوے کے ساتھ یہ کہہ چکے ہیں کہ آپ کو مقتول اور تابندہ کی شادی کا کچھ علم نہیں اور اب ”پہلی بیگم“ اور ”دوسری بیگم“ کا حساب بہ خوبی بیان کر رہے ہیں۔ یہ کیا انداز ہے شاہ جی؟“

”وہ..... وہ..... میں کنفیوژ ہو گیا..... تھا.....“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”مم..... میرا..... مطلب یہ تھا کہ..... میں نے ڈاکٹر صاحب کی بیگم..... فریدہ خانم کو..... فون کیا تھا.....!“

”شاہ جی! آپ کنفیوژ ہو نہیں گئے تھے بلکہ ابھی تک کنفیوژ ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”خیر، میں بھی آپ کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں..... تو آپ نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو مردہ حالت میں پڑے دیکھ کر فوراً ان کی بیگم فریدہ خانم کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی؟“

”جی..... میں نے ایسا ہی کیا تھا۔“ وہ قدرے سنہلے ہوئے بولا۔

”آپ نے پانچ منٹ کم پانچ پر ڈاکٹر سلیم فاروقی کو



کون کہتا ہے کہ وقت پلٹ کر نہیں آتا... اگر

ایسا ہوتا تو دن کے بعدرات... اور پھر سے دن

کبھی نہ نکلتا۔ بس یہی فارمولا زندگی کے

گرد بھی اپنا چکر پورا کرتا ہے اور پھر سے

کسی نئے روپ میں ڈھل کر اپنی چالیں

دہراتا ہے۔ ان تینوں کا ملٹ بھی کچھ ایسے

ہی گھن چکر کا شکار تھا... جب ایک کی

ڈم ایک کے ہاتھ میں تھی... لیکن اچانک

ان میں سے ایک کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی

اور پھر سب کچھ بکھر گیا۔

گھن چکر

دوسروں کی کتری اور اپنی برتری کے احساس

سے مطلوب ایک سبق آموز جملہ

میں نہیں دیکھا۔

”یہ بے شرمی... یہ ڈھٹائی... بالکل بھی نہ ہوتی اگر

تم اپنی آمد کی اطلاع دے دیتیں۔“

”بے حیائی کا جو مظاہرہ میں نے کل رات دیکھا ہے کیا

”آئیے آئیے تشریف لائیے محترمہ ڈاکٹر اقبال

فاطمہ... ہیڈ آف دی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ... یونیورسٹی

آف نیوجرسی۔“

”میں نے تم جیسا بے شرم اور ڈھٹ شخص اپنی زندگی

کی انگلیوں کے نشان حاصل کر کے اسے غائب کر دیا تھا اور
ڈاکٹر کے استعمال کے لیے اس کی جگہ اس کی ”جڑواں راڈ“
میز پر رکھ دی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی نے عقل مندی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے یہ دونوں ایک جیسی راڈز اس لیے بنوائی تھیں کہ
ان میں اگر ایک ادھر ادھر ہو جائے تو اس کی پڑھائی والا
”مخصوص کام“ نہ کرے۔ فاضل راڈ طارق شاہ کی تحویل میں
رہتی تھی لہذا اسے اس ”ادلی بدلی“ میں کسی قسم کی مشکل پیش
نہیں آئی اور اس نے دستانے پہن کر اس آہنی راڈ سے
اوندھے سوئے ہوئے ڈاکٹر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس
کے ایک سرے پر طرز کے فنگر پرنس موجود تھے۔ اس طرح
طارق شاہ کی نشاندہی پر پولیس نے طرز کو گرفتار کر کے ڈاکٹر
سلیم فاروقی کے قتل کے الزام میں حوالہ عدالت کر دیا تھا۔

جب طارق شاہ کے اقبال جرم پر فریدہ خانم کو شامل
تفتیش کیا گیا تو پہلے تو وہ اس بات سے انکار کرتی رہی کہ وہ
بھی شریک سازش ہے لیکن جب پولیس نے اپنے مخصوص
تفتیشی ”ہتھکنڈے“ استعمال کیے تو وہ زیادہ مزاحمت نہ
کر سکی اور اسے بھی اقبال جرم کرتے ہی بنی۔

واقعات کے مطابق فریدہ خانم کو اس بات کا یقین ہو گیا
تھا کہ تانبہ سے شادی کے بعد ڈاکٹر سلیم فاروقی اسے طلاق
دے کر فارغ کرنے والا ہے لہذا اس نے طارق شاہ کے
ساتھ مل کر ڈاکٹر فاروقی کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ فریدہ نے
اسے یہ پیشکش کی تھی کہ اگر وہ ڈاکٹر کو موت کی نیند سلا دے تو وہ
نہ صرف یہ کہ ”فاروقی کلینک“ اس کے حوالے کر دے گی بلکہ
اس سے شادی بھی کر لے گی۔ طارق شاہ کو جب پانچوں
انگلیاں مچی میں اور سر کڑی میں نظر آیا تو وہ بلا چون و چرا فریدہ
خانم کی پیشکش کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

صدیوں سے یہ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ ”برے کام کا
برا نتیجہ“ سو اس کیس میں بھی کچھ ایسا ہی نتیجہ برآمد ہوا تھا۔
ڈاکٹر سلیم فاروقی، طارق شاہ اور فریدہ خانم نے اپنی اپنی سطح
پر جو کچھ بھی کیا اسے برے کام ہی میں شمار کیا جائے گا لہذا ان
میں سے ایک تو جان سے گیا اور باقی دونوں عدالت سے لمبی
سزا پانے کے بعد جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے!

فریدہ خانم اور طارق شاہ جیسے ”سازشی کردار“ ہمارے
معاشرے میں ہر جگہ موجود ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان پر گہری نگاہ
رکھنے کی ضرورت ہے بلکہ اگر موقع ملے تو ان کا سر کچلنے کی کوشش
بھی کرتے رہنا چاہیے۔ اور ڈاکٹر فاروقی جیسے معاشرتی
ناسوروں کو بھی کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے!.....
(تحریر: حسام بٹ)

مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔“ میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں
دے سکتا تھا۔“ اور فوراً آپ نے فریدہ خانم کو فون کر دیا یعنی
جب آپ نے یہ فون کیا تو اس وقت پانچ بجنے میں چار منٹ
ہوں گے یا تین یا دو یا زیادہ سے زیادہ پورے پانچ بج چکے
ہوں گے..... ہیں نا؟“

”جی ہاں..... اس سے زیادہ نہیں۔“ وہ اثبات میں
گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”لیکن فریدہ خانم نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو
یہ بتایا ہے کہ آپ نے ٹھیک پانچ بج کر پچیس منٹ پر انہیں
فون کیا تھا اور وہ ٹھیک پونے چھ بجے کلینک پر موجود تھیں۔
آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟“

”مم..... میں..... کیا..... کہہ سکتا ہوں۔“ وہ کٹھرے
کی ریٹنگ کو تھامتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ
خوف ابھرا تھا۔

”آپ کیوں نہیں کچھ کہہ سکتے.....!“ میں نے نفرت
بھری نظر سے اسے گھورا۔ ”بڑے آرام سے کہہ دیں کہ
وقت کے معاملے میں فریدہ خانم جھوٹ بول رہی ہیں جیسا
کہ..... طرز نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ..... ساڑھے تین بجے
سے لے کر پونے پانچ بجے تک گلشن اقبال کے ایک ہوٹل میں
بیٹھا ہوا تھا؟“

”پپ..... پانی!“ وہ کٹھرے کی ریٹنگ کو تھامے
تھامے، اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے
ہوئے منمنایا۔

”پانی ملے گا..... ضرور ملے گا مگر..... سچ بولنے کے
بعد!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بے رحم لہجے
میں کہا۔ ”بتاؤ..... تم نے ڈاکٹر سلیم فاروقی کو کیوں قتل کیا؟“
اس سے پہلے کہ وہ میرے سنسنی خیز سوال کے جواب
میں کچھ کہتا، اس کی ٹانگیں کپکپائیں اور وہ دھڑام سے
کٹھرے کے فرش پر گر ا اور..... بے ہوش ہو گیا۔

پچھلی پیشی پر میرے تیکھے سوالات اور طارق شاہ کے
ڈرامائی طرز عمل نے اس کیس کا نقشہ پوری طرح کھول کر رکھ
دیا تھا۔ حج نے طارق شاہ کو شامل تفتیش کرنے کے احکام صادر
کر دیے تھے۔ جب شاہ جی کی گردن چھری کے نیچے آئی تو
اس نے اپنی زبان سے حقیقت حال بیان کر دی۔ ڈاکٹر سلیم
فاروقی کے قتل کا اقرار کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ کام اس
نے فریدہ خانم کی شہ پر کیا تھا۔ آؤ قتل یعنی وہ آہنی راڈ جو مقتول
کی میز پر رکھی رہتی تھی، چند روز پہلے طارق شاہ نے اس پر طرز

یہ اپنی نوعیت کا پہلا مظاہرہ تھا؟“
 ”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔“
 ”مختلف اسی طرح سے ہے کہ اس سے زیادہ بے غیرتی شاید ہو ہی نہیں سکتی تھی۔“
 ”یہ بھی ٹھیک ہے لیکن تم پہنچی کب تھیں؟“
 ”جب تم دونوں انتہائی غیر مناسب انداز میں لیٹے ہوئے تھے جبکہ تمہارے جسم سے چادر پوری طرح اور نین کے آدھے جسم سے چادر لپٹی ہوئی تھی۔“
 ”میں تمہاری قوت برداشت کی تعریف کروں گا ڈاکٹر صاحبہ۔“
 ”اس لیے کہ میں نے رات ہی کوئی ہنگامہ پانہیں کیا۔“
 ”نہ صرف یہ کہ ہنگامہ کرنے سے گریز.... کیا بلکہ دوسرے بیڈروم میں جا کر سو گئیں۔“
 ”میری اس کیپس میں ایک عزت ہے جسے میں تم جیسے گھٹیا آدمی کے لیے قربان نہیں کر سکتی۔“
 ”ویسے یہ تمہاری بھول ہے کہ یہاں کے لوگوں کے لیے یہ کوئی موضوع ہوتا۔“
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“
 ”مطلب یہ کہ یہ امریکا ہے میری جان جہاں پوری طرح شخصی آزادی کا راج ہے۔“
 ”اتنی آزادی بھی نہیں ہے کہ باپ اپنی سوتیلی بیٹی کے ہم بستر ہو جائے۔“
 ”اس معاشرے کے لیے یہ انہونی نہیں ہے۔ ویسے نین تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“
 ”وہ میرے شوہر کی بیٹی ہے اور اس رشتے سے وہ میری بھی بیٹی ہے۔“
 ”اور تم اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتی ہو کہ اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی تمام جائیداد ڈاکٹر کے لیے بغیر ہڑپ کر گئیں۔“
 ”جو کچھ مجھے ملا ہے وہ دسم اپنی وصیت میں لکھ گئے تھے۔“
 ”اور وہ سب کچھ لکھوایا کس نے؟“
 ”مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔“
 ”عرفان سے شادی کے لیے گھر سے بھاگ جانے کا مشورہ نین کو کس نے دیا تھا۔“
 ”میں نے اسے اپنی مثال دی، ملک سلیم سے شادی کے لیے میں نے بھی اپنی فیملی کو چھوڑ دیا تھا۔“

”تم جانتی تھیں کہ عرفان ایک ناکارہ شخص ہے اور نین کا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔“
 ”میں نے تو تم جیسے ناکارہ شخص سے بھی شادی کر لی تھی۔“
 ”جس مقصد کے لیے تم نے مجھ سے شادی کی تھی وہ تو تم حاصل کر رہی ہو۔“
 ”بکواس مت کرو۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“
 ”میں تعلیم میں تمہارے برابر کا تھا نہ عمر میں پھر بھی تم نے مجھ سے شادی کر لی؟“
 ”میں تمہاری چاہت کے ڈرامے سے متاثر ہو گئی تھی۔“
 ”اپنے اس فقرے پر تمہیں خود بھی ہنسی آرہی ہوگی۔“
 ”کیا تم جتنی دوپہر میں میرے ڈیپارٹمنٹ کے باہر میرا انتظار نہیں کرتے تھے۔“
 ”بالکل کرتا تھا لیکن اس سے پہلے جو ہوا تھا وہ کیا تھا؟“
 ”تم کس کی بات کر رہے ہو.....؟“
 ”تم جانتی ہو ڈاکٹر اقبال فاطمہ کہ میں کس واقعے کی بات کر رہا ہوں۔“
 ”کھل کر بات کرو۔“
 ”آج واقعی ہر بات کھل کر ہو جانی چاہیے۔“
 ”میں بھی آج ہر بات ہر آخری بات کرنے کے موڈ میں ہوں۔“
 ”لیکن ناشتا تو تم اتنے اطمینان سے کر رہی ہو جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔“
 ”میں رات میں فیصلہ کر چکی ہوں اب صرف اس پر عمل کرنا باقی ہے۔“
 ”یہ بات تو تمہاری قابل تعریف ہے کہ تم ہر فیصلہ سوچ سمجھ کے پورے اعتماد کے ساتھ کرتی ہو۔“
 ”تعریف کرنے کا شکریہ۔“
 ”پہلے 18 سال بڑے شخص سے شادی پھر دوسری شادی 10 برس چھوٹے شخص سے۔“
 ”شاید یہ دونوں فیصلے غلط کیے تھے۔“
 ”پہلے فیصلے کے بارے میں تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو، اس شادی نے تو تمہیں کروڑ پتی بنا دیا تھا۔“
 ”شادی کے وقت میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ رضوان صاحب کو ورثہ میں اتنی جائیداد ملی ہے کہ اس سے

انہیں لاکھوں کی ماہانہ آمدنی ہوتی ہے۔“
 ”اتنی معصوم تو اس وقت بھی نہیں تھیں جب تم نے اپنی بڑی بہن کے پاس کو بے وقوف بنایا تھا۔“
 ”بکواس مت کرو..... اب تم گھٹیا ترین باتوں پر اتر آئے ہو۔“ اس بار وہ تمل گئی تھی۔
 ”تمہاری ایجوکیشن کے تمام اخراجات صفر صاحب نہیں اٹھاتے تھے؟“
 ”وہ ان کی رحم دلی تھی کہ انہوں نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے میرے تعلیمی اخراجات اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔“
 ”وہ ان کی رحم دلی تھی اور تمہاری دریا دلی یہ تھی کہ ہر ہفتہ کی صبح تم کالج جانے کے بجائے ان کے فلیٹ پہنچ جاتی تھیں اور کالج ٹائم وہیں گزارتی تھیں۔“
 ”احتشام تم اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہو۔“
 ”آخری بات ہے اس لیے ہر بات کھل کر ہونی چاہیے۔“
 ”لیکن اپنی حد میں رہ کر بات کرو۔“
 ”یہ نہیں پوچھو گی کہ مجھے یہ سب کچھ کس نے بتایا؟“
 ”تم کسی کا بھی نام لے لو گے۔“
 ”خود صفر صاحب نے میری جان۔“
 ”بکواس کرتے ہو تم وہ بھی ایسا نہیں کر سکتے۔“
 ”اب یہ بھی پوچھ نہی ڈالو کہ صفر صاحب سے مجھے کس نے ملوایا تھا۔“
 ”تم انیلا کا نام لو گے۔“
 ”اپنی بڑی بہن کا نام لے کر تم نے ثابت کر دیا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے۔“
 ”اتنا کچھ جاننے کے باوجود تم نے مجھ سے شادی کر لی؟“
 ”شادی نہ کرتا تو امریکا کس طرح آتا۔ اتنی عیاشی کس طرح کرتا۔“
 ”تم اعتراف کر رہے ہو کہ میرے عشق میں مبتلا ہونے کا وہ ڈراما محض ڈھکوسلا تھا۔“
 ”مجھ سے پہلے یہ ڈھکوسلا تم نے اس شریف آدمی کے ساتھ کیا جو تمہارا استاد بھی تھا۔“
 ”میں ان سے واقعی متاثر تھی، میرا مطلب ہے ان کی علیست سے متاثر تھی۔“
 ”علیست کے ساتھ جب ان کی جائیداد کے بارے میں علم ہوا تو تمہاری محبت دوا تب ہو گئی۔“
 ”تم کیسے جاؤ اپنی بکواس مجھ پر اس کا کوئی اثر

نہیں ہوگا۔“

”تم نے ایک تجربہ کار شکاری کی طرح انہیں بھی اپنے دام میں پھنسایا اور جب تمہارے جسم کے جال میں پھنس گئے تو تم نے انہیں شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔“
 ”یہ بات بھی تمہیں انیلا نے بتائی ہوگی؟“
 ”بہت سی باتیں اس نے اور کچھ نین نے۔“
 ”انیلا ہمیشہ سے مجھ سے جلتی ہے۔“
 ”ایک بڑی بہن کی حیثیت سے اس نے تمہیں ہمیشہ سیدھے راستے پر رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن تم دونوں کے راستے الگ الگ تھے اور منزلیں بھی جدا تھیں۔“
 ”اسی لیے وہ آج بھی کہیں دو کروں کے فلیٹ میں رہ رہی ہوگی اور صبح سے شام تک نوکری کر رہی ہوگی۔“
 ”اس کا ایک بیٹا انجینئر اور ایک ڈاکٹر بن چکا ہے اور بیٹی میڈیکل کے آخری سال میں ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہے تم اس سے رابطے میں ہو۔“
 ”ہر دس پندرہ دن میں اس سے بات ہو جاتی ہے۔“
 ”ہر رابطہ ختم کرنے کے بعد میں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ بھی میرا پیچھا نہیں کرے گی لیکن اب بھی اسے معاف نہیں کروں گی۔“
 ”اسے یہ فکر پریشان کرتی ہے کہ جس راستے پر تم چل پڑی ہو اس کا انجام بخیر نہیں ہوگا۔“
 ”وہ میری اتنی خیر خواہ ہے کہ اس نے صفر سے لے کر رضوان تک کی ہر بات تمہیں بتا دی؟“
 ”وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ تم صفر اور رضوان کی طرح مجھے بھی شکار کر رہی ہو۔“
 ”جبکہ حقیقتاً شکاری تم تھے۔“
 ”ہر شکار آخری لمحہ تک یہی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ شکار کر رہا ہے جبکہ حقیقتاً وہ خود شکار ہو رہا ہوتا ہے۔“
 ”اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے مجھے شکار کیا ہے؟“
 ”تمہارے طنز اور طنزیہ مسکراہٹ کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے مجھے مجسٹریٹ کی شادی کی اس تقریب سے واپسی پر لفٹ کی پیشکش کی تو میں کچھ اور سمجھا تھا۔“
 ”مگر تم نے کہا تھا کہ واپسی کے لیے تمہارے پاس سواری نہیں ہے۔“
 ”سواری ہونے کے باوجود میں نے انکار اس لیے کیا تھا کہ میں یہی سمجھا تھا کہ تم ایک رات کے لیے مجھے مہمان بنانا چاہتی ہو۔“
 ”لیکن ایسا نہیں ہوا۔“

”جب تم نے اپنی مظلومیت کی داستان سنانی شروع کی تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم چاہتی کیا ہو لیکن دوسری ملاقات میں مجھے اندازہ ہوا کہ تم طویل منصوبہ بندی کر رہی ہو۔“

”شادی کی پیشکش تمہاری جانب سے ہوئی تھی۔“
”میں نے وہی کیا تھا جو تم چاہتی تھیں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”میں تو انکار کرتی رہی تھی۔“
”صرف اس لیے کہ میرا اصرار بڑھتا رہا۔“
”میں نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ شادی کے بغیر بھی مجھ سے رشتہ قائم کر سکتے ہو لیکن تمہارا ہی اصرار رہا تھا شادی کے لیے۔“ اس نے طنزیہ انداز اختیار کیا۔

”صرف کہا نہیں تھا بلکہ قائم بھی کیا تھا۔“
”اس کے باوجود تمہارا اصرار اپنی جگہ رہا تھا۔“
”وہ سب کچھ تم نے اس لیے کیا تھا جس طرح مال خریدنے سے پہلے گاہک مال کو اچھی طرح پرکھتا ہے۔“
”کیا یہ سب جاننے کے باوجود تم بکنے کے لیے تیار تھے؟“

”کبھی تم نے سوچا ہے کہ تم سے دس گیارہ برس کم عمر شخص تم سے کیوں شادی کرے گا؟“
”اس کی وجوہات بھی تم خود ہی بیان کرتے رہے ہو۔“

”خوب صورت تو کیا قبول صورت بھی تم کبھی نہیں رہیں اس وقت بھی نہیں جب تم نے صفدر کو گھیرا تھا۔“
”کیا میں وہ الفاظ دہراؤں جو تم مجھ سے کہتے رہے ہو۔“

”ہم دونوں اپنے اپنے ٹارگٹ پر کام کر رہے تھے۔“

”میں نے تمہیں ہر طرح کی آسائش فراہم کی۔“
”اور میں تمہیں وہ کچھ مہیا کرتا رہا جو تم چاہتی تھیں۔“
”لیکن اس کے ساتھ ہی تم وہ کچھ بھی کرتے رہے جو تمہارا دل چاہتا تھا مگر میں نہیں.....“

”تسکین کے کچھ لمحات پر میرا بھی حق ہے۔“
”یہی سوچ کر میں بہت کچھ برداشت کرتی رہی تھی لیکن اب تم نے ہر حد پار کر لی ہے تو.....“
”تم نے میں تارا سے ہر شے تو چھین لی ہے اب اس کے اتنے خلاف کیوں ہو؟“
”میں نے نہیں چھینی اس نے خود گنوا دی تھی۔“

”کورٹ میری جگہ کرنے اور گھر چھوڑنے کا مشورہ تم نے اسے نہیں دیا تھا؟“
”میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں بعد اس کا باپ اسے معاف کر دے گا۔“
”ضرور معاف کر دیتا اگر تم اسے یہ نہ سمجھاتی رہتیں کہ میں نے اس کی زندگی بھر کی کمائی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔“

”وہ بچہ نہیں تھا۔“
”اس کے باوجود تمہارے معاملے میں اس نے ہر بار تاجھی کا مظاہرہ ہی کیا تھا۔“
”یہ نین تارا نے کہا ہوگا۔“

”وہ تو یہ بھی کہتی ہے کہ جب اس نے اپنے باپ کو پوری صورت حال بتائی تو تمہارا اس سے شدید جھگڑا ہوا تھا۔“
”جھوٹ بولتی ہے وہ.....“
”اس کا کہنا ہے کہ جس صبح کو اس کا باپ تبدیل شدہ وصیت نامے پر دستخط کرنے والا تھا اس رات تم نے اسے زہر دے دیا۔“

”نین تارا نے تو باپ کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کروایا تھا۔“
”تم کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہو اور تمہارا سبیکٹ ہی زہر اور زہریات ہے۔“

”خوب اچھی طرح اس نے سبق پڑھایا ہے۔“
”میں صرف اس کے کہے ہوئے الفاظ دہرا رہا ہوں۔“
”تم نے یہ نہیں سوچا کہ جب میں پہلے شوہر کو زہر دے سکتی ہوں تو تمہیں کیوں نہیں دے سکتی یا میں تارا کو کیوں نہیں دے سکتی۔“

”نین کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے مارنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“
”تم بھول رہے ہو کہ ہم امریکا میں ہیں اور یہاں مرد اور عورت کے بغیر شادی ساتھ رہنے پر کوئی پابندی نہیں۔“
”مجھے بھی علیحدگی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ اور نین تارا کے ساتھ کچھ عرصے اڑاؤ۔“
”تمہیں اس سے کیا غرض کہ میں اپنی باقی کی زندگی کس کے ساتھ بسر کرتا ہوں۔“

”گو یا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم نے نین تارا کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“
”تب تم یہ سمجھ لو کہ تمہاری زندگی باقی ہی نہیں رہے گی کہ تم نین تارا کے ساتھ اسے گزار سکو۔“
”تم دھمکی دے رہی ہو؟“
”میں تمہیں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔“
”تم مجھے بھی وہی زہر دو گی جو تم نے نین کے باپ کو دیا تھا۔“

”میں تمہیں وہ زہر دے چکی ہوں۔“
”کیا بکواس کر رہی ہو؟“
”میں سچ بتا رہی ہوں اتنا ہی بڑا سچ جتنا کہ میں اس وقت تمہارے سامنے موجود ہوں۔“

”مگر مجھ پر اس کا اثر کیوں نہیں ہوا؟“
”یہ ایک ایسا زہر ہے جسے نہ کھانے والا محسوس کرتا ہے نہ اس کے اثرات کسی بھی پوسٹ مارٹم میں ملتے ہیں۔“
”کیا بکواس کر رہی ہو۔“

”اپنی ٹانگوں پر زور مت دو بلکہ چلنے کی کوشش تو ہرگز نہ کرنا۔“
”کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“ اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

”اپنی جگہ پر بیٹھے رہو گے تو تمہاری زندگی دو سے تین گھنٹے بڑھ جائے گی۔“
”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“
”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”اپنے لیے ناشتا میں نے خود بنایا ہے اور جب سے تم یہاں آئی ہو، میں نے تم سے کوئی چیز لے کر نہیں کھائی ہے بلکہ بریڈ بھی میں نین کو چھوڑنے گیا تھا تو دکان سے لیتے ہوئے آیا تھا۔“

”ابھی کچھ دیر پہلے تم مجھے ماہر زہریات کہہ چکے ہو۔“
”تمہاری ریسرچ اسی پر ہے۔“
”اسی لیے میں اس واحد زہر کے بارے میں جانتی ہوں جو انڈے کے ذریعہ دیا جاسکتا ہے۔“

”انڈے میں نے خود بنائے تھے۔“
”لیکن یہ غور نہیں کیا کہ فریج میں صرف دو انڈے ہی کیوں ہیں۔“
”تم سچ کہہ رہی ہو۔“

”اوپر کمرے میں چھ وہ انڈے رکھے ہیں جو فریج میں رکھے تھے اور میں نے انہیں زہریلا نہیں کیا تھا اور تمہارے ہارٹ ایک کے بعد تمہاری لاش کو اسپتال لے

جانے سے پہلے میں انہیں دوبارہ فریج میں رکھ دوں گی۔“
”انڈوں کو تم زہریلا کس طرح بنا سکتی ہو، انڈے میں تو سرخ بھی نہیں جاسکتا۔“
”کچھ دیر بعد مرحوم ہو جانے والے میرے شوہر یہ زہر صرف برازیل کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے جو پانی میں حل ہو جاتا ہے اور اگر انڈے کو اس میں دس منٹ کے لیے ڈوبا رہنے دیا جائے تو یہ زہر انڈے میں سرایت کر جاتا ہے۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو؟“
”ایک مرتبے ہوئے آدمی سے مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“
”میرا گناہ، اتنا بڑا تو نہیں تھا کہ تم مجھے قتل ہی کر دو۔“

”میں نین تارا سے کتنی نفرت کرتی ہوں تم اس کا اندازہ بھی کر سکتے۔“
”اگر میں نین سے کبھی نہ ملنے کا وعدہ کروں تو تم مجھے معاف کر سکتی ہو۔“

”تم بہت کچھ جان چکے ہو اس لیے اب تمہارے زندہ رہنے کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔“
”مجھے معاف کر دو۔“



ایک بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ شادی سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ ڈارلنگ، تم میری دُنیا ہو۔“

شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”جب میں تمہیں اپنی دُنیا کہتا تھا تو اس وقت میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا اور اب تو میں کئی دُنیا میں دریافت کر چکا ہوں۔“

میرے پاس ہیں۔

”اس کا مطلب ہے وہ مجھے زہر نہیں دے سکی تھی؟“

”وہ یہی سمجھتی ہے کہ اس نے تمہیں زہر دیا ہے۔“

”یہ بات میں اس کو بتا دوں تو وہ تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے گی۔“

”لیکن تم اسے بتاؤ گے کیوں؟“

”ایک صورت میں نہیں بتاؤں گا، اگر مال مسروقہ میں سے پچاس فیصد مجھے مل جائے۔ یہ جاننے کے بعد کہ زہر تمہارے قبضہ میں ہے تمہارے ساتھ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”رقم کا کیا کرو گے؟“

”کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جس کا تصور بھی تم دونوں کے ذہن میں نہ ہو۔“

”یہی بات تم دونوں کے لیے بہتر ہے۔“

”تم کب واپس آئیں؟“

”میں گئی کب تھی جو واپس آتی۔“

”لیکن تمہاری گاڑی تو گئی تھی اور.....“

”جتنی رقم تم دونوں کے حصے میں آتی ہے وہ لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”جب تم حقیقت جان گئی ہو تو پھر.....“

”یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی نین تارا کہ ایک کامیاب قتل کرنے کے بعد بھی زندگی کس عذاب کا شکار ہوتی ہے۔“

میرا نام بھی نین تارا ہے میں اپنا وعدہ پورا کرتی ہوں۔“

”وہ تو چلی گئی لیکن تم نے یہ بات غلط کہی کہ تم اپنا وعدہ پورا کرتی ہو۔“

”میری پاپا سے آخری ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک بڑا پیکٹ اس ہدایت کے ساتھ دیا تھا کہ اگر انہیں کچھ ہو جائے تو میں اسے کھولوں۔“

”کیا تھا اس پیکٹ میں؟“

”ان کی ڈائریاں تھیں اور وہ تمام ریسرچ کی تفصیلات تھیں جو انہوں نے کی تھی۔“

”تجہبی تم نے اس پر زہر دینے کا الزام عائد کیا تھا۔“

”لیکن میں جانتی تھی کہ کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکے گا۔“

”اس کے باوجود تم اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں امریکا تک آ گئیں۔“

”امریکا میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے نہیں بلکہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی لیکن یہاں آ کر اس نے بھی وہی کیا جو پاکستان سے یہاں آنے والے اکثر مرد کرتے ہیں۔“

”پھر تم نے مجھے اپنے جال میں پھنسا لیا۔“

”میں نے اسے دیکھا تو زخم تازہ ہو گئے تھے۔“

”رقم حاصل کر لینے کے بعد کیا کرو گی؟“

”واپس پاکستان چلی جاؤں گی۔“

”اور میں چاہوں کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں؟“

”تمہاری فطرت میں بے وفائی ہے۔“

”آج ملنے والا سبق میرے لیے کافی ہے۔“ اس نے التجائی۔

”یہ بات ہے تو پھر بقیہ زندگی یہیں گزار دو۔“

”میں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تم اس کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔“

”خطرے کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہے گی۔“

”میں اس کے زہر چوری کر چکی ہوں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو۔“

”غلطی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اس کے تمام تالوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں لیکن اس نے اس پر غور نہیں کیا۔“

”تو کیا تم نے اس کی الماری کی بھی چابیاں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کوئی جاسوس اعظم ہوں کہ فروخت کردہ تمام جامدات کی تفصیلات میرے پاس ہیں۔“

”وہ اپنی تمام ضروری چیزیں وہیں رکھتی تھی۔“

”ان ضروری چیزوں میں وہ زہر بھی شامل ہیں جواب

ہوں۔“

”تم چاہتی کیا ہو؟“

”صرف وہ تمام رقم جو تم نے میرے باپ کی موت کے بعد حاصل کی تھی۔“

”لیکن اس میں میری اپنی کمائی بھی شامل ہے۔“

”میرے پاس ایک ایک پائی کا حساب ہے جو تم نے میرے باپ سے ہتھیائی تھی۔“

”میں اس کا چیک تمہیں دوں تو تم مجھے یہ ٹیپ دے دو گی؟“

”چیک کیش ہونے کے ساتھ ہی میں تمہارے سامنے سب کچھ جلا دوں گی۔“

”تم اپنے باپ کا خون معاف کر دو گی نین؟“

”اس نے میری ماں کو قتل کیا تھا اور اس نے اسے قتل کر دیا۔“

”تم تو مجھ سے بھی محبت کا دعویٰ کرتی تھیں میرا خون بھی معاف کر دو گی۔“

”میں نے صرف اپنے مرحوم شوہر سے محبت کی تھی اور مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ اس کے بعد میں اس کی وفادار نہیں رہ سکی ویسے میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال فاطمہ اب تمہیں مرنے نہیں دیں گی۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”اب میں بھی اس راز میں شریک ہوں۔“

”میں بچ گئی تو یہ تمہیں رقم کیوں دیں گی۔“

”قتل کی کوشش کرنا بھی ایک جرم ہے اور پہلا قتل بھی ان کے ذمے ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں اب اسے مرنے نہیں دوں گی لیکن اسے میری اور تمہاری زندگی سے دور جانا ہوگا بہتر ہوگا کہ یہ پاکستان چلا جائے۔“

”لیکن پہلے بینک سے رقم نکلا کر میرے حوالے کرو ورنہ میں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکوں گی۔“

”نین پلیز پہلے میری جان بچانے دو۔“

”اگلے ہی بلاک میں بینک ہے اور وہاں رش بھی نہیں ہوتا یہ چاہے تو وہاں سے جا کر پندرہ منٹ میں واپس بھی آ سکتی ہے۔“

”میں جارہی ہوں لیکن رقم ملتے ہی تم دونوں میری زندگی سے دفع ہو جانا۔“

”تم شرائط عائد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو لیکن

”تمہیں یہ کیوں یقین ہے کہ میں معاف کر دوں گی تو تمہاری جان بھی بچ جائے گی۔“

”ہرز ہر کا تریاق ہوتا ہے اور تمہارے پاس اس زہر کا تریاق یقیناً ہوگا۔“

”موت کو سامنے دیکھ کر تمہارا ذہن کتنی تیزی سے کام کر رہا ہے۔“

”میں اپنے بینک میں موجود رقم کے علاوہ سب کچھ تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہاری بیوہ ہونے کے ناتے وہ تو ویسے بھی مجھے مل جائے گا۔ ویسے بھی وہ سب کچھ بھی تو میرا ہی دیا ہوا تھا۔“

”تم جو کہو گی وہ میں مان لوں گا لیکن خدا کے لیے میری جان بخش دو۔“

”تمہارے مرنے کا مجھے بھی افسوس ہوگا لیکن میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔“

”خون بھی چھپتا نہیں ہے، تم ضرور پھنسو گی۔“

”کون پھنسائے گا مجھے؟“

”میں پھنساؤں گی اپنی سوتیلی ماں کو دو قتل کے جرم میں۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو، اندر کیسے داخل ہوئیں؟“

”تمہارے گھر کے ہر تالے کی ایک ڈپلیکٹ چابی ہے میرے پاس۔“

”نین تارا اس عورت نے مجھے زہر دے دیا ہے۔“

”جانتی ہوں میں، باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی تم دونوں کی گفتگو ریکارڈ کرتی رہی تھی۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تم تو صبح سویرے چلی گئی تھیں۔“

”لیکن جانے سے پہلے تمہارے سامنے موجود گلدان میں مانک چھپا کر گئی تھی۔“

”اب مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں ہے۔ میرے بعد پھانسی سے تمہیں بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔“

”مجھے وہ ٹیپ دے دو میں تمہارے عاشق کی جان بخش دوں گی۔“

”اس کی زندگی سے مجھے کوئی غرض نہیں یہ مرے گا تبھی تو تمہیں اس کے قتل پر پھانسی ہوگی۔“

”نین یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔“

”آج سچ بولنے کا دن ہے اس لیے سچ بول رہی

طوائف

ڈاکٹر شیر شاہ سید

یہ حقیقت ہے کہ بردہ فروشی کے کاروبار میں اپنے پرائے کی شناخت بے معنی ہوتی ہے اور... اگر کوئی اسے اہمیت دے تو اپنی حیثیت بھی کھو بیٹھتا ہے... وہ بھی کچھ ایسی ہی خوش گمانی میں مبتلا تھا کہ اچانک ٹوٹے ہوئے اٹینے میں اپنا بکھرا ہوا عکس دیکھ کر نگاہیں چرا بیٹھا مگر... نگاہیں چرانے سے حقیقتیں کب بدلا کرتی ہیں۔

پسین پڑوں میں مچی فلاح اور مرثا کی برعنائیاں

وہ مجھے بنگاک میں ملی تھی۔ میں ہوٹل سے باہر نکلا ہی تھا کہ ٹیکسی ڈرائیوروں نے مجھے گھیر لیا۔ ”لڑکی چاہیے، لڑکی۔ بھوپاکستانی، مسلمان؟ مسلم لڑکی ایویل ایل۔ آل طین، آل نیشنل، میڈیکل سرٹیفکیٹ۔ باڈی مساج ساتھ میں۔“ وغیرہ وغیرہ نہ جانے وہ لوگ کیا کیا بولتے رہے تھے۔ تیز تیز قدموں سے چل کر میں نے انہیں پیچھے چھوڑا۔ میں عیاشی ہی کرنے آیا تھا مگر اس وقت عیاشی کا موڈ نہیں تھا۔ ابھی تو پاکستان سے مزید مہمانوں کو آنا تھا۔ جن کے لیے پورے۔۔۔ ہفتے کا عیاشی کا پروگرام مجھے ہی ترتیب دینا تھا۔

میں ایک بزنس مین تھا۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ ہر جگہ میرا بزنس تھا اور ہر قسم کے بزنس میں میرا عمل دخل بھی کبھی امپورٹ کبھی ایکسپورٹ۔ ادھر کا مال ادھر

”میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔“
”شکریہ لیکن میں تمہارے ساتھ بھی نہیں جا رہا ہوں۔“
”لیکن ابھی تو تم نے کہا تھا کہ میں اور تم۔“
”ان چند لمحوں میں دو باتیں واضح طور پر سمجھ میں آئی ہیں کہ جس طرح بچھو اپنی ڈنک مارنے کی جہلت کو ختم نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی انسان بھی اپنی جہلت کو ترک نہیں کر سکتا۔“

”میں نہیں سمجھی کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“
”دولت اور عیاشی کی متلاشی تم دونوں خواتین کی جہلت ایک جیسی ہے۔“
”تم ہم دونوں کو ایک صف میں کھڑا کر رہے ہو۔“
”یہ مائیکل جو آج میری لاش اٹھانے بلوایا گیا تھا مجھے افسوس ہے کہ اس کی لاش اٹھانے کے لیے میں یہاں نہیں ہوں گا۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“
”میں جانتا ہوں کہ مائیکل کو اپنی بیوی سے کتنی دولت ملی ہے اور تم بھی جو رقم مجھے اس لیے دے رہی ہو کہ مائیکل۔۔۔۔۔“

”تم فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ۔۔۔۔۔ تم دونوں۔۔۔۔۔“
”اور ہماری رقم۔“
”رقم اور طلاق کے کاغذات لے کر میں ایک گھنٹے میں نین تارا کے گھر پہنچ جاؤں گی۔“
”اب تم یہ رسک نہیں لینا چاہتی ہو کہ ہمارا سامنا مائیکل سے ہو۔“

”میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ ابھی اور اسی وقت۔“
”میرے پڑے اور میری چیزیں رانزنگ ہوٹل میں پہنچا دینا۔ نین مجھے وہاں تک ڈراپ کر دے گی، کیوں نہیں؟“

”میں بھی وہیں پرانتظار کر لوں گی۔“
”ہوسکا تو میں آج کی فلائٹ سے ہی واپس چلا جاؤں۔“

”فی الحال یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“
”خدا حافظ۔۔۔۔۔“
”بائی!“

”میری بات سنو۔“
”میں نے تمہارے ساتھ بھی زیادتی کی اس لیے اب تمہیں بھی آزاد کرتی ہوں۔“
”پہلے میری بات تو سن لو۔۔۔۔۔“
”میں سب کچھ سن چکی ہوں حالانکہ میں تمہاری وجہ سے ہی رکی ہوئی تھی کہ کہیں تم بھی۔۔۔۔۔“
”اگر یہ بات ہے تو تم نے زہر مجھ پر آزمایا ہی کیوں؟“

”صرف تمہیں دھمکانے کے لیے ورنہ میں واقعی۔۔۔۔۔“
”اگر میں واپس آنا چاہوں۔“
”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور میں اس غلطی کو جاری نہیں رکھ سکتی۔“
”اب میں اپنی خوشی سے رہنا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ۔“

”تم اور نین تارا شادی کر لو اور نین تارا کے باپ کی رقم سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرو۔“
”میں وہ زہر ضائع کر دوں گی تاکہ تمہارے ذہن پر تلوار نہ لگی رہے۔“
”لیکن اقبال تم۔۔۔۔۔“

”مائیکل چیک کیش کروا کر آتا ہی ہوگا۔ رقم آپس میں بانٹ لو اور برابری کی بنیاد پر اپنے رشتے کا آغاز کرو۔“
”اور آپ کیا کریں گی؟“
”باقی کی زندگی میں کوشش کروں گی کہ اپنے گناہوں کو معاف کروا سکوں۔“

”یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“
”جب تک مائیکل بینک سے واپس آئے ہم ناشتا کر لیتے ہیں۔“
”یہ مائیکل وہی ہے نا جو تمہارے ساتھ سیمینار میں گیا تھا؟“

”ہاں وہی ہے۔“
”وہ صبح سویرے کیسے آگیا؟“
”میں نے اسے بلوایا تھا۔“
”ڈاکٹر اسٹیفن مائیکل جس کی بیوی چار ماہ پہلے ہارٹ ایک سے چل بسی تھی۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“
”میں پیکنگ کرتا ہوں تاکہ فوری طور پر روانہ ہو سکوں۔“ اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔



اور ادھر کا مال ادھر۔ چینی۔ شکر کے دھندے میں بھی، لوہے کے کاروبار میں بھی۔ دوائیں منگوانی ہیں، چار پیسے کا فائدہ ہے تو خدمات حاضر ہیں۔ روٹی بھجوانی ہے تو بھجواؤں گا۔ توپ منگانا ہے تو منگواؤں گا۔ گاڑیوں کے لائسنس انک گئے ہیں، نکل جائیں گے۔ بلڈنگ گرائی ہے، گر جائے گی۔ چار منزل کے بجائے چودہ منزل بنانا ہے، بن جائے گا۔ ہر قسم کے کام میں میرا ہاتھ تھا۔ آج کل بزنس ایک چیز کا نہیں ہوتا، وہ زمانہ چلا گیا جب کاروباری لوگ صرف ایک کاروبار کرتے تھے۔ اب اصول یہ ہے کہ کوئی اصول نہیں، آگے بڑھتا ہے وقت سے پہلے ٹارگٹ پورا کرنا ہے صرف یہ اصول ہے۔ یہی میں بھی کر رہا تھا اور بڑی برکت تھی میرے کاروبار میں۔

ایک میرے باپ نے کاروبار کیا تھا۔ ساری زندگی لی مارکیٹ کی ایک چھوٹی سی دکان میں چائے بیچتا رہا اور نمازیں پڑھتا رہا۔ ساری زندگی جتنے پیسے اس نے بنائے اس سے زیادہ حساب تو میں نے ایک جھٹکے میں اسٹیل مل کی ایک ڈیل میں کر لیا تھا۔ بلجیم سے تھر موریز سنٹ واشرا پیسے تھے۔ ایک ٹکڑی پارٹی نے مجھ سے بات کی کہ انہیں بھی آگے اسٹیل مل کو پلائی کرنا ہے۔

میں نے کہا۔ ”بابا، جمہوری حکومت ہے کسی وزیر وغیرہ سے بات کرتا ہوں، کام ہو جائے گا۔“

کام ہو گیا تھا۔ اسٹیل مل والوں نے جو واشرا آٹھ سو روپے میں بک رہا تھا، وہی واشرا چار ہزار ایک سو کا ایک خریدا۔ بس یہ میرا ہنر تھا۔ بلجیم والوں کے دس ہزار واشرا بک گئے، پارٹی کو اصل سے بھی بڑا منافع ہو گیا، مجھے پورا پورا کمیشن ملا۔ میں نے کام کروانے والوں کو بھی اچھی خاصی رقم دی تھی۔ کام ہو تو ایسا ہو۔ میرے کام کرنے کے اصول بہت سادہ تھے۔

میرے باپ کی نظر میں یہ بزنس نہیں تھا، چوری تھی۔ اب اسے کون سمجھائے کہ دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ یہ ٹمک بزنس کرنے کا ٹائم نہیں ہے۔ بابا پیسا بناؤ، جتنی جلدی جتنا زیادہ بناؤ اتنا ہی اچھا ہے۔ جائز منافع، ایمان داری کا کام صرف کتابوں کی باتیں ہیں، پرانے زمانے کی باتیں ہیں اب نیاز مانہ ہے جس میں الیکٹرونک میل سے ڈالر روشنی سے بھی تیز سفر کرتا ہوا پہنچ جاتا ہے، وقت بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں اپن کو بھی بدلنا ہوگا۔

میرے باپ کو کھوکھوں کا شوق ہے کہتا ہے پرانی بلڈنگیں، کوئی ہیری ٹیج میری ٹیج ہوتی ہیں۔ میں نے کراچی میں ایک ڈیل میں بڑا ڈیپو بنایا۔ ایک بڑا بلڈر اسے رہنے بڑا اس نے کروڑوں کی ڈیل کی تھی میں نے اسے کام بھی کوئی

ایسا بڑا نہیں تھا۔ کراچی کی کچھ پرانی بلڈنگیں تھیں، کچھ کٹھنمنٹ بورڈ کے تحت، کچھ سندھ گورنمنٹ کے پاس۔ ان کو صرف کمرشل بنانا تھا۔ میں نے کہا، ابھی کراچی میں آفسوں میں چکر لگانے کا نہیں ہے۔ سیدھا اسلام آباد میں خاص آدمی کو ڈالروں سے بھرا ہوا تھیلہ دینا ہے پھر سب کچھ ہفتے بھر میں ہو گیا۔ جب کروڑوں کا بزنس ہو تو کون فکر کرتا ہے۔

وہ تو حکومت ہی چلی گئی، اپنے پاس تو ایک پلان اور تھا۔ جناح کی قبر کے چاروں طرف بڑا بڑا پلازا بالکل قبر کا اسٹائل میں۔ اوپر سے کوئی دیکھے تو لگے جیسے بہت سارے گولے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں اور سائڈ میں باپ کی قبر بھی۔ کیا نقشہ بنایا تھا دادا بھائی نے مگر یہ بد قسمی سے حکومت ہی چلی گئی۔ لیکن خیر حکومت کے جانے سے پہلے میں نے ایک اور بڑی ڈیل بھی کرادی تھی۔ یورپ اور امریکا سے کچھ پرانی ایم آر آئی کی مشینیں آئی تھیں۔ چھ کروڑ سات کروڑ قیمت میں نئی مل گئیں۔ اس دفعہ مجھے ذرا کم پیسے ملے کیونکہ صحت کے وزیر نے میرے کمیشن میں سے تھوڑا اپنا بھی الیکشن فنڈ نکال لیا تھا۔ بابا کام تو چلانا ہے، دھندے میں رہنا ہے تو یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

یہی بات بڑی کوشش کی تھی میں نے اپنے باپ کو بھی سمجھانے کی مگر سمجھا نہیں۔ بہت ایمان داری سے کام کرتے ہوئے بہت خاموشی سے ایمان داری کی موت مر گیا۔ مرنے کے ٹائم پہ تو بہت دکھ ہوا بعد میں یاد بھی بہت آئی۔

میں نے تمام لغزوں میں بہت کمایا۔ کیسے اپنے دن کالے کیے اور راتوں کو جاگتا رہا۔ ہر ایک کی قیمت لگائی۔ کسی کے پیسے لندن بھجوائے۔ کسی کے لیے مکان خریدا، کسی کی بیٹی کے نام پہ پلاٹ لکھوائے۔ ایک کو تو جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں لفافے پہنچائے۔ دنیا ایسے ہی چلتی ہے، ایسے ہی چلے گی۔ لوگ کہتے ہیں باپ کو میرا غم تھا گیا۔ ابھی اس کا کوئی جواب دے میرے کو۔ اپن کا غم اپن کو کھاتا نہیں، میرے باپ کو کھا گیا۔ بھی موت کا وقت آ گیا تو مر گیا۔ مگر اس کے باوجود کیسا بھی تھا اپن کا باپ تو تھا۔ بڑے اچھے دن گزرے اس کے ساتھ، جب میں چھوٹا تھا، دن ویسے ہی رہتے تو اچھا ہوتا مگر دن بدل گئے۔ دوست بدل گئے۔ اپن بدل گئے پر باپ نہیں بدلا۔ یاد آتا ہے اسی وجہ سے کبھی کبھی۔

اس نعرے کے بعد میں نے بنگاک میں یہ پارٹی رکھی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے جمع ہو رہے تھے۔ ہم تین کے علاوہ سب سرکاری تھے۔ سب بنگے لین اوتی بیٹے، سب کے بکٹ خریدنے گئے اور سب بنگاک پہنچ گئے۔ قادیان شہر ہوئی

میں رہنے کا انتظام تھا اور ہر روز، روز عید تھا اور ہر شب، شب برات۔ میں نے جو ہوٹل چنا تھا اس کا بھی جواب نہیں تھا۔ دریائے چاد پائی یا کے کنارے نیا ہوٹل بنا ہے بنین سلا کے نام سے۔ ایسا ہوٹل میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔

بنکاک کا بھی کیا مزہ ہے۔ ایک رات ہم لوگوں نے ایک بڑی گاڑی پکڑی اور تفریح پر نکلے۔ بھگم پو سے بھی آگے جہاں بنگوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ ان بنگوں کے بڑے بڑے گیٹ کھلتے ہیں، گاڑیاں اندر جاتی ہیں۔ صاف سترے کپڑوں میں ملبوس منجمر نما لوگ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ خوب صورت دروازوں سے گزرتے ہوئے مختلف کمروں میں لے جایا جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کر کے کم سے کم کپڑوں میں ملبوس کم عمر لڑکیاں چلی آتی ہیں۔ جسم اور جان کے ہر اشلے سے کہتی ہیں کہ انہیں چن لیا جائے۔ اس رات تین بجے تک ہم لوگ تقریباً دس گھروں میں گئے۔ یہ بھی ایک طرح کا تھرل تھا اور جب رات ٹوٹنے والی تھی تو ہم سب نے ایک ایک لڑکی منتخب کر لی۔ چوبیس گھنٹوں کے لیے یہ لڑکیاں ضرور مہنگی ہوں گی مگر ہمیں زیادہ نہیں لگیں، کیونکہ رقم کسی اور نے دی تھی۔ کسی دفاعی معاہدے کے سودے میں سے، کسی روڈ کی تعمیر کے اکاؤنٹ میں سے، کسی اسپتال کی خریداری کے لیے دیے گئے رقم کی کمیشن میں سے۔

وہ دن، وہ رات غضب کے تھے۔ ہم لوگوں نے بے تحاشا ڈالر خرچ کیے اور بنگاک نے بھی ہم سے پورا انصاف کیا۔ اتنا سستا شہر، اتنے سستے ہوٹل، اتنی سستی شراب، اتنی سستی عورت کسی اور شہر میں نہیں ملے گی۔ ہمیں مزہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے پینٹ پانگ میں ملی تھی۔ پینٹ پانگ کا علاقہ بھی کیا علاقہ ہے۔ دنیا بھر کی چیزیں خریداری کے لیے مہیا ہیں اور ساتھ میں ایک قطار میں کلب ہیں جہاں دن رات چوبیس گھنٹے عریاں عورتوں کا ڈانس ہوتا رہتا ہے۔ بس ڈالر چاہیے جو آج کے زمانے کا سب سے بڑا بھگوان۔ وہ بنگاک کی لڑکیوں کے مقابلے میں تھوڑی لانی تھی اور ناک نقشے سے بھی تھوڑی جدا۔ ہمارے واپس آنے میں صرف دو دن ہی رہ گئے تھے اور اسی شام وہ مجھے مل گئی تھی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر فوراً ہی سودا کر لیا اور اسے لے کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب دو دن مجھے اسی کے ساتھ ہی گزارنا ہیں۔ طوائفوں سے محبت نہیں ہوتی، ہونی بھی نہیں چاہیے۔ مجھے بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس سے انصاف ضرور ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اگر بنگاک آتا ہوگا تو ایسی کیے لیے آتا ہوگا۔ وہ بھی ایسی۔ ایک تو خوب صورت پورکیش، اوپر سے اس طرح

سے ملی جیسے صدیوں کی شناسائی ہو۔ یہ بھی ایک اداسی اس کی، میں بری طرح مر رہا تھا اس پہ، یہ سوچے بغیر کہ وہ بھی بنگاک کی طوائف ہے، دھندا کرنے والی ایک پروفیشنل عورت۔

واپس آنے کی شام اسے میں نے بھرپور طریقے سے گلے لگایا اور بوجھل دل کے ساتھ اسے چھوڑ کر آ گیا۔ جہاز پہ کئی دفعہ یہ خیال آیا کہ وہ کسی اور کے ساتھ ہوگی مگر میں نے دل کو بہلا لیا۔ یہی دنیا کا نظام ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ، کوئی کسی کے ساتھ۔

پاکستان کا نظام دیکھا ہی چل رہا تھا مگر ایک حکومت بدل گئی اور نئی حکومت نے مجھے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کے ہی لوگوں نے سمجھایا کہ مجھے فرار ہو جانا چاہیے۔ ابھی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے، جھٹکے میں پکڑا جاؤں گا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اپن لوگوں کو بھی جیل میں رہنے کا شوق نہیں۔ اپن کو کھلی ہوا میں ہی رہنا ہے۔ میں نے دیر نہیں کی اور پکڑے جانے سے بہت پہلے ہی بنگاک چلا آیا۔ جا تو کہیں بھی سکتا تھا مگر بنگاک میرے دل سے نہیں نکلتا تھا۔ حکومت مجھے وہاں تلاش کرتی رہی اور میں آرام سے نکل گیا۔ میرے جیسے بہت سے لوگ نکل گئے تھے۔ حکومتیں آتی ہیں پھر قیمت لگنے میں دیر لگتی ہے۔ اچھا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہی پھوٹ لو جب سب ٹھیک ہو جائے تو واپسی میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پاکستان میں بھی یہی ہوتا ہے۔ تھوڑا سا بربیک ملتا ہے، روز روز کے کام سے بچنے کا۔ پھر حکومت سے بات چیت ہوتی ہے، کچھ دینا ہوتا ہے کچھ وعدے کرنے ہوتے ہیں پھر سب کچھ ہو جاتا ہے۔

بنکاک جاتے ہی میں نے ایک اپارٹمنٹ بھگم پو کے علاقے میں لے لیا تھا۔ یہ علاقہ شہر میں ہی ہے۔ دنیا بھر کی دکانیں، مساجد کرنے کے سینٹر، بڑے چھوٹے ہوٹل بزنس۔ اور ہر قوم کا آدمی یہاں مل جاتا ہے۔ یورپ اور امریکا کے وہ لوگ جو اپنے ملکوں میں چائلڈ لیبر کے خلاف مہم چلاتے ہیں ان کے ہی ملک کے لوگوں کے لیے چائلڈ طوائفوں کا بڑا منظم انتظام ہے۔ ایک گھنٹے سے لے کر ہفتوں مہینوں تک کے لیے بھی لڑکیوں کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ بچ میں بدلی بھی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی صنعت بن چکی ہے۔

میں نے ایک اچھا اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی اور بھی مہمان پاکستان سے آئیں گے، کچھ ایسے مہمان جو مستقبل میں سفیر، وزیر اور مشیر بنیں گے، کچھ ایسے سیکریٹری جو بعد میں چیئرمین اور ڈائریکٹر بنیں گے۔ اپنا کام ہی ایسا ہے کہ ہر بات کا خیال رکھتا پڑتا ہے۔ عمر بھر کے شوقین کے لیے جدوجہد کا ٹکٹ، بٹا بٹکا بکے لیے سنگاپور۔ جس کا

جوشوق ہو اس کے مطابق اس کی خدمت۔ میں ہوں نئے دور کا نیا بیوہ پارٹی۔

میں نے اسے بھی فون نہیں کیا بلکہ پینٹ یا ٹنگ کے اس ٹائٹ کلب میں پہنچ گیا تھا جہاں پہلی دفعہ وہ ملی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اچانک اس سے مل کر اسے حیران کر دوں مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ کلب کے منیجر نے بتایا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے۔ یہ سن کر مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ کسی امریکی کے ساتھ ہوگی، کوئی شیخ اسے لے کر گھوم رہا ہوگا۔

میں نے منیجر سے کہا۔ ”مجھے ماریا چاہیے، چاہے جتنے بھی ڈالر لگیں۔“ میں کافی کچھ خرچ کرنے کو تیار تھا۔ ”مگر بزنس کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں مسٹر۔ اگر وہ کسی کے ساتھ ہے تو اس کے ساتھ ہے۔ ایک انگریز سینٹ ہے اس کے مطابق چلتے ہیں ہم لوگ۔“ کام غلط ہے مگر کام میں ایمان داری ہونا چاہیے۔ اس کا تو میں بھی قائل تھا۔ ”آپ اپنا نمبر بتادیں۔ ہم خود ہی آپ کو فون کر دیں گے اور جب تک وہ نہیں ملتی ہے اور حسینا نہیں ہیں۔ ماریا نہیں تو میری مل جائے گی۔ آپ حکم تو کریں۔“

عورت نہیں ہوتی، نمبر ہوگئی۔ میرا کچھ دل نہیں چاہا۔ میں تو اس کے بارے میں ہی سوچتا ہوا آیا تھا، کچھ دل خراب سا ہو گیا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر جانی داکر کی آدمی بوتل خالی کی اور لڑھکتا ہوا ٹیکسی میں بیٹھا اور اٹھتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ میں آکر سو گیا۔

دوسرے دن شام کو اس کا فون آیا، وہی تھی۔ اس کی آواز میں فوراً ہی پہچان گیا۔ وہ فارغ بھی یا شاید میرے لیے فارغ کرادی گئی تھی، بعد میں اس نے بتایا کہ جب اسے میرے بارے میں پتا لگا تو وہ ایک ڈچ کاروباری آدمی کے ساتھ ہفتے بھر کی ڈیوٹی پر تھی مگر اسی دن یکا یک اس ڈچ کو ضروری میننگ کے لیے کبڑیا جانا پڑ گیا۔ وہ تو اسے بھی لے جانا چاہ رہا تھا مگر جیسے ہی اسے پتا لگا کہ میں اسے تلاش کر رہا ہوں، اس نے اس سے بہانہ کر لیا کہ اس کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔ پھر وہ خوب ہنسی تھی۔ وہی ہنسی جس کا میں پچھلی ملاقات میں ہی اسیر ہو گیا تھا۔ تھائی زبان کے علاوہ اس میں کچھ بھی تھائی نہیں تھا۔ میں نے اسے رکھ لیا۔ اس رات ہم لوگوں نے مشہور اور پینٹل ہوٹل ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ ایسا ریسٹورنٹ میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔ زندہ چھلی، زندہ مرغی سے لے کر ہر طرح کی تازہ سبزیاں، سب کچھ خوب صورت انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہیں پر خریدیں اور جیسے آپ چاہیں ویسا ہی پکا کر وہ لوگ پیش کر دیں گے۔ ہر بات نرانی تھی اس

رات کی۔ ماحول رومانی تھا اور دھیمی دھیمی روشنی میں وہ تھائی کپڑے پہنے ہوئے کسی حور کی طرح میرے ساتھ تھی۔ دل میں آیا کاش یہ میری ہی بن جاتی، میرے ہی ساتھ رہتی، کبھی ساتھ نہ چھوٹا اس کا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ میں اس کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا، بنکاک کے شہر شہر، سمندر سمندر، دریا دریا، جنگل جنگل۔ وہ طوائف تو تھی مگر بہت اچھی طوائف تھی اور بھی بہت کچھ تھا اس کے اندر۔ اس کے بکنے کا بھی ایک انداز تھا۔ میں اسے محبت تو نہیں کہوں گا مگر میں اسے چاہنے ضرور لگا تھا لیکن یہ تو نہیں سوچا تھا کہ زندگی بھر کا ساتھ ہوگا۔ مگر بنکاک کا ساتھ تو اسی کا تھا۔ ڈالروں کی کمی نہیں تھی، بیچ میں اور بھی لوگ پاکستان سے آئے۔ ہر ایک کسی نہ کسی وجہ سے یا تو بھاگ کر آیا تھا یا بھگوا دیا گیا تھا۔ جو بھی میرے پاس آیا، اس کا خیال کیا تھا میں نے۔ اوپر والے نے بڑی برکت دی تھی اس قسم کی کمائی میں۔ ڈالر زخم نہیں ہو رہے تھے۔ ان کا بھی میں نے معقول انتظام کر لیا تھا۔

آہستہ آہستہ پاکستان میں بھی حالات صحیح ہونے لگے۔ نئی حکومت نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ پرانے سیاست دان یا تو ملک سے باہر تھے یا پھر حکومت کے ساتھ مل گئے۔ اب مجھے پتا تھا کہ وقت آنے والا ہے جب حکومت کو ہمارے جیسے بیچ کے لوگوں کی ضرورت ہوگی۔ کام تو کرنا ہے، پچاس سالوں سے یہی ہو رہا ہے۔ مجھے تھوڑا دکھ بھی ہوا کہ اب بنکاک چھوڑنا ہوگا۔ میں نے سوچا تھا کہ بنکاک میں بھی ایک مستقل آفس بنالوں، ماریا سمجھ دار ہے، یہاں کام سنبھال لے گی۔ اس کو اس کے پیسے ملتے رہیں گے اور میں مستقل عیاشی کا کاروبار بھی چلاتا رہوں گا۔ اپن کا یہ اسٹائل تھا، ہمیشہ ہی نئے کام کرنے کا، نئے طریقے سے۔ جدھر کچھ ہزاروں کا آسرا ہو فوراً ہاتھ ڈال دو۔ اوپر والے کی مہربانی سے بھی نقصان نہیں ہوا۔ ایک کا دو بنا اور دو کا ہزار۔ اپنے بزنس میں یہی تو خاص بات تھی۔

ایک دن اسے میں نے بتایا کہ میں اب چلا جاؤں گا اور میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں کے اپارٹمنٹ میں رہے، میرا مستقل تعلق رہے گا۔ وہ میری ہی رہے گی مگر اس کا کام پاکستان سے آنے والے مہمانوں کی دل داری کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ مجھے بھی پتا تھا کہ اب نئی حکومت کے نئے لوگ ہوں گے، نئے سیاست دان، نئے افسر، نئے ٹھیکے، نئے چکر اور ان سب چکروں میں باہر کی عیاشی کرانے والا ہمیشہ ہی جیت جاتا ہے۔ میں نے مستقبل کا

انتظام کر لیا تھا مستقل بنیادوں پر۔ پاکستان واپس آنے سے پہلے ایک شام ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ جا رہے تھے کہ اس نے بتایا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنی ماں سے ملنا ہے۔ میں انتظار کروں، وہ مل کر آتی ہے۔ میں نے کہا کہ ہم ساتھ ہی چلتے ہیں، میں گاڑی میں بیٹھا رہوں گا۔ میں اسے زیادہ دیر کے لیے نہیں جانے دینا چاہ رہا تھا۔ نہ ہی میں یہ چاہتا تھا کہ اب جانے سے قبل اس سے علیحدہ رہوں۔ انسانی تعلقات کا بھی عجیب ہی حساب ہوتا ہے۔ خاص طور پر عورت اور مرد کے تعلقات تو سمجھ سے ہی باہر ہیں۔ تمام چیزیں وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

وہ بنکاک کے ہی ایک اور علاقے میں رہتی تھی۔ خوب صورت سامکان تھا۔ میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہا، وہ اندر چلی گئی۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا ہے؟ واپس جا کر کون سے کاموں میں کب ہاتھ ڈالنا ہے؟ نئی حکومت کے لوگوں نے نئے نئے پروجیکٹس بوج لیے تھے۔ ہر پروجیکٹ میں مجھے ڈالر نظر آرہے تھے۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ نظام نہیں بدلتا، لوگ بدل جاتے ہیں۔ نام بدل جاتے ہیں، کام تو وہی ہوتا ہے جو شروع سے ہو رہا ہے۔ شاید یہی ہوتا رہے گا۔ جو ملک میں چلنے کے قابل نہیں ہیں وہ ملک چھوڑ جائیں گے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے۔ یکا یک میں اپنے خیالوں سے چونک گیا، جب مجھے اس کی آواز آئی۔ ”خدا حافظ!“ میں نے دیکھا وہ گھر کے دروازے پر اپنی ہی جیسی شکل والی عورت جس کی گود میں ایک چھوٹی بچی تھی، سے گلے مل کر سیرھی اتر رہی تھی۔ ”پرسوں آ جاؤں گی۔“ اس نے بچی کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم اردو جانتی ہو؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

”مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”کیونکہ ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میرے گالوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اس پیشے میں کسی قسم کی نسل پرستی، لسانی جانب داری نہیں ہے، مذہبی تعصب نہیں ہے۔ طوائف تو طوائف ہی ہوتی ہے اور گاہک بھی بس گاہک ہی ہوتا ہے۔ طوائف کو پیسا چاہیے ہوتا ہے اور گاہک کو وقت کا مناسب استعمال۔ دونوں اپنا مذہب، رنگ، زبان، نسل، سیاست گھر چھوڑ کے آتے ہیں۔“

میں خاموش سا ہو گیا۔ مجھے نہیں خیال تھا کہ ایک

طوائف مجھے فلسفہ بھی پڑھائے گی۔ مجھے تھوڑی سی بے چینی سی ہوئی تھی۔ میں نے رک کر پوچھا۔ ”مگر تم نے اردو کہاں سے سیکھی، گا کہوں سے؟“

”نہیں اپنی ماں سے، اور اب اس کا فائدہ بھی ہوگا۔ تمہارے لوگ جو پاکستان سے آئیں گے، ان سے اگر چاہو گے تو اردو میں بھی بات کر لوں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”اچھی سرورس دوں گی، زوردار..... خوب مزہ آئے گا۔“ وہ زور سے ہنسی۔

رات کی ٹریفک میں اس کے چہرے پر پڑنے والی مختلف رنگوں کی روشنی نے اس کے چہرے کو مزید سیکی بنا دیا تھا۔ میں نے اس کے کاندھوں کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کو کس نے اردو سکھائی؟ کیا وہ بھی دھندا کرتی تھی اور پاکستانی گا کہوں سے زبان سیکھ گئی؟

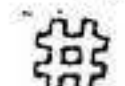
”نہیں، دھندا تو وہ کرتی تھی پر اردو اسے پہلے سے آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ جب بنگلہ دیش بنا تو وہ سولہ سترہ سال کی تھی۔ میری ہی طرح خوب صورت رہی ہوگی۔ وہ مجھے اکثر بتاتی رہی ہے کہ اسے بنگلہ دیش کے فوجیوں نے اغوا کر لیا تھا، ماں باپ، بھائی بہن کا کچھ پتا نہیں لگا کون مرا، کون جیا، کون کہاں پہنچا؟ اسے وہ لوگ کلکتہ لے آئے تھے۔ کلکتہ میں ہی اسے تین دفعہ مختلف لوگوں کے ہاتھوں بیچا گیا۔ کلکتہ میں ہی اس سے ایک تھائی بندے نے شادی کی اور اپنے ساتھ بنکاک لے آیا۔ جب میں پیدا ہوئی پھر وہ آدمی بھی چھوڑ گیا۔ ماں کو پھر دھندا کرنا پڑا۔ زندہ تو رہتا پڑتا ہے۔ ہر کوئی تو خود کشی نہیں کر سکتا ہے۔“ اس نے بڑی عمیق مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے جواب دیا تھا۔

میں پہلی دفعہ ساکت سا ہو گیا۔ اپن کو جیسے جھٹکا لگ گیا، بجلی کا جھٹکا، اوپر سے نیچے تک۔ اس کی خوشبو بھی جیسے کچھ بری سی لگنے لگی۔ اپنے ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے سے نکالتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ”تو تمہاری ماں کا تعلق کلکتہ سے تھا؟ میں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ بھی وہاں کی طوائف مجھے ملے گی۔“

اپن کو پتا نہیں کیا ہوا کہ یہ الفاظ خود بخود اپن کے منہ سے نکل گئے۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، طوائف کہیں کی بھی ہو طوائف ہوتی ہے۔“

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی کی اور کھلے ہوئے گریبان میں منہ ڈال کر زور سے ہنس دی۔





✽ محمد ہمایوں تنولی..... ضلع تناول، ہزارہ
تم بادشاہ وقت تھے کٹوا دیے ہاتھ
اب قصر گر رہا ہے تو معمار کیا کرے
✽ ماہا ایمان..... حافظ آباد
غضب ہے جستوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے
✽ محمد جاوید راؤ..... بہاولنگر
سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے ہم تو
کسی نے سمیٹا بھی تو صرف جلانے کے لیے



✽ شوکت علی..... گلبرگ، لاہور
حوصلہ تجھ میں نہ تھا مجھ سے جدا ہونے کا
ورنہ یوں تیری آنکھوں میں کاجل نہ پھیلا ہوتا
✽ غلام مرتضیٰ جانی..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
خوشبوؤں کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس تیری کمی ہے
✽ محمد لطیف ساحل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہر دعا میں تیری خوشی مانگی ہے
تیرے لیے ستاروں سے روشنی مانگی ہے
نہ ہو جس میں کوئی بھی غم
خدا سے ترے لیے وہ زندگی مانگی ہے
✽ محمد نصیر طلحہ سیال..... کوئٹہ روڈ، سکھر
دل کا درد ہے دل میں میرے بیان کروں تو گھائل ہو
حال میرا پھر وہ کیا جانیں جو دنیا پر مائل ہو
✽ عون عباس بابر..... اوکاڑہ
زیست کو تربیت کچھ اس طرح کیا جائے
جینا مشکل ہو تو لازم ہے کہ جیا جائے
اس سے پہلے کہ خزاں آکے انہیں پامال کرے
کیونکہ نہ شاخ سے ہر پھول کو توڑ لیا جائے

✽ ثقلین عباس بلوچ..... اوکاڑہ بنگلہ
میں نہیں مانتا کاغذ پر لکھا شجرہٴ نصب
بات کرنے سے قبیلے کا پتا چلتا ہے
✽ اختر عباس چٹھہ..... موڑکھنڈا
بن جاتا ہے بھی حسن بھی دنیا کا تماشا
عبرت کے لیے مصر کا بازار بہت ہے
✽ امتیاز احمد..... عظیم پورہ، کراچی
ہم جو چلتے ہیں تو خود بنتا چلا جاتا ہے
لاکھ مٹی میں چھپا کر کوئی رستہ رکھ دے
✽ شبانہ حسن..... لاہور کینٹ
یہ الگ بات کہ اوجھل ہوں نظر سے درنہ
میں تیرے پاس ہی رہتی ہوں صدا دے مجھ کو
✽ ذیشان حیدر بلوچ..... سکالا تحصیل، ساہیوال
کتنا عجیب اپنی زندگی کا سفر نکلا
سارے جہاں کا درد اپنا مقدر نکلا
جس کے نام اپنی زندگی کا ہر لمحہ کر دیا
افسوس وہی ہماری چاہت سے بے خبر نکلا
✽ سلطان احمد قائم خانی..... بٹنڈو جان محمد
پیتل کے کٹورے بھی نہیں اپنے گھروں میں
خیرات میں چاندی کا تقاضا نہ کیا کر
✽ افتخار احمد تارڑ..... کوٹ قادر بخش
شاید کبھی خلوص کو منزل نہ مل سکے
وابستہ ہے مفاد ہر اک دوستی کے ساتھ
✽ ادریس خان..... میانوالی
وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے
✽ محمد یونس چودھری..... سلطان پورہ، لاہور
اپنا جو نامہ اعمال ہے سب جانتے ہیں
ہاتھ پھر کیسے انھیں، دل سے دعا کیسے ہو
✽ بابر عباس..... گلیانہ روڈ کھاریاں
وہی محسوس کرتے ہیں خلش درد محبت کی
جو اپنے آپ سے بڑھ کر دوسروں سے پیار کرتے ہیں
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا میں اس کو بھول جاؤں گا

✽ ریاض شاہد پٹیل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہم نیند کے کچھ زیادہ تو شوقین نہیں حسن
کچھ خواب نہ دیکھیں تو گزارہ نہیں ہوتا
✽ عدنان ساعل..... بھیرہ
وہ آج بھی ہر شام مجھ کو ہی سوچتا ہوگا
یہ بات نجانے کیوں میرے دل میں بار بار آتی ہے
✽ عمران حیدر بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
وہ جو برباد ہوئے وہی بدنام ہوئے ہیں
تم تو معصوم رہے اپنی آوازوں کی طرح
غم تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی خوشی رس نہیں
زندگی کاٹ رہے ہیں سزاؤں کی طرح
✽ حسنین عباس بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
مجھ کو جاتے ہوئے آواز نہ دینا ہر گز
دیکھنا اور فقط دیکھتے رہنا مجھ کو

✽ تفسیر عباس بابر..... اوکاڑہ
سکون کی اک سانس کی فرصت نہیں ملتی
اس شہر میں جینے کی اجازت نہیں ملتی
کتنے بے مہر مزاج کے مالک ہیں یہاں لوگ
اپنی تو کسی سے بھی طبیعت نہیں ملتی
✽ جعفر حسین..... بھوآنہ، ضلع چنیوٹ
تجھ کو نہیں احساس کہ اے دل تری خاطر
اک شخص بڑے کام کا بیکار ہوا ہے
✽ کنول زریں..... گلبرگ، لاہور
وہ جس پہ عمر لگی ہے مجھے مٹانے میں
اسی کا ہاتھ ہے مجھے مٹانے میں
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
حرف تسلی تو اک تکلف ہے صاحب!
جس کا درد، اسی کا درد اور باقی سب تماشائی
✽ مدحت رضوان..... کراچی
مجھ سا کوئی جہان میں نادان بھی نہ ہو
کر کے جو عشق کہتا ہے نقصان بھی نہ ہو
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
دل کی بات کہوں؟ برا تو نہیں مانوں گے؟
بڑی راحت کے دن تھے تیری پہچان سے پہلے
✽ مصحف رضوان..... کراچی
تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کئے کسی کا سفر! تم کو اس سے کیا
✽ محمد آصف ساجد..... ارزانی پور، قصور
روکتے ہو کس لیے اڑتے ہوئے لمحات کو
کون اب تک ان پرندوں کو مقید کر سکا
✽ عمران علی..... جھنگ
لے ماں، پھر سے مجھے میرا بستہ دے دے
کہ دنیا کا دیا سبق مشکل بہت ہے
✽ خالد انصاری..... حیدرآباد
اٹھا سائبان شفقت بڑی تیز دھوپ دیکھی
نہیں دور دور چھاؤں کہاں سر کو ہم چھپائیں
✽ ڈاکٹر ایچ اے لطیف..... فقیر والی
لفظ تاثیر سے بنتے ہیں تلفظ سے نہیں محسن
اہل دل آج بھی ہیں زبان سے آگے

ہو، ایک نئی اور تیز رفتار اسپورٹس کار جو اس کی پُر جوش
امنگوں کا ساتھ دے سکے اور سب سے آخر میں ایک حسین
لڑکی جو اس سے محبت کرے اس کی گرل فرینڈ بنے اور بالآخر
بیوی بن کر اس کے بچوں کی ماں بنے۔ یہ خواب جون نے
پندرہ سال کی عمر سے ہی دیکھنا شروع کر دیے تھے اور اب وہ

جون مانگو ایک خوش شکل اور ذہین نوجوان تھا اور
ذہن صورت خواب دیکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مثلاً اچھی سی
نوکری، تاکہ سہولت سے زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ
غوی سی عیاشی بھی ہو سکے، ایک خوب صورت گھر کا خواب
جس میں کم سے کم تین بیڈ روم اور ایک سوئمنگ پول بھی



سرمے کے حسان

یہ حقیقت ہے کہ لگن سچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے مگر... پڑا تو کو
منزل سمجھنے والے ہمیشہ خسارے کا سودا کرتے ہیں۔ وہ بھی
مسلسل ایک سراب کے تعاقب میں تھی اور اس بے خبر کو اتنا ادراک
ہی نہ تھا کہ منزل تو اس کے ہم قدم تھی... بالآخر جب اس کی
جستجو نے دم توڑا تو احساس ہوا کہ وہ تو ایک کارِ لا حاصل
کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

خلوص اور وفا کے رنگوں سے کلیتی ایک دلکش تصویر



بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور
مدت ہوئی ہے کوئے بستان کی طرف گئے
آوارگی سے دل کو کہاں تک بچائیں ہم
اسلم عارفی..... گوجرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ
کیوں دور بے رخی کو سمجھتا حصول عشق
کیا آپ کے مزاج سے نا آشنا تھا میں

ذوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور! جانیے، اچھا خفا ہو جائیے
محمد اقبال..... کورنگی، کراچی
ہم تری آہٹ پہ سڑکوں پر نکل آئے تو کیا
ہم کو تو رسوا سربازار ہونا تھا، ہوئے

حسن نظامی..... قبولہ شریف
میں اسی خیال سے آج تک کبھی دل کی بات نہ کہہ سکا
کہ تو رنج و غم سے ہے بے خبر کہیں مسکرا کے نہ ٹال دے

احسان سحر..... میانوالی
ماتا وفا نبھائی مگر بے رخی کے ساتھ
جاناں گلاب بھیجا ہے تم نے کسی کے ہاتھ
ذیشان منہاس..... گلشن اقبال، کراچی
پچھڑ کے مجھ سے بھی تو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے

محمد اظہر..... ملیر، کراچی
کل شب مجھے بے شکل کی آواز نے چونکا دیا
میں نے کہا تو کون ہے اس نے کہا آوارگی
یمینی احمد..... کراچی
غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

محمد امین..... کراچی
ملنے ہی خود کو آپ سے وابستہ کہہ دیا
محسوس جو کیا وہی برجستہ کہہ دیا

طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص
ملنے کی آرزو لیے پہنچا تھا اس کلی
لیکن مرے سماج کے پہرے عجیب ہیں
سعدیہ بخاری..... انک

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا
ادریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو

راجا ضیاء الحسن کیانی..... رتی مٹی، ساہیوال
جانے کیوں آگ آتی ہیں درو کی ساری فصلیں؟
پیار کے اس کھیت میں کانٹے تو نہیں بوئے تھے

رانا حبیب الرحمن..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
میری رنگوں بھری زندگی کو ویران کر گئی
غموں کی دے کر سوغات خوشیوں سے انجان کر گئی

محمد خواجہ..... کورنگی، کراچی
آخری بات ملاقات کی حسرت ہے مگر
تم سے کچھ اس کے سوا اب نہیں کہنا مجھ کو
راجا افتخار علی افقی..... چوآسدن شاہ
ہم ہر روز اداں ہوتے ہیں اور ہر شام گزر جاتی ہے فراز
اک روز ہر شام اداس ہوگی اور ہم گزر جائیں گے

طاہرہ یاسمین..... سرگودھا
سہ سیاہ زلف ہر حال میں قیامت ہے
انجھے تو رخسار پر آئے جو سلجھے تو کمر سے جا لجھے
اختر شاہ عارف..... جہلم

ہونٹوں پر مسکان سجائے رکھتا ہوں
اپنے دل کا درد چھپائے رکھتا ہوں
جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
عشق میں جس کے یہ احوال بنا رکھا ہے
اب وہی کہتا ہے اس وضع میں کیا رکھا ہے

محفل شعرو و سخن

نام: _____
پتا: _____

کوین
برائے
شماہ
اگست
2012

بچپن برس کا ایک بھر پور مرد تھا۔

جون نے ایک درمیانے درجے کے تعلیمی ادارے سے درمیانے درجے کی بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک درمیانے درجے کی کمپنی میں درمیانے درجے کا آفیسر بنا۔ یہ اس کے خواب والی نوکری نہیں تھی۔ نوکری کی طرح اس کے پاس کار بھی درمیانے درجے کی تھی۔ بس جون کو دفتر آنے جانے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

البتہ گھر کے معاملے میں قسمت کسی قدر مہربان رہی تھی۔ جون مالکوی عمری لاس اینجلس میں گزری تھی اور اس کے ایک دور کے اکل نے مرتے وقت اپنا ایک ساحلی کابینج اس کے نام کر دیا تھا۔ لاس اینجلس سے صرف بیس کلومیٹر شمال میں ساحلی ہائی وے کے ساتھ ہی مارک بیج نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں یہ چھوٹا سا کابینج پہاڑی کے کنارے اس طرح نکا ہوا تھا کہ اس کے عقبی ٹیرس سے سو فٹ نیچے کا شفاف سمندر صاف دکھائی دیتا تھا اور جب جون کھڑکی سے پردہ ہٹاتا تو سمندر گویا اس کی کھڑکی میں حسین منظر بن کر آ جاتا تھا۔

جون کے ماں باپ اس کے بچپن میں ایک ٹریفک حادثے میں دنیا سے گزر گئے تھے۔ خالہ اور خالو نے جون کو بہت محبت سے پالا تھا اور اس کے احساس محرومی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہ ان ہی کی کوشش تھی کہ جون ایک اچھا انسان بنا۔ مگر ان کے اپنے چار بچے تھے اور وہ سب جون سے چھوٹے تھے اس لیے جیسے ہی اس نے محسوس کیا وہ اپنا بوجھ خود اٹھا سکتا ہے وہ ان کے گھر سے نکل گیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے دوران اس نے بہت سارے کام کیے تھے۔ جب غیر متوقع طور پر اسے یہ کابینج ملا تو اسے موقع ملا کہ وہ سکھ گئے ہنر اس پر آزمائے۔ اس نے عقبی ٹیرس میں خود ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول بنایا۔ پتھروں سے سیڑھیاں بنائیں جو نیچے ساحل کی ریت تک جاتی تھیں۔ کابینج کی مکمل مرمت کی اور اس پر نیا روغن کیا۔ سامنے والے حصے میں خوب صورت سا باغ بنایا اور اپنی گاڑی کے لیے شیڈ تیار کیا۔

جون نے محسوس کیا کہ اس نوکری میں وہ پُر آسائش زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اعلیٰ درجے کی نوکریاں انہیں ملتی تھیں جن کے پاس اعلیٰ درجے کی ڈگریاں ہوتی تھیں اور یہ اعلیٰ درجے کی ڈگریاں بہت مہنگی تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسی ہی ڈگری حاصل کرے گا مگر فیسوں کے ساتھ اسے گزارے کے لیے بھی رقم کی ضرورت تھی اس لیے اس نے تمام غیر ضروری اخراجات ترک کر دیے۔ فی الحال بارز اور

ٹائٹ کلبس کا رخ کرنا ترک کر دیا جن لڑکیوں سے اس کے تعلقات تھے ان کی کالز ریسیو کرنا بند کر دیں۔ کفایت شعاری کے لیے اس نے باہر کھانا ترک کر دیا اور زیادہ تر گھر میں کھانا۔ دفتر جاتے ہوئے اپنا لچ خود بنا کر لے جا رہا تھا۔ اس بچت پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے پاس رقم جمع ہونے لگی۔ تین سال میں وہ تقریباً تیس ہزار ڈالرز بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ چھٹی کے دن وہ آس پاس امرا کے لیے یاغات میں کام کرتا جس سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ مگر ابھی تک مطلوبہ رقم جمع نہیں ہوئی تھی۔ اسے پچاس ہزار ڈالرز کی ضرورت تھی۔ یہ ساری رقم فیس میں جانی اس کے بعد جب وہ ڈگری کے لیے داخلہ لیتا تو اسے نوکری چھوڑنا پڑتی۔ تین سال تک وہ صرف پڑھتا اور اس کے دوران اسے گزارے کے لیے کچھ نہ کچھ رقم درکار ہوتی لیکن اسے اعتماد تھا وہ پارٹ ٹائم کام کر کے اتنی رقم کما لے گا۔ تین سال میں وہ ڈگری حاصل کر لے گا اور اس کے بعد اسے اچھی نوکری مل جائے گی اور پھر وہ اپنے باقی خوابوں کی تعبیر حاصل کر سکے گا۔ مزید بیس ہزار ڈالرز جمع کرنے میں اسے دو سال لگ جاتے۔ مگر اب وہ مزید تاخیر نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کچھ بینکوں سے بات کی، اسے امید تھی کہ اسے لون مل جائے گا جو وہ جاب حاصل کرنے کے بعد بہ آسانی اتار سکے گا۔

اتوار کی صبح جب وہ کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور مالی کے کام کا لباس بھی پہن چکا تھا تو کال بیل بجی۔ اس نے دروازہ کھولا اور سامنے ایک خوب صورت نوجوان اور صورت سے معصوم نظر آنے والی لڑکی کو پایا تو اسے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا۔ کسی لڑکی کا ان دنوں اس کے دروازے پر آنا اس کے خیالوں سے بھی پرے تھا۔ لڑکی نے ایک چھوٹا سا بیگ شانے سے لٹکا رکھا تھا اس نے سنہری رنگ کا مٹی اسکرٹ پہن رکھا تھا جو اس کی ٹانگوں کے سنہری رنگ میں یوں کھل مل رہا تھا کہ پتا نہیں چل رہا تھا، اسکرٹ کہاں ختم ہوا اور ٹانگیں کہاں شروع ہوئیں۔ اوپر سفید رنگ کی مکمل کی شرٹ تھی۔ اس نے اپنے سنہری مائل سرخ بال پونی ٹیل کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ دل کش نقوش، نہایت متناسب جسم اور لمبی ٹانگوں کے ساتھ وہ ان حسین ترین لڑکیوں میں سے ایک تھی جواب تک جون نے دیکھی تھیں۔ لڑکی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی نہایت دلکش تھی۔

”یس...؟“ جون نے کنفیوژ لہجے میں پوچھا۔

”جون مالکوی...؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”یس...؟“ جون نے پھر کہا۔ البتہ اب اس نے اقرار

کیا تھا۔

لڑکی نے اپنا بیگ نیچے رکھا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے گلے لگ گئی۔ اس کے وجود سے نہایت بھیجی سی خوشبو اٹھ رہی تھی اور جون کو خیال آیا کہ یہ اس کے وجود کی اپنی خوشبو ہے۔ لڑکی نے گرم جوش سے کہا۔ ”میں ایلس جوزف ہوں۔“ جون کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے بادل نا خواستہ لڑکی کو خود سے الگ کیا اور بولا۔ ”اچھا تو تم ایلس جوزف ہو۔“

”ہاں میں ایلس جوزف ہوں۔“ لڑکی نے ذرا جھک کر اور نہایت اشتیاق سے کہا جیسے اسے امید ہو کہ اس بار جون خود اسے گلے لگا لے گا۔

جون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی اس طرح تعارف کیوں کر رہی تھی۔ اس نے سر کھجایا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے تم ایلس جوزف ہو۔“

اس بار لڑکی کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے اس بار بجھے سے انداز میں کہا۔ ”جون میں ایلس جوزف ہوں۔“

”میرا خیال ہے تم نے خاصا تعارف کر دیا ہے۔“

جون نے جواب دیا۔ ”آگے کہو۔“

لڑکی کا چہرہ یوں اچانک پھیکا پڑ گیا جیسے پرانے رنگین ٹی وی خرابی کی وجہ سے بلیک اینڈ و ہائٹ ہو جاتے ہیں تو... تم جون مالکوی نہیں ہو؟“

”میں سو فیصد جون مالکوی ہوں۔“

”تب تم مجھے پہچان کیوں نہیں رہے ہو؟“ لڑکی چلا

اٹھی اس سے پہلے وہ بہت دھیمے اور سریلے لہجے میں بات کر رہی تھی، اس لیے اچانک چلائی تو جون گڑبڑا گیا۔ اس نے جلدی سے باہر جھانک کر دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ تمام پڑوسی اپنے گھر میں تھے، کوئی اتنی صبح باہر نہیں آیا تھا۔ مگر ابھی سنا تھا اور ایک خوب صورت لڑکی کو اس کے گھر کے دروازے پر دیکھ کر بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ جون کو محلے میں اپنی ساکھ کی بہت فکر رہتی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ پڑوسی ہی ہوتے ہیں جو بیویوں کو شوہروں کی قبل از شادی کی سرگرمیوں سے آگاہ کر کے ان کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرتے ہیں۔ اس نے جلدی سے ایک طرف ہو کر ایلس کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ ”پلیز، تم اندر آ جاؤ۔“

وہ اندر آ گئی اور خود کچن میں میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ جون نے اس کے سامنے سادہ پانی کا ایک گلاس رکھا جو ایک سانس میں چڑھا گئی۔ ایک منٹ بعد اس کے تاثرات کی قدر نازل نظر آنے لگے تھے، اس نے معذرت

کی۔ ”سوری، میں جذباتی ہو گئی تھی۔“

”میرا خیال ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ جون نے کہا۔ ”اگر تمہیں کسی جون مالکوی سے ملنا ہے تو وہ میں نہیں ہوں۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم مجھے نہیں جانتے؟“ ایلس نے کسی قدر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

جون نے سرد آہ بھری۔ ”کاش کہ یہ جھوٹ ہوتا اور میں تمہیں جانتا لیکن یہ تکلیف دہ سچ ہے کہ میں تمہیں نہیں جانتا۔“ ایلس کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تم جون مالکوی ہو اور مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں تمہیں سچ سچ نہیں جانتا... لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم جون مالکوی کیسے جانتی ہو۔ کیا اس سے ملی ہو؟“

”نہیں میری ہمیشہ اس سے اسکا پ پر بات ہوئی ہے۔“ ایلس بولی۔ ”میں دایوونگ سے آئی ہوں۔“

جون دنگ رہ گیا۔ ”تم تقریباً ایک ہزار میل دور سے آئی ہو اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جون مالکوی کون ہے؟“

”وہ دراصل میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“ ایلس نے ہچکچا کر کہا۔

جون کو اس معصوم لڑکی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ ”اگر تم مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ جون سے تمہاری بات کیسے ہوئی اور یہاں تم نے مجھ تک آنے کی غلطی کیسے کی تو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔“

ایلس کا تعلق دایوونگ کے ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا۔ اس کی عمر ابھی صرف اٹھارہ برس تھی۔ ایک سال پہلے ہائی اسکول پاس کرنے پر اس کے باپ نے اسے آئی فون گفت کیا۔ وہ بہت امیر نہیں تھے۔ ایلس کا باپ ایک گیس اسٹیشن پر کام کرتا تھا۔ اس کے چھ بچے تھے اس لیے بس گزارہ ہوتا تھا۔ ایلس تیسرے نمبر پر تھی اس سے دو بڑے بھائی اٹھارہ سال کے ہوتے ہی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایلس کو اپنے چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں باپ سے محبت تھی۔ وہ انہیں چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس نے باپ کی مدد کے لیے ایک ریسٹوران میں جاب کر لی۔ فارغ وقت میں اس کا مشغلہ اسکا پ پر دوستوں سے چیٹ کرنا تھا۔ ایک دن اسے جونی بوائے کی طرف سے فرینڈز ریکوئسٹ ملی۔ ایلس کو یہ نام اچھا لگا، اس نے جونی بوائے کو ایڈ کر لیا اور پھر اس سے اسکا پ پر بات ہونے لگی۔ وہ اپنی ویڈیو نہیں دیتا تھا، اس کی جگہ اس نے تصویر لگا رکھی تھی۔ وہ باتیں بہت اچھی کرتا تھا، اس کے لہجے میں ایسی محبت اور مٹھاس ہوتی تھی

کہ کوئی لڑکی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی خاص طور سے اگر وہ ایلس جیسی سیدھی سادی لڑکی ہو۔
 جونی بوائے نے اسے یہی بتایا کہ وہ لاس اینجلس کے پاس ایک ساحلی قصبے میں رہتا ہے۔ وہ ایک فرم میں جاب کرتا ہے لیکن اس نے فرم کا نام اور جاب کے بارے میں نہیں بتایا۔ البتہ اس نے اپنا اصل نام بتایا تھا اور یہ نام جونی مانکو تھا۔ اس نے تصویر بھی جونی مانکو کی لگا رکھی تھی۔ دو مہینے تک اس کی ایلس سے بات چیت رہی اور پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اس وقت ایلس کا خیال تھا کہ وہ جونی کو پسند کرتی ہے لیکن اس کے غائب ہونے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی اور اس کے یوں غائب ہونے پر پاگل سی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آئی فون پر اسکا پ ہمد وقت آن رکھتی تھی لیکن کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اگر کوئی اسے کال کرتا تو اس کا جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ بس جونی کا انتظار کرتی تھی۔ اسے مسلسل آف لائن پیج کرتی رہتی تھی۔ مگر وہ نہ تو آن لائن آتا تھا اور نہ ہی کبھی اس کے کسی پیج کا جواب دیتا تھا۔
 ”جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو تم نے کیا کیا...؟“

”میں نے اسے تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔“ ایلس بولی۔
 ”میں اسے تلاش کرتی ہوئی یہاں تک آئی ہوں۔“
 ”لیکن مجھ تک کیسے پہنچیں؟“

وہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ”میں نے جونی مانکو کا نام سرچ کیا تو اسکا پ پر تم سامنے آ گئے۔ تمہاری پروفائل میں سب درج تھا تمہارا نام، پتہ اور گھر کا پتا بھی موجود تھا۔“
 ”اس میں میرا فون نمبر ہے۔“ جونی نے کہا۔ ”تم ایک کال کر کے مجھ سے تصدیق کر لیتیں تو اتنا لمبا سفر کرنے سے بچ جاتیں۔“
 ایلس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے صرف تم سے بات نہیں کرنی تھی بلکہ تم سے ملنا بھی تھا۔“

جونی اب اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا۔ ”میرا خیال ہے مجھ سے اتنی دیر بات کر کے تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں وہ جونی بوائے نہیں ہوں۔ میری آواز یقیناً اس سے مختلف ہے۔“
 ایلس ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ”سچی بات ہے میں ابھی تک کنفیوژ ہوں کیونکہ تمہاری آواز اس سے بہت ملتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ تم ذرا تیز بولتے ہو اور وہ رک رک کر پڑتا اثر انداز میں بات کرتا تھا۔“
 ”وہ جو تصویر لگائی تھی اس نے...“

”وہ ایک لڑکے کی تھی اس نے بعد میں خود بتا دیا تھا کہ تصویر اصل نہیں ہے۔“
 ”کیا اس نے تمہیں کبھی ملاقات کے لیے کہا؟“
 ”ہاں ایک بار کہا تھا اس نے بتایا کہ وہ ورجینیا آئے گا لیکن عین موقع پر اس کا سفر ملتوی ہو گیا۔“
 اگلا سوال کرتے ہوئے جونی ہچکچایا تھا۔ ”اس نے تمہیں اسکا پ پر دیکھنے کی فرمائش کی... میرا مطلب ہے کچھ خاص انداز میں... تم سمجھ رہی ہوتی؟“
 ایلس کا سرخ ہوتا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ رہی ہے۔ اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں اس نے بھی ایسی فرمائش نہیں کی اور کرتا تو میں نہیں مانتی۔“
 ”دو مہینے بعد وہ اچانک غائب ہو گیا؟“
 ”ہاں اس کے بعد سے اس سے ایک بار بھی رابطہ نہیں ہوا ہے۔“

”اس بات کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“
 ”سات مہینے اور بارہ دن ہو گئے ہیں۔“ ایلس نے دن بھی گن رکھے تھے۔ وہ واضح طور پر اس کے ساتھ بہت زیادہ انوالو ہو گئی تھی۔

جونی ایلس کے مسئلے میں ایسا کھویا تھا کہ کام پر جانے کا بھول ہی گیا۔ اچانک اس کے موبائل کی بیل بجی۔ دوسری طرف اس کا ایک کسٹمر تھا، اس نے خفگی سے کہا۔ ”جونی کہاں مر گئے، ہو اب کیا میں سارا دن تمہارے انتظار میں بیٹھا رہوں، وہاں تھیر واولے میری جان کو رو رہے ہوں گے۔“
 یہ ایک تھیرنیر تھا، جونی نے اسے تسلی دی۔ ”بس میں آ رہا ہوں۔“ فون رکھ کر اس نے ایلس کی طرف دیکھا۔ ”ابھی تو میں کام پر جا رہا ہوں واپس آ کر تمہارا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا، یہ بتاؤ کہ تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟“
 ”میں... کہیں نہیں۔ بس سے اتر کر سیدھی یہیں آئی ہوں۔“

جونی نے گہری سانس لی۔ ”او کے اگر تم چاہو تو یہیں ٹھہر سکتی ہو ایک شریف آدمی ہوں اور تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“
 ایلس نے سر ہلایا۔ ”تم کب تک واپس آؤ گے؟“
 ”تقریباً پانچ گھنٹے میں لوٹ آؤں گا، دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا، میرا نمبر ہے تمہارے پاس؟“ جونی نے اسے بیڈروم دکھایا۔ ”تم آرام کر سکتی ہو۔ اگر بھوک لگے تو کچن میں بہت کچھ ہے اور اگر کہیں باہر جانا ہو تو بس دروازہ کھینچ کر لا کر جانا۔“

جونی عجلت میں روانہ ہوا آج ویسے ہی دیر ہو گئی تھی۔ اتوار کے دن لوگ تفریحات کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ یاد دہیر اس کا انتظار نہیں کر سکتے تھے صرف دو لوگ ایسے تھے جنہوں نے اسے چابی دے رکھی تھی اور وہ کسی وقت بھی جا کر ان کے لان میں کام کر سکتا تھا۔ جبکہ تین گھروں میں اسے کمینوں کے ہوتے ہوئے کام کرنا پڑتا تھا وہ پہلے ان کے گھر جاتا تھا۔ ویسے وہ اپنے کام سے لطف اندوز ہوتا تھا اور بہت دل لگا کے کام کرتا تھا لیکن آج وہ الجھا ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کے مسئلے کا کیا حل نکالے اور وہ اسے صاف جواب بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ شروع کے تین گھر نمٹا کر اس نے ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں لچ کیا۔ باقی دو کام نمٹاتے سہ پہر کے تین بج گئے تھے۔

وہ گھر آیا دروازے کا لاک کھولتے ہوئے اسے خیال آیا کہ شاید ایلس جا چکی تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گیا، اس نے ڈرتے ڈرتے بیڈروم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور ایلس کو سوتے پا کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے نہا کر جونی کا ٹائٹ سوٹ پہن لیا تھا اور بے خبر سو گئی۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے گھوم کر میسر میں آ گیا اور وہاں کاؤچ پر لیٹ گیا۔ سمندر کی طرف سے تیز ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی کچھ دیر میں وہ بھی سو گیا تھا۔ پھر ایلس کی چیخ نے اسے بیدار کیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شام ہو رہی تھی اور ایلس باہر آئی تھی۔ ”کیا... کیا ہوا؟“

”وہ میں باہر آئی تو اچانک تمہیں دیکھا۔“ ایلس بولی۔ ”تم ٹھیک سے نظر نہیں آئے تھے اور میں ڈر گئی۔“
 ”میں تھک گیا تھا اس لیے سو گیا۔“ جونی نے کہا۔
 ”تمہارا مکان چھوٹا لیکن بہت خوب صورت ہے۔“
 ”واقعی۔“ جونی خوش ہو گیا۔ ”یہ میسر اور پول میں نے خود بنایا ہے۔ کھڑکیاں دروازے چھینچ کے ہیں اور کمر بھی خود کیا ہے۔“

ایلس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ”یہ سب تم نے خود کیا ہے۔ تم یقیناً باہر کاری گر ہو۔“
 ”ہاں تعلیم کے دوران میں نے اس قسم کے کام بہت کیے تھے میں بہت اچھا گارڈز بھی ہوں۔ اتوار والے دن میں لوگوں کے باغات کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔“
 ”جب تم جاب کرتے ہو تو پھر اتوار والے دن کیوں کام کرتے ہو؟“

جونی اندر آیا، اس نے کچن کی روشنیاں جلا لیں اور فریج کھول کر اندر سے بیئر کا ایک ٹن نکال کر ایلس کی طرف

سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن اس نے انکار میں سر ہلادیا۔ جونی میز پر بیٹھ گیا اور ایلس اس کے سامنے آ گئی۔ وہ دونوں خاموش تھے پھر ایلس نے ہچکچا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے مجھے چلے جانا چاہیے اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہے تمہارا شبہ ختم ہو گیا ہے؟“

ایلس نے گہری سانس لی۔ ”ہاں کیونکہ اتنی دیر میں مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ تم کیسے شخص ہو تم، کسی بھی لڑکی کو اس طرح دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس شخص نے یقیناً تمہاری آڑ لی ہے اور وہ تم سے واقف ہے۔“

جونی سوچ میں پڑ گیا یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جس شخص نے اس کا نام اختیار کر کے ایلس کو دھوکا دیا ہے وہ یقیناً اس سے واقف ہوگا۔ ابھی تو اس نے ایلس کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ ایسا کون سا شخص ہو سکتا ہے۔ اس نے ایلس سے پوچھا۔ ”تم نے اس کے تک نیم سے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”اسکا پ پر کی تھی۔“ وہ بولی۔ ”لیکن اس کی پروفائل میں کچھ بھی نہیں ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہے وہ ایسا شخص ہے جو دوسروں کو دھوکا دیتا رہتا ہے۔“

ایلس نے سر ہلایا۔ ”مجھے لگتا ہے وہ لڑکیوں کے جذبات سے کھیلتا ہے اور جب وہ محسوس کرتا ہے کہ لڑکی اس میں دلچسپی لینے لگی ہے تو وہ غائب ہو جاتا ہے۔“
 ”تب وہ کوئی نفسیاتی مریض ہوا۔ ورنہ اس طرح بغیر کوئی فائدہ اٹھائے صرف کسی کو تکلیف دینا نفسیاتی مریضوں کا کام ہے۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مشکل میں پڑ گیا ہو۔“ ایلس نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ”وہ بیمار ہو گیا ہو یا کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو؟“

”آٹھ مہینے بہت ہوتے ہیں اگر وہ کسی حادثے کا شکار ہوا تھا تب بھی اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔“ جونی نے سوچ کر کہا۔ ”ایک دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے ممکن ہے وہ اب زندہ ہی...“
 ”نہیں پلیز۔“ ایلس نے بے ساختہ کہا۔

جونی نے نظر جما کر اسے دیکھا۔ ”تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟“
 ”ہاں اور اس وقت تک کرتی رہوں گی جب تک مجھے معلوم نہ ہو جائے کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔“
 ”یہ بات نوے فیصد کفر ہے کہ وہ تمہیں دھوکا دے

چکا ہے اب صرف دس فیصد اطمینان باقی رہ گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ تم کس طرح یہ اطمینان حاصل کرو گی۔“

ایلیس نے سنجی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم میری مدد نہیں کر سکتے میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔“

”میں۔“ جون چونکا۔ ”میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔“

”دیکھو اس نے تمہارا نام استعمال کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کہاں رہتے ہو اور کہاں کام کرتے ہو۔“

”یہ بات تو اس کا نپ استعمال کرنے والا ہر شخص جان سکتا ہے۔ میری پروفائل اوپن ہے۔“

”اس نے تمہارا نام ہی کیوں استعمال کیا؟“ ایلیس نے اصرار کیا۔

”ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔“ جون نے کہا۔ ”اس پر بعد میں سوچیں گے پہلے رات کے کھانے کا بندوبست کر لیں۔“

”کھانا تم خود بناتے ہو، میں نے دیکھا یہاں کچن میں سب کچھ موجود ہے۔“

”ہاں میں زیادہ تر گھر میں کھاتا ہوں۔“ اس نے کہا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ بخت کے خیال سے گھر میں پکاتا ہے۔ اس نے فریج سے منجمد چکن نکالی۔ نیچے تازہ سبزیاں موجود تھیں۔ ایلیس کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے جون سے کہا۔

”لاؤ میں بناتی ہوں، میں ریسٹوران میں بھی بناتی ہوں۔“

”تم لگ ہو؟“

”سب تو نہیں لیکن چائیز کھانے اچھے بناتی ہوں جب کوئی گاہک چائیز کی فرمائش کرتا ہے تو میں بناتی ہوں۔“ ایلیس نے چکن سنک میں پکھلنے کے لیے رکھ دی۔ ”تم چائیز پسند کرتے ہو؟“

”بہت شوق سے لیکن مجھے بنانا نہیں آتا۔“ جون نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم بناتی ہو؟“

”بہت اچھا، میرا دعویٰ ہے تم نے ایسا چائیز کبھی نہیں کھایا ہوگا۔“

لیکن ایلیس نے سنبھال لیا اور جون کرسی پر بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہا۔ اس نے تیزی اور نفاست سے کام کیا اور ایک گھنٹے بعد ڈنر میز پر تھا۔ شائشک کے ساتھ اس نے سادہ چاول اور فرانی آلو بھی بنائے تھے۔ جون نے سفید واٹن کی بوتل نکالی۔ ڈنر واقعی لذیذ تھا اور جون نے اس سے پہلے ایسا شائشک نہیں کھایا تھا۔ اس کی تعریف سے ایلیس خوش

ہو گئی۔ ڈنر کے بعد اس نے جون سے کہا۔ ”مجھے امید ہے میری آمد سے تمہیں جو کوفت ہوئی اس کا ازالہ ہو گیا ہوگا۔“

”کیا تم جارہی ہو؟“

”ہاں اس وقت بھی یہاں سے گرے ہاؤنڈ کی بسیں گزرتی ہیں، مجھے امید ہے کوئی نہ کوئی بس مل جائے گی۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

جون ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا تم رات کو رک جاؤ اور صبح چلی جانا۔۔۔ اتنی رات گئے جانا مناسب نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کسی بس میں جگہ مل جائے۔“

”ایسا تو صبح بھی ہو سکتا ہے۔“

”نہیں صبح زیادہ بسیں چلتی ہیں اور جگہ آرام سے مل جاتی ہے۔“ جون نے کہا۔ ”میں ڈیوٹی پر جاتے ہوئے تمہیں خود چھوڑ جاؤں گا۔“

”کیا یہ مناسب ہوگا میں نے تمہیں پہلے ہی پریشان کیا ہے؟“ وہ ہچکچاتی تو جون نے اصرار کیا۔

”ایک رات کی بات ہے میں نشست گاہ میں سو جاؤں گا۔“

وہ مان گئی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جون کا نائٹ سوٹ اسے بڑا تھا پاجامہ نیچے سے موڑنا پڑا تھا اور ہاف آستین اس کے کہنی سے نیچے آ رہی تھی۔ وہ اس لباس میں کسی قدر مضحکہ خیز لیکن دلکش لگ رہی تھی۔ جون نے دو تین بار اسے غور سے دیکھا تو وہ شرمائی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ جون نے کافی تیار کی اور دونوں ٹیرس میں آ بیٹھے۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا خاصی سرد ہو گئی تھی۔ جون نے لکڑیاں جلانے کے لیے جگہ بھی بنائی تھی مگر ابھی اتنی سردی نہیں تھی کہ لکڑیاں جلانے کی ضرورت پیش آتی۔ ایلیس نے کہا۔

”تم مجھے آئیڈیلٹ لگتے ہو۔“

”میں ہوں۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”شاید اس لیے کہ میں نے آئیڈیل لائف نہیں گزاری ہے۔“

”آئیڈیل لائف تو کوئی نہیں گزارتا۔“ ایلیس گھٹنوں پر چہرہ رکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں ایک خواب کے پیچھے نہیں بھاگ رہی ہوں؟“

”یہ بھی آئیڈیل لائف نہ گزارنے کا نتیجہ ہے۔“ جون نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن ابھی تک کر نہیں پایا۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

جون اسے بتانے لگا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مگر اس کے

پاس وسائل نہیں ہیں۔ بات طویل تھی کافی ختم ہوئی تو وہ اندر سے براڈی کی بوتل اور گلاس لے آیا۔ ایلیس ہچکچائی لیکن پھر اس نے گلاس قبول کر لیا۔ بات ختم کرتے کرتے وہ بوتل تقریباً ختم کر چکے تھے۔ ایلیس نے بوجھل ہو جانے والی آنکھیں اٹھائیں۔ ”تم وقت ضائع کر رہے ہو تمہارے پاس پچاس ہزار ڈالر ہیں تم ان سے کچھ کرو، ایسا نہ ہو کہ جب تم ڈگری لیتو تو تمہیں پتا چلے کہ اس ڈگری کی ویلیو ختم ہو چکی ہے۔“

”میں جو ڈگری لے رہا ہوں اس کی ویلیو کبھی ختم نہیں ہوگی۔“ جون نے یقین سے کہا۔

”تب ممکن ہے اس کی اہمیت ختم ہو جائے اور تم جو آمدنی سوچ رہے ہو وہ تمہیں نہ ملے۔“

جون چڑ گیا۔ ”ضروری نہیں ہے کہ آدمی ناکام رہے بہت سارے لوگ جو سوچ کر جدوجہد کرتے ہیں وہ اسے حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ تم بھی تو ایک موہوم سی امید پر ایک ہزار سیل دوڑی آئی ہو۔“

ایلیس کھسیا گئی پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آخر میں وہ رودی جون بوکھلا گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

ایلیس رودی رہی، جون اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب کوشش کرتے کرتے سو گیا تھا۔ ایلیس اس سے پہلے ہی کاؤچ پر سو چکی تھی۔ صبح سورج کی تیز روشنی پھیلی تو جون کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نو بج رہے تھے یعنی دفتر جانے کا وقت گزر چکا تھا۔ ایلیس کاؤچ پر سٹوئی سٹی سو رہی تھی۔ رات خاصی سردی تھی لیکن انہیں نشتے کی زیادتی میں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ پر پانی مارا اور پھر کافی کا پانی رکھ دیا۔ اس نے دفتر فون کر کے طبیعت خرابی کی اطلاع دی اور مزید دو دن دفتر نہ آنے کا اعلان کیا۔ کافی لے کر وہ ایلیس کے پاس آیا جو کاؤچ پر کسمسا رہی تھی۔ اس نے شکر پیے کے ساتھ کافی لے لی۔ ”اتنی صبح ہو گئی پتا ہی نہیں چلا۔“

”ہاں آج میں دفتر نہیں جاسکا۔“

وہ اٹھ بیٹھی۔ ”مجھے بس مل جائے گی؟“

”بس تو مل جائے گی لیکن میرا خیال ہے جب تم یہاں تک آ گئی ہو تو جون مانکو کو تلاش کرنے کی کوشش کرو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اسے کس طرح تلاش کر سکتی ہوں جبکہ میں سوائے نام کے اور کچھ نہیں جانتی۔“

”تم نہیں اسے ہم تلاش کریں گے۔“ جون نے کہا۔ ”یہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔“

ایلیس کا چہرہ دکنے لگا۔ ”تم سچ میری مدد کرو گے؟“

جون نے سر ہلایا۔ ”میں نے تین دن کی چھٹی لے لی ہے اور ہم مل کر جون مانکو کو تلاش کریں گے۔“

ایلیس بارے جوش کے اس کے گلے لگ گئی۔ ”میں تمہارا شکر یہ ادا نہیں کر سکتی۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ جون نے نرمی سے اس کی پشت چھکی۔ ”تم میری مہمان بھی ہو اس لحاظ سے یہ میری ذمہ داری بنتی ہے۔“

”اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ لاس اینجلس کے کسی ساحلی قصبے میں رہتا ہے۔“ جون نے لاس اینجلس کا ساحلی نقشہ نشست گاہ کی میز پر پھیلایا۔ ”لاس اینجلس کے ساحل پر کوئی دو سو قصبے ہیں اور یہ سب شہر سے الگ ہیں۔“

”دو سو قصبے۔“ ایلیس نے فکر مندی سے کہا۔ ”کیا تین دن میں دو سو قصبوں میں جون مانکو نامی شخص کو تلاش کیا جاسکتا ہے؟“

جون کے چہرے پر بھی فکر مندی نظر آئی لیکن پھر اس نے شانے جھٹکے۔ ”کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“

”ہم فون ڈائریکٹری سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔“ ایلیس نے تجویز پیش کی تو جون نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس طرح کامیابی یا ناکامی دونوں مشکوک ہو جائیں گی آج کل لوگوں میں فکس فون لگانے کا رواج بہت کم رہ گیا ہے زیادہ تر لوگوں کے پاس سیل فون ہوتا ہے۔ اگر ہم نے کسی قصبے میں جون مانکو کو پا کر وہاں نہیں دیکھا تو ممکن ہے وہ ہم سے مس ہو جائے۔ اس لیے روایتی طریقہ کار ٹھیک رہے گا۔ ہم ہر قصبے میں جائیں گے اور لوگوں سے پوچھیں گے۔“

ایلیس نے لاس اینجلس کی ساحلی پٹی دیکھی۔ ”یہ سو کلومیٹر لمبی ہے کیا ہم روز واپس گھر آ سکیں گے؟“

”نہیں اتفاق سے مارک بیچ شمال کے آغاز میں ہے اور ہم یہاں سے شروع کریں گے اور جنوب کی طرف سفر کریں گے۔ جہاں رات ہو گی وہیں کسی موٹیل میں رک جائیں گے اور اگلے صبح اس سے آگے سے آغاز کریں گے۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ ایلیس خوش ہو گئی اس نے اپنے پرس سے ہنڈل بنے نوٹ نکالے۔ ”میرے پاس تین سو ڈالر کی رقم ہے امید ہے یہ ٹرپ اتنی رقم میں پورا ہو جائے گا۔“

اس نے جس طرح یہ رقم نکالی تھی صاف ظاہر تھا یہ اس کی تمام جمع پونجی تھی۔ جون نے نوٹ لے کر واپس ایلیس کے پرس میں ڈال دیے۔ ”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن۔۔۔“ ایلیس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن جون نے اسے خاموش کر دیا تھا۔

”اگر ضرورت پڑے گی تو میں تم سے لے لوں گا۔“

ان کے پاس تین دن تھے اس لیے جون نے فوری روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے اپنے چند پیٹھ اور شرٹ کے جوڑے ایک بیگ میں رکھے۔ گاڑی کے عقبی حصے میں بیئر، پانی کی بوتلیں، چپس کے پیکٹ اور چاکلیٹ رکھی۔ احتیاطاً دو کبل بھی رکھ لیے کہ انہیں کہیں رات گھلی جگہ گزارنی ہو تو مشکل نہ ہو۔ ایس اس کی تیاری دیکھ رہی تھی۔ سامان رکھتے ہی وہ روانہ ہو گئے۔ ایس نے کہا۔ ”تمہاری گاڑی اچھی ہے۔“

”ہاں۔“ جون نے بے دلی سے کہا۔ ”لیکن میں نئی اسپورٹس کار چاہتا ہوں۔“

”تم نے اسے بھی بہت اچھا بنا رکھا ہے۔“ ایس نے اصرار کیا۔ ”دیکھنے میں یہ تقریباً نئی نظر آتی ہے۔“

”اچھا۔“ جون کی قدر خوش ہو گیا کیونکہ آج تک کسی نے اس کی کار کی اس طرح تعریف نہیں کی تھی۔

پہلا قصبہ مارک بیچ سے دو کلومیٹر دور تھا۔ جون یہاں آتا رہتا تھا اور لوگ اس سے واقف تھے اس لیے فوراً پتا چل گیا کہ یہاں اس کا کوئی ہم نام نہیں رہتا۔ شام ہونے تک وہ کوئی تیس قصبے کھنگال چکے تھے۔ ایس کو جلدی ہوتی تھی لیکن جون نسلی سے کام کرتا تھا۔ جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ اس نے پوری طرح معلوم کر لیا ہے وہ اگلے قصبے کی طرف نہیں جاتا تھا۔ نو بجے انہوں نے ایک کینے میں کھانا کھایا اور رات میں بارہ بجے چالیسویں قصبے تک پہنچے۔ دونوں تھک گئے تھے اس لیے جون نے یہیں قیام کا فیصلہ کیا۔ اتنی رات گئے کسی سے معلوم کرنا آسان نہیں تھا اس لیے یہ کام صبح پر ملتوی کر کے اس نے ایک موٹیل میں کمرالے لیا۔ اتفاق سے سنگل روم تھا اس لیے ایس اس وقت تک کار میں چھپی رہی جب تک موٹیل کے کلرک نے آکر جون کو کمر انہیں دکھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد جون نے اشارہ کیا اور ایس بھاگ کر کمرے میں گھس آئی۔ اس کا چہرہ مارے ہنسی کے سرخ ہو رہا تھا۔ اندر آتے ہی وہ بلند آواز سے ہنسنے لگی۔ جون نے بوکھلا کر کہا۔

”چپ ہو جاؤ، اس نے سن لیا تو آکر دونوں کو باہر نکال دے گا۔“

ایس خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”بہت مزہ آ رہا ہے، ہم نے کس طرح اسے بیوقوف بنایا ہے۔“

کمرے میں ایک ہی سنگل بیڈ اور ایک چھوٹا صوفہ تھا اس لیے جون کا ریسے کبل لایا اور قالین پر لیٹ گیا۔ اتنی دیر میں ایس سو چکی تھی۔ صبح اچانک ہی صفائی والی میڈ آگئی تو جون نے جلدی سے ایس کو اٹھا کر داش روم میں دھکیل دیا

اور پھر کبل بستر پر رکھ دیا۔ میڈ نے اندر آکر مشکوک نظروں سے کبل کو دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کے جانے کے بعد ایس باہر آئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک ہی لباس لے کر آئی تھی۔ رات اسی میں سوئی تھی۔ جون نے تیار ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک ٹائٹ ڈریس ضروری ہے۔“

اس قصبے سے وہ ناشتا کر کے اور جون مائلو کا پوچھ کر نکل گئے۔ راستے میں ایک سپر اسٹور پر رک کر جون نے ایس کے لیے ایک سوئی پا جامہ اور ہلکی ٹی شرٹ لی، یہ رات کا آرام دہ لباس تھا جو آسانی سے اس کے چھوٹے بیگ میں آگیا۔ اس کی ادائیگی بھی جون نے کی۔ ایس نادام ہو گئی۔ ”تم میرے لیے بہت کر رہے ہو۔“

”ارے نہیں...“ جون نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ”یہ کوئی خاص نہیں ہے۔“

ایس جذباتی ہو گئی۔ ”نہیں تم واقعی بہت کر رہے ہو اور تم نے مجھ سے اس کا صلہ بھی نہیں چاہا۔“

”مجھے کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں ہے، خاص طور سے جو لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔“

”کاش...“ ایس بولتے بولتے رک گئی۔

اس دن بھی انہوں نے کوئی چالیں کے قریب قصبے دیکھے۔ اتفاق سے انہوں نے جس قصبے میں رکنے کا فیصلہ کیا اس میں ایک ہی موٹیل تھا اور اس کے سارے کمرے بک تھے۔ بڑی مشکل سے موٹیل کے مالک نے جون کو اپنی کار موٹیل کی پارکنگ میں کھڑی کرنے کی اجازت دی۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر کسی گاہک نے اعتراض کیا تو اسے کار ہٹانا پڑے گی۔ یہ رات انہوں نے خاصی مشکل سے گزاری تھی۔ ایس تو پچھلی سیٹ پر سسٹریٹ کر لیٹ گئی تھی لیکن جون فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر سوتا رہا تھا۔ صبح بڑی مشکل سے کار سے نکلا تھا۔ ایک ریسٹوران میں جا کر انہوں نے ناشتا کیا اور آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک وہ مزید دو درجن قصبے دیکھ چکے تھے اب تک صرف ایک جگہ انہیں جون مائلو ملا تھا لیکن وہ ایک ستر سال کا نابینا بوڑھا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس کا پ اور انٹرنیٹ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

”آج آخری دن ہے۔“ ایس نے جون سے کہا۔

”یہ جگہ کتنی خوب صورت ہے۔“ جون نے ان سنی کر کے ہائی دے کے ساتھ چلتے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا خیال ہے، ہم کچھ دیر کے لیے یہاں رک جاتے ہیں۔“ جون نے گاڑی ساحل کی طرف موڑ لی۔ ساحل کی سفید ریت سے پہلے بہت ہری مہنگاں تھی جس

میں رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ جون نے ایس کی طرف دیکھا۔ ”تیرا کی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”تم میری بات کا جواب نہیں دے رہے ہو۔“

”اگر تمہیں یہ فکر ہے کہ آج آخری دن ہے اور جون مائلو نہیں ملا ہے تو فکر مت کرو ہم آخر تک جائیں گے اور تمام قصبے دیکھیں گے۔“

”لیکن تم نے تین دن کی چھٹی لی ہے۔“

”چھٹی مزید لی جاسکتی ہے۔“

”اور حباب...“

”جاب گئی بھاڑ میں۔“ جون کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ کار سے اتر کر ساحل کی طرف چل پڑا۔ ایس تیزی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔

”جون میری بات سنو آئی ایم سوری... پلیز ناراض مت ہو... جو تم کہو گے میں وہی کروں گی۔“

جون کا موڈ اچھا ہو گیا۔ ”بس تو ٹھیک ہے ہم یہاں پکنک منائیں گے اور پھر آگے جائیں گے۔“

سمندر کا پانی نہایت شفاف اور کسی قدر سرد تھا۔ جون کو حیرت تھی کہ یہ جگہ لوگوں سے کیسے ہنجی ہوئی تھی ورنہ لاس اینجلس کا ہر اچھا ساحل لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ شاید یہ جگہ شہر سے دور تھی۔ جون نے تیرا کی کے لیے ایس کی طرف دیکھا تو وہ شرماتے ہوئے تیرا کی کے لباس میں آگئی تھی۔ یہاں لہریں کم تھیں کیونکہ آگے ریف کی چٹانیں تھیں اور زیر آب بہت خوب صورت مناظر تھے۔ جون اس کا ہاتھ تھام کر اسے کسی قدر گہرے پانی میں لے گیا اور وہ غوطہ خوری کرنے لگے۔ وہ سانس روک کر کچھ دیر زیر آب تیرتے رہتے اور جب سانس روکنا مشکل ہو جاتا تو باہر آکر دوبارہ سانس لے کر نیچے آ جاتے۔

ایس کو تیرا کی آتی تھی لیکن اس نے کبھی غوطہ خوری نہیں کی تھی اور سمندر میں تیرا کی کا اتفاق بھی کم ہوا تھا۔ اگر جون نہ ہوتا تو وہ غوطہ نہیں لگا سکتی تھی۔ جب وہ تھک گئے تو پانی سے باہر آتے ہوئے بہت خوش تھے۔ ایس یوں خوش تھی کہ اس نے پہلی بار سمندر کے اندر کی خوب صورتی دیکھی تھی، غوطہ لگانے کی سسٹی الگ تھی اور جون اسے دیکھ کر خوش تھا۔ وہ دونوں آتی جاتی لہروں کے ساتھ ساحل پر لیٹ کر سستانے لگے۔

”مزہ آیا؟“ جون نے پوچھا۔

”بہت... لیکن بھوک لگ رہی ہے۔“

یہ حقیقت ہے

غزوہ بدر میں حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو کھوٹوں کھودنے کا مشورہ دیا جسے نبی ﷺ نے پسند فرمایا اور ان کو ”صاب الرائے“ کا لقب ملا تھا۔

+++

نبی کریم ﷺ نے غزوہ خندق میں حضرت زبیر بن العوامؓ کے لیے فرمایا ”میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔“

+++

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو نہ تو نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی اور نہ ہی کسی اور نے بلکہ وہ خود نبی کریم ﷺ میں نبوت کی نشانیاں پا کر مسلمان ہوئے۔

+++

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی گود میں بعض اوقات بی کا بچہ رہتا تھا اسی لیے لوگوں نے ان کو ابو ہریرہ (بی کا باپ) کہنا شروع کیا۔ ان کا اصل نام ایک قول کے مطابق عبد الرحمن بن صخر تھا۔

+++

نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا ”اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔“

+++

ابن رشد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی صرف دو راتیں مطالعے کے بغیر گزریں ایک شادی کی رات اور دوسری موت کی رات۔

+++

مشہور سائنس دان نصیر الدین طوسی 18 برس مسلمانوں کے بدترین اور سفاک دشمن ہلاکو خان کا وزیر رہا تھا۔

+++

بوعلی ابن سینا کی کتاب ”القانون فی الطب“ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی کسی طبی کتاب کا مطالعہ اس قدر نہیں ہوا جتنا اس کا ہوا ہے۔

+++

سلطان شمس الدین اتمش کو اس کے بھائیوں نے بچپن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح باپ سے غیر معمولی محبت کی وجہ سے غلام بنا کر بیچ دیا تھا۔

+++

”ٹھیک ہے لیکن پہلے تیرا کی کا ایک دور اور ہو جائے پھر ہم لٹچ کریں گے۔ میں پڑا اور بیڑ لایا ہوں۔“
ایس نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”یعنی تمہارا پہلے ہی ارادہ تھا؟“

”ہاں تین دن تک اپنی ہی تلاش نے تھکا دیا تھا۔ اب میں نے سوچ لیا تھا کہ آج انجوائے کروں گا اور آرام کروں گا۔“
”تم سچ کچ کام پر...“

جون نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ”اب تم اس بارے میں کوئی بات نہیں کرو گی۔“
”جیسی تمہاری مرضی۔“ ایس مان گئی۔

سارے دن انہوں نے وقفے وقفے سے تیرا کی کی دوسرے دور کے بعد انہوں نے پڑا اور بیڑ سے سچ کیا اور کچھ دیر آرام کیا۔ شام تک وہ تھک گئے تھے اور تیز دھوپ نے سمندری آب و ہوا کے ساتھ مل کر ان کے جسم جلا دیے تھے ان کے پاس سن بلاک لوشن نہیں تھے۔ ایس کی جلد زیادہ نازک تھی اور اسے جلن ہو رہی تھی اس کے باوجود وہ خوش تھی۔ جون نے کہا۔ ”ہم راستے سے جلن مٹانے والا لوشن لے لیں گے۔ تم کل تک ٹھیک ہو جاؤ گی۔“
”پلیز آج کسی موٹیل میں رکنا۔“ ایس نے التجا کی۔
”کار میں سونا بہت مشکل ہے۔“

”اس کے لیے ہمیں جلدی چلنا ہو گا۔“ جون نے کہا۔ ”دیر ہونے کی وجہ سے موٹیل کے سارے کمرے بھر جاتے ہیں۔“

”اس طرح ہم زیادہ قصبے نہیں دیکھ سکیں گے۔“ ایس نے کہا مگر اس کا انداز فکر انگیز نہیں تھا۔

”میں نے کہا نا آج آرام کا دن ہے۔“ جون نے آخری بار سمندر کا رخ کرتے ہوئے کہا تاکہ جسم سے ریت صاف ہو جائے۔ ایس نے اس کا ساتھ دیا اور پھر کار تک آکر انہوں نے کپڑے پہنے۔ ان کے بال کھارے پانی سے الجھے ہوئے تھے۔ انہوں نے راستے میں ایک اسٹور سے جلد کی جلن مٹانے والا لوشن لیا۔ رات ہونے تک وہ ایک موٹیل پہنچ گئے تھے۔ جون نے اس بار ڈبل بیڈ کا روم لیا اور انہوں نے باری باری غسل کر کے کھارے پانی کے اثر سے نجات حاصل کی۔ دوپہر کا کھانا پڑا کب کا ہضم ہو گیا تھا۔ موٹیل میں ڈائننگ روم بھی تھا۔ انہوں نے وہیں ڈنر کیا۔ ایس کا بازو، شانے اور پشت کی کھال زیادہ متاثر ہوئی تھی اور آبلے کی طرح سرخ ہو گئی تھی، اس کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں آکر جون نے اسے لوشن لگایا اور وہ لباس بدل کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ جون نے تکیہ اور کبل لیا اور قالین پر دراز ہو گیا۔ ٹھکن کی وجہ سے وہ دیر تک سوتے رہے۔ پھر ایس نے اسے بیدار کیا۔

”بس اب اٹھ جاؤ۔“
”تم کیسی ہو؟“ جون نے پوچھا تو اس نے اپنا مرمیں بازو آگے کر دیا جس پر سرخی بہت کم رہ گئی تھی۔
”تقریباً ٹھیک ہوں۔“

گزشتہ دن کی تلافی کے لیے جون نے اس دن زیادہ تندہی سے راستے میں آنے والے قصبوں میں جون مالکو کو تلاش کیا۔ سارے دن میں انہیں ایک ہی جون مالکو ملا اور یہ چار سال کا بچہ تھا۔ جب وہ اس قصبے سے روانہ ہوئے تو جون نے مسکرا کر کہا۔ ”لگتا ہے ہمیں مطلوبہ جون مالکو نہیں ملے گا بوڑھے یا بچے ہی ملیں گے۔“

”تیک جون مالکو مل گیا ہے۔“ ایس نے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن وہ مطلوبہ جون مالکو نہیں ہے۔“ جون ہنسا۔
ایس نے جواب نہیں دیا وہ کار کے باہر سے گزرنے والے مناظر دیکھ رہی تھی۔ وہ تین چوتھائی قصبے دیکھ چکے تھے اور اب ایک چوتھائی باقی رہ گئے تھے۔ جون کہہ رہا تھا کہ اگر ان میں بھی جون مالکو نہیں ملا تو...؟

”تو کچھ نہیں۔“ ایس نے اس سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں سمجھوں گی میری تقدیر میں نہیں تھا۔“
”یا ہماری کوشش میں خامی رہ گئی ہو گی۔“

”ایسا مت سوچو کوئی انسان جتنی کوشش کر سکتا ہے تم نے اس سے زیادہ ہی کی ہے۔“ ایس نے اسے تسلی دی۔ ”میں تمہاری احسان مند ہوں تم سے شکایت نہیں ہے۔“

”اس کے لیے میں تمہارا احسان مند ہوں۔“ جون ہنسا۔

اس رات انہیں پھر سنگل روم ملا اور جون نے وہی ترکیب اختیار کی۔ ایس چپکے سے کمرے میں پہنچ گئی۔ ڈنر انہوں نے راستے میں کر لیا تھا۔ جب ایس نہا کر آئی تو جون قالین پر کبل بچھا چکا تھا۔ ایس نے اس سے کہا۔ ”آج نیچے میں سوؤں گی تم بستر پر لیٹ جاؤ۔“

”نہیں بستر پر تم لیٹو اور ویسے بھی قالین پر سونے کا عادی ہوں مگر میں بھی اکثر نشست گاہ کے قالین پر سو جاتا ہوں۔“

اس کے مجبور کرنے پر ایس اوپر لیٹ گئی۔ یہ دن بھی

بہت معروف تھا اور وہ دونوں تھک گئے تھے لیکن انہیں نیند نہیں آرہی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ کل آخری دن تھا۔ اس کے بعد انہیں بچھڑ جانا تھا۔ ایس نے بیڈ کے کنارے اوندھے منہ لیٹ کر پوچھا۔ ”جون تم نے میرے لیے یہ سب کیوں کیا؟... سچ سچ بتانا...“

جون کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”سچ یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا... میری زندگی میں کسی دوسرے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، میری زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے اپنے لیے گزرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں تمہارے لیے گنجائش کیوں نکل آئی۔“

”تم نے کسی سے محبت کی ہے؟“
”ویسی نہیں جیسی تم نے جون مالکو سے کی ہے۔ اس کے لیے سب چھوڑ کر ایک ہزار میل دور چلی آئیں۔“

”پتا نہیں وہ مجھے ملتا بھی ہے یا نہیں...“ ایس کے انداز میں مایوسی تھی۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے میں اسے نہیں پا سکوں گی۔“

”اس کا فیصلہ کل کا دن کرے گا۔“ جون نے اس کی طرف دیکھا۔
ایس نے گہری سانس لی۔ ”ہاں کل فیصلے کا دن ہے، میں اپنی محبت کو حاصل کر لوں گی یا اسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گی۔“

اس رات وہ دونوں ہی دیر سے سوئے تھے۔ لیکن دوسرے کو ایسا جاتے رہے جیسے انہیں نیند آگئی ہے۔ صبح وہ چپ تھے بات کرنا چاہتے تھے لیکن یوں بولتے بولتے رک جاتے جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کیا بات کریں۔ وہ بے دلی سے تیار ہوئے اور ناشتا کر کے قصبے میں نکل آئے۔ اس سے پہلے کہ جون تلاش شروع کرتا اچانک ایس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے جون مالکو نہیں ملے گا اس نے مجھے دھوکا دیا ہے، اس نے سب جھوٹ بولا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے ہمیں اس کی تلاش ترک کر دینی چاہیے؟“

ایس نے سر ہلایا۔ ”ہاں کوئی فائدہ نہیں ہے۔“
”لیکن اب آخری مرحلہ ہے اسے بھی دیکھ لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ آخر تم اتنی دور سے اسے تلاش کرتی آئی ہو۔“
ایس سوچ میں تھی پھر اس نے تذبذب سے کہا۔ ”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں اس کے لیے اب میرے جذبات وہ نہیں رہے ہیں اس لیے اگر وہ مل بھی جائے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور اگر وہ نہ ملا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

خوف

بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”اب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی اور چند دنوں میں زمین کے اندر دبی اشیا باہر نکل آئیں گی۔“
”یا اللہ خیر۔“ دوسرے نے بدحواس ہو کر کہا۔
”میری تین بیویاں زمین میں دبی ہوئی ہیں۔“

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا:

”میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں میں چھپا رکھا ہے، لیکن لوگ انہیں غیر محل تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے نہیں پاتے۔“

☆ عزت کو میں نے شب بے داری میں رکھا ہے مگر لوگ سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمہ حلال میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے لقمہ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ تو تکبر کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔

☆ علم کو میں نے سفر و بھوک میں رکھا ہے لوگ اسے شکم سیری اور کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔

بے بسی

ایک مرتبہ امام شافعیؒ ایک خلیفہ کے پہلو میں تشریف فرما تھے کہ ایک کبھی خلیفہ کو پریشان کرنے لگی اس پر خلیفہ نے تنگ آکر کہا۔ ”نہ جانے اس کبھی کے پیدا کرنے میں خدا نے بزرگ و برتر کی کیا حکمت عملی تھی۔“
امام شافعی نے جواب دیا۔ ”اس میں حکمت یہ ہے کہ طاقتوروں کو ان کی طاقت کی بے بسی دکھائے۔“

مرسلہ: ماہا ایمان..... حافظ آباد

جون اسے دیکھنے لگا۔ ”یہ تمہاری مایوسی ہے یا تمہاری خواہش ہے؟“

”جو تم چاہے سمجھ لو مگر اب میں اسے تلاش نہیں کرنا چاہتی، میں داپس جانا چاہتی ہوں۔“

جون نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے تمہاری مرضی... میں اس معاملے میں دخل نہیں دے سکتا۔ میں تمہاری خواہش پر جون مانگو کو تلاش کر رہا تھا اور اب تمہاری خواہش ہے کہ میں ایسا نہ کروں تو مجھے اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

ایلس افسردہ نظر آنے لگی۔ ”تم مجھے کسی نزدیکی بس اسٹاپ پر اتار دو جہاں سے مجھے دایو منگ جانے والی بس مل جائے۔“

جون نے اسے پیش کش کی۔ ”کیا حرج ہے اگر تم میرے ساتھ چلو، بس تو مارک بیچ سے بھی بہت گزرتی ہیں؟“

ایلس مان گئی اور انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ خاموشی مزید گہری ہو گئی تھی۔ خاصی دیر بعد جون نے کہا۔ ”کیا تمہیں واقعی فرق نہیں پڑتا اگر تمہیں جون مانگو مل جاتا؟“

”ہاں میں اندر سے ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”جب میں نے یہ بات محسوس کر لی تو اس کی تلاش بے کار تھی اب اس کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔“

”اور اگر وہ تم سے اسکا پ یا فون پر رابطہ کرتا ہے تو...؟“

”میں اسے بتا دوں گی کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔“ ایلس اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”پلیز اب کوئی اور بات کرو... تمہارے دفتر سے کوئی فون نہیں آیا؟“

جون نے جیب سے اپنا آئی فون نکالا۔ ”میں نے تین دن پہلے فون بند کر دیا تھا، اب تک بند ہے۔“ اس نے موبائل آن کیا۔ ”کال تو دفتر والوں نے بہت کی ہوں گی۔“

آدھے گھنٹے بعد ہی موبائل نے بیل دی۔ جون نے اسکرین دیکھی اور کراہا۔ ”میرے خبیث باس کا فون ہے اب کوئی بہانہ کرنا پڑے گا۔“

جون نے گاڑی ایک طرف روک کر کال ریسو کی اور بیماری آواز بنا کر بولا۔ ”ہیلو...“

”جون“ میں ریکر ہوں۔ تم تین دن سے کہاں غائب ہو؟“

”مجھے فلو ہو گیا تھا حالت بہت خراب تھی۔ اب جا کر بہتر ہوئی ہے۔“

”تو سیل فون کیوں بند کیا ہوا تھا؟“ وہ برہمی سے بولا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی ڈاکٹر نے مستقل آرام کا کہا تھا۔ اس لیے سیل آف رکھا تھا۔“ جون نے آواز میں مزید نقاہت پیدا کر کے کہا اور اس کی بد قسمتی کہ اسی وقت ایک بڑا ٹریلر پاس سے اپنا بھیا نک ہارن دیتا ہوا گزرا۔

”خوب! تم ہائی وے پر آرام کر رہے ہو۔“ ریکر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”دفتر آتے وقت اس ڈاکٹر سے سر ٹیفکیٹ لیے آنا جس نے تمہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔“

کال کٹ گئی اور جون نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”اس خبیث ڈرائیور کو ہارن دینا ضروری تھا؟“

ایلس پریشان ہو گئی۔ ”کیا تمہارا باس تمہیں جاب سے نکال دے گا۔“

جون نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔“

اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس نے ایلس سے کہہ دیا تھا لیکن اندر سے اسے فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ آج کل ملازمتوں کا بحران چل رہا تھا اور زیادہ کم بختی درمیانے درجے کے افسران کی آتی تھی۔ اگر اسے یہاں سے نکال دیا جاتا تو دوسری ملازمت آسانی سے نہیں ملتی اور اس کا اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کا خواب ادھورا رہ جاتا۔ ایلس اس کے انکار کے باوجود بھانپ گئی تھی، اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

”تم نے نہیں کہا تھا میں نے خود تمہاری مدد کا فیصلہ کیا تھا۔“ جون نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا اور اگر کچھ ہو تو...“

”تو کیا...؟“

”تب دیکھیں گے ابھی سے فکر مند ہونے سے فائدہ۔“ جون بولا۔

مزید آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ مارک بیچ پہنچ گئے تھے۔ بس اسٹاپ پر پہنچ کر پتا چلا کہ دایو منگ کی طرف جانے والی بس شام چار بجے یہاں سے گزرے گی۔ ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ جون خوش ہو گیا۔ ”ابھی چار گھنٹے اور ساتھ رہ سکتے ہیں۔“

”ہاں۔“ ایلس نے مجھے لہجے میں کہا۔

”آج میں تمہیں اپنا بنایا ہوا بیچ کراؤں گا۔“ جون بولا۔

”مجھے یقین ہے تم بہت اچھا پکاتے ہو۔“ ایلس نے خود کو سنبھال لیا۔

وہ گھر آئے۔ لیٹر بکس میں ڈاک کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور

فون مشین میں درجنوں کے حساب سے پیغام موجود تھے اور یہ تقریباً سب ہی دفتر کی جانب۔ سے ڈاک کوئی خاص نہیں تھی سوائے ایک خط کے جو ایک بینک کی طرف سے آیا تھا اور اس میں اطلاع دی گئی تھی کہ بعض وجوہات کی بنا پر اس کی لون کی درخواست مسترد کی جاتی ہے۔ جون نے ایک گہری سانس لے کر ڈاک کا ڈھیر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ خط ایلس نے بھی دیکھ لیا تھا اس نے جون سے کہا۔ ”میں تمہیں پھر مشورہ دوں گی کہ ڈگری کا خیال چھوڑ دو اور ان پچاس ہزار ڈالر ز سے کوئی کام شروع کر دو۔“

”مثلاً کون سا کام؟“

”مثلاً یہی اپنا گھروں کی مرمت اور ری شپ کا کام، تم نے اپنا گھر اتنا اچھا بنالیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تمہیں کام آتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کرو اس میں کام بہت مل جاتا ہے۔ وقت کبھی زیادہ نہیں لگتا اور آمدنی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔“

جون نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے تمہیں اس کام کا تجربہ ہے؟“

”مجھے تجربہ نہیں ہے میرے ایک انکل یہی کام کرتے ہیں۔ وہ میری ماما کے دور کے بھائی ہیں۔ پہلے وہ بھی تمہاری طرح جاب کرتے تھے اور پھر انہوں نے یہ کام شروع کر دیا اور اب وہ اچھا کماتے ہیں۔“ ایلس نے بتایا۔ ”میرا خیال ہے لاس اینجلس میں اس قسم کا کام زیادہ ملے گا۔ یہ بڑا شہر ہے اور شو بزنس کی وجہ سے یہاں لوگوں میں دکھاوا بھی زیادہ ہے۔“

جون نے سر ہلایا۔ ”چلو تم نے میری ایک ٹینشن تو ختم کر دی کہ کل مجھے جاب سے جواب مل گیا تو مجھے آگے کیا کرنا ہوگا۔“

”اگر تمہاری جاب چھوٹ گئی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے؟“

”ان معنوں میں نہیں، میں اتوار والے دن کام کر کے جو کماتا ہوں گزارے کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ مگر میرے مستقبل کے خواب ختم ہو جائیں گے۔“

”مجھے افسوس ہے تمہارا یہ نقصان میری وجہ سے ہوگا۔“

”مجھے تمہارا افسوس ہے۔ یہ زیادہ بڑا دکھ ہے۔“ جون نے خلوص سے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے یہ اس شخص کی بد قسمتی ہے جس نے تم جیسی لڑکی کو دھوکا دیا ہے۔“

”شاید اس کا قصور بھی نہیں ہے۔“ ایلس بولی۔

جون کچن میں آیا وہ کھانا بنانے میں لگ گیا تھا۔ ایلس اس کے ساتھ بیٹھی تھی اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی۔

ایلس نے پرس سے نکال کر سیل فون دیکھا اور اس کی پیشانی پر ٹھنکیں آگئیں۔ وہ جون سے معذرت کرتے ہوئے لاؤنج سے باہر ٹیرس کی طرف نکل گئی۔ جون نے اتنا سا وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ ”تم نے کال کیوں کی اب...“

پھر وہ ٹیرس پر نکل گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ جون نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا لیکن پھر اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ کسی کی فون کال سننے کی کوشش کرے۔ کچھ دیر بعد ایلس اندر آئی تو برہمی اس کے چہرے سے عیاں تھی جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے موبائل پرس میں رکھ دیا اور فریج سے بوتل نکال کر پانی پیا۔ کچھ دیر بعد وہ اعتدال میں آگئی۔ جون نے نہیں پوچھا اس نے خود بتایا۔ ”ایک ایسے شخص کی کال تھی جسے میں اب ناپسند کرتی ہوں۔“

جون نے سر ہلایا اور میز پر برتن رکھنے لگا۔ ”شاید تم نے اسے جھاڑ دیا ہے۔“

”ہاں۔“ ایلس نے گہری سانس لی۔ ”اس نے میرا سر گھما دیا تھا۔ بہر حال لعنت بھیجؤ اس پر مجھے زور سے بھوک لگ رہی ہے۔“

”بس ایک منٹ۔“ جون نے ڈش نکال کر میز پر رکھی۔ انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔ جون نے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”واپس جانے کا۔“

”میرا مطلب ہے واپس جا کر کیا کرو گی؟“

”اپنی جاب۔“ وہ بولی۔ ”میں صبح سے شام چار بجے تک ایک پائی وے ریسٹوران میں کام کرتی ہوں۔ مجھے اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس سے میرے باپ کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔“

”تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچا؟“

”سوچا تھا بھی تو یہاں تک آگئی تھی لیکن...“ وہ چپ ہو گئی۔

کھانے کے بعد ایلس نے برتن سمیٹ کر دھوئے۔ پھر وہ ٹیرس میں آ بیٹھے۔ یہاں دھوپ بھی لیکن سمندر کی طرف سے آتی ہوا دھوپ کے اثر کو زائل کر رہی تھی۔ دو بج گئے تھے دایو منگ کی بس دو گھنٹے بعد وہاں سے گزرتی۔ وہ دونوں کبھی بات کرتے اور کبھی خاموش ہو جاتے۔ کبھی جون ایلس سے کچھ کہتے کہتے رک جاتا تھا اور کبھی ایسا ہی ایلس کے ساتھ ہوتا تھا۔ ایک بار وہ نم آنکھوں کے ساتھ واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ آخر جون نے گھڑی دیکھی اور چونکا۔ ”چار بجنے میں بیس منٹ ہیں۔“

ایلس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ پرس پہلے ہی اس کے

نکاح

تویریا ض

احساسات کی دنیا میں اگر جذبات کی روانی نہ ہو تو سمجھو انسان صرف آتی جاتی سانسوں کی تعداد مکمل کر رہا ہے مگر... اس ایک شخص نے اپنے بے حس معاشرے سے بغاوت کرتے ہوئے ثابت کر دیا کہ اصل زندگی احساسات اور جذبات کے بغیر نامکمل ہے... وہ اپنے گرد پھیلے خوب صورت رشتوں کے حصار میں لطف اندوز ہوتا رہا حتیٰ کہ محبت کی اس ادا کو معاشرے نے غلامی کا نام دے دیا۔

مشرقی معاشرے کی بے رحمی اور رشتوں کی ناقدری کا تکلیف دہ احساس



سیدھا سادا سا انسان ہوں حالانکہ ملازمت کے دوران میں میرے ساتھی مجھے بہت تیز اور ہوشیار سمجھا کرتے تھے جو کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتا اور ہر ایک کو خوش رکھنے کے فن سے واقف ہے لیکن میری نجی زندگی اس کے برعکس ہے۔

میری زندگی غیر متوقع واقعات و حادثات سے بھری پڑی ہے، ان کے بارے میں لکھنے بیٹھوں تو سیکڑوں صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے شاید اس لیے کہ میں بہت معصوم اور

”مجھے ایس میں دلچسپی نہیں تھی بس وقت گزاری کر رہا تھا لیکن کل میں نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تو اسے کال کر دی۔ میری آواز سن کر اس نے اتنی سائیں...“

”اس نے ٹھیک کیا۔“ جون بولا۔ ”اب اگر تم نے اسے کال کی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔“

جون نے فون بند کر دیا پھر اس نے ایک دم کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔ وہ ہر ممکن تیز رفتاری دکھا رہا تھا مگر کار اس کے خیال سے زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی اور اسے شدت سے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر آدھے گھنٹے بعد جب اسے بس دکھائی دی تو اس کا غصہ سرد پڑ گیا تھا اس نے کار کو بس کے پاس لے کر ہارن دیا اور جب ڈرائیور نے نہیں روکی تو اس نے کار بس کے آگے لے جا کر اس کی رفتار کم کرنی شروع کی اور بالآخر کار روک دی۔ بس والا مسلسل ہارن دے رہا تھا۔ وہ نیچے اتر اور بس کے دروازے تک آیا ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا اور اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑا۔

”سوری...“ جون نے ایک لفظ میں اسے نمٹایا اور ایس کی طرف بڑھا جو پہلے ہی اپنی نشست سے کھڑی ہو گئی تھی۔

”جون یہ کیا حرکت ہے؟“

”ایس۔“ جون نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تم سے کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا... جب تم چلی گئیں تو مجھے احساس ہوا مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“

ایس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”سچ کہہ رہے ہو؟“

جون نے سر ہلایا۔ ”سو فیصد سچ... میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

ایس اس کے گلے لگ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد بس کے مسافروں نے تالیاں بجانا شروع کیں تو انہیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے نہیں تھے۔ وہ جھینپ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ جون نے کہا۔ ”میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا۔ میں اپنے معاملات نمٹا کر ایک مہینے کے اندر تمہارے پاس آؤں گا۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ ایس نے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ جون نے اسے پیار کیا اور بس سے اتر گیا۔ بس آگے روانہ ہو گئی لیکن اب یہ جدائی کی روائی نہیں تھی۔ جون نے جاتی بس کی طرف دیکھا، اسے نوکری پسند کی نہیں ملی، مگر بھی ویسا نہیں ملا جیسا وہ چاہتا تھا لیکن گھر والی ویسی مل گئی تھی جیسی وہ چاہتا تھا۔

”تم نے اسے دھوکا دیا...“

”اوہ۔“ جون مالکو کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”تو وہ اب تمہارے پیچھے ہے ورنہ آٹھ مہینے پہلے وہ میرے لیے پاگل ہو رہی تھی۔“

شانے سے لگ رہا تھا۔ وہ دونوں جون کی کار میں بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوئے۔ دس منٹ میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ جون نے کار ایک طرف روک دی اور وہ بس اسٹاپ کے شیڈ تک آ گئے۔ ایس نے جون کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں اپنی زندگی کے یہ چند دن میں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔“

”اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے کام نہیں آ سکا۔“

”لیکن مجھے خوشی ہے تم میرے کام نہیں آ سکتے۔“

ایس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر کبھی واپس آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔“

جون نے سر ہلایا۔ ”میں کوشش کروں گا۔“

کچھ دیر میں واپس آ کر جانے والی بس وہاں آ کر رکی اور ایس جون سے گلے مل کر بس میں سوار ہو گئی۔ بس آگے روانہ ہوئی اور جب تک جون کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی وہ اسے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر کار کی طرف بڑھ گیا۔ اندر بیٹھ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر اس نے ایس کے سیل فون سے لیا تھا جب وہ واش روم گئی تھی۔ اسی نمبر سے اسے کال آئی تھی۔ جون نے یہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا تھا اور ایس کے آنے سے پہلے اس کا سیل فون اسی طرح پرس میں رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔ جون نے سیل کان سے لگایا۔ چند لمحوں بعد ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ جون نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

”جون مانکو...؟“

”بات کر رہا ہوں، تم کون ہو؟“

”جون ابھی تم نے کچھ دیر پہلے ایک لڑکی کو کال کی تھی تم اسے جانتے ہو؟“

”تم ایس کی بات کر رہے ہو۔“ جون مانکو نے شک سے کہا۔ ”لیکن تم کون ہو؟“

”میں کوئی بھی ہوں۔“ جون مانکو کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے ایس سے کیا بات کی ہے؟“

”تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟“ جون کے لہجے پر اس کا انداز بھی جارحانہ ہو گیا۔

”میں اس کا بوائے فرینڈ ہوں۔“

”اوہ۔“ جون مانکو کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”تو وہ اب تمہارے پیچھے ہے ورنہ آٹھ مہینے پہلے وہ میرے لیے پاگل ہو رہی تھی۔“

”تم نے اسے دھوکا دیا...“

”اوہ۔“ جون مانکو کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”تو وہ اب تمہارے پیچھے ہے ورنہ آٹھ مہینے پہلے وہ میرے لیے پاگل ہو رہی تھی۔“

”تم نے اسے دھوکا دیا...“

”اوہ۔“ جون مانکو کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”تو وہ اب تمہارے پیچھے ہے ورنہ آٹھ مہینے پہلے وہ میرے لیے پاگل ہو رہی تھی۔“

لوگ جان گئے ہیں کہ میں کسی کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ میری معصومیت اور سادگی سے فائدہ اٹھا کر میری ہموار زندگی میں ہلچل پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا جب میری بہو نے دنیا جہان کی محبت اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”ڈیڈی! کیا تم میرا ایک کام کر دو گے؟“

”کیوں نہیں؟“ میں نے اپنی حسین اور اسماٹ بہو گلو ریا کے سراپے پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا جو تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود ہمیشہ کی طرح دلکش اور تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مارٹن جیسے گاؤڈی کو یہ پری کہاں سے مل گئی۔

”اگلے دو ہفتوں کے لیے میرا باس شہر سے باہر جا رہا ہے اور اس کا سارا کام مجھے ہی دیکھنا ہوگا اس کے لیے میں ایک گھنٹا پہلے گھر سے نکل جاؤں گی اور واپسی میں بھی دیر ہو سکتی ہے۔“

”تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ بچوں کو اسکول لے جاؤں اور دوپہر میں انہیں واپس بھی لے آؤں؟“

”بالکل ایسی ہی بات ہے۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں کار چلانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ تم بہ آسانی انہیں صبح گھر سے پک کر کے واپسی میں ڈراپ کر سکتے ہو۔ بچے بہت ہوشیار ہیں، تمہیں بالکل تنگ نہیں کریں گے بلکہ وکٹوریہ تو اپنے مسئلے خود ہی حل کر لیتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ چھوٹے بہن بھائی کا بھی خیال رکھے گی۔“

میں اس کی بات سن کر شش و پنج میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ اس بھاگ دوڑ سے بہتر ہے کہ میں بچوں کو اپنے گھر ہی لے آؤں لیکن میں نے بہو کے سامنے اس کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی بچوں کو تھوڑا بہت وقت والدین کے ساتھ بھی گزارنا چاہیے۔ ان کے بہت سے مسئلے وہی حل کر سکتے ہیں۔

”ٹھیک ہے، میں پندرہ دن کے لیے یہ ذمہ داری قبول کر سکتا ہوں۔“ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکوں گا۔“

مجھے ہمیشہ سے ہی یہ تینوں بچے بہت عزیز تھے۔ میری خواہش تھی کہ گلو ریا اور مارٹن بھی ان سے اپنی محبت و شفقت کا اظہار اسی طرح کریں جیسے والدین اپنے بچوں سے کرتے ہیں لیکن وہ اپنی مصروفیات میں اتنے گھرے ہوئے تھے کہ ان کے پاس بچوں سے پیار جتانے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا البتہ موقع بہ موقع وہ بچوں پر چلاتے رہتے تھے۔ یہ کرو

یہ نہ کرو۔ میرے پاس رہنے سے یہ ضرور ہوا کہ بچے اس ڈانٹ ڈپٹ سے آزاد ہو گئے۔ ان کے چہروں پر چھائی خوشی اور اطمینان سے مجھے بھی ایک گونہ سکون ملا۔ میں نے وہ تمام پرانے کھلونے نکال لیے جن سے مارٹن اور اس کی بہن جوئے کھیلا کرتے تھے اور ان کے لیے ڈھیروں بسکٹ، کیک اور ان کے پسندیدہ ڈرنکس لے کر آ گیا۔

آٹھ سالہ وکٹوریہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار تھی اور بعض اوقات ایسی باتیں کر جاتی کہ میں اس کی شکل دیکھتا رہ جاتا، وہ جب بھی میرے ساتھ شطرنج کھیلتی یا تصویری معما حل کرنے بیٹھتی تو میں سوچنے لگتا کہ کیا واقعی یہ مارٹن جیسے نکلے شخص کی بیٹی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں چند دنوں میں ہی اس کی ذہانت کا معترف ہو گیا۔ سات سالہ لیری کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ اس کی پیدائش سے مارٹن کا خاندان مکمل ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں روشن اور چمکدار تھیں اور وہ بھی اپنی بہن کی طرح ذہین تھا۔ البتہ اس کے چہرے سے شوخی اور شرارت نکلتی تھی اور میں نے اسے شاذ و نادر ہی سنجیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ چار سالہ مارکوس حادثاتی طور پر اس دنیا میں آ گیا تھا، میرا مطلب ہے کہ اس کی پیدائش میں والدین کی منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ شاید اسی لیے وہ اسے بری طرح نظر انداز کرتے تھے حالانکہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ توجہ شفقت اور پیار کا مستحق تھا۔ اس کی کمزور حیثیت پر مجھے ترس آتا اور اسی لیے مجھے اس سے زیادہ محبت تھی۔

تینوں بچے مجھے بہت عزیز تھے اور میں چند ہی دنوں میں ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو انہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا لیکن مجبوری تھی۔ گلو ریا کی واپسی شام ساڑھے چھ بجے تک ہوتی تھی اور اس سے پہلے میں بچوں کو ان کے گھر چھوڑنے چلا جاتا اور گلو ریا کے آنے تک ان کے پاس ہی رہتا۔ گلو ریا نے اس معمول پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ ایک طرح سے وہ مطمئن ہی تھی۔ اس کا معیار زندگی اتنا اچھا نہ تھا کہ وہ میری طرح ان بچوں کی ناز برداری کر سکتی۔ میرا بیٹا مارٹن پولیس میں ملازمت کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی کے اوقات انتہائی غیر یقینی تھے۔ ایک بار وہ کام پر چلا جائے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ واپسی کب ہوگی۔ شاید اسی لیے وہ گھر کے معاملات سے بالکل لاتعلقی ہو گیا تھا اور گلو ریا کو ملازمت کے ساتھ ساتھ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ آ گیا تھا۔

دو ہفتے گزر گئے لیکن گلو ریا نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں اسی طرح بچوں کو اسکول لے جانے اور واپس لانے کی ذمہ داری نبھاتا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی جلدی اس معمول کا کیسے عادی ہو گیا یا پھر میں خود بھی اس ذمہ داری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے بچوں کو ان کے گھر سے لیتا اور ساڑھے تین بجے اسکول سے چھٹی ہونے پر انہیں اپنے گھر لے آتا۔ انہیں کھانا کھلاتا اور تین گھنٹے تک ان کے ساتھ کھیلتا رہتا اور پھر ساڑھے چھ بجے انہیں گھر چھوڑ آتا۔ گلو ریا کبھی کبھی کوئی رکی سا جملہ کہہ دیتی مثلاً یہ کہ تم بہت نیک دل انسان ہو یا یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے بغیر میں کیا کرتی، لیکن میں نے بھی اس کے الفاظ میں گرم جوشی محسوس نہیں کی اور نہ ہی اس نے بھی میری ان خدمات کا معاوضہ ادا کرنے کے بارے میں سوچا حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ میری قلیل سی پنشن کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ کمزور تھی اور اسے بھی میری مالی حیثیت کے بارے میں بخوبی اندازہ تھا۔ کیا وہ نہیں جانتی ہوگی کہ ایک مالی نوکوتنی پنشن ملتی ہے۔ غالباً وہ یہی سمجھتی ہوگی کہ میں یہ سب کچھ بچوں سے محبت کی خاطر کر رہا ہوں اور وہ میری اس جذباتی کیفیت سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ میں نے ایک بار اسے اپنی پڑوسن سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ ایسی بات کہہ کر اس کے جذبات مجروح کروں۔ ممکن ہے کہ اسے وہ اپنی بے عزتی سمجھے میں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اگر کبھی اس نے ایسی کوئی پیشکش کی تو اسے قبول نہیں کروں گا۔ واقعی اس میں میری بے عزتی تھی۔“

گوکہ میں نے بھی ان خدمات کو پیسوں کے ترازو میں نہیں تولایا تھا لیکن جانتا تھا کہ زیادہ عرصہ تک یہ اضافی اخراجات برداشت کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوگا۔ جب وکٹوریہ نے مجھے بتایا کہ اس کے اسکول یونیفارم کا بلاؤز تنگ ہو گیا ہے اور اس کے موزے بھی پھٹ گئے ہیں تو میں اسکول سے واپسی پر اسے بازار لے گیا اور اس کے لیے بلاؤز اور دو جوڑی موزے خرید لیے۔ شام کو جب گلو ریا گھر آئی تو میں نے خریداری کی رسید اسے تھماتے ہوئے کہا۔

”وکٹوریہ کو بلاؤز اور موزوں کی ضرورت تھی۔ تم دیر سے گھر آتی ہو۔ لہذا میں نے اس کے لیے دونوں چیزیں خرید لیں۔“

گلو ریا نے وہ رسید مٹھی میں دبائی اور کچن میں چلی گئی۔ میں اسی انتظار میں رہا کہ وہ مجھے رقم کی ادائیگی کرے گی لیکن وہ اپنے لیے کافی بنانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی کا مگ لیے

اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ میں نے کچن میں جا کر دیکھا۔ اس رسید کے کٹڑے ڈسٹ بن میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی لیکن اس واقعے کے بعد محتاط ہو گیا اور اس سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا تاکہ وہ میرے بارے میں کوئی غلط تاثر قائم نہ کرے۔

کبھی کبھی میں حساب لگاتا کہ اس خدمت کے عوض مجھے کتنے اضافی اخراجات برداشت کرنا پڑ رہے ہیں تو میری پریشانی بڑھ جاتی تھی۔ ایک روز میں نے سپر مارکیٹ سے خریدی گئی اشیاء کی تمام رسیدیں نکالیں اور ایک کاغذ پر ان کی تفصیل لکھنا شروع کر دی، پھر میں نے پیپرول کا حساب رکھا۔ ان بچوں کی وجہ سے کیس، بجلی اور پانی کے اخراجات میں جو اضافہ ہوا تھا وہ بھی نوٹ کیا اور جب میں نے ان سب کو جمع کیا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

اس کے باوجود میں نے کبھی گلو ریا کو ان اخراجات کی تفصیل بتانے کے بارے میں نہیں سوچا، ویسے بھی ایک ایک چیز کا حساب رکھنا بہت مشکل تھا۔ میں نے تو شخص ایک اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی اور میرے نزدیک یہ انتہائی گھٹیا بات ہوتی اگر میں اس کا ذکر گلو ریا سے کرتا، ویسے بھی ان اخراجات کی اہمیت اس خوشی کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی جو بچوں نے مجھے دی تھی، جب وہ اسکول میں ہونے والے کھیلوں میں کامیابی حاصل کرتے یا امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تو میرا سینہ فخر سے چوڑا ہو جاتا۔

کچھ ہی دنوں بعد میرے اس چھوٹے سے خاندان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا۔ میری بیٹی جوئے کی شادی ایک اسکول ٹیچر سے ہوئی تھی گوکہ اس کی جاب کے اوقات مناسب تھے لیکن قلیل آمدنی میں گزارہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ لہذا اس نے شام کے اوقات میں بھی ایک جزوقتی ملازمت اختیار کر لی جوئے، بھی اس کے ساتھ ہی جانے لگی۔ اس کی وجہ سے ننھے ولیم کی دیکھ بھال کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ جوئے اور گلو ریا میں ہمیشہ سے ہی رقابت چلی آ رہی تھی اور جوئے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ اس کا بوڑھا باپ اس عمر میں گلو ریا کے بچوں کی خدمت گزاری کرے۔ لہذا جب اس کے شوہر نے تجویز پیش کی کہ ننھے ولیم کو بے بی کیئر سینٹر میں چھوڑ دیا جائے تو جوئے نے اس کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ جب گلو ریا اور مارٹن نے اپنے بچے میرے حوالے کر دیے ہیں تو وہ کیوں اپنے بچے کو بے بی کیئر سینٹر میں بھیجے۔ جوئے نے یہ مسئلہ میرے سامنے رکھا اور بولی کہ میں گلو ریا کے بچوں کے ساتھ ساتھ ولیم کو بھی اسکول سے اپنے ساتھ لے آیا کروں۔

البتہ ولیم ان بچوں کے جانے کے بعد بھی تین چار گھنٹے میرے پاس رہے گا۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور کہا۔ ”تم جانتی ہو کہ اب میں پہلے کی طرح جوان نہیں رہا۔ اس بڑھاپے میں یہ مشقت مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔“

”مارٹن کے بچوں کے ساتھ تو تم بہت خوش رہتے ہو۔ میرے بچے کے لیے تمہارے پیٹ میں درد اٹھ رہا ہے۔ تم نے ہمیشہ مارٹن کو مجھ پر ترجیح دی ہے اور اب بھی تم ایسا ہی کر رہے ہو۔“

جوعے کے طعنے سن کر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ اس طرح ولیم کی ذمہ داری بھی مجھ پر آگئی۔ چند دنوں بعد جوعے کو یاد ہی نہ رہا کہ مجھے اپنے لیے بھی کچھ وقت چاہیے۔ اس نے بھی بھولے سے بھی نہیں کہا کہ ولیم کی وجہ سے میں پابند ہو کر رہ گیا ہوں اور نہ ہی میں نے اسے یاد دلانے کی ضرورت سمجھی۔ میرے دوست مجھے ایک ایسا غلام سمجھتے تھے جس نے دل سے یہ غلامی قبول کی ہو اور اپنے مالکوں سے پورا پورا تعاون کر رہا ہو۔

بچے مجھ سے باتیں کرتے تو مجھے بڑا سکون ملتا لیکن کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو میں سننا نہیں چاہتا تھا یا جن سے مجھے تکلیف ہوتی تھی جب ایک روز لیری نے بتایا کہ گھوڑیا نے گزشتہ شب مارکوس کو پھڑ مارا تھا تو مجھے بے حد صدمہ ہوا لیکن میں بچوں کے سامنے ان کے والدین پر تنقید کرنے کا حامی نہ تھا۔ اس لیے اوپری دل سے کہہ دیا۔ ”اس نے یقیناً ایسی حرکت کی ہوگی جس کی وجہ سے اسے یہ سزا ملی۔“

ویسے بھی میرا تعلق اس نسل سے تھا جس کے نزدیک تھپڑ مارنا تشدد کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ میرے خیال میں بچوں کو سدھارنے کے لیے ان پر تھوڑی بہت سختی ضروری تھی لہذا میں نے گھوڑیا سے بھی پوچھنا ضروری نہ سمجھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے عام زندگی سے ہٹ کر سمجھا جائے۔

ایک دن شام کو گھر جاتے وقت وکٹوریہ نے مجھے بتایا۔ ”گزشتہ رات ڈیڈی گھر نہیں آئے۔“

”پولیس والوں کی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ بعض اوقات کوئی ایسا کیس آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ وقت پر گھر نہیں آسکتے اور پھر گھر میں لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔“

”لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں ہاں، بولو..... رک کیوں گئیں۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ نظریں چراٹے ہوئے بولی لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی خاص بات جانتی ہے جو بتانا نہیں چاہ رہی۔ تین دن گزر گئے۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ

بچے بالکل گم سم سے تھے۔ وہ بے دلی سے کھانا کھاتے اور کسی کھیل میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ میں ان کی اداسی کا سبب جاننا چاہ رہا تھا لہذا پوچھ بیٹھا۔

”کیا اب بھی تمہارے ڈیڈی بہت مصروف ہیں؟“

ان بچوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ اس سوال کا کیا جواب دیا جائے۔

”ہاں۔“ وکٹوریہ بولی۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا اور گزر گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔

”مئی کہتی ہیں کہ انہیں نہیں معلوم، ڈیڈی کب واپس آئیں گے۔“

”ادہ ڈیڈی۔“ میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی تسلی کے لیے کیا کہوں پھر بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں نا تمہارے پاس۔“

”ہاں۔“ لیری نے کہا۔ ”اور ہم جب چاہیں یہاں آکر رہ سکتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔“ میں نے خلوص دل سے کہا۔

مجھے ڈر تھا کہ وکٹوریہ اس بارے میں کچھ نہ کہہ دے۔ شاید اسے لیری کی بات اچھی نہ لگی ہو لہذا میں نے کہا۔ ”فی الحال ہم اس بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ ہی تم لوگ گھر پر اس کا ذکر کرو گے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بہتر ہے کہ ہم اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لیں، ممکن ہے کہ تمہارا باپ کسی مسئلے میں الجھ گیا ہو۔ اس سے فارغ ہوتے ہی وہ گھر آجائے گا۔“

”کیسا مسئلہ؟“ ننھے مارکوس نے پوچھا۔

”تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ منہ بسور کر رہ گیا لیکن اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں، باپ کی جدائی کا درد تو محسوس کر سکتا ہوں۔

میں نے کئی بار سوچا کہ اس مسئلے پر گھوڑیا سے بات کروں لیکن بچوں کے خیال سے خاموش رہا۔ وہ یقیناً یہی سمجھتی کہ بچوں نے مجھ سے کچھ کہا ہے اس طرح ان کی شامت آجاتی لیکن میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ بچوں نے اپنے باپ کے غائب ہونے کا ذکر مجھ سے کر دیا ہے چنانچہ وہ ایک روز کپڑوں سے بھرے دو سوٹ

کیس لے کر میرے پاس چلی آئی اور بولی۔

”ڈیڈی، یہ بچے چند دنوں تک تمہارے پاس رہیں گے۔ میں زیادہ عرصے تک مارٹن کا یہ رویہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ کرنا ہوگا۔ یا تو وہ ان بچوں کا باپ بن کر اپنی ذمہ داری قبول کرے اور دن میں چند گھنٹوں کے لیے گھر آئے یا پھر ہمیشہ کے لیے فلوزی کے پاس چلا جائے جس کے ساتھ وہ اس وقت رہ رہا ہے۔“

میرے خدشات درست ثابت ہوئے، مجھے پہلے سے ہی شک تھا کہ وہ کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا ہے پھر بھی میں نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔ ”آخر اس نے گھر نہ آنے کی کوئی وجہ تو بتائی ہوگی۔ اس کا کوئی خط آیا، کوئی فون کیا؟“

”کچھ نہیں، حالانکہ میں فلوزی کے بارے میں مہینوں سے جانتی ہوں۔“

”اس کے باوجود تم نے یہ بات ظاہر نہیں کی۔ اگر بچے نہ بتاتے تو مجھے بھی معلوم نہ ہوتا۔“

”میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی تم اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فلوزی جیسی عورتیں کسی مرد کو بے آسانی قابو کر سکتی ہیں اور مارٹن تو سدا کا احق ہے۔ اسے بے وقوف بنانا کون سا مشکل کام ہے، بہر حال ان سوٹ کیسوں میں بچوں کے کپڑے ہیں اور زیادہ تر پراسٹری کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں چاہوں گی کہ کسی کو بھی ان بچوں کے لباس میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئے اور نہ ہی اسکول میں اس بارے میں کوئی بات کی جائے۔ امید ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو گے۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور بچوں کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ میرے پاس ان کے گھر کی ایک چابی تھی چنانچہ جب بھی انہیں کسی کپڑے، کیم یا کھلونے کی ضرورت ہوتی، میں انہیں لے کر وہاں چلا جاتا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جا کر حسرت سے تمام چیزوں کو دیکھتے۔ اس امید پر کہ کب انہیں دوبارہ اپنے گھر میں رہنا نصیب ہوگا اور جب واپسی میں دروازہ بند کرتا تو مجھے ان کے چہروں پر اطمینان اور سکون کی جھلک نظر آتی کہ یہ گھر اب ان کا ہے اور وہ کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔

میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ انہیں کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہو۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت تو میں نہیں دے سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا۔ اگر کسی بچے کے لیے موزوں کی ایک جوڑی خریدی تو بقیہ دو کو بھی کچھ نہ لے کر دے دیا تاکہ ان کے دل میں کوئی بات نہ

زاویہ نگاہ

☆ عالم بے عمل کی مثال ایسے ہے کہ جیسے اندھے نے چراغ اٹھایا ہو کہ لوگ اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور خود تاریکی میں رہتا ہے۔

☆ اپنی ضرورتوں کو کم کرو گے تو راحت پاؤ گے۔

☆ قدرت انتقام رکھتے ہوئے غصے کو پی جانا افضل ترین جہاد ہے۔

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے ہم نشین ہیں۔

☆ جب تک تیرا اترا اور غصہ کرنا باقی ہے، اپنے آپ کو اہل علم میں شمار مت کرو۔

مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا (اوکاڑہ)

آئے۔ ان کے اسکول کی تیاری میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں کوئی ایسی بات ہو جس سے بچے پریشان ہو جائیں۔

جب مارکوس پانچ سال کا ہوا تو ڈاک سے ایک لفافہ ملا جس میں پانچ پاؤنڈز کا ایک نوٹ اور برتھ ڈے کارڈ رکھا ہوا تھا اور اس کی پشت پر لکھا تھا ”تمہاری ماما کی طرف سے۔“ وہ اس وقت اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا جو سب جانوروں کی شکل کے تھے۔

”تم بھی میری طرح ہو۔“ میں نے اسے کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی جانوروں سے بہت محبت تھی لیکن وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ اس لیے کھلونے مشکل سے ملتے تھے۔“

”تمہیں سب سے زیادہ کون سا جانور پسند تھا؟“

مارکوس نے معصومیت سے سوال کیا۔

”مجھے کینگر و پسند تھا۔ ہم اسے پیار سے کانگا کہا کرتے تھے۔“

”کیا مجھے بھی کنگرو مل سکتا ہے؟“

”ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔ کسی نہ کسی دکان پر مل ہی جائے گا جہاں پرانی اشیاء فروخت ہوتی ہوں ورنہ میں تمہیں اس سے ملتی جلتی کوئی چیز دلا دوں گا۔“

دوسرے دن ہم مختلف دکانوں پر گئے اور ایک دکان پر ہمیں مطلوبہ شے مل گئی، یہ بات دوسری ہے کہ گھوڑیا کا بھیجا ہوا پانچ پاؤنڈز کا نوٹ اس کی نذر ہو گیا۔ البتہ مجھے اس بات کی خوش تھی کہ میں مارکوس کی معصوم خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اگلی سالگرہ و کنویریہ کی تھی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اس موقع پر گلوں یا اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھیجے گی لیکن ہم سارا دن پوسٹ مین کی آمد کا انتظار ہی کرتے رہے۔ البتہ ایک ہفتہ بعد اس کی جانب سے سالگرہ کا کارڈ موصول ہوا جس کے ساتھ دس پاونڈز کا ایک نوٹ بھی تھا۔ کارڈ کے اندرونی حصے پر میرے لیے ایک پیغام درج تھا۔ ”ڈیڈی! تم جو کچھ کر رہے ہو۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ۔“ وکنویریہ نے وہ پیغام پڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھرا کی ہوئی آواز میں بولی۔ ”گرینڈ پا۔ یہ واقعی تمہارے لیے ہے۔“

اس دوران میں تینوں بچے مجھ سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ وہ میری حقیقی اولاد ہیں۔ وہ میرے ساتھ رہ کر اتنے مطمئن اور خوش تھے کہ اکثر مجھے اپنی بیوی یاد آنے لگتی۔ کاش وہ زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ یہ بچے مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنے بچوں مارٹن اور جوئے سے بہت محبت کرتی تھی لیکن کبھی بھی اس کے ذہن میں اندیشے سراٹھانے لگتے اور وہ کہتی۔ ”دیکھ لیتا۔ ایک دن یہ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“ میں اسے ان بچوں کی مثال دے کر بتاتا کہ ضروری نہیں کہ بچے بھی ماں باپ پر جائیں۔ مارٹن کے بچے اپنے باپ سے بالکل مختلف تھے۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ میری تربیت کا اثر قبول کر رہے تھے۔ میں انہیں جو کچھ سمجھاتا وہ اس پر سنجیدگی سے عمل کرتے۔ میں جب کبھی ان کے ساتھ باہر جاتا تو وہ اپنے دوستوں سے خیر یہ انداز میں میرا تعارف کرواتے۔ ”یہ ہمارے دادا ہیں، ہم انہی کے ساتھ رہتے ہیں۔“ میں جانتا تھا کہ انہوں نے اپنے دل اور ذہن میں مجھے والدین کی جگہ دے رکھی ہے اور اب مجھے ہی اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ جان کر میرے اندر گرم جوش کی لہر ابھرنے لگتی لیکن اس کے ساتھ ہی میں تھوڑا سا فکرمند بھی ہو جاتا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید زیادہ دیر تک میں ان بچوں کی ذمہ داری نہ اٹھا سکوں۔

ایک دن جب سب بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے باپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں گزشتہ آٹھ ماہ سے ان بچوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن مارٹن نے اس پورے عرصے میں ان کی پلٹ کر خبر نہیں لی اور نہ ہی اس دوران اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس بارے میں مجھے مارٹن کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کرنا چاہیے جہاں آخری بار اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔

”کیا میں مارٹن منڈے سے بات کر سکتا ہوں۔“

جواب میں ایک بے زار اور ٹھکی چکی سی آواز سنائی دی۔ ”کس سے؟“ اس نے پلٹ کر سوال کیا۔

”مارٹن منڈے۔ میری معلومات کے مطابق وہ گزشتہ برس اسی پولیس اسٹیشن میں تعینات تھا۔“

”اوہ مارٹن..... میں سمجھ گیا۔“ اس بار اس کا لہجہ خاصا پر جوش تھا۔ ”میں انسپکٹر پلیٹ سے تمہاری بات کروا رہا ہوں۔“

انسپکٹر پلیٹ کے لہجے میں شرمندگی نمایاں تھی۔ اس نے کہا کہ بہت سی باتیں فون پر نہیں کی جاسکتیں اس لیے بہتر ہوگا کہ میں پولیس اسٹیشن پر آ کر اس سے مل لوں۔

اس کی بات سن کر میرا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی کہ وہ مجھے پولیس اسٹیشن بلا رہا تھا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”مجھے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش مت کرو۔ مارٹن میرا بیٹا ہے اور جانتا ہوں کہ اس میں کچھ کمزوریاں ہیں۔ میری عمر بہتر برس ہے اور اب بھی قابل رشک صحت کا مالک ہوں۔ مجھے اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کرنا پڑ رہی ہے اور اس وجہ سے میں دن بھر مصروف رہتا ہوں۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی اگر ٹیلی فون پر ہی اس کے بارے میں بتا دو۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میں نہیں چاہتا تھا کہ ٹیلی فون پر یہ بات کی جائے لیکن تمہارا اصرار ہے تو یونہی سہی۔ مارٹن فی الحال معطل ہے۔ اس کا جرم اس وقت ہمارے علم میں آیا جب وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو گیا تھا۔“

”اس سے کیا جرم سرزد ہو گیا تھا؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”ان دنوں ہماری سراغ رساں ٹیم ہیلی ٹیکس میں ایک ایسے گروہ کے بارے میں تحقیقات کر رہی تھی جس کا تعلق مائنجر کے ایک بڑے اور خطرناک گروہ سے تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ تمہارے بیٹے کا تعلق اس گروہ سے تعلق رکھنے والی عورت سے تھا۔ اس نے اسے پولیس پلان کے حوالے سے معلومات فراہم کر دیں اور اس طرح وہ عورت جو پہلے اس گروہ کے لیے سرورہ بن گئی تھی، اچانک ہی اہمیت اختیار کر گئی۔ اس کے ساتھ ہی تمہارے بیٹے نے دوسرے گروہوں سے بھی رابطے قائم کر لیے۔ جب ہمیں ان معاملات کا علم ہوا تو اسے فوری طور پر ملازمت سے معطل کر دیا گیا۔ یہ ساری کہانی مائنجر کے مقامی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے لیکن دوسرے شہر کے رہنے والوں کو اس بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری زبانی یہ سب کچھ سننے کو مل رہا ہے۔“

”تم سے زیادہ افسوس مجھے ہے کہ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسی باتیں سن رہا ہوں۔“

”میں نے سنا ہے کہ اس کے بچے تمہارے پاس ہیں۔“

”ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔“

”ان بچوں کو اپنے بیٹے سے دور رکھنا۔ اس کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑنا چاہیے۔“

اگر وہ مجھے یہ مشورہ نہ دیتا تب بھی میں ایسا ہی کرتا۔ مارٹن سے جو تھوڑی بہت امید تھی، وہ بھی دم توڑ گئی۔ اب مجھے بیک وقت ان بچوں کے لیے ماں اور باپ کا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں ایک خلش تھی اور میں سوچتا تھا کہ کاش ایسا کوئی معجزہ ہو جائے کہ مارٹن اپنے بچوں کی محبت میں واپس چلا آئے۔ یہ ظاہر ایسا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر پلیٹ کا کہنا تھا کہ وہ مائنجر چلا گیا ہے اور تحقیقاتی ٹیم سے بالکل بھی تعاون نہیں کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی ملازمت کا خاتمہ یقینی ہے۔ جس شخص نے آٹھ ماہ تک اپنے بچوں کی پلٹ کر خبر نہ لی۔ وہ بے روزگار ہونے کے بعد بھلا بچوں کو کیوں پوچھے گا۔

اس واقعے کے بعد میرے دل میں ان بچوں کے لیے ایک نیا احساس پیدا ہو گیا۔ اب تک میں انہیں دادا کی نظر سے دیکھتا تھا اور اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا کہ ماں باپ کی عدم موجودگی میں ان کی دیکھ بھال کروں لیکن اب اس محبت نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ بچے میرا کل اثاثہ ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے میں اپنی اولاد کو بھی بھول گیا تھا۔ اب بیوی کی یادیں بھی میرے گرد گھیرا تنگ نہیں کرتی تھیں۔ وہ بہت ہی پیارے بچے تھے اور وہی کچھ کرتے جس کی میں نے انہیں تربیت دی تھی۔ اپنی بساط بھر گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹاتے۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ ان کے ذہن بہت تیز تھے اور ہر بات ان کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا کہ اس نے بڑھاپے میں مجھے اولاد کی نعمت سے نوازا تھا اور میں ان بچوں کی صورت میں اپنا روٹن مستقبل دیکھ رہا تھا۔

اسکول کی چھٹیاں ہوئیں تو میرا سارا وقت انہی کے ساتھ گزرنے لگا۔ البتہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ پارک میں کرکٹ کھیلتے ضرور جاتے مگر بارش کے موسم میں گھر پر بیٹھ کر ہی مختلف کھیل کھیلتے رہتے۔ وکنویریہ کو شطرنج سے دلچسپی تھی لہذا وہ میری شاگرد بن گئی اور گھنٹوں میرے ساتھ شطرنج کھیلتی رہتی۔ دوسرے بچوں کی طرح

انہیں بھی شاپنگ پر جانے کا شوق تھا اور وہ بہانے بہانے سے مجھے مختلف شاپنگ سینٹرز پر لے جاتے۔ مجھے ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں پوری کر کے خوشی ہوتی۔ ایک روز وہ ضد کر کے میرے ساتھ دہائٹ روز سینٹر گئے اور بڑے شوق سے ہر دکان میں جا کر اپنی دلچسپی کی اشیاء دیکھتے رہے۔ انہوں نے اپنے جیب خرچ سے کافی پیسے بچا کر جمع کر رکھے تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کی چیزیں خرید رہے تھے لیکن یہ ان کی سعادت مندی تھی کہ کچھ بھی خریدنے سے پہلے مجھ سے مشورہ ضرور کرتے، لیری نے سب سے زیادہ خریداری کی تھی اور اس کے لیے وزنی بیگ اٹھا کر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اچانک ہی وہ چلتے چلتے رک گیا اور اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

”ڈیڈی، ڈیڈی!“

اس کی آواز سن کر مجھے بھی رکنا پڑ گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ تینوں ایک فریہ اندام شخص کی جانب لپکے۔ میری آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ مارٹن تھا جو ایک موٹی بھدی عورت کے ساتھ ایک دکان کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ تینوں بچے اس کے گرد کھڑے خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے جیسے انہیں اپنی کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔ میری آنکھیں اس کے بعد کا منظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں۔ جب وہ تینوں بچے اس سے لپٹ جاتے اور وہ ان کی پیشانی گالوں پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دیتا لیکن یہ منظر دیکھنا میری قسمت میں نہ تھا۔ مارٹن گھبرا کر پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔

”مجھے افسوس ہے بچو۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔“

یہ الفاظ پچھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اترے۔ درد کی شدید لہر سینے سے اٹھی جس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا تاکہ بچے میری آنکھوں میں اڈتے آنسو نہ دیکھ سکیں۔ جب سر اٹھایا تو تینوں بچے میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں محبت کے ساتھ خوف بھی جھلک رہا تھا۔ شاید ڈر رہے تھے کہ جس طرح ماں باپ نے انہیں ٹھکرا دیا۔ کہیں میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑ دوں۔ میں نے ان تینوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ بدنصیب تھے کہ ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے لیکن میں اپنے آپ کو خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔ مجھے یہ غلامی بہت عزیز ہے۔ کاش اتنی مہلت مل جائے کہ ان بچوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا دیکھ سکوں۔

ناصر ملک مسافر

قسط نمبر: 5

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زار سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبائے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گلزار سے راہ پر خارتک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

میرے شدید اصرار پر اس کے لبوں سے یہ دقت برآمد ہوا۔ ”شہرے پتر! ہم برباد ہو گئے، ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ پیو، اوئے تیری لاڈلی بہن پروین، گھر سے بھاگ گئی ہے... اپنا اور ہمارا منہ کالا کر گئی ہے... ہائے وے میرے ربا! یہ دن دکھانے سے پہلے مجھے مار کیوں نہ دیا تو نے؟“



یوں لگا جیسے چاچی نے ایک بارگی پگھلا ہوا گرم سیرہ میرے کانوں میں ڈال دیا۔ دماغ پھٹنے لگا تھا۔ آنکھیں بے یقینی کے مارے پھیل سی گئیں اور کمرے میں موجود ہر چیز گھومنے لگی۔

میں نے اپنی پوری قوت سے چاچی کو جھنجھوڑا ڈالا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو چاچی! جانتی بھی ہو..... نہیں..... میری پروین ایسا نہیں کر سکتی..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

چاچی کی حالت پھر غیر ہو گئی۔ ایک ایک کر بولی۔ ”نہیں..... اللہ سوہنا جاتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ ہائے میری بچی! یہ تم نے کیا کر دیا؟“

بجا طور پر اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ میں نے چاچے چراغ اور دوسرے گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے سر کو پوری قوت سے دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نہیں پتا..... کون کدھر گیا ہے، میں نہیں جانتی۔ مجھے تو یہ پتا ہے کہ میرا اس جہان سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے.....“

میں نے اسے چار پائی پر لٹایا اور کمرے سے نکل آیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر میں نے پوری قوت سے چلا کر پروین کو پکارا مگر چاچی نے درست کہا تھا، وہ میری آواز کی پہچان سے کہیں دور جا چکی تھی۔ دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکلا۔ کہاں جانا تھا، کہاں جا رہا تھا، کچھ خبر نہیں تھی۔ جب میں کھالے کے باپ کی دکان پر پہنچا تو چاچا چراغ کو دیکھا جو اسپتال کی جانب سے تیز تیز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر اس کے قریب پہنچا، پوچھا۔ ”چاچا! یہ چاچی کیا کہہ رہی ہے؟“

مجھے چاچا چراغ کی بوڑھی آنکھوں کی غیر معمولی سرخی اور اشکوں سے ترسید ڈاڑھی وہ سب کچھ بتلا گئی جو شاید وہ زبان سے بھی نہ کہہ پاتا۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ کئی ساعتیں عجیب سی، خالی الذہنی کی کیفیت میں گزر گئیں۔ چاچے نے میرے کندھوں پر اپنا استخوانی ہاتھ رکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پتر! ہوش کر..... یہ وقت ہوش کرنے کا ہے۔“

غور دیکھا مگر مجھے کہیں پروین دکھائی نہیں دی۔ میری امید دم توڑ گئی تو میں چارہ کاٹنے والی مشین کا بڑا وہیل دونوں ہاتھوں سے تھام کر جھک گیا۔ اپنے ہاتھوں کی پشت پر سرنگا کر بلند آواز میں رونے لگا۔ انہونی ہو گئی تھی۔ نور پور میں کسی بھی وقت خوف ناک دھماکا ہونے والا تھا۔ پروین نے وہ کیا تھا جو آج تک نور پور میں کسی نے نہیں کیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ میرے ہاتھ بھیگ گئے۔ آنکھیں چھینے لگیں مگر دل میں لگی ہوئی آگ کسی طور بجھتی دکھائی نہیں دی۔ جب میں نے ڈیرے سے نکل کر نور پور کو جانے والی پگڈنڈی پر قدم رکھا، بے اختیار میرے حلق سے چیخ برآمد ہو گئی۔ ”نہیں..... پروین ایسا نہیں کر سکتی..... وہ بھاگی نہیں، اسے کسی نے اغوا کیا ہے..... وہ مر تو سکتی ہے مگر اپنے بھائی کو جیتے جی مار نہیں سکتی..... نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتی!“

مجھے بہ خوبی یاد ہے کہ افسر علی اور بدر دین جو اپنی زمینوں میں کام کر رہے تھے، کے مجھ تک پہنچے تو میں اپنے حواس میں تھا۔ پھر یاد نہیں، کیا ہوا، میں نے کیا کہا اور انہوں نے مجھے کس طرح سنبھالا دیا..... جب مجھے اپنی دہلیز دکھائی دی تو میں نے ایک جھٹکے سے اپنی بائیں ان کی مضبوط گرفت سے چھڑا لیں۔ میرے دروازے کے سامنے گلی میں جھگھٹا لگا ہوا تھا۔ مختلف انواع کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ان دل گیر آوازوں کے پس منظر میں اپنے گھر کی فضا سے اٹھنے والے بین سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو رہے تھے۔ کسی نے کہا۔ ”وہ آگیا ہے شہر! اس سے پوچھو..... شاید اسے کچھ پتا ہو.....“

وہ بھی میرے ارد گرد کھڑے ہو کر مجھ سے پروین کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں باری باری سبھی چہروں کو دیکھ رہا تھا مگر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں دیوانہ بھیڑ کو چیرتا ہوا مجھ تک پہنچا اور میرے بے جان وجود کو دھکیلتا ہوا گھر میں لے آیا۔ اندرون خانہ کا ماحول باہر سے کسی طور پر بھی کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ نور پور کی کم و بیش تمام عورتیں وہاں موجود تھیں جو ایک ہی وقت میں چاچی اور میری پچازاد بہنوں کو دلا سادے رہتی تھیں اور اپنے اپنے انداز میں اس انہونے واقعے پر رائے زنی بھی کر رہی تھیں۔ دیوانہ مجھے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لایا، دروازہ بند کر کے مجھے چار پائی پر بٹھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔ ”شہرے! حوصلہ کر..... مصیبت آئی تھی، سو آچکی۔ اب دانش منہری اور دلیری سے اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ رونے دھونے اور چیخنے چلانے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

میں نے اسے خشکی نظروں سے دیکھا اور بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس قیامت آگئیں گھڑی میں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے کپڑے پھاڑ دوں، ہر دکھائی دینے والی شے کو آگ لگا کر خاکستر کر دوں اور پاگلوں کی طرح دھاڑیں مارتا ہوا نور پور کی گلیوں میں نکل جاؤں۔ دیوانے نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے سہارا دینے کی پوری کوشش کی مگر ہیجان کی طور کم نہ ہوا تو وہ میرے لیے پانی کا گلاس بھر لایا۔ زبردستی پلاتے ہوئے بولا۔ ”عقل کے ناخن لو یا! تمہیں کیوں سمجھ نہیں آتی کہ پروین کسی کے ساتھ بھاگنے والی نہیں تھی۔ اسے کسی بے غیرت انسان نے اغوا کیا ہے یا وہ کسی مصیبت کا شکار ہو گئی ہے۔ تم سبھی لوگ یوں روتے دھوتے رہو گے تو کیا ہوگا؟ اس کے ملنے کے امکانات سرے سے ختم ہو جائیں گے۔“

اس کے لہجے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ کسی خاص بات کی غیر معمولی آمیزش تھی جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا وہ بولا۔ ”شہرے! میں بالکل ٹھیک کہتا ہوں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اتنا بڑا اور انتہائی قدم اٹھاتی اور نہ ہی اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر تھا۔ یہ بات نور پور کا ہر شخص جانتا ہے۔ اول تو وہ اب تک زندہ نہیں بچی ہوگی، اگر خدا کی رحمت سے اس کے بدن میں زندگی کی کوئی رمت باقی ہوئی بھی تو وہ تم لوگوں کی بے وقوفی اور جہالت کی وجہ سے ختم ہو جائے گی۔“

میں نے بے بسی کے عالم میں کہا۔ ”تو بتاناں! میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

مجھے اپنی آواز بجا طور پر اجنبی لگی تھی۔ وہ بولا۔ ”پانی پیو..... اپنے آپ کو یقین دلاؤ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ ہے۔“

میں نے پانی کا ایک اور گلاس حلق میں انڈیلا۔ دیوانے کی باتوں نے مجھے دکھ کی پہلی نچ سے بچھڑکا تھا۔ میں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”دیوانے یا! میری پروین مل جائے گی ناں؟“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، تھوڑا دبایا اور پرتیقن لہجے میں بولا۔ ”ہاں شہرے! مجھے اپنے رب سونے پر پورا بھروسہ ہے۔ کوئی اس کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔“

وہ کھڑا ہوا، مجھے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک گیا اور پوری قوت سے چلا یا۔ ”چاچی! پروین ابھی مری نہیں ہے مگر مرنے والی ہے۔ رونے دھونے اور بین کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ اس لیے آپ سب لوگ ہاتھ

پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے بجائے اسے آس پاس تلاش کریں۔“

دیوانے کی تیز چٹکھڑتی ہوئی آواز نے صحن میں ایک دم سناٹا طاری کر دیا۔ میں اس دوران اس کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ ہرج کی طرح کھیتوں کی طرف گئی ہو اور کسی سانپ یا زہریلے پھوٹنے کاٹ لیا ہو۔ بعض سانپوں کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا اور بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ آپ سب لوگ اسے نور پور کے آس پاس تلاش کریں۔ وہ گھر سے بھاگی نہیں ہے، اتنی بات کی آپ لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آتی؟“

دیوانے کی باتوں سے عورتوں میں غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی۔ سبھی اپنی اپنی چادریں اور دوپٹے سنبھالتی ہوئی وہاں سے کھٹکے لگیں جبکہ میں اور دیوانہ مسجد میں جا کر اعلان کرانے کی غرض سے گھر سے نکل آئے۔ امام مسجد نے فوری طور پر لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا اور نور پور کے سب باسیوں کو حکم دیا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر پروین کو تلاش کریں۔ ایسے ہی وقت میں وریام خان اور حیات خان کا میرے نام بلاوا آ گیا۔ میں نے بے اختیار حیات خان کی حویلی کی طرف قدم بڑھائے۔ دیوانے نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یار شہرے! خان سے جلد جان چھڑا لیتا۔ وہ کچھ کرے گا نہ کرنے دے گا..... ہمیں ابھی تھانے جا کر رپٹ لکھوانی ہے۔“

میں چونکا۔ ”تھانے؟“

”ہاں تو..... تمہاری بہن اغوا ہوئی ہے۔ اغوا کی رپٹ لکھوانی پڑتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس اسے ڈھونڈ نکالے۔“ وہ مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔ انہی باتوں کے دوران ہم حیات خان کے دارے پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں نے چاچا چراغ کو حیات خان کے پہلو میں بیٹھ کر سسکتا ہوا دیکھا تو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ حیات خان اس کی گردن میں بازو حمال کے تسلی دے رہا تھا اور حوصلے کی تلقین کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے پیچھے چلے آنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے چاچا چراغ کو ساتھ لے کر اپنے دارے کے خصوصی کمرے کی طرف چل پڑا۔ عیاں تھا کہ وہ تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

دیوانہ برآمدے میں ہی رک گیا۔ میں اندر چلا گیا۔ حیات خان متفکر انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ”چراغ خان! جتنا کچھ جانتے ہو، بلا کم و کاست مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی راہ نکل آئے۔“

چاہے نے اپنے تہبند کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”خان! ساری عمر کی کمائی کھوہ کھاتے چلی گئی ہے۔ بتانے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ بھرا (بھائی) اور بھرجائی (بھابی) کا دکھ قسمت میں دیکھنا لکھا تھا، دیکھ لیا۔ دو تیسوں کا بھار (وزن) خدا نے مجھ پر لادنا اٹھا لیا۔ یہ بھار میری حیثیت سے بھاری ہے جو قدرت نے میرے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ چار دن کی زندگی اب گزرتی دکھائی نہیں دیتی..... سر جھک گیا ہے۔ دعا کرو کہ زمین جگہ دے دے اور میں لوگوں کی نظروں کے تیروں سے بچ جاؤں۔“

چاہے کی حالت غیر تھی۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وہاں موجود ہونا یا نہ ہونا چاہے کے نزدیک بے معانی تھا۔ حیات خان نے اسے شفقت آمیز انداز میں ڈانٹا۔ ”انسان بن بھرا! یوں سوانیوں (عورتوں) کی طرح دین (بین) کرنے سے دمی نہیں ملے گی۔ مرد کا بچہ بن اور بتا..... تجھے کس بے غیرت پر شبہ ہے؟“

چاہے کے ساتھ ہی میرا سر بھی ایک جھٹکے سے بلند ہوا۔ چاہا بولا۔ ”نہیں خان! مجھے کسی پر شک نہیں ہے۔“

”کڑی اپنے ہاتھ سے خاندان کا منہ کالا نہیں کرتی کسی سے کرواتی ہے۔ کلنگ بھرا ہاتھ منہ پر پھیرنے والا زمین پر دندنا تا پھرے، یہ کہاں لکھا ہوا ہے۔“

اس کے سوال کا ہم دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے استفسار پر چاہا چراغ نے بتایا کہ ہم سب لوگ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ سوئے تو ہوش تک نہیں رہا۔ صبح جب چاچی کی آنکھ کھلی تو اس نے پروین کی چار پائی خالی دیکھی۔ سوچا کہ معمول کے مطابق اٹھتے ہی گھیتوں کی طرف چلی گئی ہوگی۔ دل کو ایک کھٹکا سا لگ گیا کہ وہ سدا اپنی بہنوں کے ساتھ باہر جاتی تھی۔ آج اکیلی کیسے چلی گئی؟ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ ممکن ہے کہ اس نے دونوں کو جگانے کی کوشش کی ہو مگر وہ نیند سے بیدار نہ ہوئی ہوں۔ جب نصف گھنٹا گزر گیا اور وہ بلی نہیں تو چاچی بے چین ہو گئی۔ دونوں بیٹیوں کو جگایا اور انہیں پروین کا پتا کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ کہیں نہ ملی تو چاچی بری طرح گھبرا گئی۔ ننگے پیروں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ معمول کے مطابق جہاں پروین کو جگانا چاہیے تھا، وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے چراغ دین کو جگایا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس قضیے میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ شانو نے پروین کا سامان چیک کیا۔ سوائے پہنے ہوئے لباس اور زور کے، سب کچھ

موجود تھا۔ پر دین گھر میں عمومی طور پر پہنی جانے والی نائیلون کی چپل پہن کر گئی تھی۔ گھر میں کوئی کھٹ پٹ بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی گزشتہ ہفتہ بھر سے اسے کسی نے ڈانٹا تھا۔ ساری تفصیل جاننے کے بعد حیات خان نے باری باری ہم دونوں کو گھورا، ایک ہنکارا بھرا اور کہا۔ ”پھر تم لوگوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے؟“

ہم دونوں سر جھکائے خاموش رہے تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”وہ بچی ہے، نادان ہے۔ اس کا کسی سے کوئی عشق و شوق کا معاملہ بھی نہیں ہے، پھر وہ کیسے کسی کے ساتھ رات کی تاریکی میں نور پور سے باہر جاسکتی ہے؟“

میں نے شکست خوردہ سے انداز میں کہا۔ ”دیوانہ بھی یہی کہتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کیا ہے یا اسے کسی زہریلے کپڑے نے کاٹ لیا ہے۔“

”پہلی بات دل کو لگتی ہے، دوسری نہیں کیونکہ اگر وہ کہیں گری ہوتی تو اب تک اس کا سراغ مل چکا ہوتا۔ نور پور والوں نے فصلوں کا چپا چپا چھان مارا ہے۔“

ایسے ہی وقت میں خاص کمرے کے باہر ہلچل ہوئی۔ ایک دارے دار نے جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”خان جی! باہر پولیس آئی ہے۔“

”نکا تھانیدار آیا ہے یا بڑا؟“

”کریمیاں پاولی آیا ہے جی! اس کے ساتھ دو چار سپاہی (سیاہی) بھی ہیں۔“

”تم گریسے کو اندر بھیج دو، باقی لوگوں کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا کر چام پانی کا بندوبست کرو۔ فٹ!“

چاہے چراغ کی پیشانی عرق آلود تھی۔ حالت بہتر نہیں تھی۔ وہ پولیس والوں کی وردی دیکھ کر ہی سہم جایا کرتا تھا جبکہ آج سامنا ہونے چلا تھا۔ اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ چوڑے چٹکے سینے والا وردی پوش اندر داخل ہوا۔ سیدھا حیات خان کے پاس پہنچا، مؤدبانہ انداز میں مصافحہ کیا اور بولا۔ ”خان جی! تہاڈے پنڈکوں کہیں دشمن دی نظر لگ گئی اے سیں!“

(خان جی! آپ کے گاؤں کو کسی دشمن کی نظر لگ گئی ہے) حیات خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے، بولا۔

”ہا..... ہا..... جڈن دی آسیں، بھونڈا آسیں..... کوئی جادو منتر پڑھ، منٹ مارتے ساڈی دمی رانی کوں گول کڈھنی تاں اسماں مردے ہیں.....“

(ہاں ہاں! جب بھی آتے ہو، بھونکتے ہوئے آتے ہو۔ جادو منتر پھونکو، بہ جلد ہماری بیٹی کو ڈھونڈ نکالو نہیں تو

ہم مر جائیں گے) کریمے پاولی کا اصل نام کریم بخش تھا۔ وہ بہت تیز طرار اور شاطر دماغ شخص تھا۔ دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹتا تھا اور پلو بھی نہیں پکڑنے دیتا تھا۔ اس وقت بھی ملی بنا حیات خان کے سامنے بیٹھا جی، جی کر رہا تھا۔ رکی جائے پانی کے بعد حیات خان اور چاچا چراغ پولیس والوں کی معیت میں مدد ملنے کے لیے روانہ ہوئے جبکہ میں اور دیوانہ حویلی سے نکل کر کھالے کے ویکین اسٹینڈ میں آ کر کھڑے ہو گئے، دیوانہ بولا۔ ”شہر..... تم نے ناشا کیا ہے؟“

”کیا ناشتے کی کسر باقی ہے؟“

وہ بولا۔ ”آؤ، پل کر روٹی کھائیں۔ آتما میں کچھ پڑے تو پر ماتما کی سوچتی ہے۔“

میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم چاہو تو جا کر کھا آؤ۔“

وہ معر نہیں ہوا بلکہ موضوع بدل کر بولا۔ ”کھالا اور امیر نواز دکھائی نہیں دیتے۔ کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟“

کھالے کے غیاب کا علم تھا۔ امیر نواز مجھے گزشتہ شام ملا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ میں نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ کل تو ادھر ہی تھا۔“

”وہ نور پور میں نہیں ہے۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”اگر وہ یہاں ہوتا تو اسے یقینی طور پر اس حادثے کا علم ہو جاتا۔ پھر یہ ممکن ہی کس طرح تھا کہ وہ اب تک تمہیں نہ ملتا؟“

”دیوانے نے پورے دھوکے سے کہا۔“

”شاید شہر چلا گیا ہو، کھا دیا اسپرے لینے کے لیے۔“

اس نے کندھے اچکائے، بولا۔ ”اس صورت میں بھی اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔“

میری عدم رغبت کے باوجود دیوانہ حیات خان کی حویلی میں گیا۔ کارپورج میں جھانک کر واپس آیا، بولا۔ ”شہرے! خان کی دونوں کاریں، ڈالا، ٹریکٹر اور موٹر سائیکل موجود ہیں۔ امیر نواز نور پور سے باہر نہیں گیا۔“

میں نے بیزاری سے کہا۔ ”تو پھر کیا ہوا؟“

دیوانہ منہ سے کچھ نہیں بولا مگر اس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ امیر نواز کی طرف سے مشکوک ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے تشکیک کے تاثرات تو مترشح تھے مگر اپنی کم حیثیت کے سبب منہ سے نہیں بولا تھا، آنکھوں سے بول پڑا تھا۔ اس کی خاموش انگشت نمائی سے میری گردن پر چھوٹیاں سی رہ گئیں۔ امیر نواز، خواہ میرا دوست

تھا خواہ امیر زادہ تھا، جوان مرد تو تھا ہی..... عمر کے اس حصے میں تھا جہاں کسی بھی گھر کی عصمت کو نقب لگا سکتا تھا۔ ایسے میں کئی مختلف اوقات میں امیر نواز کے منہ سے برآمد ہونے والے جملے میرے ذہن میں سانپوں کی طرح کلبلائے گئے۔

”دیکھ شہرے! اپنی بہن کو پڑھاتے رہتا۔ اگر پیسوں کا مسئلہ آڑے آئے تو بے دریغ مجھے کہنا۔“

ایک مرتبہ اس نے کہا تھا۔ ”یار! ان پڑھ عورت بھی کوئی عورت ہوتی ہے، اسے نہ بیٹھنے کا ڈھنگ، نہ چلنے کا سلیقہ..... اس کو دیکھ کر دیکھتے رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ تم لوگ اچھا کر رہے ہو، اپنی لڑکیوں کو پڑھا رہے ہو۔“

مجھے یاد آیا، ایک مرتبہ اس نے پروین کی موجودگی میں کہا تھا۔ ”پروین! پڑھائی کے بغیر انسان جاہل ہوتا ہے، بالکل گدھے کی طرح.....“

پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ وہ ہر عید کے موقع پر پروین کے لیے کچھ نہ کچھ بازار سے خرید لاتا تھا اور کہتا تھا۔ ”اگر اسکول جاتی رہو گی تو ہر عید پر اسی طرح ملنے کے لیے آؤں گا ورنہ کبھی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔“

ایک مرتبہ اس نے کھال کے پختہ کئے پر بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا تھا۔ ”شہرے! جب تمہاری بہن میٹرک کر لے گی تو اسے ہماری ملتان والی کوشی میں چھوڑ دینا تاکہ وہ اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھا سکے۔ میں نے بات کر لی ہے، اس کی پڑھائی اور رہائش پر جتنا خرچ ہوگا، بابا کرے گا، تم فکر نہ کرنا۔“

جو باتیں آج تک امیر نواز کو میری نظر میں سر بلند کرتی تھیں، آج وہ سیم زدہ بڑھی حویلی کی طرح منہدم ہونے لگی تھیں۔ دیوانے کی نظروں کی تیز زنی جاری تھی اور میں سر ہٹا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے مجھے امیر نواز کا محبت بھرا رویہ یاد آتا جا رہا تھا، ویسے ویسے میں تشکیک اور نفرت کی بھینٹ اور اتھاہ کھائی میں گرنا جا رہا تھا۔ میں دیوانے کی پروا کیے بغیر حیات خان کی حویلی میں چلا گیا۔ دارے کے کبھی کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنے لیے مختص کئے گئے کمرے میں بھی موجود نہیں تھا۔ جھجک کو بالائے طاق رکھ کر زنان خانے میں چلا گیا۔ اس کی ماں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی۔ ”صبح کا گیا ہوا ہے، لوٹ کر نہیں آیا۔ تم بتاؤ، دمی پروین کا کچھ پتا چلا؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے کریدنے کی کوشش کی۔ ”چاچی! بتا کر گیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ ”نہیں..... میں اس وقت سو رہی تھی۔ میں نے رات کو نیند والی گولی کھائی تھی۔“

سسپنس ڈائجسٹ 189 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 189 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 189 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 189 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 189 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 189 جولائی 2012ء

”گھر میں کسی کو اس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟“

”شاید کسی کو بتایا ہو.....“ وہ بولتے بولتے چوکی۔ ”مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ خیر تو ہے؟“

میں نے جلدی سے بات بتائی۔ ”خیر ہی تو نہیں ہے چاچی! ہم پر قیامت آن ٹوٹی ہے، اگر وہ نور پور میں ہوتا تو ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کرتا.....“

یہ وہ وقت تھا جب میرے قلب و دماغ میں دکھ، یاس یا دہشت نہیں تھی بلکہ عجیب نوع کی نفرت اور جھمن میرے دل میں بھرنے لگی تھی۔ زنان خانے سے نکل کر دیوانے کے پاس پہنچا اور اسے بتایا کہ گھر میں کسی کو بھی امیر نواز کا علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گیا ہے۔ یہی پتا چلا ہے کہ وہ علی الصباح ہی گھر سے نکل چکا ہے۔

”میں نہ کہتا.....“ دیوانہ بولتے بولتے رک گیا، بات بنا گیا، بولا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ وہ نور پور میں ہوتا تو اس وقت تمہارے ساتھ ہوتا.....“

میرے لہجے میں سانپ کا زہر گھل گیا۔ ”دیوانے! تم جو کہنا چاہتے ہو، کہہ دو۔ میرے اندر ایسی آگ دہک رہی ہے جس کے سامنے کوئی شعلہ، کوئی چنگاری حیثیت نہیں رکھتی۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پروین کے اغوا میں امیر نواز کا ہاتھ ہے؟“

دیوانے کا رنگ فق ہو گیا ہلکا کر بولا۔ ”نہیں..... میں نے یہ تو..... نہیں کہا تم سے!“

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اور دانت بچھنے ہوئے تھے۔ میرے چہرے پر آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بھی پل میں جل کر خاکستر ہو جاؤں گا۔ میں بے ارادہ سر جھکائے چلتے ہوئے بخشو لوہار کی دکان کے چھپرے تلے آن کھڑا ہوا۔ آج پورا نور پور گرم صم اور سنان دکھائی دیتا تھا۔ یوں کہ جیسے کسی آسب نے ڈیرا ڈال دیا ہو۔ تمام دکانوں کی طرح بخشو لوہار کی دکان بھی آج بند تھی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں اور دیوانہ چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، فضا میں تیز نسوانی چیخ گونج اٹھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میں اس آواز کو لاکھوں انسانوں کے شور میں پہچان سکتا تھا۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت اپنی نگاہیں کی طرف دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس، ننگے سر کوئی عورت بجلی کی سی رفتار سے میری نگاہ سے نکل کر بخت خان کی حویلی کی طرف دوڑ گئی۔ وہ ہمیں محض ایک یا دو پل کے لیے دکھائی دی تھی۔

میں اور دیوانہ بھی بے ساختہ اچھل کر اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ میں نے اپنی زندگی کی تمام تر توانائیاں اس چند سو فٹ کی دوڑ پر صرف کر دیں۔

وہ غزالہ بھی جسے میں نے بخت خان کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے تمام لیا۔ وہ سخت خوف اور بخلت کے حصار میں تھی۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”شہرے! پروین کوں خان دا پتر امیر نواز کھن گیا ہے..... میں سچ آدمی ہاں پر کوئی من کیسے راضی ای نہیں.....“

(شہرے! پروین کو خان زادہ امیر نواز کہیں لے گیا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں مگر کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے) میں بھونچکا رہ گیا۔ قدرے بچی آواز میں پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا ہے اس بات کا؟“

وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ گھر کے پچھواڑے جنگل کے پار امیر نواز سے ملنے جایا کرتی تھی۔ کبھی دن میں، کبھی رات کو..... میں نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو ملے دیکھا ہے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”کیا تم یہ بات پہلے نہیں بتا سکتی تھیں؟“

وہ جلدی سے بولی۔ ”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم اس بگڑی کو تلاش کر دو۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگی۔“

کچھ فاصلے پر دیوانہ کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور غزالہ سے پوچھا۔ ”تم پاگلوں کی طرح گلیوں میں کیوں دوڑتی پھرتی ہو؟“

”میں نے چاچے سے کہا تھا کہ پروین کو امیر نواز کہیں لے گیا ہے، اسے تلاش کرو۔ پولیس والے نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ وہ مجھے تھانے لے جائے گا۔ میں ڈر کے مارے بھاگ کر ادھر چاچے بخت خان کی حویلی میں جا رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم حویلی میں جاؤ اور چاچے بخت خان سے بات کرو۔ میں گھر جاتا ہوں۔“ میں نے اسے حویلی کی طرف دھکیلا اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

دیوانہ میرے ہم قدم ہو کر بولا۔ ”کیا بات تھی؟“

اس کے کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی اس لیے میں نے اسے مختصر بتایا اور اسے گلی میں روک کر گھر میں کھس گیا۔ گھر کا منظر ویسا ہی تھا، جیسا چھوڑ کر گیا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور ان کی ملی جلی آوازوں کا شور..... شانوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کمرے میں جانے کا کہا۔ کمرے میں کریم پاولی، حیات

خان اور چاچا چراغ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ میں سلام کر کے چاچے کے پاس چار پائی پر بیٹھ گیا۔ کریم پاولی اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو ہل دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ چاچا! تجھے میں نے تصویر کے دونوں رخ دکھا دیے ہیں۔ اب تو جیسا چاہے، میں ویسا ہی کروں گا۔ کیوں جی سردار صاحب؟“

حیات خان کو گلو کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ پیشانی پر زرد تھی۔ ایک ذرا توقف کے بعد گلا کھنکھار کر بولا۔ ”سیدھی پدھری بات تو یہ ہے کہ میرا پتر ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ غزالہ دھمی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔“

میں نے چونک کر حیات خان کو دیکھا۔ اس کی پریشانی کی وجہ سامنے آگئی تھی۔ اس کی سفید چادر پر دھبہ لگ چکا تھا تبھی اس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ چاچے چراغ کا جھکا ہوا سراٹھا نہیں، بچھنے ہوئے لب و لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ ”سیدھی سینے سے خارج ہوئی اور اس نے کن اکیوں سے میری طرف دیکھا۔“

کریم نے بے مبری سے پوچھا۔ ”تم نے کوئی جواب نہیں دیا چاچا؟“

غیر معمولی تاخیر کے بعد چاچے کی آواز کمرے میں سسکی کی طرح گونجی۔ ”حیات خان اس گھر کا رکھوالا ہے۔ رکھوالے کا پتر ہی سیندھ لگا لے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ میں حیات خان کے پتر کے خلاف پرچا نہیں کھاتا۔ تم سب لوگ چلے جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔“

حیات خان تڑپ کر بولا۔ ”نہیں.....! اگر تمہیں یقین ہے کہ امیر نواز تیرا مجرم ہے تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں مگر تم یہ نہ کہو کہ رکھوالے کے بیٹے نے گھر میں نقب لگائی ہے۔ اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو میری اور تمہاری رگوں میں ہے۔ وہ کسی کو قتل تو کر سکتا ہے، کسی کے ہاتھ پیر توڑ سکتا ہے مگر..... نہیں چراغ دینا..... نہیں! وہ کسی کی ہانہ کا چور نہیں بن سکتا۔“

چاچے کا جھکا ہوا سراٹھا۔ نم گرد بکٹی ہوئی آنکھیں حیات خان کے چہرے پر ٹھہر گئیں، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں لفظ لفظ چبا کر بولا۔ ”خان! تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ میرے تن پر ماس نہیں رہا مگر کیا ہوا..... بچکی ہوئی رگوں میں خون اور خون میں غیرت تو موجود ہے ناں! اگر رب سوہنے نے توفیق دی تو میں اپنے مجرم سے نمٹ لوں گا۔ تم میرے مجرم نہیں ہو..... جاؤ! اپنے پتر کو جتنا بھی چھپانا چاہو، میری نظروں سے چھپا لو۔ جاؤ..... مجھے کوئی پرچا اور چاچا نہیں کھاتا۔“

حیات خان اور کریم پاولی تادیر چاچے کو نرم اور لچھے

دار گفتگو کے بل پر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے پھر اللہ بلیٰ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ میں نے چاچے کے دونوں لرزیدہ ہاتھ تھام لیے، کہا۔ ”چاچا! حوصلہ کرو۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا کہ ہماری ہانہ امیر نواز کے پاس ہے۔ اگر یہ فیصلہ ہو گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

چاچے نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگا۔ اچھا تھا کیونکہ رونے سے اندر کا غبار کم ہو رہا تھا۔ میرے اندر بھی جس بھرا ہوا تھا جس میں زار و قطار رونے سے کچھ کی واقع ہوئی تو میں گھر سے نکل آیا۔ دیوانے کو گلی میں ٹھہرا کر گیا تھا مگر اب وہ گلی میں کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید مایوس ہو کر چلا گیا تھا۔

گھر میں ویرانیاں اپنا تسلط جما چکی تھیں۔ کسی کے حلق سے ایک نوالہ تک نہیں اترتا تھا۔ اگر وہ کسی بیماری یا حادثے میں مر جاتی تو گھر پر صرف دکھ کے سائے چھاتے، ندامت اور پریشانی کی آگ ہر ذہن میں دہک نہ اٹھتی۔ نور پور کی قدیم روایتی بستی میں بیٹی یا بہن کا یوں گھر سے جانا خاندان کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دینے کا سبب بنتا تھا۔ چونکہ آج تک اتنا بڑا قصہ ظہور پذیر نہیں ہوا تھا اس لیے میرے گھر سے اٹھنے والے پہلے شعلے نے آن کی آن میں پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ میری اکلوتی اور لاڈلی بہن تھی۔ اس کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ اسے چھونے والی ہوا غیرت کی سانسوں کو ناگوار گزرتی تھی۔ اب نجانے کس حال میں تھی؟ یہی خیال اپنی سنگین لپیٹ میں ذہن کو دبوچے رہا اور میں شب بھر جاگتا رہا۔ کبھی کمرے میں اس کے استعمال کی چیزوں کو کھنگالتے، کبھی کھوجیوں کی طرح صحن میں ثبت پیروں کے ہزاروں نشانات میں سے اس کا نقش پا کھوجتے اور کبھی دیوانوں کی طرح نور پور کی گلیوں میں اس کی ناکام تلاش میں گھومتے..... دن چڑھ گیا مگر میری غیرت کا ڈوبا ہوا سورج طلوع نہیں ہوا۔ گھر کی تینوں عورتوں نے اپنے دوپٹے اپنے سروں پر کس کر باندھے ہوئے تھے اور دس بجنے تک چولہے میں آگ نہیں جلائی گئی تھی ہمسایہ گھروں سے ناشا پہنچایا گیا جسے ان کے بے حد اصرار پر ہر مار کیا گیا۔ مجھ سے تو ایک روٹی بھی معدے میں اتاری نہیں جاسکتی۔ کم و بیش سب کا حال ایسا ہی تھا۔

دس بجے کے قریب میں گھر سے نکلا۔ کھالے اور امیر نواز کا پتا کیا۔ دونوں غائب تھے۔ دیوانے کے گھر وندے پر جا کر کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، اس کی ہمدردی آمیز باتوں کا ہوں، ہاں! میں جواب دیتے ہوئے من میں جلتی

ہوئی آگ کو چھڑتا رہا جو دم بہ دم بجھنے کے بجائے بھڑکتی جا رہی تھی۔ دو پہر تک میں دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پروین یا تو اپنی رضامندی کے ساتھ امیر نواز کے ساتھ چلی گئی تھی یا پھر امیر نواز نے اسے کسی طریقے سے اغوا کر لیا تھا۔ مجھے کچھ تحفظات کا غیر یقینی احساس ہوا بھرے پُربے گھر میں اتنی خاموشی اور دیدہ دلیری سے جوان لڑکی کو اغوا کیا جانا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ یقینی طور پر کمرے سے یا گھر سے اپنے پیروں پر چل کر نکلی تھی۔ محن میں یا مکی میں اس کے ساتھ غیر متوقع حالات پیش آئے تھے۔

کوئی بھی ایسے حالات رونما نہیں ہوئے تھے جن کے پیش نظر وہ گھر سے چوری چھپے رات کی تاریکی میں ہمیشہ کے لیے جانے کا فیصلہ کرتی۔ میں اسے بے پناہ چاہتا تھا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ چاچا اور چاچی بھی اس کی بات کو رد نہیں کرتے تھے۔ اسے اتنا اعتماد حاصل تھا کہ اگر وہ امیر نواز سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو کہہ دیتی اور ہم سب مان جاتے۔ امیر نواز نہ تو غیر برادری سے تعلق رکھتا تھا، نہ ہی اوپاش فطرت اور مفلس تھا اور نہ ہی ہمارے درمیان دشمنی کی بیج حاصل تھی۔ اگر دیانت داری کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ حقیقت تھی کہ اگر سردار حیات خان اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگتا تو ہم بخوشی اسے ہانہ تھما دیتے۔

ہزار دوستی اور تعلقات کے باوجود امیر نواز بخوبی سمجھتا تھا کہ پروین پر میلے ہاتھ تو کجا، میلی نظر بھی ڈالے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے بھی چوری چھپے پروین کو بھگا لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب اس کی پوزیشن اور کردار کو ذہن میں کھنگالا جاتا تو دل اس کی طرف سے تشکیک زدہ ہو جاتا۔ اگر اس کا پروین کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ غائب کیوں تھا؟ کہاں چلا گیا تھا؟

بہر حال یہ طے تھا کہ طویل عرصے سے دونوں چوری چھپے ملتے چلتے آ رہے تھے۔ غزالہ ان کی ہم راز تھی۔ پروین اسے اپنے دل کی بات بتا دیا کرتی تھی۔ غزالہ کی حالت زار بہت ابتر تھی۔ گھر میں ہر کوئی اسے مورد الزام ٹھہرا رہا تھا اور لعن طعن کر رہا تھا۔ میں نے بہ دقت تمام اس سے پروین اور امیر نواز کے مابین تعلقات کی نوعیت دریافت کی تھی۔ اس کی سنائی ہوئی روداد کے مطابق دو سال پہلے امیر نواز نے اسے پہلی مرتبہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ پروین نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی جس سے شہہ پا کر امیر نواز نے ایک خط اسے لکھا۔ پروین نے یہ خط غزالہ کو پڑھایا تھا۔ پھر دونوں اطراف سے خطوط کا سلسلہ چل نکلا۔ امیر نواز ہر صبح اسکول

کے راستے میں اسے دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے سے موجود ہوا کرتا تھا۔ خطوں کے تبادلے کے نتیجے میں دونوں چوری چھپے ملنے لگے مگر ان کے درمیان دیوانگی آمیز اور بے سرو پا باتوں کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان کی چاہت زبانی اظہار تک محدود تھی اور غزالہ کے بقول دونوں نے اپنی اخلاقی حدود کو کبھی عبور نہیں کیا تھا۔

میں نے پروین کو ہمیشہ ہنسی سمجھا تھا۔ وہ پوری قامت کے ساتھ اس طرح میری نظروں کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی کہ میری نظر میں دنیا کی تمام قاتلیں بے اعتبار ہو کر رہ گئی تھیں۔ امیر نواز کے بارے میں میں نے بھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ اس کی عیاشیاں دیکھی تھیں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنا ماس کھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شاہ جی اور سردار بخت خان کی سونیاں پروین کے اغوا پر انکی ہوئی تھیں۔ وہ امیر نواز کو اتنا گھٹیا اور بد قماش فطرت سمجھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ خود نش و پنج کا شکار تھے اور میری رہنمائی کرنے سے معذور دکھائی دیتے تھے۔ پولیس والے بے نیل مرام گئے تھے۔ کریماں پادلی یا کوئی بھی اہل کار دوبارہ نور پور میں دکھائی نہیں دیا تھا چونکہ سردار حیات خان کے بیٹے کا نام اس واقعے سے منسلک ہو چکا تھا، اس لیے جو بھی ہوتا، وہ ہمارا ساتھ نہ دیتے۔ اب تو انہیں بڑا مضبوط جواز مل گیا تھا کہ ہم نے پرچا کٹوانے اور قانونی کارروائی کر دانے سے بالکل انکار کر دیا تھا البتہ سردار حیات متفکر تھا۔ وہ اس آگ کی پیش اور طاقت کو بخوبی جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کی زندگی شدید خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ اگر گھر پہنچنے سے قبل مجھے یا چاچے چراغ کو دکھائی دے جاتا تو اس کا زندہ بچنا محال تھا۔

مرگ کی چٹائی دو تین دنوں بعد سمیٹ لی جاتی ہے۔ غیرت کے جنازے پر کبھی مٹی نہیں ڈالی جاتی بلکہ کرید کرید کر شعلوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ میرے گھر کی صورت حال بالکل ایسی ہی تھی۔ اس عزت پاش واقعے کو گزرے تین روز ہو گئے مگر نہ تو پروین اور امیر نواز کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی آہ و بکا اور سسکیوں کو قنار آ یا۔ بات نور پور سے نکل کر اطراف کے دیہاتوں میں پھیل گئی تھی اور چاچے اور چاچی کے ملنے والوں کی آمد کا ناگوار سلسلہ چل نکلا۔ لوگوں کی ہمدردی بھرے جملے تیز نشتر بن کر دل و دماغ کو چھلنی کر کے رکھ دیتے مگر زبان دانتوں میں رکھ کر سیکڑوں سننا پڑتیں اور یقین دلاتا پڑتا کہ وہ گھر سے بھاگی نہیں بلکہ کسی بے غیرت دشمن نے اسے اغوا کیا ہے۔ سردار حیات اور ہمارے گھر میں دشمنی کے

مسافر

واضح اثرات نمودار ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ بات چیت کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ سردار بخت خان، امان اللہ قریشی اور سائیں دل جیت شاہ افسوس کرنے کے لیے آئے تھے مگر دریام خان اور حیات خان نے دوبارہ ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

جمعہ کے روز، جب سبھی دکانیں بند تھیں اور میں بخشو لوہار کی دکان کے باہر دھرے ہوئے ہمارے پر پہلو کے مل نیم دراز تھا، میری نظروں کے عین سامنے سفید رنگ کی ہنڈا اکارڈ آن رکی۔ میں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں کار سے شناسائی کی ایک موہوم سی رمت جاگی مگر جو نبی پچھلا گیٹ کھلا اور میرو شاہ کی شکل دکھائی دی، فوراً یاد آ گیا کہ میں اس کار میں بیٹھ کر میڈم ٹیلیف کی کوٹھی سے نکلا تھا اور لاری اڈے پر گیا تھا۔

چونکہ گزشتہ ایام میں میرے ذہن پر ہمہ وقت پروین بھائی رہی تھی اس لیے مجھے میڈم ایک ہل کو بھی یاد نہیں آئی تھی۔ میڈم کی دی ہوئی خطیر رقم میرے ٹرنک میں جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ جو نبی میرو شاہ کی شکل دکھائی دی، مجھے ملتان میں بیٹے ہوئے پُر عذاب لمحات یاد آ گئے۔ میں چار پائی سے اترا اور ہانہیں کھولے اپنی جانب آتے میرو شاہ سے لپٹ گیا۔ اب تک شاید کوئی ٹنگسار نہیں ملا تھا، اس لیے اس سے گلے ملتے ہی آنسو چھلک پڑے اور میں ہلکے ہلکے کر رونے لگا۔ میرو شاہ گھبرا گیا۔ مجھے خود سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر میری گرفت سے لکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”اڑے غنچے! بولے بھی تو..... کس نے تیرے پر ہاتھ ڈالا، جیادتی (زیادتی) کی..... قسم ماڑے کو اپنی ماں کی، خون کر دیوے ہے اس کم جات (کم ذات) کا..... پر تو بولے بھی تو سہی ناں!“

میرے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ نہ میرا رونا تھمتا ہے، نہ ہی میں کچھ بتاتا ہوں تو اس نے ڈرائیور کو بلا لیا۔ دونوں نے مل کر مجھے کار کی پچھلی سیٹ پر دھکیلا اور غیر معمولی مستعدی سے کار موڑ لی۔ مجھے پروا نہیں تھی کہ وہ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے، جانا چاہیے یا نہیں..... میں تو بس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گرد و پیش سے لائق تھا۔ قریشی موڑ سے نکلتے ہی کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ مظفر گڑھ کے قریب ایک جگہ پر میرو شاہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”ماڑے مٹھو! ادھر ایک جانب کو اڑن کھنولا روک دیوے ہے۔ یہاں سنگتزر آ رہے ہیں ماڑے فون پر..... ہاں ادھر ہی روک ناں!“

میں چونکا۔ شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ ہم مظفر گڑھ شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور مضافاتی آبادی کے بکھرے بکھرے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ کار رک گئی۔ میرو شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، بولا۔ ”اڑے لاڈے میاں! اب بول بھی دیوے کہ یوں جتنا یوں (زنانیوں) کی طرح کیوں ٹسوے بہا دے ہے؟ کیا تکلیف ہووے ہے تیرے کو؟“

میں ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان کی طرف سے قطعی طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ پروین کی تلاش میں دونوں اپنے تمام تر خلوص اور طاقت کے باوجود میرے کسی کام نہیں آ سکے تھے۔ وہ میری طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ ایسے میں میرو شاہ کی آمد میرے لیے بہت بڑا امکانی سہارا ثابت ہوئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کی پروا کیے بغیر اسے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ امیر نواز اور پروین کے بارے میں، جو کچھ سن رکھا تھا، بلا کم و کاست بتا دیا۔ وہ بڑی خاموشی سے سنتا رہا، پھر بولا۔ ”ہائے غنچے! یہ تیرے کو کون مصیبتوں نے دیکھ لیا ہووے۔ ایک سے بھاگے تو دوجی تیار ملت ہے۔ ہائے ہائے! کرماں والا کسی کو بھی ایسی بے عزتی (بے عزتی) کا منہ نہ دکھاوے تو بھلا ہے۔“

اس دوران اس نے اپنے ننھے سے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔ چونکہ وہ میرے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا اس لیے اسپیکر سے پھونکنے والی میڈم کی آواز پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر میرو شاہ نے مختصر الفاظ میں، اپنے مخصوص انداز میں، میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بیان کیا۔ میڈم نے کچھ پوچھا، کچھ باتیں کیں پھر میرو شاہ نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موبائل فون پکڑا اور کان سے لگایا۔ میڈم کی مترنم اور پُر اعتماد آواز سماعت میں اتری۔ ”شہر یار! مجھے بہت دکھ ہوا۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اب جبکہ ہو چکا ہے تو اس کے ہونے کے دکھ سے نکل کر اس کے ازالے کے لیے توانائیاں صرف کرنا چاہئیں۔ میری بات سمجھ رہے ہوناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فوراً ہی حماقت کا احساس ہو گیا۔ وہ مجھے سن رہی تھی، دیکھ نہیں رہی تھی کہ میرا اوپر نیچے حرکت کرتا ہوا سرا سے نظر آتا۔ میں نے کہا۔ ”جی میڈم!“

”میرے خیال میں تمہاری بہن کو اغوا کیا گیا ہے اور یہ کام سائیں بھی کر سکتا ہے۔ کیا تم نے اس رخ سے سوچا ہے اب تک؟“

میں چونکا۔ ”سائیں؟ یعنی سائیں دل جیت شاہ؟“

”ہاں وہی لیکن اگر اس نے اغوا کیا ہے تو پھر امیر نواز کہاں گیا؟“ میڈم رائے دینے کے بعد خود ہی متضاد سوچ میں الجھ گئی۔ ”میں چند وجوہات کی بنا پر نور پور نہیں آ سکتی ورنہ وہاں آ کر تمہاری مدد کرتی۔ تم ایسا کرو کہ دل جیت پر پکا ہاتھ ڈالو اور اس سے اگلوانے کی کوشش کرو کہ اس نے تمہاری بہن کو اغوا کرنے کے بعد کس کے حوالے کیا۔ اگر تم اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر تمہاری بہن جانے اور میں جانوں، ایک دن میں ہی بازیافت کروا کر تمہارے حوالے کر دوں گی۔“

”مگر میں دل جیت سے کس طرح یہ پوچھ سکتا ہوں؟ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“ میں نے نیم دلی سے کہا۔ ”تم نے یہ کام کس طرح کرنا ہے، یہ تم پر ہی موقوف ہے۔ میں مدد نہیں کر سکتی۔“ وہ قدرے بے پروائی سے بولی۔ ”یہ بتا دیتی ہوں کہ تمہارے خاندان سے بھی اس کے پارٹنر ہیں۔ اس کی پشت پناہی سردار حیدر خان کرتا ہے۔ جو بھی کرنا نہایت رازداری سے کرنا۔“

”میڈم! کیا آپ کو یقین ہے کہ دل جیت نے ہی.....؟“ ”ہاں! میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت کمینہ انسان ہے۔“ میڈم کے لہجے میں غیر معمولی نفرت کی آمیزش تھی۔ ”نہ ہی آسانی سے زبان کھولنے والا ہے وہ۔ تم پکا ہاتھ ڈالو گے۔ اپنا کام کرنے کے بعد فوراً میرے پاس چلے آنا ورنہ اس کے اندھے مرید اور حصہ دار خاندان سے تمہاری ٹکا بولی کر دیں گے۔“

”مگر میڈم! وہ کیوں میری بہن کو اغوا کرے گا؟“ ”اس بات کا تمہیں جلد علم ہو جائے گا۔“ میڈم کے لہجے میں قدرے مختلف نوعیت کا چیلنج چھپا ہوا تھا، بولی۔ ”شہر یار! وہ آلو کا پنٹھا آسانی سے کچھ نہیں بتائے گا۔ تمہیں دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔“ ”مجھے سچ جھوٹ کا کیسے پتا چلے گا؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

”تم نے اس سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ اس نے تمہاری بہن کو کس کے حوالے کیا ہے۔ مٹی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ انگلیاں ٹیڑھی کرنے کے ساتھ ساتھ تم اپنے دماغ کے گھوڑوں کو سیدھی راہ پر دوڑا دو گے۔ وہ صرف تین آدمیوں کو سپلائی دیتا ہے۔ سردار حیدر خان، فقیر وگسی اور جی ایم کو..... اگر ان تینوں کے علاوہ کسی کا نام اس کی زبان پر آئے تو سمجھو کہ جھوٹ بکتا ہے.....“

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی، اچنبھے

سے بولا۔ ”سردار حیدر خان؟“

”فضول حیرانی مت دکھاؤ، تم سب کو جانتے ہو مگر حقیقت میں کسی کو بھی نہیں جانتے۔ یہ دعا کرو کہ اس نے تمہاری بہن کو سردار حیدر خان کے حوالے نہ کیا ہو ورنہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ دوسرے دونوں میری مٹھی میں ہیں۔“ میڈم نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ جو باتیں کہہ چکی ہوں، ان پر غل کرو اور وقت ضائع نہ کرو ورنہ تمہاری بہن بہت دور چلی جائے گی۔ ممکن ہے دیر ہونے کی صورت میں وہ میری دسترس سے بھی نکل جائے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ بائے!“

میڈم نے فون بند کر دیا اور میں چند لمحوں تک موبائل فون کو کان سے لگائے بیٹھا رہا پھر میرا شاہ کو تھمتاتے ہوئے بولا۔ ”میڈم کہتی ہے کہ.....“

اس نے میری بات کاٹ دی، بولا۔ ”ماڑے کانوں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ وہ جو کہتی ہے، ٹھیک کہتی ہے۔ اس کے حکم پر عمل کرو۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میرا شاہ نے ڈرائیور کو گاڑی موڑنے کا حکم دیا۔ چوک قریشی پہنچ کر میرا شاہ نے کار رکوائی اور میرے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”لے بھی غنچے! ویگن پر بیٹھ کر نور پور چلا جاوے ہے اور ہاں! تیرے کو اتنا بتا دیا ہے میرا شاہ کہ جب تک تیرے کو سوچنا ہے، تب تک تیری بہن اس دنیا سے چلی جاوت ہے۔ جو کرنا ہے، ان باجوؤں (بازوؤں) سے کرو۔ تیرے کو میڈم شکیلہ پیار کرے ہے تو اس کا مطلب یہ ہوت ہے کہ تم سے زیادہ (زیادہ) طاقت ور خان جادے (خاندان) نہ ہووے ہیں۔ میڈم میدان میں نکل آوے تو ان لونڈوں کی ایسی کی ایسی ہو جاوے گی۔ ڈر کا ہے، رب کی جات (ذات) کا، بندہ تو ایک سات رپے کی گولی کو بھی نہ روکنے کا ہووے..... آجما (آزما) کر دیکھ لیوے ہے۔“

میں کار سے اترنے لگا تو اس نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ بولا۔ ”ارے جالم (خالم)! تیرے پاس کوئی ٹھاٹھا کا شاکا ہو تو ہے؟“

ساتھ ہی اس نے داہنی شہادت انگلی کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے پستول کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ”نہیں تو.....“ اس نے جلدی سے قمیص کا اگلا دامن اٹھایا نیچے پہنے ہوئے سلو کا نما چو لے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ننھا سا پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔ دوسری جیب میں سے بیس کے قریب گولیاں بھی نکال کر میری جھولی میں ڈال دیں بولا۔ ”اڑے لاڑے! یہ

میک جین (میگزین) والا اصلی ولا تھی پستول ہووے ہے، سو گولیاں چلاویں تب بھی گرم نہ ہووے ہے..... لے اب جا! آگ بن جا۔ جو تیرے راستے میں آن کھڑا ہووے، اسے آگ لگا دیوٹ..... جا ماڑے لاڑے جا!“

میں نے عجیب سے احساسات سے مغلوب ہو کر اسے دیکھا اور پھر احتیاط سے پستول اور گولیوں کو اپنے لباس میں چھپا لیا۔ دونوں سے ہاتھ ملا کر ویگن اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ویگن نور پور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی واپسی میں خاصی دیر تھی۔ میں ویگن اڈے والے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ چائے کا آرڈر دے کر میرا شاہ اور میڈم کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اتنا اہم نہیں تھا جتنا ان دونوں نے مجھے اہم بنا دیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اپنی بگلی جیب کو ٹٹولا۔ پستول کی موجودگی کا احساس بڑا جاندار تھا۔ ایک آگ میرے دل میں جل اٹھی تھی۔ دوسری آگ فولادی پرزے کے اندر بھڑک نکلنے کو بے تاب تھی۔ چائے سے پہلے عزت خان اور شیدو پہنچ گئے۔ میرا اترنا ہوا چہرہ اور ناگفتہ بہ حلیے کی بدولت وہ فی الفور سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے روایتی جملہ بازی نہیں کی۔ عزت خان نے اپنے لیے چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مستفسر ہوا۔ ”استاد کھالے کا کچھ پتا چلا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شیدو نے کہا۔ ”استاد شہرے! منظور ریزی کے پاس جاؤ گے؟“

وہ مجھ سے بالواسطہ طور پر عاشی کو دیکھنے کے لیے جانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے منہ بنایا۔ ”نہیں یار! میں نور پور جاؤں گا، تمہارے ساتھ۔“

ویگن کی روانگی کا وقت ہو گیا اور عزت خان نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا جھکا ہوا سر اور ڈھلکا ہوا بدن متحرک ہو گیا۔ طویل سانس حلق میں اتارتے ہوئے ہمارے سے اترنا اور ویگن کے پائیدان پر آن کھڑا ہوا۔ شیدو نے میرے لیے ویگن میں بیٹھنے کی جگہ بنانے کی کوشش کی تو میں نے اسے روک دیا۔ میں کھلی ہوا میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔

میں نے پستول اور گولیاں اپنے ٹرنک میں چھپا دیں۔ کبھی گھروالے ڈیرے پر گئے ہوئے تھے۔ گزشتہ چند دنوں سے مال مویشیوں کی چٹا بھی عتقا تھی۔ انہیں سنبھالنا ضروری تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہمسائیوں نے دو تین دن تک پانی اور چارے کا انتظام کیے رکھا تھا۔ زیادہ دنوں تک اپنا معمول کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ڈیرے کا کام کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ویسے بھی زندگی کی گاڑی کو، جس بھی حال میں ہو، دھکیلنا پڑتا ہے۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ یاد آیا،

صدف بی بی نے آنے کا کہا تھا مگر نہیں آئی تھی۔ پھر خیال آیا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں کے حالات بدل گئے تھے۔ وہ آنا چاہتی بھی تو کس طرح آ سکتی تھی۔ صدف بی بی کی طرف میرا دھیان زیادہ دیر تک نہیں رہ پایا، میں اپنی آگ میں لوٹ آیا۔ میڈم اور میرا شاہ کی ہدایات کے بارے میں سوچنے لگا۔ میڈم اتنی بڑی بات بغیر کسی ثبوت کے کیسے کہہ سکتی تھی کہ پروین کے اغوا کے پیچھے دل جیت شاہ کی کمینگی جاگزیں تھی۔ کیا دل جیت اس کا دشمن تھا؟ اور وہ میرے ذریعے سے اپنے دشمن کو زک پہنچانا چاہتی تھی؟

میں نے چابی وغیرہ کے آنے تک بہت سوچا مگر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں نہ تو میڈم شکیلہ کو اچھی طرح جانتا تھا، نہ دل جیت کو اور نہ ہی خاندانوں کو۔ کھانا ہر بار کیا اور لیٹ گیا۔ نیند حسب سابق آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آنکھیں بند کرتا تو پروین کی شبیہ ابھر کر سامنے آ جاتی۔ کبھی روتی بہتی دکھائی دیتی، تو کبھی ایک دم ساکت اور سپاٹ..... وہ بولتی نہیں تھی۔ مجھے بتاتی نہیں تھی کہ وہ کہاں تھی۔ بس ایک ننگ مجھے دیکھتی رہتی تھی۔

ایسے میں کھالے کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ ہوتا تو ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہ چھوڑتا۔ اپنی عقل کے مطابق مشورے اور دلاسا دیتا۔ کوئی راہ نکالنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا..... مگر وہ کہیں جا کر غائب ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ مولی کے غیر متوقع قتل پر خوف زدہ ہو کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ لاہور یا کراچی کی طرف نکل گیا ہو۔ چونکہ وہ ماہر ڈرائیور تھا اس لیے اسے بہ آسانی کہیں بھی نوکری مل سکتی تھی۔ ڈرائیوری کی وسیع و عریض فیلڈ میں رہائش اور طعام کی سہولتیں بہ آسانی حاصل ہو جاتی تھیں۔

میں فطرتاً بزدل نہیں تھا۔ میں نے کالج کے ایام میں اپنی تنظیم کے کارندوں کے ساتھ مل کر خوفناک مشن انجام دیے تھے۔ بہت کچھ سیکھا تھا۔ نور پور میں آتے ہی میں ہر اس کام سے تاؤ بھگتا تھا جو میرے لیے یا پروین کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ میری احتیاط روی کام نہیں آئی تھی۔ میری جان سے پیاری پروین اس وقت تا کر دہ گناہوں کی یاداش میں نجانے کس عذاب سے گزر رہی تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ دل جیت شاہ کی سرگرمیاں بھلے میری نظر میں مشکوک تھیں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ لڑکیوں کو اغوا کرتا بھی تھا تو نور پور سے دور واردات کرتا ہوگا۔ میڈم کی سوچ اس کے برعکس تھی۔ وہ مصر تھی کہ دل جیت نے ہی پروین کو اغوا کیا

ہے۔ نصف شب کا عمل تھا جب کوئی بھی فیصلہ نہ کر پاتے ہوئے میرا دماغ پھٹنے کو آگیا۔ بے اختیار خود کو لعن طعن کرنے لگا۔ میری جوانی لا حاصل، میری طاقت نامراد..... جو مرد اپنی بیٹی یا بہن کو تحفظ نہ دے سکے، اس کا جینا اور مرنا ایک برابر ہوتا ہے۔ میں نے بے رحمی سے سوچا۔ ”تو کیا مجھے مر جانا چاہیے؟“

کھالا کہتا تھا کہ پڑھا لکھا بندہ کچھ بھی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ بزدل ہوتا ہے۔ سوچنے میں قیمتی وقت ضائع کر دیتا ہے۔ جب پانی سے سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تب اس کے ہڈی جھڑکتے ہیں اور پھر وہ منہ کی کھا کر اپنی جھلی (بستر) میں چھپ جاتا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ”کیا میں واقعی ایسا ہوں؟ پڑھ لکھ کر میں نے اپنے خاندان کو بٹالگا دیا۔“

میں نے خود کو ٹٹولا۔ دل جیت آسان شکار نہیں تھا۔ سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالنا تو کجا، اس تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ میں کیا کروں؟ اسی ادھیڑ بن میں غرق تھا کہ محسن میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور جست بھرنے کے سے انداز میں باہر کی طرف بھاگا۔ محسن کے شمالی گوشے میں پانی کے گھڑے رکھنے والی گھڑوچی (چونی اسٹینڈ) پر کسی کو جھٹکے دیکھا۔ آدھے چاند کی روشنی میں پہلی نظر کو ہی باور ہو گیا کہ وہ شانو تھی۔ وہ ایک گھڑے پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے چند ثانیے انتظار کیا مگر وہ جوں کی توں کھڑی رہی۔ پانی بھر رہی ہوتی تو پانی کنورے میں ڈال کر سیدھی ہو جاتی..... میں جلدی سے اس کے عقب میں پہنچا۔ پتا چلا کہ وہ گھڑے پر ہاتھ لگائے پھکیاں لے رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، کہا۔ ”کلی تھی گئی ہیں شانو! میڈے ول دیکھ.....“ (شانو! ہنگی ہو گئی ہو کیا، میری طرف دیکھو)

اس نے چونک کر ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، سیدھی ہوئی اور پیروں پر پلٹ کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”کیا بات ہے شانو! کیوں رو رہی ہو؟“

ہوں، جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو، مجھے یک ٹک دیکھے گئی۔ میرے جھنجھوڑنے پر اس نے سرد آہ سینے میں اتاری اور بولی۔ ”میڈے مان تے اساں ڈوہیں بھیناں آکڑتے ٹردیاں ہا سے..... پرتوں تاں اپنی پروین جو گاوی نوں نکھتا.....“

(ہم دونوں ہمیشہ ہمہ سے پر اکڑ کر چلا کرتی تھیں۔ آج پتا چلا کہ تم اپنی بہن کو بچانے کے قابل بھی نہیں ہو)

اس کے شعلے اگلے جملے نے مجھے زمین میں گاڑ دیا۔ مجھ پر ایک نگاہ عجب ڈال کر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ہنسی نے میرے روم روم میں وہ زہرا تار دیا تھا جس نے آن کی آن میں مجھے خاکستر کر دیا تھا۔

میں جو فیصلہ نصف شب تک نہیں کر پایا تھا، اس کے ایک جملے اور خون آشام ہنسی نے کر دیا۔ چاچا چراغ بوڑھا تھا۔ زیادہ زور لگاتا تھا تو کھانسنے لگتا تھا۔ انجیر پتھر بل کر رہ جاتا تھا مگر اس کے کانوں میں پروین کے ساتھ جو نبی امیر نواز کا نام پڑا تھا، اس نے حیات خان سے کہہ دیا تھا کہ میں پرچا نہیں گنواؤں گا بلکہ اپنے مجرم سے خود نمٹوں گا۔ اس کے بوڑھے دل نے غیرت کی آغوش پر جوانی کا پلو تھام لیا تھا۔ میرا جوان دل ابھی اندیشوں میں مبتلا تھا..... مجھے اپنے وجود سے ایک لمحے کو گھن آئی اور میں دانت پیس کر اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ میرے انگ انگ میں غیر معمولی مستعدی بھر گئی تھی۔

ملتان کالج کے ہاسٹل میں لی گئی تربیت آج کام آنے والی تھی۔ میں نے میرا شاہ کا دیا ہوا پستول نکالا، اسے بہ نظر احتیاط چیک کیا اور میگزین لوڈ کر کے بغلی جیب میں ڈال لیا۔ ننھا سا جرمین ساختہ پستول دیکھتے ہی اس کی ہلاکت خیزی کی خبر ہوتی تھی۔ یہ آٹو مینک تھا۔ پہلی گولی چڑھانے کے لیے بولٹ کھینچنا پڑتا تھا۔ پھر خود کار انداز میں گولیاں میگزین سے نکل کر اسٹروک پن کے سامنے آتی جاتی تھیں اور ٹریگر دبانے پر موت بانٹنے لگتی تھیں۔ میں نے اضافی گولیاں بھی اٹھالیں۔ آنے والے وقت میں کس طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا، اس خیال کے پیش نظر میں نے میرا شاہ کی دی ہوئی نوٹوں کی گڈی نکالی، پن نکال کر آدھی جیب میں اور آدھی ٹرنک میں رکھ چھوڑی۔ کھالے کا تحفہ نظر آتا تو میں نے خنجر بھی اٹھالیا۔ وہ تقریباً نو آٹھ پھل والا دو دھاری خنجر تھا جس کا دستہ کلپ لاک والا تھا۔ ہاتھ میں پکڑ کر کلپ چڑھا دیا جاتا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر نہیں سکتا تھا اور نہ ہی چھینا جاسکتا تھا۔ وہ خوبصورت اور نفیس چرمی کور میں لپٹا ہوا تھا اور اسے بہ آسانی پنڈلی کے ساتھ تسوں کی مدد سے باندھا جاسکتا تھا۔ میں نے کھالے کو کئی مرتبہ پنڈلی پر باندھتے ہوئے دیکھ رکھا تھا۔ کرکٹ کھیلنے والے جاگر بوٹ پہنے، منہ پر ڈھانچا باندھنے کے لیے سیاہ پھولدار صاف اٹھایا اور ناقدا انداز میں اپنا جائزہ لیتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

چاند اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا جب میں دل جیت کی حویلی نما رہائش گاہ کے عقب میں کھڑا ڈھانچا

باندھ رہا تھا۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ امیر نواز کون تھا؟ پروین کے ساتھ ہی کیوں غائب ہوا تھا؟ دل جیت کے اثر و رسوخ کی طاقت کیا تھی؟ میں تو بس یہی جانتا تھا کہ مجھے مرنا ہے یا دل جیت سے دریافت کرنا ہے کہ اس نے پروین کو کس بے غیرت کے حوالے کیا تھا۔ مجھے اس سے بھی سروکار نہیں تھا کہ میڈم شکیلہ نے سچ کہا تھا یا اس نے کس برتے پر اتنا بڑا الزام دل جیت پر لگایا تھا۔

میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں تھام لیا، بولٹ کھینچ کر گولی چڑھائی اور حفظہ با تقدیم کے طور پر میں نے پارکنگ کی دیوار سے جھانک کر مزار کے محسن اور ہال کی کھلی ہوئی کھڑکی کا جائزہ لیا۔ نہ کوئی شخص دکھائی دیا اور نہ ہی ہال کی بتیاں روشن تھیں۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی اس چھت پر چوروں کی طرح چڑھ چکا تھا۔ پہلے ننگے پیر تھا، آسانی چڑھ گیا تھا۔ اب میں نے اسپورٹس جوگزر پہن رکھے تھے۔ کچھ دقت ہوئی مگر چڑھ گیا۔ احتیاط سے جھانک کر دیکھا۔ سوئے ہوئے محل میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں کمروں اور برآمدوں کی ساجھی منڈیروں پر چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ انہی سیڑھیوں کے نیچے دل جیت کا کمر تھا جس میں اس وقت وہ اپنی کسی بیوی کے ساتھ محو استراحت تھا۔ اس کے کمرے کی بتی گل تھی یا زبرد کا بلب روشن تھا جس کی روشنی باہر تک نہیں پہنچ پارہی تھی۔ میں دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر برآمدے میں آ گیا۔ حویلی تین طرف سے کمروں اور چوٹھی جانب سے بڑے ہال سے گھری ہوئی تھی۔ ہال کے ساتھ ہی حویلی سے نکلنے کے لیے بڑا آہنی گیٹ نصب تھا۔

میں اوکھلی میں سردے چکا تھا۔ سر کو بچانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا اور بجا طور پر میں اس وقت سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ آگ اندھی ہوئی ہے۔ میرے اندر بسیرا کرنے کے بعد اس نے میرے ادراک کی آنکھیں بھی بند کر دی تھیں۔ میں پستول ہاتھ میں لیے دروازے تک پہنچا۔ دھکیل کر دیکھا، میری خوش بختی عروج پر تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑا سا دھکیل کر اندر جھانکا۔ زیر و داٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں جہازی سائز کے بڑے سے بیڈ کے عین وسط میں سائیں دل جیت پہلو کے بل لیٹا دکھائی دیا۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ میں بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں سائیں دل جیت کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور ہلکی آواز میں گونجنے والے خراٹے اس کی گہری نیند کی خبر دے رہے تھے۔

کمرے کی تعمیر دیہاتی طرز کی تھی جبکہ زمین جدید خطوط

پر کی گئی تھی۔ فرش بہت نرم قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا، چنچنی چڑھائی اور بیڈ کا چکر کاٹ کر سائیں کے چہرے کے رخ آن کھڑا ہوا۔ وہ گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ میں تیزی سے بیڈ کے دوسری جانب پہنچا۔ چونکہ میں نے ربر کے سول والے اسپورٹس جوگزر پہن رکھے تھے اور فرش پر دبیز قالین بیٹھا ہوا تھا اس لیے میرے چلنے پھرنے سے مطلق آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے جگانے سے پیشتر اس کے کمرے کا طائرانہ تلاشی لینا مناسب جانا۔ بیڈ کے برابر دیوار کے ساتھ قالین کے ہم رنگ صوفے بڑے تھے۔ ایک صوفے پر چھوٹے سائز کی سیاہ چمکدار کن پڑی تھی جس میں میگزین چڑھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک ڈائری اور جیبی رومال دھرا تھا۔ شیشے کی چھوٹی سی تپائی پر بوتل اور نقرتی گلاس پڑا تھا۔ بوتل پر غیر ملکی شراب کا لیٹبل دیکھ کر لمحہ بھر کو میرے دل میں دل جیت شاہ کے لیے کراہت کا جذبہ نمودار ہوا مگر میں نے اپنی توجہ بٹنے نہیں دی۔ گن اٹھا کر بیڈ کے نیچے رکھ دی تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت میں وہ مجھ پر غلبہ پا کر اپنی گن تلاش نہ کر سکے۔

کمرے میں، بیڈ کے عین سامنے والے گوشے میں خوب صورت ٹی وی ٹرائی میں سجا ہوا اکیس انچ کا ٹی وی اور وی سی آر پڑا تھا۔ ٹی وی ٹرائی پر دونوں کے ریموٹ اور ان گنت وڈ پوئیسٹس رکھی تھیں۔ میرے لیے دل جیت کا پینا پلانا اور وڈ پوئیسٹس کا شوق حیرت کا سبب تھا۔ اس کا کردار میری نظر میں پہلے ہی مشکوک تھا، آج کل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ مذہب اور عقیدے کے نام پر لوگوں کو نہ صرف بے وقوف بناتا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ ایسے بے ضمیر انسان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔

لگ بھگ پانچ منٹ کی پر احتیاط جستجو کے بعد میں دل جیت کے بھاری وجود سے نمٹنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ سانڈ کی طرح پلا ہوا انسان تھا۔ اس کا انگوٹھیوں سے آراستہ دایاں ہاتھ کوٹھے پر دھرا ہوا تھا جبکہ بائیں ہاتھ سر سیاہ اور چمکدار ڈاڑھی والے چہرے کے نیچے تھا۔ سر ہانے کے قریب عمائے دار پگڑی اور سبج پڑی تھی۔ میں نہایت آہستگی سے بیڈ پر چڑھ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ جاگتے ہی مجھے دیکھ کر چیخے گا، اس لیے میں نے اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہی منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ شاید وہ کھینچ لیے جانے پر نہ جانتا مگر منہ پر ہاتھ کی موجودگی کے باعث اسے ایک جھٹکا لگا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں پھرتی سے اس کے سینے پر چڑھ کر گھٹنوں

کے بل بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے خرخرکی آواز برآمد ہوئی اور مجھے دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ جونہی اس نے حیرت اور دہشت کا پہلا مرحلہ عبور کیا، میں نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور یو الوار کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ اس سے پہلے اس نے میرا یو الوار والا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ خوفناک ہتھیار دیکھ کر اس کی آنکھیں فرط خوف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو میں نے اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا اور غرا کر کہا۔ ”ہاتھ اور زبان کو حرکت دو گے تو گولی مار دوں گا۔“

وہ محض گھر گھرا کر رہ گیا۔ وہ بہت بری طرح میرے شکنجے میں جکڑ گیا تھا۔ اس کی دونوں بانہیں میرے گھٹنوں تلے دبی ہوئی تھیں اور منہ میں پستول کا ایک چوتھائی حصہ دبا ہوا تھا۔ اس کی زبان بند تھی، آنکھیں چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھیں کہ میں کون تھا جو رات کے اس پہر میں اچانک موت بن کر اس کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”دل جیت! تم مجھے نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ چالاکی دکھاؤ گے، جھوٹ بولو گے تو گولی چلانے میں دریغ نہیں کروں گا۔ سچ بولو گے تو سانس لیتے رہو گے۔“

اس کی ٹھکھیا ہٹ بے معانی تھی۔ میں اسے اچھی طرح خوف زدہ کر کے اپنے مطلب کی بات کرنا چاہتا تھا تا کہ وہ جھوٹ نہ بول سکے مگر میری تاخیر نے اسے سنبھلنے کا موقع دے دیا۔ اچانک ہی وہ پھلکی کی طرح تڑپا اور اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں تلے سے نکل گئے۔ اس کا رد عمل میرے لیے غیر متوقع اور اس کے لیے نہایت خطرناک تھا۔ اس کی اس حرکت سے پستول کا ٹریگر دب سکتا تھا جس کا مطلب اس کی فوری ہلاکت تھی۔ میں نے اٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور پستول والے ہاتھ پر پورا وزن ڈال دیا۔ مارے تکلیف کے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ گھٹنوں کے نیچے سے نکلنے والے دونوں ہاتھ بے جان سے انداز میں میرے ہاتھ پر آن کرے مگر ان میں اتنی تاب نہیں تھی کہ میرے ہاتھ کو پکڑ کر باہر کھینچ لیتے۔ میں نے اپنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس کی دائیں آنکھ میں چبھو دی۔ اس کے پورے بدن کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ میں نے غرا کر کہا۔ ”اگر تم کوئی بھی حرکت کرو گے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی مار دوں گا۔“

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اشارے سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنی چھٹی ہوئی آنکھ پر جا لگا جس سے پانی نکلنے لگا تھا۔

میں اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز رکھتے ہوئے اس کی چھاتی پر سے اترا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر اٹھایا تو میں نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن کو عقب سے پکڑ لیا اور کھینچ کر بیڈ پر بٹھا دیا۔ اسی اثنا میں بجلی کی سی مستعدی سے میں نے اس کے منہ میں سے پستول نکالا اور کپٹی پر رکھ دیا۔

میں اسے حویلی سے باہر لے کر جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس پر بے تحاشا تشدد کرنا تھا۔ میڈم کے بقول اس نے آسانی سے مجھے پروں کے بارے میں نہیں بتانا تھا۔ تشدد کے نتیجے میں اس کے حلق سے چیخوں کا برآمد ہونا ناگزیر تھا اور اس کی چیخ و پکار سن کر حویلی کے بھی مکین کمرے کے باہر اکٹھے ہو جاتے۔ نشی مجاوروں اور گھروالوں کی آمد پر میں بری طرح پھنس سکتا تھا۔ میں نے شعلہ بار لہجے میں کہا۔ ”دل جیت! تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا، کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بتا دو گے تو زندہ بچ جاؤ گے، نہیں بتاؤ گے تو کھوپڑی میں سوراخ کر کے چلا جاؤں گا۔“

پستول حلق سے نکلنے کے بعد بھی وہ کئی ثانیوں تک اس قابل نہیں ہو پایا تھا کہ کچھ بول سکتا۔ وہ کچھ دیر تک ’اوغ، اوغ‘ کی آوازیں نکالتا رہا، پھر نیم مردہ آواز میں بولا۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے گردن چھوڑ دی اور اپنا بازو اس کی بغل سے نکال کر چھاتی پر پھیلا لیا۔ اب وہ پوری طرح میرے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔ اس کے آرام طلب اور غیر ورزشی وجود پر چھایا ہوا نیم خوابیدگی اور خوف کا اثر میری معاونت کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چلو! حویلی سے باہر چلو۔ تمہیں بتانا ہوں کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ چلو!“

میں نے دانستہ اپنی آواز خاصی پست رکھی ہوئی تھی تا کہ میری آواز کمرے سے باہر نہ نکل سکے اور کسی سوئے ہوئے کو بیدار نہ کر سکے۔

وہ میری توقع کے برعکس بزدل ثابت ہوا تھا۔ ہتھیلیوں کے بل گھسٹ کر بیڈ سے اترا اور میرے دھکیلنے پر نڈھال قدموں سے دروازے کی طرف چل دیا۔ اس نے ایک لمحے کو صوفے کی طرف دیکھا تھا۔ میرے خیال میں صوفے پر گن کی عدم موجودگی نے اس کی رہی سہی سکت بھی ختم کر دی تھی۔ ”چپٹی کھولو۔۔۔۔۔ اور ہاں! اگر کسی کو جگانے کی کوشش کی، منہ سے آواز نکالی تو پھر پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”اچھا!“ اس کے حلق سے کراہی برآمد ہوئی اور اس نے بلاچوں و چراں میری ہدایت پر عمل کیا۔ چند لمحوں کے بعد

ہم برآمدے سے گزر کر صحن میں پہنچ گئے۔ میں اس پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اطراف پر بھی تنکھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ کسی پل کچھ بھی ہو سکتا تھا اور میں اپنی کامیابی کو موت آگئیں تا کامی میں تبدیل ہونا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے میری توقع کے مطابق کوئی مزاحمت نہیں کی اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی آواز پیدا کیے بغیر گیٹ کھولو۔۔۔۔۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے چپٹی کھولی۔ گیٹ کے کندے میں گریس یا تیل ڈالا ہوا تھا کیونکہ بہت ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کندھوں کے اوپر سے مزار کی طرف دیکھا۔ کوئی مجاور دکھائی نہیں دیا۔ سب کسی کوئے کھڈے میں پڑے خرائے مار رہے ہوں گے۔ صحن خالی تھا۔ آہستگی سے مین گیٹ بند کرنے کے بعد میں اسے لیے ہال کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پارکنگ کی طرف بڑھا۔ پارکنگ میں داخل ہونے کے بجائے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس وقت میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس جنگلی بلے کو کہاں لے جا کر پوچھ پچھ کی جائے۔ فوری طور پر اپنے ڈیرے کا خیال آیا۔ وہ رات کو خالی ہوتا تھا۔ اریب قریب کوئی اور ڈیرا نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی کے ساتھ اپنا کام مکمل کر سکتا تھا۔ اسے اپنے ڈیرے پر لے جانے میں محض یہی قیامت تھی کہ ڈیرا یہاں سے خاصا دور تھا۔ وہاں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ پا کر میں نے اسے مزار کے بیرونی اودھ کھلے گیٹ سے دھکیل کر نکالا اور جنوبی سمت میں پگڈنڈی پر ہانکنا شروع کر دیا۔

اس کی کمر اپنے سینے سے چٹائے پیدل چلنے کی وجہ سے میں اب جھٹکنے لگا تھا۔ میں نے اسے روک کر اپنا بازو کھینچ لیا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ میں اپنے مشن میں آدمی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ آدمی کے حصول کے لیے میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اسے ہانکتے ہوئے اپنے ڈیرے پر پہنچا۔ اندھیرے میں، پگڈنڈی پر چلتے، گرتے پڑتے سائیں دل جیت کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی تھی اور وہ ہانپنے لگا تھا۔ اس نے راستے میں ایک دو مرتبہ کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر میں نے جھڑک کر خاموش کر دیا تھا۔

ڈیرے پر رات کو سوائے مال مویشیوں اور اپنے پالتو کتوں کے، کوئی نہیں ہوتا تھا۔ بھانے میں اندھیرے کا راج تھا۔ وہاں دیوار کے حوالے میں لائین اور ماچس پڑی تھی مگر میں دل جیت کی موجودگی میں لائین جلانے کی مہلت حاصل

نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ بکریوں کے لیے تیار کیے گئے چھپر پر نظر جا پھری۔ وہاں بھی اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے دل جیت کو اس سمت چلنے کا حکم دیا۔ وہ چند قدم چلا، پھر نہایت غیر متوقع طور پر رکا اور میرے جھٹکنے سوچنے سے بیشتر ساعت بھر میں لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس کا دایاں پیر سیدھا پستول کو لگا اور پستول میرے ہاتھ سے جھوٹ کر ناہموار جگہ پر گر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے میری غفلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اور اس کی اگلی حرکت پر نظریں جھانکا، ایک زوردار مکا میری کپٹی پر پڑا۔ میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میں لڑکھڑا کر پہلے آگے کی سمت بڑھا پھر کمرے زمین پر جا گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ٹاپنے لگے۔ وہ میری طرف بڑھنے کے بجائے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں کی مگر میرا سر بری طرح اور میں پھر گرا۔ دوسری مرتبہ بھی میں اپنی تمام تر برادری کا رلایا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ نا پختہ زمین پر اندھیرے میں اپنی بانہیں پھیلائے پستول تلاش کر رہا تھا۔

میری قسمت میرا ساتھ دے گئی تھی ورنہ اس کا وار بڑا خطرناک تھا۔ میں فضا میں اچھلا اور پورے وزن کے ساتھ اس پر جا گرا۔ وہ میرے نیچے دب کر زمین پر لم لیٹ ہو گیا۔ میں نے پستول کی پروا کیے بغیر اس پر کموں کی بوچھاڑ کر دی۔ منہ، سر، کپٹی۔۔۔۔۔ مجھے کوئی اختیار نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس کے منہ سے ہلکی چیخیں برآمد ہونے لگیں تو میں نے ہاتھ روک لیا اور کسی خونخوار درندے کی طرح اس کی بائیں آنکھ میں دونوں انگلیاں گھسیڑ دیں۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی، پھر دوسری چیخ۔۔۔۔۔ پھر وہ بری طرح سر جھٹکنے لگا۔ اس کی آنکھ کا ڈیلا میری ٹیڑھی انگلیوں میں پوری قوت سے جکڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا تو وہ تڑپ کر اٹھا۔ میں کمر کے بل زمین پر گرا۔ اس کی بائیں آنکھ کا ڈیلا میرے ہاتھ میں تھا جسے میں نے ایک جھٹکے سے پرے پھینک دیا۔ اسے دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ اپنی آنکھ پر سختی سے رکھے بری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے مسلسل کراہیں اور گالیاں نکل رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی ارد گرد دیکھا۔ مجھے اندھیرے کی وجہ سے پستول دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اس پر چار حرف بھیجے اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ وہ بڑا خطرناک انسان تھا۔ میں نے اس کی موقع فہمی اور چالاکی کو بڑی قدر دیا تھا۔ اگر قسمت میرا ساتھ نہ دیتی تو اس وقت بازی پلٹ چکی ہوتی اور میں اس کے رحم و کرم پر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔

خنجر ہاتھ میں آتے ہی میں نے دستے کی پن لاک لگا دی تاکہ وہ میرے ہاتھ سے پستول کی طرح چھوٹ کر اندھیرے کی نذر نہ ہو جائے۔ اس کے مایے بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے وجود کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے پالتو کتے جاگ کر ہمارے قریب آ کر بھونکنے لگے تھے۔ میں نے انہیں پکڑ کر بھگا دیا۔ وہ میری آواز پہچان کر دم ہلاتے ہوئے دور جانے کے بجائے میرے قریب ہو گئے۔ میں نے دل جیت کو دو تین ٹھڈے مارے پھر بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بکریوں کے چھپر کی طرف بڑھا۔ کتے تجسس بھرے انداز میں اس کے دائیں بائیں سوگھتے ہوئے چھپر تک چلے آئے۔ چھپر تلے اندھیرا تھا مگر اتنا گہرا نہیں تھا کہ سرے سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

سائیں دل جیت خاصا وزنی تھا۔ میں نے اسے بہ دقت تمام دیوار کی جڑ میں لا پھینکا۔ اپنی سائیں ہموار کرتے ہوئے اس کے آنکھوں پر دھرے ہوئے ہاتھوں پر لات ماری تو وہ بلبلاتا اٹھا۔ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس کے منہ سے غلیظ مغالطات کی قے برآمد ہوئی تو میں خود پر قابو نہیں رکھ پایا اور میں نے آن کی آن میں خنجر کے چرموں سے اسے لہو میں نہلا کر رکھ دیا۔ کتے خون کی بو پر بھڑک اٹھے۔ ایک نے دل جیت پر چھلانگ لگائی تو میں نے اسے لات مار کر پرے پھینکا اور گھٹنوں کے بل دل جیت کے سامنے بیٹھ گیا۔ خنجر کا پھکدار پھل دل جیت کی دائیں آنکھ کے قریب لہرا کر کہا۔ ”دل جیت! میں نے تمہیں کہا تھا کہ چالاکی کرو گے تو رعایت نہیں کروں گا۔ تم نے میری بات نہیں مانی اور ایک آنکھ گنوا لی۔“

میں سانس لینے کو رکا، پھر غرایا۔ ”تم بے غیرت اور کمینے انسان ہو۔ اپنی دوسری اور اکلوتی آنکھ بھی گنوا بیٹھو گے۔“ اس کا جسم مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کے چہرے کے خطوط دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر ان پر طاری دہشت اس کے بدن اور آواز کی غیر معمولی لرزش سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر تکلیف کی شدت سے ہائے نکل گئی۔ میں نے اپنے لہجے میں بے تحاشا سنگینی پروتے ہوئے کہا۔ ”دل جیت! پروین کہاں ہے؟“ یکبارگی اس کا سر اٹھا چڑھا۔ ”کون پروین..... تم کون ہو؟ تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، کیوں میری جان کے دشمن بنے ہو؟“

میں نے جواب دینے کے بجائے خنجر اس کی ران میں

گھونپ دیا۔ اس کے منہ سے تیز چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے خنجر والا ہاتھ اس کی اکلوتی آنکھ کے سامنے ہوا میں معلق کر دیا، کہا۔ ”دل جیت! کوئی دوسری بات نہ کرو، جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ پروین کہاں ہے؟“

”میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔“ اس نے ہچکیوں کے درمیان دانت پیس کر کہا۔ ”تم موت کو آواز دے چکے ہو۔ تم مجھے نہیں.....“

میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور خنجر بجلی کی طرح کوند کر اس کی دوسری ران میں کھب گیا۔ اس کے حلق سے بڑی دردناک مگر پھٹی پھٹی آواز نکلی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کم بخت، دیکھنے میں بہت نازک بدن تھا مگر حقیقت میں بہت سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس نے بے ہوش ہونے میں خاموشی دیر کی تھی ورنہ جونہی اس کی آنکھ سے خون کی دھار پھوٹی تھی، بے ہوش ہو کر گر گیا ہوتا۔

بکریوں میں اضطراب پھیل گیا تھا۔ آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگی تھیں اور پچی آواز میں احتجاج کرنے لگی تھیں۔ میں نے اس کی زخمی آنکھ میں انگلی ماری۔ انگلی خون سے لتھڑ گئی مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ مجھے اس کی بے ہوشی کا یقین ہو گیا۔ کتے اس جگہ پر سر جھکائے کھڑے تھے جہاں میں نے دل جیت کی آنکھ زخمی کی تھی۔ مجھے دیکھے بغیر علم ہو گیا تھا کہ وہ زمین پر پڑے ہوئے اس کے خون کو چاٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں اٹھا اور بھانے میں گیا۔

جالے میں رکھی ہوئی کیروسین آئل (مٹی کے تیل) والی لائٹیں اور ماچس مخصوص گوشے میں رکھی ہوئی پانی کی بالٹی اٹھا لایا۔ بکریوں والے چھپر میں پہنچ کر لائٹیں روشن کی اور چھپر کی چھت میں لٹکا دی۔ اب دل جیت کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ اور سیاہ ڈاڑھی خون میں تر تھی جبکہ آدھے چہرے پر پیلا ہٹ مثبت تھی۔ میں نے بالٹی کے پانی سے اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں تادیر یہی ورز کر رہا۔ بالآخر اسے ہوش آ گیا اور وہ اپنی اکلوتی آنکھ میں حیرت اور خوف کی پرچھائیاں سمیٹے مجھے دیکھنے لگا۔ میرا چہرہ ڈھانٹے میں چھپا ہوا تھا۔ اگر نہ بھی چھپا ہوتا تب بھی اسے دکھائی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ لائٹیں میرے عقب میں روشن تھیں۔

”تم کون ہو؟“ اس کی مریل سی آواز سنائی دی۔

”میں تمہاری موت ہوں۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”بتاؤ، پروین کہاں ہے؟“

ہوش میں آتے ہی تکلیف کی شدت سے اس کا چہرہ مسخ

ہونے لگا تھا۔ میرا سوال سن کر جیسے اسے ہوش آ گیا ہو، سرفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔“

میڈم نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ میڈم کی انگلیوں سے نکلنے والی کھیر تھی۔ میں اپنی انگلیاں میڈم کی چمکا ہوا گروہ نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے قسائیوں کے سے انداز میں خنجر والا ہاتھ جھٹکا اور اس کا بایاں کان اڑا دیا۔ وہ بلبلاتا اٹھا اور کان پر ہاتھ رکھ کر پھر جھٹکے لینے لگا۔ ایسے میں اس کے جسم میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت عود کر آئی کہ اس نے مجھ پر بجلی کی سی سرعت سے حملہ کر دیا۔ اس کا دو ہتھوڑ میرے سینے پر پڑا اور میں پیچھے جا گرا۔ اگر میں نے خنجر کی پن لاک نہ لگائی ہوتی تو خنجر میرے ہاتھ سے یقیناً چھوٹ گیا ہوتا۔ وہ کسی سائڈ کی طرح اینڈتا ہوا میری چھاتی پر آن بیٹھا اور اس نے میرے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ اس کی گرفت میں بلا کی طاقت تھی اور مجھے ایک لمحے میں ہی اندازہ ہو گیا کہ میں اپنی تمام تر طاقت بروئے کار لا کر بھی اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا نہیں سکتا تھا۔

میں نے اس کے پہلو میں، چھاتی اور چہرے پر ان گنت کے مارے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ پوری قوت سے میرے ہاتھ سے خنجر چھیننے کی تیگ و دو میں مصروف رہا۔ میری بے پروائی اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بدولت وہ مجھ پر بھاری پڑ گیا تھا۔ میں اپنے جوش و جنوں اور جلد بازی میں مات کھا چکا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے پوری قوت کے میں سموتے ہوئے اس کی زخمی آنکھ پر وار کیا۔ اس کے قلع سے بھیانک چیخ نکلی۔ اس کا دایاں ہاتھ آنکھ پر جا لگا، میں نے دوسرا مکا ہاتھ کی پشت پر جڑ دیا۔ وہ بلبلاتا کر میرے چہرے پر آن گرا۔ میں نے دونوں گھٹنے اس کی پشت کے نیچے زور سے مارے۔ وہ میرے سر سے ہوتا ہوا زمین پر جا گرا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ زیادہ دیر تک اڑا نہیں رہ سکا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں لائین اٹھا کر کتوں کے پاس پہنچا۔ کچھ فاصلے پر گوبر کی پاتھیوں کے بیچ پستول پڑا مل گیا۔ میں نے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور کتوں پر نظر ڈالتا ہوا چھپر میں آ گیا۔ وہ ہنوز ساکت پڑا تھا۔

وہ جیسیم، قوی الاعضا اور ادھیر عمر انسان تھا۔ بگڑتا تو بڑی مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ میں نے ایک بکری کے گلے سے رسی نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ سیدھا کیا اور منہ پر پانی کے چھینے مارنے لگا۔

اب کے اس نے ہوش میں آنے میں زیادہ دیر نہیں کی بلکہ ہوش میں آتے ہی نان اسٹاپ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں نے اسے ڈرانے کے لیے آنکھ کے سامنے خنجر لہرایا، وہ بڑی مکروہ چیخ حلق سے نکال کر بولا۔ ”کتے کے بچے! میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔“

ایک لمحے کو میرا یقین متزلزل ہوا۔ اس کے لہجے نے چغلی کھائی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے ورنہ اس حالت میں پہنچ کر جان بچانے پر پروین کے اٹھا کو ترجیح نہ دیتا۔ پھر میڈم کی بات یاد آگئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”اب بھی تمہاری جان بخش سکتا ہوں اگر تم بتا دو کہ پروین کہاں ہے؟“

میری آواز میں آگ کی تمام تر لپٹیں سمٹ آئی تھیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کا دوسرا کان کاٹ دیا۔ اس کے حلق سے نہایت ہلکی سی چیخ نکلی۔ جسم نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے ناک کی پھٹکی کاٹ دی، پھر خنجر کی خون آلود نوک اس کی زندہ آنکھ کے ابرو پر رکھ دی، سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”دل جیت! آخری موقع دے رہا ہوں، پھر تم ہمیشہ کے لیے دنیا کو دیکھنے سے محروم ہو جاؤ گے۔“

اس کے کندھے پر۔ شاید ہاتھوں کو حرکت دینا چاہتا تھا مگر بندھے ہونے کی وجہ سے بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ جونہی میں نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا، وہ کراہا۔ ”بتاتا ہوں..... مم..... مگر تم کون ہو؟“

میرا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ساکت ہو گیا۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”بتاؤ ورنہ.....“

”مم..... مم جان..... تم شہرے ہو..... پروین کے بھائی..... ہاں!“ اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ بولا۔ ”پروین کے بھائی ہو..... میں جان گیا..... مگر پروین کا مجھے پتا نہیں..... مجھے مت مارو..... میں کچھ نہیں جانتا.....“

میں ٹھنک گیا۔ وہ اگر کچھ نہیں جانتا تھا تو میں بہت بڑا جرم کر چکا تھا۔ میں اپنی واپسی کی راہ مسدود کر چکا تھا۔ وہ نور پور میں جاتے ہی میرا خاندان سولی پر لٹکا دیتا۔ بھیانک سوچوں کی لچاتی یلغار نے مجھے سمجھا دیا کہ دل جیت کی زندگی میری موت تھی۔ ایک قبر کا منہ کھل گیا تھا۔ میں اس میں دفن ہوتا یا دل جیت.....

فرط غیظ سے میری آواز لرز اٹھی۔ ”تو ٹھیک ہے دل جیت..... تم اگر پروین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو تو اوپر جاؤ۔ خدا حافظ! میں پروین کو زمین پر ڈھونڈتا ہوں۔“

میں نے اس کی کٹی ہوئی ناک پر ہاتھ رکھا اور اوپر کی طرف کھینچا۔ گردن کھینچ گئی اور میرا خنجر اس کی گردن پر تک

گیا۔ وہ چیخا۔ ”خدا کے لیے..... مجھے مت مارو..... میں بتاتا ہوں۔“

”اب تم بتاؤ یا نہ بتاؤ..... مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔“

وہ چیخا۔ ”تم پروین تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“

میرا خنجر پر دباؤ بڑھا اور دانتوں کی کڑکڑاہٹ گونجی۔ ایسے ہی وقت میں دل جیت کے اکڑے ہوئے منہ سے خرخراہٹ برآمد ہوئی۔ ”وہ حیدر خان کے پاس ہے.....“

جونہی اس کے منہ سے حیدر خان کا نام برآمد ہوا، میری دھڑکن جیسے پسلیوں میں ہی کہیں دب کر رہ گئی تھی۔ میڈم نے سب سے پہلا نام اسی کا لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔

”امیر نواز؟“

اس کی اکھوتی آنکھ میں بے بسی رچ گئی۔ نفی میں سر ہلایا۔

”تم نے پروین کو کیسے اغوا کیا؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا مگر اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی بہت کمزور تھی۔ میں اس سے اور بھی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر میڈم شکیلہ نے کہا تھا کہ میرا کام اس کے حلق سے اس شخص کا نام اگلوانا تھا جس کے حوالے اس نے پروین کو کیا تھا۔ وہ پتا چل گیا تھا۔

میں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اب اسے ٹھکانے لگانے کا کام باقی تھا۔ میں جذباتی کیفیت میں بلا سوچے سمجھے اس پر جا پڑا تھا۔ آگے کیا کرنا ہے؟ یہ سوچا نہیں تھا۔ اب جب وہ بے حس و حرکت میرے سامنے پڑا تھا، میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے پاس ابھی دو گھنٹوں کی مہلت باقی تھی۔ میں نے نکلے کی ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پیا اور چھپر کے باہر ٹھیلے ہوئے سوچنے لگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ میں دل جیت کو گھسیٹا ہوا بخت خان کے پاس لے جاؤں اور چیخ چیخ کر پورے نور پور کو جگا دوں۔ سب گویاؤں کہ جس شخص کو انہوں نے دیوتا بنا رکھا تھا وہ کتنا ذلیل اور بے غیرت تھا۔ بخت خان کو ساتھ لے کر اسے تھانے دے آتا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔

شاید میں ایسا ہی کرتا مگر ایک زہر خند خیال نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ اگر یہ سانپ نور پور میں داخل ہوتے ہی اپنی پٹلی میں لوٹ جاتا اور میری باتوں کو جھٹلا دیتا تو میرا کیا جتنا؟ میری بات پر سوائے ڈاکٹر شاہ جی کے کوئی

اعتبار تک نہ کرتا۔ میں نہ صرف تھانے کی سیر کرتا بلکہ میرے عزیز دل جیت کے عتاب کا شکار ہو کر کہیں کے نہ رہتے۔ میں پروین کو حاصل کرنے کے بجائے سالوں دور ہو جاتا۔ جب تک میں جیل سے رہائی یا کر آتا، وہ مٹی میں مل چکی ہوتی یا اپنی موت آپ مر گئی ہوتی۔

میں اپنی لگائی ہوئی آگ میں گھر گیا تھا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ دل جیت سے پروین کے بارے میں معلومات لینے کے بعد اس کا کیا کروں گا؟

میرے ارد گرد میرے کتے اچھل کود رہے تھے۔ دل جیت کو اگر زمین میں دبا تا تو کتوں نے صبح دم میرا راز فاش کر دینا تھا۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں اچھل پڑا۔ میرے ڈیرے کے پچھواڑے میں بالٹن (لکڑیوں کا ایندھن) کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ چھ ماہ قبل اپنے رقبے کے درختوں کی چھٹائی کر کے یہاں لکڑیاں ڈھیر کر دی گئی تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ تین چار ٹرکوں کا مال تھا۔ میرے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے دل جیت کو ٹھکانے لگانے کا محفوظ ترین طریقہ سوچ لیا تھا۔

مجھے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ میں نے بے ہوش دل جیت کو اپنی پوری قوت صرف کر کے کمر پر اٹھایا اور نپے تلے انداز میں چلتا ہوا پچھواڑے پہنچا۔ اسے ڈھیر کے وسط میں پہنچانا بہت مشکل تھا۔ اسے ڈھیر پر ایک طرف ڈال کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کھینچ کر وہاں تک لے گیا جہاں تک لکڑیوں کے ڈھیر کے اوپر لے جاسکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے خنجر سے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ اس کی گردن سے خون کا فوراً ابلا اور فضا میں خوفناک خرخراہٹ گونجی۔ میں نے فی الفور ڈھیر پر سے چھلانگ لگا دی تھی ورنہ میرا منہ سرخون سے لتھڑ جاتے۔ وہ تین چار منٹ تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ اس دوران میں نے بہت سی لکڑیاں اس پر ڈال دیں۔ آنے والے دس پندرہ منٹوں میں، میں نے اس کے مردہ بدن پر کم و بیش سات آٹھ من بالٹن ڈال دیا۔

بھانے میں سے کسی اٹھائی۔ زمین پر جہاں جہاں اس کا خون گرا تھا، اٹھایا اور لکڑیوں کے ڈھیر پر لا پھینکا۔ اس کی آنکھ کے ڈیلے کو تلاش کیا۔ وہ وہاں نہیں تھا جہاں میں نے پھینکا تھا۔ ارد گرد دیکھا۔ دکھائی نہیں دیا تو اندازہ کیا کہ اسے کتے نگل گئے ہوں گے۔ سائیں دل جیت کو گھسیٹنے کے نشانات پھاڑے کی مدد سے ہموار کیے۔ لائین اور بھانے میں رکھا ہوا چاچے چراغ کا حقہ اٹھایا اور پچھواڑے آ گیا۔ لکڑیوں

کے ڈھیر کے اطراف میں خاصا دور دور تک سوکھے پتوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے دیوار کی جڑ کے ساتھ حقہ اس طرح زمین پر لٹایا کہ اس کی چلم زمین پر گر گئی۔ اس میں بجھے ہوئے کوئلے پتوں کے فرش پر پھیل گئے۔ میں نے لائین کی تیل والی ٹینگی کا سانچہ روڑہ ڈھکن کھولا، مٹی کے تیل کی ایک دھار چلم سے نکلے ہوئے کوئلوں سے شروع کی اور دل جیت کے لکڑیوں میں دبے ہوئے جسم تک لے گیا۔ لائین کی ٹینگی خالی ہو گئی۔ مٹی جلدی سے بھانے میں رکھی ہوئی مٹی کے تیل والی چھوٹی کین اٹھا لایا۔ بغیر کوئی وقت ضائع کیے بڑی چابکدستی اور مہارت سے لکڑیوں کے ڈھیر پر اس طرح تیل چھڑکا کہ دل جیت کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔

میرا خنجر، لباس اور اسپورٹس جو گرز خون سے تر تھے۔ بھانے میں پڑا ہوا اپنا کام کاج والا لباس اور سوٹی چل پھنی اور خون سے لٹھڑی ہوئی تمام اشیاء کو لکڑیوں کے ڈھیر پر اچھال دیا۔ دیوار کی جڑ میں بیٹھے ہوئے کتے میری حرکات و سکنات کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا مالک رات کی تاریکی میں کیا کارنامہ سرانجام دینے جا رہا ہے۔

جب مجھے پوری طرح تسلی ہوئی کہ میں نے دل جیت کے قتل کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تو میں نے حقے کی چلم کے پاس دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ چھوڑ دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کے ڈھیر کی طرف لپکا۔ میں تیل کی کین، لائین اور ماچس اٹھائے بھانے میں لوٹ آیا۔ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنے سے پیشتر میں نے تنقیدی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ سب کچھ اوکھے تھا۔ دل مطمئن ہوا تو میں نے پچھواڑے میں جھانکا۔ آگ بڑی تیزی سے پھیل چکی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ آن کی آن میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ ممکن تھا کہ نور پور جاگ جاتا اور ادھر متوجہ ہو جاتا اس لیے فوراً یہاں سے نکل جانا مناسب جانا۔

میں ابھی گھر جانے والی پگڈنڈی پر ہی پہنچا تھا کہ میرے عقب میں تڑتڑاہٹ کی ڈراؤنی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب منظر دکھائی دیا۔ آسمان کی طرف لپکتے ہوئے بڑے بڑے شعلوں نے نور پورے ماحول کو منور کر دیا تھا۔ دل کی تیز دھڑکن کو قدرے تقویت ملی اور میرے قدموں کی حرکت تیز ہو گئی۔ ابھی میں نور پور میں داخل نہیں ہوا تھا کہ گھروں کی بتیاں روشن ہونے لگی گئی تھیں۔ یعنی لوگ جاگ رہے تھے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں میں شور و غوغا

بلند ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں بھاگوں تو بھی لوگوں کے نور پور سے نکلنے سے پیشتر اپنے گھر تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کچھ سوچ کر میں ایک گھنے درخت پر بندر کی سی پھرتی سے چڑھ کر چھپ گیا۔ عافیت کی یہی ایک صورت بنی تھی کہ جب لوگ دوڑتے ہوئے ڈیرے کی طرف آئیں تو میں ان میں کسی طرح شامل ہو جاؤں۔

لوگوں نے نور پور سے نکلنے میں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دیر لگائی تھی۔ مجھے سائیکس کے مزار کی طرف سے آتی ہوئی پہلی ٹولی دکھائی دی، تب تک مجھے درخت کے پتوں میں چھپے ہوئے نصف گھنٹا بیت چکا تھا۔ مجھے انیسوس ہوا۔ اگر میں نہ رکتا تو پانچ سات منٹ میں اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ انتظار کے اس طویل وقت میں میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں عود کر آئی تھیں اور سینے میں جلتی ہوئی آگ پر اندیشوں اور تفکرات کی اوس بڑنے لگی تھی۔ میں بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اگر کسی صورت دل جیت کے قتل کا انکشاف ہو جائے تو کیا میں بچ جاؤں گا؟ کیا آگ دل جیت کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کے نام و مقام کو بھی نکل لے گی؟ جو نبی چاچا چراغ اور اس کے پیچھے دس بارہ آدمیوں پر مشتمل ٹولی درخت کے نیچے سے گزری، پیچھے راستہ صاف دکھائی دیا تو میں فوراً درخت سے اتر آیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی عقبی کھڑکی والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ سائیکس دل جیت کا مزار اور حویلی خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی۔ کچھ عرصہ قبل اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ حویلی کے کین دن چڑھنے سے پیشتر جاگنے کے عادی نہیں تھے۔ آج بھی اسی معمول کے مطابق جاگیں گے اور جب تک دل جیت کی راکھ ہوا میں اڑ چکی ہوگی، تب تک اس کی عدم موجودگی کا علم نہیں ہو پائے گا۔

اپنے پچھواڑے کے جوہڑ پر پہنچا تو مسجد کی جانب سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ دوسری ٹولی میرے ڈیرے کی طرف جانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے یہ بھروسہ تھا کہ نور پور کے لوگ بالن کو لگی ہوئی آگ بجھانے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ وہ ارد گرد سے پتا ہٹا کر آگ کو بھانے کی طرف جانے سے روکنے پر اپنی توجہ دیں گے۔ بالن گاؤں والوں کے نزدیک قیمتی نہیں تھا۔ بارہا خشک بالن کی آتش زدگی کے واقعات نور پور میں رونما ہو چکے تھے۔ لوگ آگ بجھانے کے بجائے آگ کے پھیلاؤ کو روک کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ خاص تکنیک سے کھڑکی کی اندر کھنڈی میں پھنسی ہوئی سلاخ نکالتے ہوئے میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ

لوگ بھانے، چھپر اور ڈیرے کے ناہوار محن میں خوب چلیں پھریں تاکہ اگر دل جیت اور میری وہاں موجودگی کا کوئی ثبوت میری نظروں سے چھپا رہ گیا ہو تو وہ بھی روند جائے۔ گھر والے جاگ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہیں حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میرا ان سے پہلے جاگنا، باہر جانا اور کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہونا معمول کی بات تھی۔ شانو نے مجھے دیکھ کر اراداً نظر انداز کر دیا۔ چاچی کا رویہ بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں ان کے پاس رکے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ چاچی کی قدرے پریشان آواز سنائی دی۔ ”شہرے! آگ اپنے ڈیرے پر لگی ہے ناں؟“

میں نے عقبی چادر دیواری کے اوپر دھوئیں کے بڑے مرغولوں اور شعلوں کو دیکھ کر کہا۔ ”ہاں چاچی! میں ادھر جانے ہی لگا تھا کہ چاچے کو انفر علی وغیرہ کے ساتھ جاتا ہوا دیکھ کر پلٹ آیا۔“

شانو نے سر جھکا کر ہولے سے کہا۔ ”ماں! اسے آگ سے کیا، اس کا تو اندر ہی بجھا ہوا ہے۔“

میں نے ایک نگاہ شکایت اس پر ڈالی۔ پڑمردگی کے عالم میں میں نے انہیں بتایا کہ میں پروین کی تلاش میں مظفر گڑھ جا رہا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ مجھے مظفر گڑھ میں پروین کی موجودگی کا شک کیوں گزرا تھا یا کون سا کلیو ہاتھ لگا تھا کہ صبح دم ڈیرے پر بھڑک اٹھنے والی آگ پر قابو پائے بنا میں نور پور سے نکلنا چاہ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر پستول نکالا اور اسے چھت میں موجود ایک خفیہ جگہ پر ٹھکانے لگایا۔ چوٹی شہتیر کے اوپر کی جانب قدرتی طور پر ایک بڑی سی کھوہ بنی ہوئی تھی۔ ایک خاص انداز سے ہاتھ ڈال کر وہاں چیز رکھی اور اٹھائی جاسکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے علاوہ نہ تو کسی کو اس کھوہ کی موجودگی کا علم ہو سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اس میں رکھی ہوئی شے کو نکال سکتا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ اور چہرہ اپنے بالن پر پھینکے ہوئے لباس سے پونچھا تھا۔ ہلکے ہلکے داغ بانی تھے جوج کے ل جگے اندھیرے میں واضح دکھائی دینے لگے تھے۔ میں تولیا اٹھائے غسل خانے میں کھس گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ناشائے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں جلد از جلد ملتان پہنچنا چاہتا تھا تاکہ میڈم شکیلہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کو فی الفور اپنی کارگزاری سے مطلع کروں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ قتل جیسے بھیا تک جرم کا ارتکاب کیا تھا، یہ بے چینی اور اضطراب بھی نور پور کی حدود سے جلد از جلد نکل جانے پر مجبور

کر رہا تھا۔ چونکہ کھالا موجود نہیں تھا اس لیے ویگن عزت خان ڈرائیور شام کو قریشی موڑ لے گیا ہوگا۔ اس کی آمد میں ابھی کافی دیر تھی۔ اتنی صبح سوائے گوالوں کی سائیکلوں کے کوئی سواری دستیاب نہیں ہو سکتی تھی اور میں اسی لالچ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نور پور کی حدود سے نکل آیا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ انور دودھی کا ریہڑا آتے دیکھا۔ اس کے پاس چونکہ زیادہ مقدار میں دودھ اکٹھا ہوتا تھا، اس لیے وہ سائیکل کے بجائے اپنے دبلے پتلے گھوڑے والے ریہڑے پر نور پور اور نواحی بستیوں میں سے دودھ اکٹھا کیا کرتا تھا۔ میں اچھل کر ریہڑے پر چڑھ گیا وہ بولا۔ ”شہرے خان! دھمی دے لے کتھ نکھتاو بندیں؟“

(شہرے خان! صبح کہاں نکل کھڑے ہوئے؟) میں نے جھوٹ بول دیا کہ میں قریشی موڑ پر ویگن کے ڈرائیور عزت خان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ گھوڑا ریہڑا اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہوا نوری چوک پہنچا۔ انور دودھی نے کہا۔ ”مجھے یہاں کچھ دیر لگے گی۔ اگر چاہو تو بیٹھے رہو، چاہو تو کسی ویگن پر بیٹھ جاؤ۔“

محمود کوٹ اور کوٹ ادو سے آنے والی ویگنیں نوری چوک سے سواریاں اٹھا لیتی تھیں۔ میں ریہڑے سے اتر گیا۔ کچھ دیر کا انتظار سودمند رہا۔ انور دودھی کا ریہڑا ہونٹ پر کھڑا ہوا اور میں ایک ویگن کے پائیدان پر چڑھ کر قریشی موڑ سدھار گیا۔ اپنے تئیں میں خطرات کی لپک سے محفوظ ہو گیا تھا۔

میں چاہتا تو قریشی موڑ کے کسی پبلک کال آفس سے میڈم کوفون کر سکتا تھا مگر میں نے بس میں بیٹھ کر وقت بچانے کو ترجیح دی۔ نوبے کے قریب ملتان کے ڈیرا اڈاسے میں نے میڈم کوفون کیا۔ اس نے مجھے اڈے کے سامنے والے ہونٹ پر بیٹھ کر میر و شاہ کا انتظار کرنے کا حکم صادر کیا۔ اس کی آواز میں نیند کا خمار جھلکتا تھا۔ وہ یا تو میری فون نیل پر بیدار ہوئی تھی یا کچھ ہی دیر پہلے جاگئی تھی۔

میں نے مذکورہ ہونٹ میں بیٹھ کر چائے کا کپ حلق سے اتارا۔ نصف گھنٹے بعد سفید ہنڈا کارڈ کار اور میر و شاہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ جہاں لیتے ہوئے اپنی بدست چال چل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میری طرف آیا۔ ہانہیں کھول کر بولا۔ ”اڑے او غنچے! کچھ کمالاوت یا خالی ہاتھ آوت ہے؟“ میں اس کی بات سمجھ نہ پایا مگر کھلی ہانہوں کی دعوت سمجھ میں آ گئی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سینے لگا اور بولا۔ ”ماڑے کو بتا دے ناں کہ کوئی کامیابی ہووے یا نہیں؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ الگ ہو کر بولا۔ ”اڑے

جندہ باد (زندہ باد) لاڈے میاں! کمال کر دیوے ہے تم نے۔ چلو! میڈم کو خوش خبری دیوے.....“

میں چائے کا مل ادا کر کے ہنڈا کارڈ کی پچھلی نشست پر میرا شاہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آج ڈرائیور بدلا ہوا تھا۔ پہلا ڈرائیور اسمارٹ اور کم گو تھا، یہ فرہی مائل اور خاصا باتونی تھا۔ ڈیرے اڈے سے میڈم کی کوٹھی تک اس کی زبان مسلسل چلتی رہی تھی۔

دس بجے ہم دونوں اسی گیٹ روم میں تھے۔ میں جلد از جلد میڈم سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے دل جیت کے منہ سے سردار حیدر خان کا نام اگلوایا تھا۔ اس فرعون کے شکنجے سے پردین کو نکالنا اس کا کام تھا۔ میرا شاہ گیا، تھوڑی دیر میں ہی پلٹ آیا، بولا۔ ”ماڑے غنچے! کوئی گڑبڑ ہووے ہے، میڈم ماڑا انتجار (انتظار) کیے بنا کہیں چلی جاوت ہے۔“

مجھے تھوڑا سا دکھ ہوا۔ اسے جانا ہی تھا تو مجھ سے مل کر چلی جاتی۔ میں نے میرا شاہ کے استفسار پر بلا کم و کاست تمام کارروائی کہہ سنائی۔ وہ بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ میری ران پر زور دار وہب رسید کر کے چپکا۔ ”اڑے جالم غنچے! تیرے کو تو تمغہ دیا جاوے، تیرے کو جھوم کے چوما جاوے..... پہلی واردات اور وہ بھی اتنی جو ردار (زوردار)..... ماڑی میڈم سن لیوت تو جھوم جھوم جاوت لاڈے!“

اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اٹھا، قالین پر دھمال کے سے انداز میں رقص کرنے لگا، ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جھومتا ہوا گیا، رک کر بولا۔ ”لاڈے میاں جندہ باد..... تیرے کو بڑا ثواب.....“ پھر ہاتھ لہرا کر گانے لگا۔ ”نہ کوئی آرزو (آرزو) نہ کوئی آس ہے، میرے دل یہ بتا کیسا احساس ہے.....“

اس نے مجھے تسلی دی، اپنے مخصوص اسلوب میں سمجھایا کہ جو ہو گیا، اچھا ہو گیا ہے، بچھتا نا بے سود ہے۔ میں نے حماقت کے دوران کئی دانش مندی کے پھول بھی کھلائے تھے، جن کی بنا پر پولیس مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اگر پولیس کو یہ پتا چل بھی جائے کہ سائیں دل جیت کا نل میرے ہاتھوں ہوا ہے، تو بھی میڈم سنبھال لے گی اور مجھ پر آج نہیں آنے دے گی۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے تک میرے ساتھ رہا، پھر کہیں فون نہ کرنے اور کمرے میں رہ کر میڈم کا انتظار کرنے کی تاکید کر کے رخصت ہو گیا۔

چار بجے کے قریب، جب میں چائے پی رہا تھا، اس کا

فون آیا، کہہ رہا تھا۔ ”ماڑے غنچے! فکر نہ کرے، ماڑی میڈم سے بات ہووت ہے۔ اسے ساری رام کہانی بول سناوت ہے۔“

اس نے میری جلد بازی پر پانی ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ ”بولے تو ہے ناں کہ فکر نہ کرت ہے، میڈم جہ داری (ذمہ داری) لیوت ہے تو جانو کہ تیری بہن تیرے پاس ہووے ہے۔ ماڑے کو جلدی ہووت، پھر بات کرت..... خوش رہوے لاڈے، خوش!“

دن ڈھل گیا۔ شام میڈم شکیلہ کی محل نما کوٹھی میں دبے پاؤں اتر آئی۔ میں کئی مرتبہ واج مین سے دریافت کر چکا تھا مگر میڈم ابھی تک پلٹی نہیں تھی۔ نجانے کس مصروفیت میں غرق تھی۔ اگر مجھے میرا شاہ نے یہیں رہنے کی تاکید نہ کی ہوتی تو بعید نہ تھا کہ میں کوٹھی سے نکل کر سردار حیدر خان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اگر مجھے پروین تک رسائی حاصل نہ ہوتی تو یقینی طور پر دل جیت کو قتل کرنا بے سود ثابت ہوتا۔

کھانا بڑا پر تکلف تھا مگر حلق سے اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ نور پور کے حالات کس بچ پر تھے؟ کھالا کہاں تھا؟ کیا دل جیت کے قتل کا پتا چلا تھا یا نہیں؟ اگر اس کی لاش شعلوں کے بیچ نظر آگئی تو چاچا چراغ اور گھر والوں کے ساتھ پولیس اور لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟ بہت سارے سوالات زہریلے کیڑوں کی طرح میرے ذہن میں مسلسل ریگ رہے تھے اور بے چین کر رہے تھے۔

ایک اور خیال نے میرے روم روم میں اضطراب کی گہری لہر دوڑا دی۔ دل جیت کے قتل یا غیاب کا سنتے ہی کہیں سردار حیدر خان میری بہن کو ٹھکانے نہ لگا دے..... میری مٹھیاں بھنج گئیں۔ جڑے کڑکڑانے لگے۔ میں بیڈ سے اتر کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گیا، پھر پلٹا، کھڑکی کا پردہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ سوائے ظاہر شاہ کے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کوٹھی پر سکون تھی، میں پر سکون نہیں تھا۔ میں نے ایک مرتبہ میرا شاہ سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر دو تین مرتبہ نکل جانے کے باوجود اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔

میڈم رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب کوٹھی میں پہنچی۔ میں گاڑی کے انجن اور مین گیٹ کے کھلنے کی آواز سن کر اچھلا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا۔ سیاہ رنگ کی بڑی لینڈ کروزر گیٹ عبور کر رہی تھی۔ نصف رات کا قتل، اندھیرا اور فرنٹ اسکرین پر پڑتی ہوئی بڑے بلب کی دو دوہیا روشنی کے سبب جیب کے اندر بیٹھے ہوؤں کی شکل دکھائی نہیں دی۔ جیب چند ہی لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے

جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ جو بھی آیا تھا، اسے گزرتے ہوئے میری نظر میں آنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند منٹ پہلے سی خاموشی فضا پر طاری ہو گئی۔ جیب اور جیب سے اترنے والوں نے نہ جانے کون سا راستہ اپنایا تھا کہ میری نظروں میں آئے بغیر کوٹھی میں داخل ہو گئے تھے۔ چند منٹوں کے بعد سیزھیاں اتر کر آتے ہوئے میرا شاہ پر نگاہ پڑی تو قدرے طمانیت ہوئی۔ اس نے آہستگی سے مجھے دھکیل کر دروازے سے ہٹایا اور کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے بے مبری سے پوچھا۔ ”میڈم آئی ہے؟“

اس نے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے کہا۔ ”ماڑے کو سانس تو لینے دیوے غنچے!“

وہ دیکھنے میں تھکا ہوا لگتا تھا۔ شاید کسی مشکل مشن پر سے لوٹا تھا۔ وہ کچھ دیر صوفے پر آنکھیں موندے نیم دراز رہا، پھر اٹھ کر بیڈ پر آ گیا بولا۔ ”غنچے! آرام سے سو جاوت ہے، سمجھ لیوے ہے کہ تیرے کام کا آدھا حصہ مکمل ہو جاوے ہے.....“

میں نے پوچھا۔ ”کچھ بتاؤ تو سہی، میں بڑا پریشان ہوں۔“

اس نے میری تھوڑی پر ہلکی سی چٹکی بھری، بولا۔ ”کہا ناں لاڈے میاں! سو جاوت ہے۔“

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل مضطرب تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں خاموش نہیں رہ پاؤں گا تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھایا کہ میں آرام سے سو جاؤں۔ چونکہ میڈم شکیلہ سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالنے سے گریزاں تھی، میری مدد کرنا بھی چاہتی تھی اس لیے اس نے ایک نئے طریقے سے میری بہن کی بازیابی کی کامیاب کوشش کی تھی۔

میرا شاہ نے بتایا کہ میڈم نے بھی کسی کام میں اتنی لگن اور پھرتی نہیں دکھائی جتنی وہ آج متحرک رہی تھی۔ میں نے اسے کریدنے کی بہتری کوشش کی، مگر اس نے کچھ پھوٹ کر نہیں دیا۔ جب زچ ہو گیا تو بولا۔ ”کیا ماڑا سر کھاوت ہے، تیرے کو بہن چاہوے یا میرا سر چاہوے، آرام کرو اور ماڑے کو بھی گھڑی دو گھڑی آنکھ میٹھی کرنے دیوے۔“

کچھ دیر لیٹا، پھر کچھ سوچ کر اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”اب کہاں کی تیاری ہے؟“

وہ قدرے بھنا کر بولا۔ ”ہم ساتھ والے کمرے میں جاوت ہیں، تم ادھر سووے ہے۔“

وہ میرے روکنے اور ڈسٹرب نہ کرنے کی تاکید کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں

نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید یہ ان کے طریق کار کا بنیادی حصہ تھا۔

چونکہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اس لیے میں بے آرامی سے بیڈ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ آنکھیں میچ کر زبردستی سونے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔ اس کا بے سود سے تھکا تو دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ آہستہ روی سے چلتا ہوا گیلری کے آخری سرے پر واقع دروازے تک آیا، کھولا اور باہر لان میں ٹھلنے لگا۔ بے دھیانی میں لان عبور کر کے کوٹھی کی بیرونی دیوار تک چلا گیا۔ چار دیواری سے پشت ٹکا کر کھڑا ہوا تو اپنے سامنے کوٹھی کے فرسٹ فلور پر سرخ روشنی سے معمور کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی دکھائی دی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ بہ غور دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ کوئی عورت تھی جو کھڑکی کے پٹ سے کندھا ٹکائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا جبکہ بال ہوا میں اڑ کر اس کی نسوانیت پر ولیلیں لا رہے تھے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا یا میری موجودگی اس کے نزدیک لائق توجہ نہیں تھی، جیسی تو اس کے ساکت وجود میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

وہ کون تھی؟ فوری طور پر میرا ذہن میڈم کی طرف گیا۔ پھر سوچا کہ اسے رات کے اس سے میں یوں کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اس حیرت کدے میں اور کون رہتا ہے۔ اس کے خاندان کے افراد یا ملازمین؟

میں ٹھنکی باندھے اسے دیکھنے لگا۔ اچانک اسے میری موجودگی کی خبر ہو گئی۔ فضا میں ایک نہایت باریک آواز گونجی۔ ”اے! کون ہو تم؟“

اس کا مخاطب میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ آواز نے تائید کر دی تھی کہ وہ میڈم نہیں، کوئی اور تھی۔

میرے جواب دینے سے پیشتر کوٹھی کے بیرونی لان سے ظاہر خان کی آواز سنائی دی۔ ”اوئے نامراد کا بچہ! کون ہے تو؟“

میں جلدی سے بولا۔ ”میں..... میں شہریار ہوں۔“

وہ اچانک عقب سے نکل کر میرے سامنے آ گیا، مجھے دیکھ کر بیزار انداز میں بولا۔ ”ام سمجھا کوئی چور آگئی ہے۔ تم ادھر کیا کرتے ہو؟“

اس نے فرسٹ فلور کی ادھ کھلی کھڑکی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ شاید اس کے کانوں میں عورت کی آواز نہیں پڑی تھی۔ ”نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا، تھوڑی چہل قدمی کر لوں۔“

”اچھا، اچھا..... دوبارہ چہل قدمی کرنی ہو تو مجھ کو گیٹ

پر بتا کر ادھر آتا۔ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے!“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ وہ اپنی گن کندھے پر ڈالتے ہوئے پلٹ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیوار کی ٹیک چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر گھاس پر چلنے لگا۔ ایسے میں پھر فرسٹ فلور کی کھڑکی بول پڑی۔ ”اے! تم کون ہو؟“

میں نے سر اٹھایا۔ وہ دکھائی نہیں دی۔ اس کا ہیولا دکھائی دیا۔ میں نے قدرے نیچی آواز میں جواب دیا۔ ”میں شہر یار ہوں۔“

”وہ تو میں سن چکی ہوں۔“ اس کی مترنم آواز کانوں میں رس گھول گئی۔ ”کیا تمہیں میڈم نے گیٹ ہاؤس میں ٹھہرا رکھا ہے؟“

میں نے عادات اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اتنے فاصلے پر موجود ہونے کے باعث وہ میرا ہلتا ہوا سر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”جی!“

اس کی آواز میں بلاشبہ بڑی کشش تھی۔ کسی بھی شخص کو اپنے پاس سمجھ لینے کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔ آسمان کی ڈھلانون پر پھسلتی رات کے اس پہر میں میرا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ بولتی رہے، میں جواب دیتا رہوں۔ میں گھاس کی خشکی جذب کرتا ہوا کسی بت کی طرح وہیں ایستادہ تھا، وہ اپنی جگہ پر سرخ روشنی مائل اندھیرے کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

چند گھڑیاں یوں ہی بیت گئیں۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”کس کمرے میں رہائش پذیر ہو؟“

میں نے بتایا۔ ”لائبریری کے سامنے والے کمرے میں۔“

”اکیلے ہو؟“

”ہاں! مگر تم کون ہو؟“

”اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ میں آ کر بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔“ اس کی قدرے مدہم سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا، اپنی حیرت کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

اس کے کہے ہوئے جملے کی معنویت کو سمجھتے ہی میری سانس رکنے لگی۔ وہ کون تھی؟ میرے کمرے میں کیوں آتا چاہتی تھی؟ اگر میڈم کو پتا چل گیا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ ان گنت سوالات نے ایک دم میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ میں گیٹ روم کے بیڈ میں دھنس کر دھڑکتے دل سے اس کا

انتظار کرنے لگا۔

گھبراہٹ کے عالم میں، میں نے گیلری میں جھانک کر دیکھا۔ لمبی گیلری کے عین وسط میں ایک انرجی سیور روشن تھا جس کی خوابیدہ سی روشنی میں کوئی وجود متحرک نہیں تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس عورت کی گیٹ روم میں آمد میرے لیے کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھی۔ میں دودھ کا جلاتھا، چھاپچھ سے ڈر رہا تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیند جو پہلے ہی روشنی ہوئی تھی، اب تو کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ مترنم آواز نے آنے کا کہا تھا، وقت کا تعین نہیں کیا تھا مگر ہر مل اس کے چلے آنے کے خوف میں جاگ رہا تھا۔ میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ ایک دوجے کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ محض ہیولے دیکھے تھے۔ کسی ہیولے کی طرف یوں متوجہ ہونا اور بڑھنا غیر فطری اور غیر دانش مندانہ فعل تھا۔ اسے کیا مجبوری لاحق تھی کہ وہ خطرات مول لے کر میرے پاس آتا چاہتی تھی۔ سیزھیاں چڑھنا آسان ہوتا ہے۔ سیزھیاں اترنا بڑا تکلیف دہ اور اندھا اقدام ہوتا ہے۔

کانی دیر گزر گئی۔ وہ نہیں آئی تو مجھے عافیت کا احساس ہوا اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ غنودگی عارضی ثابت ہوئی اور دروازے پر ہونے والی بہت مدہم دستک نے مجھے اچھل کر بیڈ سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری دستک نے غلط فہمی کے شائبے کو دور کر دیا اور میں غیر معتدل سانسوں کو سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ آواز پیدا ہونے کے خوف سے میں نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے قفل کھولا۔ لیور گھمایا۔ دروازہ کھلتے ہوئے چرچراتا تھا اس لیے اسے نہایت احتیاط سے کھولنا ضروری تھا۔ دروازہ کھلا، ایک اور حیرت کدہ میری نظروں کے سامنے سجا ہوا تھا۔ کھڑکی میں دکھائی دینے والا، نسوانی ہیولا بھری پری اور خوب صورت جوانی کی چولی اوڑھے مجھے دم بخود کرنے لگا تھا۔ میں اسے دیکھ کر یک دم ساکت ہو گیا تھا۔

اس نے چوروں کی طرح ارد گرد دیکھا پھر مجھے دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اسی حالت میں ایستادہ ہو گیا جبکہ وہ دروازہ لاک کر کے پلٹی، مجھ پر نگاہ ڈال کر بولی۔ ”تمہی لان میں کھڑے تھے ناں؟“

اس کی آواز نے یقین دلایا کہ کھڑکی میں وہی کھڑی تھی۔ میں نے تھوک نگلا۔ ”ہاں..... آں.....“ مگر تم کون ہو، یہاں کیوں آئی ہو؟ کسی نے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے

گی۔ پلیز! تم واپس چلی جاؤ۔“

اس نے شاکی نگاہ سے مجھے گھورا۔ جواب دینے کے بجائے بیڈ کے کونے پر ٹنگ گئی۔ مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا میرا آنا تجھے اچھا نہیں لگا؟“

میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کا ٹائٹ سوٹ، بکھری ہوئی زلفیں اور کھلی بائیں مجھے مدعو کر کے مبہوت کیے دے رہی تھیں۔ تلخ جلد، تھیکے نقوش اور میک اپ سے بے نیاز، خمار آلود چہرہ کسی بھی زندہ آفت سے کم نہیں تھا۔ اس کے حسن کی تاب میڈم کی آب و چمک سے کم تھی مگر خیرہ کن تھی۔

میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”تم میڈم کی کیا لگتی ہو؟“

وہ مجھے سر تا پا دیکھ رہی تھی۔ دلچسپی ہو یا کر رہی تھی۔ خود کھلی کتاب تھی، مجھے کھولنے کا ارادہ آشکار کر رہی تھی۔ ایک ادا سے بولی۔ ”یہاں کوئی بھی میڈم کا کچھ نہیں لگتا۔ جیسے تم یہاں لائے گئے ہو، ایسے ہی مجھے بھی ایک سال پہلے یہاں لایا گیا تھا۔“

میں اس کی بات میں پنہاں مفہوم کو بھانپ نہیں پایا تھا بولا۔ ”مگر میں تو از خود یہاں آیا ہوں۔“

”بہ ظاہر میں بھی اپنے پیروں پر چل کر یہاں آئی تھی۔“ وہ بولی پھر میری اضطرابی کیفیت کو دیکھ کر مسکرائی۔ ”فکر نہ کرو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ سبھی سو رہے ہیں۔ ظاہر خان جاگتا ہے جس کا جاگنا یا سونا ایک برابر ہوتا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کھل کر بات کرو۔“

”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم اب چلی جاؤ۔ اگر میڈم کو پتا چل گیا تو مجھے گھر سے نکال دے گی۔“

”تم میڈم کی فکر نہ کرو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔“

”کہاں گئی ہے؟“

”وہ بتا کر نہیں جاتی کہ کہاں جا رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو سونے کے لیے آ جاتی ہے۔ اب تک اگر آگئی ہے تو اپنے کمرے میں ہوگی۔ وہ ٹوہ لینے کی عادی نہیں ہے۔“

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی کاٹ عیاں ہونے لگی۔ ”یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اتنا کہ ہمارا ملنا کوئی معافی نہیں رکھتا۔“

وہ غیر محسوس انداز میں کھسک کر میرے بہت قریب ہو گئی۔ اس کی موجودگی اور غیر معمولی قربت مجھ پر اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ ایک عجیب سی سرشاری ہولے ہولے بدن

مسافر



دوائی کی شیشی لئے ہوئے ڈسپنسری مرزا جی میں داخل ہوئے اور اس کی پکڑ دسے جس نے انھیں ان کی ساس کے لئے کچھ بنا کر دیا تھا کہنے لگے۔ غالباً تم سے کچھ بنانے میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں جہاں کو زمین کھکا ہوا ہے وہاں تم نے خواب آور دوا شامل کر دی ہے۔

پکڑاؤ ڈرنے غور سے نسخہ دیکھا، نسخہ دیکھتے ہی اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کپڑا۔ ”پریشان کیوں ہوتے ہو دوست؟“ مرزا جی نے کہا۔ ”میں تو صرف معلوم کرنے آیا ہوں کہ مجھے مسزید کتنی مستم دنیا چاہیے۔“



میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں کمرے سے نکل کر دور بھاگ جاؤں مگر شاید یہ اختیار بھی میرے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا، سہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم کتنے اچھے ہو شہر یار! یہی نام بتایا تھا ناں تم نے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لبوں پر زبان پھیری۔ جتنا کھسک سکتا تھا، کھسکا مگر ہمارے بیچ فاصلہ پیدا نہ ہو سکا۔ ایک کراہ نما آواز میرے حلق سے برآمد ہوئی۔ ”مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پرے ہٹو۔“

وہ چند لمحوں تک یک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر کھسک کر چند بالشت کی دوری پر چلی گئی بولی۔ ”میں شاید تمہیں اچھی نہیں لگی۔ یہ تو دلوں کا سودا ہوتا ہے۔ طے پا گیا تو ٹھیک ورنہ..... خیر کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر باتیں تو کر سکتے ہیں ناں؟“ میں نے بے غلجٹ کہا۔ ”ہاں! مگر تم وہیں بیٹھی رہو گی۔“

اس نے ایک ذرا مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر باتیں کرنے لگی۔ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگی۔ کوئی نصف گھنٹا یونی گزر گیا۔ مجھے اس کی آمد کی غرض و غایت کا پتا نہ چلا۔ محض باتیں کرنے کے ارادے سے اس کا آنا بعید از یقین تھا۔

”تم نے مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا۔“

”اب پوچھ لیتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام سونیا ہے۔“

میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا تھا کہا۔ ”خوب صورت نام ہے۔“

”کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“ وہ اٹھلائی۔

میں نے آنکھیں چرا لیں، پوچھا۔ ”تم یہاں کیا کام

کرتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میں میڈم کا حکم بجالاتی ہوں۔“

”وہ تم سے کیا کام لیتی ہے؟“

وہ مسکرائی، بولی۔ ”تمہیں پتا چل جائے گا۔“

”میرے پاس کیا کرنے آئی ہو؟“

”تمہیں ملنے کے لیے آئی ہوں۔ اگر تم چاہو گے تو

آئندہ بھی آتی رہوں گی۔ برا مناد گے تو کبھی نہیں آؤں

گی۔“ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال

کر کہا۔

میں کوئی بھی جواب نہ دے پایا، وہ بولی۔ ”کیا

تمہارے دل میں نیکی کرنے کا جذبہ موجود ہے؟“

میں نے خالی الذہنی کی کیفیت میں اسے دیکھا،

بولی۔ ”میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں کچھ کہنا نہیں، تمہیں اپنے کمرے میں لے کر جانا

چاہتی ہوں۔“ وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔

”مگر کیوں؟“ میں گھبرا سا گیا۔

”یہ تو تمہیں وہیں جا کر ہی پتا چلے گا۔“

”اگر کسی نے دیکھ لیا تو.....؟“

”کیا یہاں کسی نے دیکھا ہے؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”یہ تو گیسٹ ہاؤس ہے۔“

”یہ ساری کوئی ہی گیسٹ ہاؤس ہے۔ ڈرومت، چلو

میرے ساتھ۔ تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔“

میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیا

ہوا کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ گیلری میں پہنچ کر

اس نے میری کمر میں اپنا بازو حائل کر دیا۔ اپنا آدھا وزن

مجھ پر ڈال کر اٹھلائی، بولی۔ ”دیکھو! عورت کیسے مرد کو اپنے

پیچھے چلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔“

میں ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ اپنی

سائیس ہموار کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہارا رویہ یہی رہا تو

میں لوٹ جاؤں گا۔“

اس نے ایک ذرا مسکرا کر میری بات مان لی۔ گیلری

کے آخری سرے پر کشادہ سیزہیاں اوپر جاتی نظر آئیں۔ ہم

دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے فرسٹ فلور پر آئے۔ بڑا ہال

کمر خالی تھا۔ اسے عبور کر کے ہم ایک کارپنڈ گیلری میں

داخل ہوئے۔ یہ گیلری بھی آخری سرے تک خالی تھی۔ شاید

رات کے اس پہر میں کسی کے بیدار ہونے کا احتمال نہیں تھا،

اس لیے وہ کمال اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی

جاری تھی۔ اس کا کمر گیلری کے آخریں واقع تھا۔

اس کے کمرے کی آرائش ویسی ہی تھی، جیسی میرے

گیسٹ روم کی تھی۔ اندر سرخ رنگ کا ٹائٹ بلب روشن تھا جس

کی مدد سے روشنی میں، پہلی نظر میں کچھ واضح دکھائی نہیں دیا۔

آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو پتا چلا کہ سونیا کے بیڈ پر کوئی

لڑکی سو رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں

رہتی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے سرگوشی کی۔ ”یہ میری نئی روم میٹ ہے۔ میڈم

نے اسے ایک گھنٹا قبل میری تحویل میں دیا ہے۔“

شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ سونے والی ہماری آوازوں

کے سبب بیدار ہو جائے، بھی رازدارانہ انداز اختیار کیے

ہوئے تھی۔ میں ابھی تک یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے

کیا دکھانے کے لیے یہاں لائی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”ہاں!

تم مجھے کیا دکھانا چاہتی تھیں؟“

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور تقریباً کھینچتے ہوئے بیڈ کی

دوسری طرف لے گئی۔ اب سونے والی لڑکی کا چہرہ میری

جانب تھا۔ روشنی کم تھی۔ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں

کہا۔ ”اسے دیکھ لیا، اب کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟“

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پلٹ کر دروازے کے

دائیں جانب دیوار میں نصب سوچ بورڈ تک گئی۔ ایک بٹن

پش کیا۔ کمر ایک بارگی روشنی سے معمور ہو گیا اور میری

آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے فوراً آنکھوں پر ہاتھ رکھ

لیے۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے ہاتھ ہٹائے۔ ناگاہ، نظر

خوابیدہ چہرے پر پڑی تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ میرے

پورے بدن کا خون میری آنکھوں میں سمٹنے لگا اور یوں محسوس

ہوا جیسے میری ٹانگوں نے اچانک میرے جسم کا بوجھ اٹھانے

سے انکار کر دیا ہو۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلو کے بل لیٹی ہوئی لڑکی کو

دیکھنے لگا۔ میں اسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سردار حیدر

خان کی بیٹی اسما تھی جس پر کھالاجی جان سے فریفتہ تھا۔ میں

نے گردن موڑ کر سونیا کو دیکھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے

دیکھ رہی تھی، بولی۔ ”یہ کون ہے، میں نہیں جانتی۔ یہاں تک

کیسے پہنچی، میں نہیں جانتی۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ شکل

سے معصوم اور اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔“

میں نے خوابیدہ اسما کے چہرے کو غور سے دیکھا، نیند

کے گہرے استغراق میں تھی۔ تابندہ چہرے پر زلفیں بکھر کر

سایہ کر رہی تھیں۔ میں نے چند لمحوں میں بہت سوچا مگر اس کی

یہاں موجودگی کا سبب بھائی نہ دیا۔ اس کا میڈم سے کیا تعلق

تھا؟ یہ بھی نہ کھلنے والا عقدہ تھا۔ ایسے میں میرے کندھے پر



صرف کنبوسی میں شہرت نہیں رکھتے بلکہ ان کی بذلہ سخی و ظرافت بھی مشہور ہے۔ ایک ریفری نے

”جنوبی امریکہ کی ایک فٹ بال ٹیم ایڈنبرا میں اسکاٹ لینڈ کی قومی ٹیم سے میچ کھیل رہی تھی میں ریفری

تھا۔ مقابلہ بڑا زبردست تھا۔ لوگ بار بار میسر فیصلے پر اعتراض کرتے۔ اسکاٹ لینڈی صفر کے مقابلے میں چار

گول سے ہار گئے جب میدان سے جانے لگے تو ایک کھلاڑی بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

”ریفری! تمہارا کتا کہاں ہے؟“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کتا؟ کونسا کتا؟“

وہ شخص طنز آمیز انداز میں بولا۔ ”کمال ہے۔ میں نے آج تک کسی اندھے کو بغیر کتے کے نہیں دیکھا۔“

لس آن ٹھہرا۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ سونیا نے اپنا چہرہ میرے

کندھے پر ٹکا دیا تھا اور آنکھیں موند کر مسکرا رہی تھی۔ میں

آہستگی سے ہٹ گیا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی،

بولی۔ ”قرب آتی ہوں تو دور چلے جاتے ہو۔ دور ہو جاؤں

گی تو قریب آنے کے لیے ترسو گئے۔“

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا

یہ سوری ہے؟“

اس نے ایک ادا سے سر ہلایا۔ ”نہیں، بے ہوش ہے۔

پھولوں کی بیج پر سوئی تھی، ہوش میں آئے گی تو خود کو غلاقت

کے ڈھیر پر دیکھ کر آدمی مر جائے گی۔“

سونیا اپنے لہجے سے بہت پڑھی لکھی لگتی تھی۔ باتیں بھی

ابھی ابھی کرتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”بتایا تو ہے.....“ وہ اٹھلائی۔

اس کے انگ انگ میں شوخی اور شباب کی چنگاریاں

بھری ہوئی تھیں۔ وہ سنہلنے کا موقع دے بغیر قریب ہو کر حواس

پر چھانے لگتی تھی۔ وہ خوب صورتی میں کسی طور بھی اسما سے کم

نہیں تھی مگر میری تمام توجہ اسما کی جانب مبذول تھی۔ میں

نے کہا۔ ”اگر تم اسے جانتی نہیں ہو تو پھر یہ بے ہوشی کی حالت

میں تمہارے کمرے میں کیوں لیٹی ہوئی ہے؟“

”میڈم نے اسے میری تحویل میں دیا ہے اور کہا ہے کہ

اس کا خیال رکھوں۔ اسے کمرے سے ایک بل کے لیے بھی

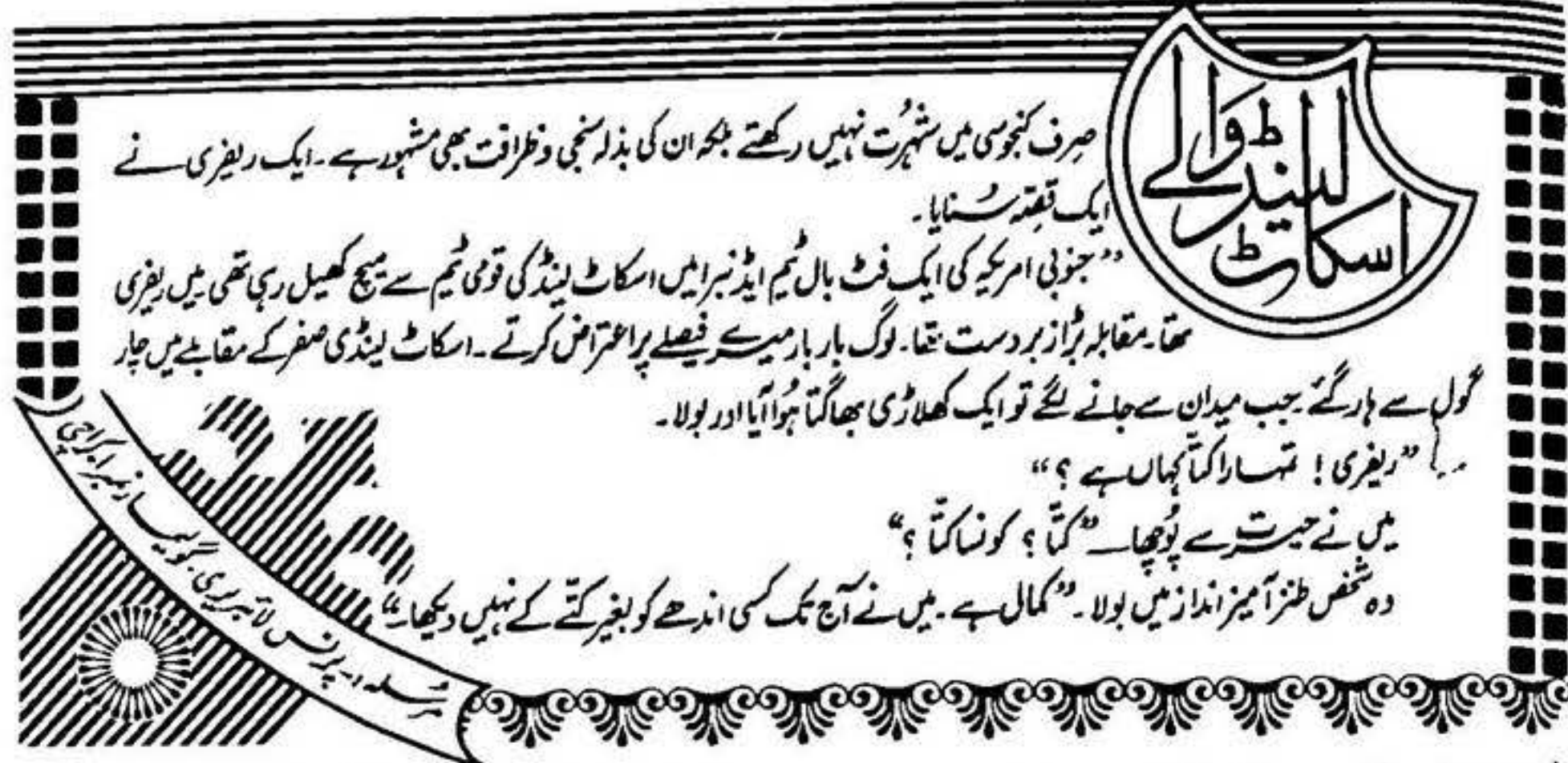
باہر نہ جانے دوں۔“

”تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟“ میں مختصے میں پڑ

گیا۔ ”میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟“

میرے سوال پر اس کے چہرے پر انداز کی ایک

پہچان نہیں لہرائی، بولی۔ ”بہت سائل چلے، پتلے ہی شبانہ۔ ایک معصوم لڑکی اپنی دنیا میں پلٹ جائے، کیا بری بات ہے؟“



نام کی ایک لڑکی کی تحویل میں آئی تھی۔ سفید چادر والے بیڈ پر

سوئی تھی، دھبوں سے اٹھے ہوئے بیڈ پر بیدار ہوئی۔ تب

سے آج تک واپسی کی راہ نہیں ملی۔“

”تو؟“ میں کچھ نہ سمجھ پایا۔

”میں تمہیں نہیں جانتی۔ اسے نہیں جانتی۔ مگر تم دونوں

کی شکلیں بتاتی ہیں کہ تم اچھے اور شریف خاندانوں سے تعلق

رکھتے ہو۔ بھٹک کر ادھر آ نکلے ہو یا بھٹکائے گئے ہو۔ آج

واپس چلے جاؤ گے تو زندگی گزارنے کے قابل ہو جاؤ گے،

یہیں کے ہو جاؤ گے تو تمام عمر کانٹوں سے الجھتے رہو گے۔“

میں چند قدم پیچھے ہٹ کر آرام دہ کرسی پر گرنے کے

سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے

میرے ہمدردوں میں فرش پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ میرے

گھٹنوں پر رکھ دیے۔ بولی۔ ”سچ کہتی ہوں۔ یہاں جو بھی لایا

جاتا ہے، اسے یہی سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کوئی سمجھ

جاتا ہے، کوئی مجھے احسن سمجھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ

بگلا میڈم کا ہے۔ میڈم کا حکم چلتا ہے۔ وہ ہماری سائیس اپنی

منٹھی میں دبائے رکھتی ہے۔“

میں عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ میڈم شکیلہ میری محسنہ

تھی۔ سونیا کے چہرے پر سچی عبارت پڑھنے کے باوجود بھی

دل میڈم کی طرف سے میلا نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر یقین کرنا

محال تھا تو اس کی بات کو رد کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم میڈم کے ساتھ رہتی ہو، میڈم کا کھانا پہنتی

ہو، اسی کو ڈستی ہو، یہ کیا ہے؟“

اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں اس کا نہیں، وہ میرا کمایا

ہو! مال کھاتی ہے۔ رہی بات ڈسنے کی، تو میرے ڈسنے سے

بڑا پرچھا نہیں لہرائی، بولی۔ ”بہت سائل چلے، پتلے ہی شبانہ۔ ایک معصوم لڑکی اپنی دنیا میں پلٹ جائے، کیا بری بات ہے؟“

”کیا پہلے بھی تم نے ایسا کیا ہے؟“
 ”ہاں! میں دو تین لڑکیوں کو اس جہنم کدے سے نکال چکی ہوں۔“
 ”یہاں ایسا کیا ہے جس کی بنا پر تم اتنی خوب صورت کوٹھی کو جہنم کدہ قرار دے رہی ہو؟“
 وہ قدرے زچ ہو کر بولی۔ ”تم اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہو؟ سیدھی سی بات ہے، یہاں ہر وقت جسم کی آگ دہکتی رہتی ہے جس پر میڈم کی دلچسپی چڑھی رہتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے، کیا تم اس لڑکی کی مدد کرنا چاہتے ہو؟“
 ”میں اس کی مدد کیوں کرنا چاہوں گا؟“ میں اب بھی شدید الجھن میں تھا۔
 ”نیکی اور برائی کی فلاسفی کو مانتے نہیں ہو، کیا تم مسلمان نہیں ہو؟“ وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں بتا رہی ہوں کہ یہ گناہ کی دلدل ہے۔ میرا جسم لاکھوں ہزاروں میں بکتا ہے جس میں سے مجھے بھی رات بھر ملتا ہے۔ اس کا بدن بھی شوکیں میں لگا دیا جائے گا۔ لاکھوں کمائے گی مگر صرف میڈم کے لیے۔ ہر رات مرے گی، ہر صبح جیے گی۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گی مگر کئی پروں والے کبوتر کی طرح یہیں چکراتی رہے گی۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمہارا جسم، خون اور تمام طاقتیں میڈم کے ہاتھ گروی رکھی جائیں گی۔ وہ تمہارے ہاتھوں میں سگن پکڑا کر اپنے دشمنوں کو گولی مارے گی۔ تمہارے ہاتھوں منشیات کی سپلائی دے کر ہزاروں گھروں کے چراغ بجھائے گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے، کیا تم نے خدا کے سامنے پیش نہیں ہونا حشر کے دن؟“
 میرے بدن کا خون چہرے پر سمٹ آیا۔ وہ بڑی روانی سے اتنی بڑی بڑی باتیں کہہ گئی تھی جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میڈم اتنے فصیح کام کرتی تھی، حیرت کی بات تھی۔ اگر میں نے اسے معصوم اور کاروباری خاتون سمجھا تھا تو یہ میری فاش غلطی تھی کیونکہ میں اس کا رسوخ دیکھ چکا تھا۔ یہ دبدبہ، یہ دولت، عام اور صاف ستھرے کاروبار سے حاصل نہیں ہوتی۔ کسی بھی تاجر کے سامنے شہر کا ایک تھانیدار اس طرح سر نہیں جھکاتا جس طرح میڈم کے سامنے میں نے تھانیدار کا جھکا ہوا سر دیکھا تھا۔ مجھے سونیا کے کمرے میں آئے کافی دیر گزر گئی تھی۔ کسی نے بھی دخل نہیں دیا تھا۔ کوٹھی کے کچھ مین خواب غفلت کے مزے لے رہے تھے۔ یہ وہ لمحے تھے جب مجھے جاننے سے پیاری پروین کا اغوا، بائیس دل بیت کا ٹکڑا اور کھانے کا غلاب مضطرب نہیں کر رہا تھا بلکہ

میں ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔
 اسباب دستور بے ہوش تھی۔ میں کرسی سے اٹھا، سونیا سے بچ کر بیڈ کے پاس آیا اور اس کو یہ غور دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ تھکے نقوش، گھٹکھریالی سیاہ دراز زلفیں، بلخ جلد اور گلاب کی طرح کھلا کھلا رنگ..... میں نے پلٹ کر سونیا کو دیکھا۔ اس کا حسن چودھویں کے دھلے ہوئے چاند کی طرح آنکھوں میں کھب رہا تھا، وہ بولی۔ ”یہ دیکھ رہے ہو کہ ہم دونوں میں سے زیادہ خوب صورت کون ہے؟“
 اس کے لہجے میں استہزاء اور شرارت کے عناصر غالب تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی۔ ”سچ کہتی ہوں، آج یہ خوب صورت ہے کیونکہ اس کا دامن اجلا ہے۔ کل میں خوب صورت قرار پاؤں گی کیونکہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کی سوار ہوں گی۔ میری مانو، اسے لے کر کوٹھی سے نکل جاؤ۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں پناہ مل جائے گی۔ زندگی گزارنے کا راستہ مل جائے گا۔ اس کے ساتھ شادی کر لیتا۔ چونکہ اسے میڈم یہاں لائی ہے اور جسے میڈم گھر سے اٹھا لائے، اس کی واپسی کے تمام راستے بند ہوتے ہیں۔ یہ واپس اپنے گھر گئی تو اسے کاٹ کر پھینک دیا جائے گا۔“
 اس کے لہجے میں خوفناک عین اتر آئی۔ میرے مقابل آن کھڑی ہوئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”خاموش کیوں ہو؟ کیا مرد نہیں ہو؟ زندگی میں ایسا موقع ایک مرتبہ ملتا ہے۔ آدی ادھر ہو جائے تو دنیا چمن زار دکھائی دیتی ہے۔ ادھر ہو جائے تو آگ کی لپٹوں سے عمر بھر کا واسطہ پڑ جاتا ہے۔“
 میں نے اپنا رخ سوئی ہوئی اسما کی طرف کر لیا۔ خوابیدگی کے عالم میں وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں سونیا کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو رہا تھا، میرے ذہن میں سائیں دل جیت کے منہ سے آخری ساعتوں میں نکلا ہوا لفظ گونج اٹھا ”حیدر خان.....“
 وہ سردار حیدر خان کی بیٹی تھی جس نے میری بہن کو سائیں دل جیت کے ذریعے اغوا کر لیا تھا۔ نفرت کی ایک آتش فشاں لہر میرے تن بدن میں اتر گئی۔ ایسی لہروں کے مقابل میں کوئی اور جذباتی کیفیت یا ہمدردی کا جذبہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ایک بند عقدہ وا ہونے لگا۔ ممکن تھا، میڈم نے اس کو پروین کی بازیابی کے لیے اغوا کیا ہو؟ وہ سردار حیدر خان سے اسما کے بدلے میں پروین کو مانگتا چاہتی ہو؟..... یہ خیال آتے ہی میرے ذہن میں سونیا کا بیان کیا ہوا تمام تر قلعہ ہوا ہو گیا۔ میرے جڑے کے اعصاب تن گئے، ہر نفسی انداز

میں مل گیا، پلٹ کر بولا۔ ”سونیا! میں اس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میڈم میری محسنہ ہے، احسان کا بدلہ احسان سے دینا ہماری روایات میں شامل ہے۔“
 ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کیا میں نے اب تک جو کچھ اس کی ہے، وہ سب فضول رہی؟“
 ”نہیں.....“ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت اچھی لڑکی ہو مگر میں تمہارے اچھے خیالات پر شائبہ نہ کہنے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا۔“
 ”کیا تم میڈم کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو؟“
 ”ہاں! میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔“
 ”خواہ اس لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے؟“
 ”تمہاری زندگی تباہ ہوگئی، بقول تمہارے تو یہ کیا آسمان سے اتری ہوگی؟“ میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔
 ”ایک نہ ایک دن تو تم میڈم کو چھوڑ ہی جاؤ گے، جب؟“
 ”چھوڑ کر جانے سے پہلے میڈم کو بتا دوں گا۔“
 ”وہ تمہیں گولی مار کر سڑک پر پھینکوا دے گی، جانے نہیں دے گی۔“ وہ پورے یقین سے بولی۔
 مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ”کیا مطلب؟“
 ”یہاں کی دنیا کے راز تمہارے سینے میں ہیں جو کسی وقت ثبوت بن کر میڈم کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں گے۔ میڈم بانس کو جلا دیتی ہے تاکہ اس کے نام کی بانسری بجنے کا خطرہ نہ رہے۔“ وہ مجھے ڈرانے کے سے انداز میں بولی۔
 خوف کی ایک لہر میرے بدن میں اتر گئی مگر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنی اس کمزوری کو آشکار نہیں ہونے دیا بولا۔ ”پروا نہیں..... میں مرنا قبول کر لوں گا مگر منافقت کی سانس پھپھڑوں میں نہیں اتاروں گا۔ کیا اب میں جاسکتا ہوں؟“
 وہ برق کی سی تیزی سے میرے پہلو سے نکل کر میرے اور دروازے کے بیچ حائل ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”اب کیا ہے؟“
 وہ ادا سے بولی۔ ”نیکی نہیں کرنا چاہتے، نہ سہی، گناہ ہی کرلو۔“
 ”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔
 اس نے میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکیلا۔ پسپا نہیں کر پائی تو محسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”طاقت ہے مگر قح کا جذبہ نہیں، تم کیسے مرد ہو؟“
 میں نے کہا۔ ”مجھے جانے دو، اگر میرا شاہ جاگ گیا تو مجھے موجود نہ پا کر پریشان ہو جائے گا۔“

اس نے ہونٹ سیٹھڑے، بولی۔ ”اس کی فکر نہ کرو، وہ سکر عاشق گھوڑے گدھے بچ کر سوتا ہے۔ سر پر ہم پھٹے، تب بھی نہیں جاگے گا۔“
 وہ مجھے پسپائی پر مجبور نہیں کر پائی تھی۔ ناکامی کی خفت منانے کے لیے میرے سینے میں سر چھپانے کی کوشش میں مجھ سے چٹ گئی۔ کھالے کی بہن بلونے مجھے اپنی جوانی سے روشناس کرایا تھا، سمجھایا تھا کہ جوانی کی آگ کی اپنی تمازت ہوتی ہے، جلاتی ہے تو خاکستر نہیں کرتی بلکہ شعلہ بنا دیتی ہے۔ خالدہ عرف بلو کی تمازت اور تھی۔ سونیا کی لپک بہت گرم تھی کہ لحوں میں پورے بدن میں اتر گئی۔ میری سانس غیر معتدل ہونے لگی۔ میں نے سنبھل کر دامن چھڑانا چاہا مگر اس کی گرفت کو وارفتگی نے مضبوط کر دیا تھا۔ میں نے جب کہا کہ ”چھوڑو مجھے، جانے دو“ تو میری آواز میری سماعت کو بھی کمزور لگی۔
 وہ اپنا چہرہ میری چھاتی پر رگڑ رہی تھی اور مجھے جہان حسن کی آوارگی پر اکسار ہی تھی۔ شاید وہ میرے اندر چلتے بجتے کرب کے شعلوں سے آگاہ نہیں تھی جن کی آغ مجھے کسی اور طرف مائل نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایسے میں اچانک میرے اندر کا سلگتا ہوا انسان جاگ اٹھا اور میں نے اس کی بانٹیں کھول کر پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے جا لگی اور تھنہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ سانسیں ہوار کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا۔“
 میں نے کہا۔ ”تم نے غلط کہا، میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔“
 ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں تالی کی آواز گونجی۔ میں بڑی تیزی سے پلٹا۔ پہلے گمان گزرا تھا کہ اسما جاگ گئی ہے مگر آنکھوں کے سامنے میڈم کو کھڑا دیکھ کر میری اوپر کی سانس ۲۰ پر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کے لبوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ نے جیسے میرے قدموں کو قائلین سے چپکا دیا تھا۔ اس کے اگلے اور آدستہ وجود کے پیچھے دو کمرؤں کے درمیانی دروازے پر لٹکا ہوا دبیز پردہ لہرا رہا تھا اور وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجا رہی تھی۔ ہاتھ تھے تو زبان نے حرکت کی۔ ”ویل ڈن شہر یار! تم خوب صورت ہو، اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور مخلص بھی ہو۔“
 اس کے ایک ہی جملے نے مجھ پر آشکار کر دیا کہ نصف شب تک چلنے والا رومانوی تحرک اور نیکی کا پرچار محض ڈراما تھا۔ یہ ایک طرح کا امتحان تھا جس میں میں کامیاب ٹھہرا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس پھپھڑوں میں اتاری۔ میڈم

کی سرخ آنکھوں والا چہرہ دیکھا۔ پھر گردن موڑ کر چوکھٹ سے فیک لگائے، آنکھیں موندے، ساکت بدن کھڑی سونیا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ساٹ تھا۔ چند لمحے پیشتر نظر آنے والے تاثرات معدوم ہو چکے تھے۔ وہ اب نہ تو فریفتہ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی آنکس شباب سے ہاری ہوئی دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے میڈم کو مخاطب کیا۔ ”میڈم! یہ سب کیا ہے؟“ وہ بولی۔ ”تمہارا اشارہ اس کی طرف ہے یا سونیا کی طرف؟“

میں چونکا۔ ”میرا مطلب، آپ کی یہاں موجودگی سے ہے۔“

اس کے گلابی لبوں سے جلت رنگ سی بج اٹھی، پھر مترنم گھنٹیاں گھم گئیں، بولی۔ ”سونیا! تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔“ سونیا نے جانے میں دیر نہیں کی۔ میڈم نے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود صوفے پر ٹنگ گئی، بولی۔ ”شہر یار! اسے جانتے ہو؟“ اس کا اشارہ بیڈ پر بے حس و حرکت پڑی اس کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ”جی! یہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما ہے۔ اسی سے ملنے کے لیے تو میں اور کھالا ملتان آئے تھے۔“ ”میں نے اسے اغوا کر دیا ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ کچھ دیر تک گھورتی رہی، پھر ہونٹوں پر انداز عجب سے زبان پھیرنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”جی!“ وہ چونکی۔ ”ہاں تو شہر یار! میں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں سردار حیدر خان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی تمہاری بہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ جاؤں گی تو اس کے خونخوار کارندے گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ اگر وہاں سے بچ کر آگئی تو میرے بڑے مجھے التالاؤں کا دیں گے۔ سمجھ رہے ہوں؟“

میری بات؟

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہر بڑے کے پیچھے ایک اور بڑا موجود ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ میں لگا میں تھامے کھڑا ہوتا ہے۔ میرے پیچھے بھی ایسی طاقتیں موجود ہیں۔ وہی طاقتیں سردار حیدر خان کی رسی کو دراز کرتی ہیں۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی، ساتھ بگلیوں سے کھیل رہی تھی۔ ”ایک تیسری پارٹی کو سچ میں ڈال کر میں نے اسما کو حیدر خان کی ملتان والی کوٹھی

سے اغوا کر لیا ہے۔ وہ پارٹی اغوا برائے نادان کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ حیدر خان سے رابطہ کر رہی ہے۔ رابطہ ہونے پر اسما کے بدلے تمہاری بہن کو مانگے گی۔ ملنے پر مجھے پہنچا دے گی اور اسما کو اپنی جوبل میں لے لے گی۔ اسما کے ساتھ پندرہ لاکھ روپے بھی اس کوٹھی سے جائیں گے۔“

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ میڈم نے میری خاطر ادا کھلی میں سر ڈال دیا تھا۔ میری آنکھوں میں ممنونیت کے تاثرات جھلک اٹھے۔ بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ ”میڈم! میں آپ کے احسانات کا بدلہ شاید کبھی نہیں چکا پاؤں گا۔“

”اگر احسان کا بدلہ محبت میں طلب کیا جائے تو؟“ میرا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اٹھا، میڈم کو دیکھا، دلچسپی آمیز مسکراہٹ چہرے پر ناچ رہی تھی اور وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں قدرے گھبرا گیا، بولا۔ ”جی میڈم! میں سمجھا نہیں۔“

وہ بولی۔ ”انسان جس سے محبت کرتا ہے، اسے دھوکا نہیں دیتا۔ اسے چھوڑ کر نہیں جاتا۔ کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ رہ سکتے ہو؟“

اس کی فرمائش کو پورا کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جی میڈم! میں کوشش کروں گا کہ آپ کو ناراض نہ کروں۔ ویسے میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔“

وہ بولی۔ ”تم کس قابل ہو، یہ میں جانتی ہوں۔ تمہیں کس قابل کرنا ہے، یہ میرے سامنے جانتے ہیں۔ اب تم جاؤ، آرام کرو، اور ہاں! کسی سے، حتیٰ کہ اپنے دوست کھالے سے بھی اسما کا تذکرہ نہیں کرو گے۔ اگر سردار حیدر خان کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ اسما یہاں ہے تو اس کے غنڈے بھیڑیوں کی طرح یہاں دوڑے چلے آئیں گے۔ منزل ہاتھ میں آ کر دور ہو جائے گی۔“

میں نے ”یس میڈم“ کہا اور گراؤنڈ فلور پر واقع اپنے گیسٹ روم میں جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔ میڈم کی آواز سنائی دی۔ ”اب تم اس کمرے میں بھی نہیں آؤ گے۔ اگر اسما نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر تم پر نور پور کی فضا تنگ ہو جائے گی۔“

مجھے اس بات کا خیال نہیں تھا، میڈم شکیلیہ کی تاکید پر مجھے جھکا سا لگا۔ اسما بے ہوش پڑی تھی۔ اگر جاگ رہی ہوتی تو مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیتی اور پھر سردار حیدر خان کو میرے گھر تک پہنچنے میں مطلق دیر نہ لگتی۔

میں نے جاتے ہوئے ممنون نظر سے میڈم کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ اسما کے چہرے سے کھیلنے لگا تھا اور نظریں

اس کے گلابی چہرے کا طواف کرنے لگی تھیں۔

گراؤنڈ فلور کے گیٹ روم میں پہنچ کر میں گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر لیٹا۔ جب سے پروین نظروں سے اوجھل ہوئی تھی، پہلی مرتبہ اطمینان کی سانس سینے میں اتری تھی۔ دل کو تسلی ہوئی تھی کہ اس کے اغوا کا سستہ ہی سردار حیدر خان کی اونچے شیلے والی پگ زمیں بوس ہو جائے گی اور وہ اپنی بانہہ لینے کے لیے پروین کو بلاترود بالواسطہ طور پر میڈم کے حوالے کر دے گا۔ میرے دل میں بے اختیار میڈم کے لیے احترام اور عقیدت کے جذبات ہلکورے لینے لگے۔ سونیا نے اس کے بارے میں جو بتایا، وہ درست بھی تھا تو بھی وہ میرے لیے قابل احترام تھی، میری محنت تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے قتل کے متوقع مقدمے میں مکھن سے بال کی طرح نکال لیا تھا۔ مجھے سائیں دل جیت والا مضبوط کلیو دیا تھا۔ وگرنہ میں اگر تمام عمر بھی سر پختا رہتا تو اپنی پروین تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ طے تھا کہ میں سردار حیدر خان تو کجا، سردار حیات خان پر بھی ہاتھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے میری خاطر اتنے بڑے اور طاقتور آدمی سے ٹکر لے لی تھی۔ وہ دیکھنے میں بہت نازک اندام تھی، جبکہ عملی طور پر وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اتنی طاقت رکھتی تھی کہ سردار حیدر خان کی مونچھ پکڑ کر اپنی ایڑی کے نیچے دباسکتی تھی، یہ تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ شکر تھا کہ میں اس کی آزمائش کے کڑے امتحان میں سرخرو ہوا تھا۔ اس کی ذہانت اور چالاکی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے بجا طور پر علم تھا کہ میرا دیہاتی پن مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا گیا تھا۔ اگر میں چالاک بننے کی کوشش کرتا تو اس وقت میں یہاں نہ ہوتا بلکہ دھکا دیا گیا ہوتا یا کہیں پڑا زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔ یہ طے تھا کہ میڈم جیسی دکھائی دیتی تھی، ویسی تھی نہیں۔ اس کے کارنامے عیاں کرتے تھے کہ وہ بہت زیرک، تیز فہم اور سفاک عورت تھی۔ اگر وہ میری خاطر سردار حیدر خان کی غیرت کو چرکہ لگا سکتی تھی تو مجھ سے بدگمان ہو کر میرا ہاتھ بھی کاٹ سکتی تھی۔

میں اب بھی خطرات کی زد میں تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ دل جیت کی نقش راکھ بن کر دنیا سے غائب ہوگئی تھی یا نشانِ عبرت بن کر اپنے قاتل کو تلاش کرتی پھرتی تھی۔ مجھے اس کی بیویوں اور کم سن بیٹوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، مجھے وریام خان، حیدر خان اور دل جیت کے بدتماش اور جیتے بد معاشوں کا خوف لاحق تھا جو رات کے اندھیرے میں کسی بھی وقت موت کے ہر کارے بن کر میرے گھر میں اتر سکتے تھے۔ چونکہ میرے علاوہ گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جو ظلم کی ایسی تندہوا کے

سامنے چند سیکنڈ بھی ٹھہر سکے، اس لیے میرا دل اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اگر اس کی نقش بالن کے ساتھ جل کر راکھ بن گئی تھی تو پھر اس کے غیاب کا مسئلہ نور پور میں پورے شدو مد سے کھڑا ہوگا۔ چہ میگوئیں کا بازار گرم ہوگا اور پولیس کا آنا جانا لگا ہوگا۔ ایک دھڑکا یہ بھی تھا کہ میری عدم موجودگی میری ذات کو مشکوک نہ بنا چکی ہو۔ میں گیٹ روم میں پڑے ہوئے فون پر بخت خان سے رابطہ کر کے نور پور کے حالات کے بارے میں پوچھ سکتا تھا مگر میرا شاہ اور میڈم نے مجھے کہیں فون کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرے کمرے کی کسی طریقے سے نگرانی بھی کی جا رہی ہو اور ابھی میرا آزمائشی مرحلہ ختم نہ ہوا ہو۔

اسا کو دیکھ کر دل میں جاگنے والا پہلا احساس ہمدردی کا تھا۔ تب میں نے اسے کھالے کی نظروں سے دیکھا تھا۔ جونہی مجھے اس کے وجود کے تاوان میں ملتی ہوئی پروین کی شکل دکھائی دی، میرے دل میں اس کے لیے کدورت اور نفرت کے جذبات اٹھ آئے تھے۔ وہ فرعون کی بیٹی تھی۔ وہ زہرے سانپ کی بیٹی تھی۔ انسانی لبادے میں خطرناک ناگن تھی جو کسی پل ڈس کر زندگی کی ڈور کاٹ سکتی تھی۔

ذہنی رو بدلی اور اس نے مجھے آن واحد میں میڈم، سونیا اور اسما کے چہروں کے تسلط سے نکال کر نور پور کی تازہ دم گلیوں میں پہنچا دیا جہاں شانو، صدف بی بی اور غزالہ کے معصوم چہروں کی راجاڑیاں قائم تھیں۔ صدف بی بی یاد آئی تو اس کا ملتفت ہونا پہلو میں کچھ لگانے لگا۔ کھالے کے گھر میں پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے کے بعد جب میں اسپتال سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں نے غزالہ کو چھیڑنے کی غرض سے مصنوعی تفاخر کے ساتھ کہا تھا کہ صدف بی بی بہت اچھی ہیں اور مجھے بہت غور سے دیکھتی ہیں تو اس کا منہ بن گیا تھا۔ پھر اس نے تنہائی پاتے ہی کہہ دیا۔ ”شہریار! اسکول کی کڑیاں تمہاری تعریفیں کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ کسی نمازن پر ہیزن ماں نے تمہیں جنا ہے۔“

”اور تم کیا کہتی ہو؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ اس نے میری طرف بے ساختگی سے دیکھا۔ فخر کا جذبہ انگ سے عیاں ہو گیا، بولی۔ ”میرا شہر تو جگ سے دکھرا (جداگانہ) ہے۔ کڑیاں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔“

”اور اگر میں بلو کے خطرناک حملے میں ہار جاتا تو؟“ وہ وثوق سے بولی۔ ”تو بھی میرا سوہنار ب میری محبت کی لاج رکھتا اور تمہیں اس کل موہی کے چنگل سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیتا۔“

محبت کا سفر یقین کی راہ پر جاری رہتا ہے۔ جونہی بھر دسا اٹھ جاتا ہے، پیرشل ہونے لگتے ہیں۔ اس کا پڑھیں لہجہ اور سٹائش بھری نگاہ سے مجھے نئی توانائی مل رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے صدف بی بی نے بلوایا تھا۔ مجھ سے کئی کئی (چھوٹی چھوٹی) باتیں پوچھتی رہی۔ میں نے سارا واقعہ کھول سنایا تو پتا ہے اس نے کیا کہا تھا؟“

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”کیا کہا تھا؟“

”اس نے کہا تھا کہ شالا میں شہرے کی ’منگ‘ ہوتی۔“ غزالہ کی آنکھوں میں شرارت بھر گئی۔ سارا نور پور جانتا تھا کہ غزالہ میری منگ (مگیٹر) تھی۔ مجھے اس کی یہ بات سن کر تعجب ہوا۔ کہاں میں، کہاں صدف بی بی۔ سوائے ایک ننھے سے رقعے کے کوئی تعلق استوار نہیں ہوا تھا۔ غزالہ میرے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ پروین نے جھانکا۔ غزالہ کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم کھالے سے ملے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ تو کر سکتے ہو کہ اسے باہر مل لیا کرو، اس کے گھر نہ جایا کرو۔ سچی شہرے! میرا دل اب بھی کانپ اٹھتا ہے جب میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آتا ہے۔ تمہیں چارپائی پر بے ہوش پڑے دیکھ کر میری جان لکل گئی تھی۔“

میری بند آنکھوں کے عقب میں پروین، غزالہ اور کھالے کی صورتیں گڈمڈ ہونے لگیں، نجانے کس وقت نیند آئی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو دس نک رہے تھے۔ میں جلدی سے میرا شاہ کے کمرے کی طرف لپکا۔ خالی کمر میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میرا شاہ نجانے کس وقت چلا گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میرا شاہ تو دکھائی نہیں دیا البتہ انسپکٹر اظہر سفید کھٹے کے کلف شدہ سوٹ میں ملبوس ظاہر خان کی معیت میں مین گیٹ میں داخل ہوتا نظر آیا۔ میں چونکا۔ اس کی یہاں آمد بلا جواز نہیں تھی۔ وہ اکیلا تھا، سرکاری گاڑی میں نہیں تھا یا اگر ایسا نہیں تھا تو گاڑی اور اس کے سامنے گیٹ کے باہر ہی رک گئے تھے۔ گیٹ ہاؤس کے مرکزی گیٹ کے سامنے بنے ہوئے آرائشی برآمدے میں داخل ہوتے ہی دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کمرے کے دروازے میں ظاہر شاہ کی شکل دکھائی دی۔ اس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اثبات میں کرہلا کر پوچھا۔ ”خان! وہ میرا شاہ دکھائی نہیں دیتا۔“

اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ چڑی مار کا بچہ اباسیاں (جماہیاں) لیتا ہوا دپان (دفعان) ہو گیا اے۔“

وہ کہاں چلا گیا تھا؟ کم بخت کے آنے جانے کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ مجھے بے عنوان اضطراب نے آن گھیرا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ تمہیں اذکیوں آیا ہے؟“

”امارے کو کیا پتا۔۔۔۔۔ میڈم صاب سے ملنے آئی اے۔“ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ آدمی بات سنائی دی، آدمی گیلری میں ہی تحلیل ہو گئی۔ میں ناشتا کر رہی رہا تھا کہ کھڑکی کے راستے ظاہر خان اور انسپکٹر اظہر کی باتوں کی ملی جلی آوازیں کانوں میں پڑیں جن سے معلوم ہوا کہ انسپکٹر اظہر میڈم شکیلہ سے ملنے کے بعد رخصت ہو رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی مختصر ملاقات میں اس نے میڈم سے کیا کہا ہوگا؟ پھر سر جھٹکا اور ناشتے میں مشغول ہو گیا۔ وہ کیوں ملے، یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ ظاہر خان برتن سمیٹ کر اوجھل ہوا تو میڈم کا بلاوا آ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں مخصوص صوفے پر بڑے پڑ سکون انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔ اس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں صوفے پر ٹک سا گیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر کے بعد گویا ہوئی۔ ”شہریار! میں بہت بری طرح پھنس گئی ہوں۔“

”جی؟“ میں چونکا، میڈم کو دیکھا، بولا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

اس کے دل ربا چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیں رقصاں دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا تھا۔

مجھے چند لمحوں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ”میں نے افضل نیازی کے گروپ کو اسما کے اغوا کا ٹاسک دیا تھا۔ پندرہ لاکھ میں سودا ہوا تھا۔ افضل وعدہ نبھانے والا آدمی ہے۔ اس نے یہی پراسر سوس جہا کر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ یہاں تک تو معاملہ بالکل درست تھا۔ ابھی انسپکٹر اظہر نے آ کر اطلاع دی ہے کہ افضل نیازی کو بھرے بازار میں اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کاروں کا طریق کار اور دیدہ دلیری چٹکی کھاتی ہے کہ وہ سردار حیدر خان کے تربیت یافتہ لوگ تھے۔“

میری پیشانی بھی ٹھکن آلود ہو گئی۔ میڈم شکیلہ کی پریشانی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اگر سردار حیدر خان اتنے مختصر وقت میں میڈم کی ہار کی ہوئی پارٹی کے سربراہ تک پہنچ گیا تھا تو وہ میڈم تک پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔ میں نے گہرا کر کہا۔ ”اب کیا ہوگا میڈم؟“

میڈم نے فی الفور میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنی

گداز اور گل فام انگلیوں سے کھینچتی رہی، سوچتی رہی، توقف کے بعد بولی۔ ”افضل نیازی معمولی آدمی نہیں ہے مگر وہ حیدر خان کے غیظ و غضب کے سامنے زیادہ دیر نہیں بھربھرا پائے گا اور میرا نام بتا دے گا۔ حیدر خان کا گرگا، استاد بلو، پہلے ہی مجھ سے خار رکھتا ہے۔ اپنے مالک کی شہ پر بھوکے کتے کی طرح میری طرف دوڑ پڑے گا۔“

میں نے فکرو استعجاب آمیز انداز میں کہا۔ ”کیا حیدر خان اتنا ہی طاقت ور ہے؟“

”ہاں! وہ بہت بڑا فرعون ہے۔ ایک طرف تو اس نے پیلے میں اپنے گرگوں کی فوج پال رکھی ہے، دوسری طرف سیکڑوں سیاست دان اس کی ٹانگی میں ہیں۔“

وہ بیک وقت متفکر بھی تھی، پریشان بھی اور خوفزدہ بھی۔ میرا دیہاتی پن عود کر آیا، کہا۔ ”میڈم! آپ خوفزدہ نہ ہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ پر آنے والی آج اپنے بدن پر روکوں گا۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، یقین نہیں آیا تو آنکھوں ہی آنکھوں سے کریدنے لگی، بولی۔ ”میں خوفزدہ نہیں ہوں، پریشان ہوں۔ حیدر خان اور اس کا گرگا مجھ سے ذاتی پر خاش رکھتے ہیں۔ چونکہ کچھ مفادات کے معاملے ہیں کہ ہم نے آج تک ایک دوسرے پر اسلحہ نہیں تانا۔ مگر شہر یار! یہ زندگی، عام دنیا کی زندگی سے بہت مختلف ہے۔ یہاں اپنے ہاتھ سے اپنے وفاداروں کو گولی مارنا پڑتی ہے، کبھی اپنی جان دے کر ان کی حفاظت بھی کرنا پڑتی ہے۔ میرا گروپ بڑا مضبوط ہے۔ مجھ پر میرے جاں نثار لنگی نہیں اٹھنے دیں گے، کوئی گن اٹھانے کی جرأت کیسے کرے گا مگر یہ لوگ بہت قیمتی ہیں۔ ایک بھی مارا گیا تو ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔“

میں نے اسے یہ غور دیکھا۔ وہ دیکھنے میں معصوم، حقیقت میں بہت گھاگ تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے دائیں پہلو میں صوفے پر بڑا ہوا موائل فون بچ اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ننھے اسپیکر سے ابھرنے والی آواز سنتی رہی، پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولی۔ ”کیا تم لوگوں نے اپنے باس کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کیا اب تک؟“

دوسری طرف کی بات سن کر طعنہ زن لہجے میں بولی۔ ”تم لوگوں پر آج آئے تو نیازی بھڑک اٹھا ہے۔ خون کا بازار گرم کر دیتا ہے۔ ایک تم ہو کہ وہ بھرے بازار میں اغوا ہو گیا اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔“

موائل فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی توجیہ سننے کے بعد قدرے استہزاء سے انداز میں بولی۔ ”ارے واہ! پولیس

ڈیپارٹمنٹ کو پتا چل گیا ہے کہ افضل نیازی کو سردار حیدر خان نے اغوا کر لیا ہے اور تمہیں پتا نہیں چل رہا..... کیا خوب! تم لوگ میری فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو اور اگر نمک حلال ہو تو شام ڈھلنے سے پیشتر اپنے باس کو ڈھونڈ نکالو ورنہ تم سب لوگ بے موت مارے جاؤ گے۔“

اس نے مخاطب کا مکمل جملہ سنے بغیر فون کان سے ہٹالیا اور اسکرین کو گھورنے لگی۔ ایسے میں خود کلامی کے بے انداز میں بولی۔ ”افضل خان کا چہرہ تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ ان کے باس کے اغوا میں کس کا ہاتھ تھا۔ ابھی پوچھتے پھرتے ہیں، جب بھی اس تک پہنچ پائے تو کئی سڑی نقش کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔“

میں چونکہ میڈم کے مقابلے میں خود کو نہایت ہونا تصور کرتا تھا، ان معاملات میں تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے اس کی مدد کرنے یا کوئی اچھا مشورہ دینے سے قاصر تھا۔ اس نے مجھ پر توجہ دیے بغیر کئی لوگوں سے فون پر رابطہ کیا اور مختلف ہدایات دیں۔ اس کی باتوں سے میں صرف یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ اس نے تمام لوگوں کو پوزیشنیں بدلنے، اپنے دفاع میں قلعہ بند ہونے اور اسلحہ سنبھال لینے کے ہنگامی احکامات صادر کیے تھے۔ اس نے میرا شاہ کو فون کیا، کہا۔ ”میرا شاہ! تم کسی نہ کسی طرح استاد بلو کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ محتاط انداز میں نگرانی کرو۔ وہ جب بھی اپنے غنڈے لے کر اڑے سے نکلے، مجھے بتا دینا۔ میں سی ٹیو میں جاری ہوں۔ سبھی لوگوں کو میں نے سی ون اور سی تھری میں جانے کا حکم دے دیا ہے۔ اوکے؟“

میرا شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں کچھ کہا جسے سن کر میڈم کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی بولی۔ ”تم کبھی بھی انسان نہیں بن سکتے۔ جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو ورنہ ہم اپنا نقصان کر بیٹھیں گے۔“

فون بند کر کے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”ہا! میڈم کی آنکھ کے ایک اشارے پر میرا شاہ استاد بلو اور حیدر خان کی ایسی تیمی کر دے گا..... کم بخت سنجیدہ بات کرے تب بھی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ یہ بھی درست تھا کہ وہ میرا شاہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ اس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ میڈم ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ سرسری انداز میں چار سو دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ ایسے میں رک گئی۔ کھالا میرے ساتھ ہوتا تو یہی کہتا کہ یوں جیسے دنیا ایک نقطے پر رک گئی ہو..... میری طرف یہ غور دیکھتے ہوئے

بولی۔ ”شہر یار! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اگر چاہو تو واپسی کا راستہ اب بھی کھلا ہے۔ چاہو تو میرا ساتھ دو۔“

اس نے میری وجہ سے دوسرے مول لیا تھا، جس سے نکلنا نہیں چاہتی تھی، اسی سے نکلنا میری وجہ سے ہونے چلا تھا۔ کیسے لوٹ جاتا۔ کھڑا ہو کر مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میڈم! مجھے آپ کی دنیا اچھی نہیں لگی مگر آپ سے اچھا تو دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کے احسانات کے بارے میں دبا ہوں۔ جان دے سکتا ہوں، چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“ وہ بڑے جاندار انداز میں مسکرائی، ایک ذرا لہرائی، بولی۔ ”دیکھ لو..... گولیوں کے شور میں اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ خون بہنے لگے تو جسم ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے۔ پھر انسان پچھتاووں کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔ اکثر پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملتی ہماری دنیا میں۔“

اس کی آنکھوں سے ہویدا تاثرات نے میرا دل یکبارگی دھڑکا دیا۔ وہ جتنی خوب صورت تھی، اتنی ہی خوب صورت باتیں کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بہت زیادہ بڑھی لکھی، یونیورسٹی لیول کی لڑکی تھی۔ ہر رنگ میں پیاری لگتی تھی۔ خدا جانے کن حالات کے تحت وہ اس مقام پر پہنچی تھی کہ آنکھوں کے اشاروں سے قتل کے احکامات صادر کرتی تھی۔ اس کی گفتگو اور رک رکھاؤ کے پیش نظر اس کے کردار اور افعال کی مظاہر کہانیوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”میڈم! میرے ماں باپ کسی ظالم بھیڑیے نے برسوں پہلے قتل کر دیے تھے۔ مجھے نہ تو قتل کی وجہ معلوم ہو سکی، نہ میرا ہاتھ قاتل کی گردن تک پہنچ پایا۔ والدین کے بعد میرا دنیا میں ایک ہی رشتہ بچا تھا، وہ تھا بہن کا۔ بہن سائیں دل جیت کے ہاتھوں سے گزر کر سردار حیدر تک پہنچ گئی ہے۔ خدا جانے کس حال میں ہے، زندہ ہے، مردہ ہے یا مردوں سے بھی بدتر ہے۔ اگر وہ مل گئی تو اس کے بارے میں سوچوں گا۔ نہیں ملی تو پھر سردار حیدر خان کی گردن ناپوں گا۔ کہیں زندگی میں ماں باپ کا قاتل مل گیا تو اس سے حساب کتاب کروں گا۔ بس..... یہی میری زندگی ہے..... یہی زندگی کا مقصد..... رہی بات جذبات کی، تو کل تک کھالا تھا، ڈاکٹر شاہ جی تھا اور میری منگیتر تھی۔ آج آپ ہیں، میرا شاہ ہے اور میں..... کل کیا ہوگا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جب مجھ پر اعتماد نہ رہے، مجھے کہہ دیجیے گا۔ میں ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گا۔ جانے کے بعد آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے قتل نہ کروا دیں گے، بلکہ مجھے اپنی زندگی میں

کے مقاصد پورے کرنے کی مہلت دیجیے گا۔“ میری گفتگو لہجے کی سختی سے شروع ہوئی تھی، ناہیدہ آنسوؤں کی نمی پر مٹج ہوئی۔ وہ مجھے یہ غور دیکھتی رہی، زیب آئی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”شہر یار! تم بہت بہت انسان ہو، سمجھ گئی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ آئی لو یو شہر!“

میرے ہاتھوں پر اس کے گداز ہاتھوں کا لمس..... کانوں میں اترتا ہوا جملہ آئی لو یو شہر!..... میرے لیے نہایت غیر متوقع تھے۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ زبان تھم گئی۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تمہاری بہن تمہیں ضرور ملے گی مگر تم اسے نور پور میں نہیں رکھ سکو گے۔ کیونکہ سردار حیدر خان ناکامی پر تھملا کر، اپنے کالے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے تمہیں اور تمہاری بہن کو مردادے گا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ تم اس کے گرگوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ دعا کرو، تمہاری بہن جلد ہاتھ لگ جائے اور میں تمہیں انسانوں کے اس جنگل میں، اس شہر میں، کہیں چھپا دوں۔“

اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا اور مسکرا کر بولی۔ ”کم آن..... ہمیں قلعہ بند ہونا ہے کیونکہ کسی وقت بھی میرا شاہ کی کال آ سکتی ہے۔“

میں اس کے عقب میں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ گیلری خالی تھی۔ چند لمحوں بعد پتا چلا کہ فرسٹ فلور بھی خالی تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر آئے۔ گیٹ ہاؤس کی مشرقی گیلری میں آخری کمرے کے دروازے تک چلے گئے۔ اس کمرے کے بالقابل ہاتھ روم تھا جس کا واش بیسن گیلری میں نصب تھا۔ وہ جھکی اور واش بیسن کے پانی والے زیریں پائپ کے سامنے پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ پائپ اور دیوار کے بیچ میں ہاتھ ڈالا، کلائی موڑی اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ مجھے اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ یہ بالکل اسی نوع کا کمرہ تھا، جس طرح کے کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ جہازی سائز کے بیڈ کا چکر کاٹ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھی۔ میں بیڈ کے پاس ہی رک گیا۔

وہ ہاتھ روم میں چند لمحوں تک مصروف رہی، پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”شہر یار! کم آن.....“

میں ہاتھ روم میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ فرش کے پار، دو فٹ چوڑائی کی حامل سیزھیاں موجود تھیں۔ میڈم دوسرے زینے پر کھڑی پلٹ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے نقش پا پر چلتا ہوا بیٹھ بیٹھوں تک آیا۔ اس نے اپنے دواڑ کے ساتھ کمر کا کمرہ مجھے نیچے جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں دیواروں کے مابین محض دو فٹ کا

فاصلہ تھا۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ ٹماٹر رسلٹا۔ میری پلچا ہٹ پر بولی۔ ”گزر جاؤ ناں..... میں نے یہ راستہ بند کرنا ہے۔“

میں نے فح کر گزرتا چاہا مگر اس کے دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے بدن سے رگڑ کھاتا ہوا یہ مشکل گزر پایا۔ یہ مرحلہ بڑا جاں کسل تھا۔ جب میں تین چار سیڑھیاں اتر کر رکھا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ بیٹھی، دیوار کی جڑ میں کچھ کر رہی تھی۔ میری حیرت دو چند ہوئی جب میں نے دائیں ہاتھ والی دیوار کو آہستہ سے سرکتے ہوئے پڑھیوں اور ہاتھ روم کے درمیان حائل ہوتے دیکھا۔ چڑھوں بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے سیڑھیوں کے سامنے آف وائٹ کلر کی دیوار چن دی گئی ہو۔ زیر و واٹ کا بلب روشن نہ ہوتا تو کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وہ راستہ مسدود ہونے کے بعد بھی چند لمحوں دیوار کی جڑ میں بیٹھی رہی، پھر کھڑی ہو کر زینے اترنے لگی۔ زینوں کا اختتام ایک کشادہ کمرے میں ہوا جو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ہموار چھت میں تین ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ پہلی نظر میں ’اسٹور‘ محسوس ہوا کیونکہ کئی کریٹ سائز کی چوبلی پٹیاں، عام استعمال کا گھریلو سامان اور پولی پرائیمن کے تھیلے ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میڈم نے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”اسٹور کا دروازہ کھولو۔“

میں نے چونک کر چار سو دیکھا۔ سوائے سیڑھیوں کے خلا کے کوئی دروازہ نہیں تھا۔ تب مبہوت رہ گیا جب چوبلی پٹیاں کے عقب میں پندرہ سہ فٹ لمبی دیوار آہستگی سے دائیں ہاتھ کھسکنے لگی اور کٹڑ میں ایک خلا نمودار ہو گیا۔ دو ضرب تیرہ فٹ چوڑے خلا کے پار ایک طویل گیلری دکھائی دی۔ میڈم نے گیلری میں قدم رکھنا تھا کہ فائر کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ وہ چونک کر لٹی، بولی۔ ”ہری اپ شہر یار! ایک ہو گیا ہے۔“

فائر کی آواز تیز نہیں تھی مگر پچان لی جانے والی تھی۔ میں نے گیلری میں داخل ہونے میں دیر نہیں کی اور بھاگنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی میڈم ٹکیلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو دیوار سر کر خلا کو بند کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں فائرنگ کی ہلکی مگر مسلسل آوازیں ہمارے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میڈم نے ٹھک کہا تھا کہ کوئی پر سردار حیدر خان کے گروگوں کا حملہ ہو گیا تھا۔

تقریباً تین سو فٹ لمبی گیلری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دیوہیا بلب روشن تھے۔ گیلری کا دوسرا سرابند تھا۔ ہم ابھی نصف فاصلہ طے کر پائے تھے کہ گیلری کو بند کرنے والی دیوار

جی بامیں ہاتھ سرکنے لگی۔ ہمارے وہاں پہنچے تک اس نے جتنا ہٹا تھا، ہٹ گئی اور ہمارے گزرنے کی جگہ بن گئی۔ گیلری ایک بارہ ضرب چودہ فٹ کے کمرے میں کھلی تھی جو عجیب ساخت کی گتے کی پٹٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں ابھی اپنی حیرت میں گم تھا کہ بھول بھلیوں کا ایک اور مرحلہ شروع ہو گیا۔ ہمارا سفر ایک فلیٹ نما عمارت میں اختتام پذیر ہوا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں گیسٹ ہاؤس سے کم و بیش آٹھ سو فٹ دور اور سطح زمین سے بیس بائیس فٹ کی گہرائی میں کھڑا تھا۔ پہلے کمرے اور گیلری میں فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تھے، فائرنگ کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ شاید فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ گیلریوں میں گھسن کا احساس ہوتا تھا مگر یہاں کی فضا جس آلودہ نہیں تھی۔ یہاں چار کمرے تھے جن کے نیم وادروازوں سے ملی جلی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ دس پندرہ یا اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگ یہاں موجود تھے۔

میڈم ٹکیلے نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ دس ضرب آٹھ سائز کی ٹی وی لائونج نما گیلری میں کھلنے والے چاروں میں سے آخری دروازہ عبور کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں نے تقلید کی۔ کمراتنا بڑا نہیں تھا۔ مجھے داہنی دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دوسری دیوار تک گئی۔ چوبلی میز پر کمپیوٹر رکھا تھا۔ وہ سوچ بورڈ پر کئی بٹن پیش کرنے کے بعد کمپیوٹر کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسے میں اس کی پشت میری جانب تھی۔

میڈم نے فون پر کسی سے رابطہ کیا، سخت لہجے میں بولی۔ ”تم استاد بھلو کو ٹریس کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہو، ڈیٹیلز مارنے کے علاوہ تمہاری تمام صلاحیتیں زنگ پکڑنے لگی ہیں۔“

وہ یقیناً میرا شاہ سے بات کر رہی تھی۔

”ہاں تو! کوئی پر حملہ ہو چکا ہے۔ فائرنگ کی آواز میں نے سنی ہے۔“

میرا شاہ کی بات سن کر بولی۔ ”میرا فکر نہ کرو، میں سی ٹو میں پہنچ چکی ہوں۔ سبھی لوگ محفوظ ہیں۔ تم حملہ آوروں سے دور رہو۔ جو کرتے ہیں، کرنے دو۔“

میں نے ایک منظر میرا دیکھا ہوا تھا۔ کوئی کا کھلا ہوا مین گیٹ دکھائی دے رہا تھا جس کے پار تین گاڑیاں سڑک پر کھڑی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی کرولا کار بھی جبکہ دوسفید رنگ کے فورویل ڈبل کین ڈالے تھے۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ سبھی گاڑیاں، مین گیٹ کا وچ مین کین اور برآمدے کی طرف آتی ہوئی چوڑی روش خالی تھی۔ کوئی ذی نفس اسکرین پر متحرک نہیں تھا۔ دوسرے مناظر میرے نزدیک اجنبی تھے۔

میڈم فون پر میرا شاہ سے مخاطب تھی۔ ”میرا شاہ! سبھی لوگ کوئی میں اٹل ہو چکے ہیں۔ تم پٹرولنگ اور ایلٹ فورسز کو فون پر اطلاع دو۔ ان میں سے کوئی بھی فح کر نہ جائے۔ ایک آدی کو ایسی پوزیشن پر تعینات کرو جہاں سے وہ کسی کی نگاہ میں نہ آئے اور آسانی سے کسی پولیس آفیسر کا نشانہ نہ لے سکے۔“

پھر بولی۔ ”ہاں ہاں! جب تک کوئی پولیس والا نہیں گرے گا، مقابلے میں جان نہیں پڑے گی۔“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ کسی اور کا نمبر ملا لیا۔ وہ اس وقت پوری طرح متحرک تھی۔ فون کان سے لگائے میری طرف پلٹی اور ہاتھ کے اشارے سے پانی طلب کیا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے ایک کونے میں پورٹیل فریج موجود تھا۔ اسے نوڈ بانہ انداز میں پانی کا گلاس پیش کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ وہ کسی پولیس آفیسر سے جو کلام تھی۔

کمپیوٹر اسکرین پر پھیلے ہوئے مناظر قریب سے اور اجاگر ہو گئے۔ چاروں چوٹوں میں ماہرانہ انداز میں نقل و حرکت کرتے ہوئے گن بردار نظر آئے۔ چونکہ میڈم فون پر باتیں کر رہی تھی، اس لیے میں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ خاموش رہتا بھی مشکل تھا۔ گن برداروں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی۔ ان کی حرکات سے عیاں مشافی ان کے عزائم کو آشکار کرتی تھی۔ وہ میڈم کو تلاش کر رہے تھے مگر خالی کمرے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ ایسے میں میڈم نے فون پر بھی ہوئی بساط لپیٹ لی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ ”کوئی میں نصب شدہ کیمروں نے اب تک دس آدمیوں کو ٹریس کر لیا ہے۔ ان میں استاد بھلو شامل نہیں ہے۔ اگر بروقت پولیس پہنچ جائے تو مزہ آ جائے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا یہ لوگ یہاں تک نہیں پہنچ سکتے؟“

وہ قدرے تفاخر سے بولی۔ ”نہیں شہر! وہ اگلے جنم میں بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ جگہ سی ٹو کہلاتی ہے۔ ایسی ہی دو محفوظ پناہ گاہیں ہیں جنہیں سی ون اور سی تھری کہا جاتا ہے۔ یہ کوڈ ورڈ لا ہیں تاکہ کسی سنے دانے کو کوکیشن کا

پتہ نہ چل سکے۔“

میری نظر مانیٹر کی اسکرین پر مرکوز تھی۔ مین گیٹ والی ’ونڈو‘ پر مجھے پولیس کی موبائل وین رکتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے فوراً میڈم کی توجہ اس جانب دلائی۔ اس نے دیکھا تو لبوں پر ایک دل فریب مسکراہٹ ابھرا آئی۔ ماؤس کی مدد سے ’ونڈو‘ کو مانیٹر کی پوری اسکرین پر پھیلاتے ہوئے چکی۔ ”اب مزہ آئے گا شہر یار!“

مانیٹر کے پہلوؤں میں نصب اسپیکرز میں سے پولیس وین کے ہوڑ کی ہلکی ہلکی آواز ابھرنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میدان کارزار سج گیا۔ دو طرفہ فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا اور جو سین بھی کوئی میں نصب شدہ کیمروں کی نظر میں محفوظ ہوتا، ہم تک پہنچ جاتا۔

میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ میڈم اسکرین میں مستغرق تھی۔ چونکہ میں اسکرین پر متحرک لوگوں کی سرگرمیوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے قابل نہیں تھا، اس لیے جلد ہی اکتا گیا۔

میں نے آہستگی سے پوچھا۔ ”میڈم! میں گھوم پھر کر سی ٹو دیکھ لوں؟“

وہ چونک کر بولی۔ ”ہاں! کیوں نہیں..... یہاں تمہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔“

اس کا لہجہ چغلی کھار ہا تھا کہ میری وہاں موجودگی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میں کمرے سے نکلا، لائونج نما ہال میں ادھر ادھر دیکھ کر ساتھ والے کمرے کے دروازے پر جا رکھا۔ کان لگائے مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ کمرہ خالی تھا یا کمرے میں موجود لوگ قطعی طور پر خاموش تھے۔ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو دروازے کے عین سامنے ڈریسنگ چیئر پر بیٹھی ہوئی عورت کی پشت دکھائی دی۔ آئینے میں چہرہ سجا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سونیا تھی۔ میں نے انگلی کی ضرب سے دروازے پر ہلکی سی دھک دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے آئینے میں دیکھا، مسکرا کر بولی۔ ”یس کم آن.....“

کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ پڑا تھا جس پر سیدھے رخ اسما پڑی تھی۔ گزشتہ رات کی طرح وہ گہری نیند میں تھی۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا سونیا کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا چہرہ سنوار رہی تھی۔ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں میری کشش یہاں لائی ہے یا اس بے ہوش لڑکی کی؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بولی۔ ”تمہارا ذہن پانس دیتے کے لیے جواب نہیں دیتے۔“



حکم

سیمبایدید

بینائی کا دھوکا... دانائوں کا بھروسا
بہت کم لوگوں کو اس آتا ہے مگر... جسے
راس آجائے وہ پانچوں انگلیاں گھپی میں اور سر
کڑھائی میں کے مترادف ہوتا ہے... اگرچہ یہ
مقدروں کا کھیل ہے مگر موقع سے فائدہ اٹھانے والا مقدر کا
کھلاڑی بن جاتا ہے... اور اس ہنرمیں اسے کمال حاصل تھا۔

حماقتوں کے بھنور سے ابھرنے والے ایک خوش قسمت کاماجرا

اس روز میں بے حد پریشان تھا۔
میں نے ڈائلٹ سے وعدہ کیا تھا کہ شام کو اسے ساتھ
لے کر پہلے ڈنر کے لیے کسی اچھے سے ہوٹل میں جاؤں گا اور
پھر مل کر کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے... لیکن میرے پاس
مسٹر بیر نے یہ کہہ کر سارے پروگرام کا ستیاناس مار دیا کہ
حاضر اسٹاک کی مکمل فہرست فوری طور پر درکار ہے۔ مجھے
غصہ تو بہت آیا لیکن اس ملازمت کے بغیر میں ڈائلٹ سے
شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

صاف عیاں تھا کہ وہ مجھے ٹر خا رہی تھی۔ میں مصر نہیں
ہوا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دسک ہوئی۔ اجنبی مگر
جلبے سے ملازم دکھائی دینے والا شخص کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔
مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ”آپ کو میڈم بلارہی ہیں۔“

میں سونیا کے کمرے سے نکل کر میڈم کے پاس پہنچا۔
وہ بہ دستور کمپیوٹر کے سامنے براجمان تھی۔ مجھے کچھ کہنا چاہتی
تھی کہ کی بورڈ کے پاس پڑا ہوا موبائل فون بجا۔ اس نے
اسکرین کو دیکھتے ہوئے کال ریسپونڈ کر لی، بولی۔ ”ہاں میرا شاہ!
کیا رپورٹ ہے؟“

دوسری طرف کی آواز سن کر میڈم کا چہرہ کھل اٹھا۔
’اوکے‘ کہہ کر فون بند کر دیا اور بولی۔ ”خس کم جہاں پاک،
کوٹھی پر حملہ کرنے والوں میں سے دو آدمی پولیس کے ہاتھوں
ہلاک ہو گئے ہیں جبکہ باقی دم دبا کر فرار ہو گئے۔ گڈ نیوز!“
اس نے جلدی جلدی ماؤس کو حرکت دی۔ کسی اور
کمرے کا ”آئی کون“ کلک کیا۔ ایک اور منظر کھل گیا۔
کمرے کی طرف پٹھے کیے گٹھے ہوئے جسم والا ایک شخص
کاندھے پر گن لٹکائے کھڑا تھا اور چوکس انداز میں اطراف
کا جائزہ لے رہا تھا۔

میڈم نے فون پر کسی سے رابطہ کیا اور نفرت آمیز انداز
میں بولی۔ ”ایک مفرور حملہ آور کوٹھی کی عقبی کھلی میں کھڑا
ہے۔ تم لوگ گلی کے دہانے پر پہنچ جاؤ۔ گلی سے نکلتے ہی اسے
غائب کر دیا جائے۔“

کال منقطع کر کے خود کلامی کے سے انداز میں
بولی۔ ”کاش! اس کمرے کے ساتھ آٹو گن بھی نصب ہوتی
جو ایک بٹن دبانے پر اس حرام زادے کی کھوپڑی میں
سوراخ کر دیتی۔“

ایسا ممکن تھا یا نہیں، میں نہیں جانتا تھا۔ میری نظریں
اس چاق چو بند مفرور کی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں
لگ رہا تھا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھ رکھا تھا۔ ایک تو ونڈو
میں نظر آنے والی تصویر کافی حد تک دھندلائی ہوئی تھی، دوسرا
میں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اچانک وہ کمرے کی طرف پلٹا۔
اب اس کا چہرہ سامنے تھا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے تمام تر
بدن کا خون سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گیا ہو۔ میری
سانس رکنے کو آگئی اور میں بے اختیار چیخ پڑا۔

معاشرتی ناہنویوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو
کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اکیلے بڑاؤ کا احوال آئندہ بہ

یا جواب دینا نہیں چاہتے ہو؟“
میں نے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“
وہ بولی۔ ”میڈم کیا کر رہی ہیں؟“
”کمپیوٹر پر بیٹھی ہے۔“

”اچھا!“ اس نے یوں کہا جیسے وہ سمجھ گئی ہو کہ میڈم
کمپیوٹر پر کیا کر رہی تھی، بولی۔ ”تم کہاں سے آئے ہو؟“
میں نے کہا۔ ”گاؤں سے!“
اس کا بالوں میں برش پھیرتا ہاتھ رک گیا،
مسکرائی۔ ”گاؤں کا کوئی نہ کوئی نام بھی ہوگا؟“
میں نے کہا۔ ”نہیں... اس کا کوئی نام نہیں ہے۔“
اس کی آنکھوں میں شرارت اتر آئی مگر اس نے منہ
سے کچھ نہیں کہا۔ آنکھوں سے سمجھا دیا کہ جھوٹ بولنا اچھی
بات نہیں ہوتی۔ بالوں کو کاندھے پر پھیلاتے ہوئے
بولی۔ ”کیا اس لڑکی کا چہرہ دیکھ کر تمہارے دل کی دنیا زیرو
زبر نہیں ہوتی؟“

میں نے کہا۔ ”اس میں ایسی کیا بات ہے؟“
وہ مسکرائی۔ ”یہ تو کوئی مرد ہی بتا سکتا ہے۔“
”تمہارا تجربہ بھی تو کچھ کہتا ہوگا؟“

”نہیں... میں اپنے سوا کسی کے بارے نہیں سوچتی۔“
”پھر اپنے سوا کسی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟“
”بس! ویسے ہی۔“ وہ کھسکا کر بولی۔ ”کیا تم ہمیشہ یہیں
رہو گے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ میں نے کاندھے اچکائے۔ ”میں
اپنے حال کو نہیں جانتا، مستقبل کے بارے میں کیا رائے قائم
کر سکتا ہوں۔“

”ہوں...“ اس نے ہنکارا بھرا، پھر ہاتھ روک کر
کریدتی ہوئی نگاہوں سے میرا سراپا جائزہ لیا، بولی۔ ”تم
بڑے پینڈسم ہو۔“

میں نے کہا۔ ”تم بھی کم نہیں ہو۔“
”بھی مجھے اپنے فریب نہیں آنے دیتے ہو؟“ اس کے
لہجے میں شرارت عیاں تھی۔ میں نے آنکھیں چرا لیں،
پوچھا۔ ”کیا میڈم کا اصل نام شکلیہ ہی ہے؟“
وہ بولی۔ ”کیا یہ سوال میری طرف دیکھ کر نہیں کیا
جاسکتا؟“

میں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا کھلا کھلا چہرہ،
جوانی کا شرارت آمیز دعوت نامہ بنا ہوا تھا۔ میں نے سنجیدہ
رہتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولی۔ ”اس کا نام میڈم
شکلیہ ہی ہے۔“



روزگار

ٹیلی ویژن پر ایک دیہاتی کائنات پر پیش ہو رہا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ”ہمارے قصبے کے لوگ بے حد خوشحال ہیں اور ان کی صحت بھی اچھی ہے، یہی وجہ ہے کہ پچھلے پانچ برس سے ہمارے قصبے میں صرف ایک آدمی کی موت واقع ہوئی ہے۔“

انٹرویو لینے والا یہ سن کر بہت حیران ہوا، اس نے پوچھا۔ ”بہت خوب! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ بد نصیب شخص کون تھا اور اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟“

دیہاتی نے جواب دیا۔ ”جناب! وہ ہمارے قصبے کا واحد ڈاکٹر تھا اور اس کی موت فاقوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔“

مراسلہ نگار..... طیبہ طاہر، دادو

بہر حال، تم اس کی بیوی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ ”صرف اتنا کہ وہ سماجی کاموں میں الجھی رہنے والی ایک ایسی عورت تھی جس کا زیادہ تر وقت تقریریں کرنے میں صرف ہوتا ہے۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“ والٹ نے ہنس کر کہا ”سماجی شخصیت ہونے کی وجہ سے اس کے بارے میں آئے دن کوئی نہ کوئی خبر شائع ہوتی رہتی ہے..... اور تازہ ترین خبر یہ ہے کہ آج رات وہ اپنے گھر پر موجود نہیں ہے بلکہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی ہے میں نے شام کے اخبار میں یہ خبر تفصیل سے پڑھی تھی۔“

میں پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ.....“ ”اور سنو.....“ اس نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”اس نے سرشام ہی فون کر کے کہا تھا کہ رات آٹھ بجے اس کے ہاں درجن بھر تازہ گلاب بھجوا دیے جائیں۔ میں نے کال تو ریسیو نہیں کی تھی البتہ جو گل دستے بھجوائے جا رہے تھے، ان پر لگی ہوئی پتے کی پرچیاں ضرور پڑھی تھیں۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی میں کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا.....“

میں اس کا مطلب عجوبی سمجھ رہا تھا۔ اس کی بیوی شہر

نہیں پوچھا کہ خود میں کس حال میں ہوں؟ کہیں میں زخمی تو نہیں ہو گیا؟

میرا سر گھوم رہا تھا اور پیٹ میں درد کی لہروں کا سیرا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے گھر پہنچ کر سیدھا بستر پر لیٹ جانا چاہیے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس صورت حال میں والٹ ہی سے ہاتھ نہ دھونا پڑیں۔

فون کرنے کے بعد اتنی ریزگاری تھی کہ میں بس کے ذریعے والٹ کی دکان تک پہنچ سکتا تھا۔ شہر کے وسطی حصے میں وہ پھولوں کی ایک دکان پر ملازم تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ گھبرائی ہوئی میری طرف دوڑ پڑی۔

”اوہ جارج۔ یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟“ اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر ایک کاؤچ میں لٹا دیا۔

”دو غنڈوں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔“ میں نے کراہ کر بتایا۔

”زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟“

میں نے اسے اطمینان دلایا کہ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں البتہ انہوں نے میرا نچر ضرور ڈھیلا کر دیا ہے۔ اس نے تو لیا جھگو کر میرا چہرہ صاف کیا۔

میں نے مسٹر پیری کے پیکٹ سے اس کے پاس پہنچنے تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا اور یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ مسٹر پیری کے ہاں کل میری ملازمت کا آخری دن ہوگا۔

”مسٹر پیری کو اس پیکٹ کی آج ہی رات ضرورت تھی؟“ والٹ نے چونک کر دریافت کیا۔ ”اور وہ اپنی بیوی کو تحفہ دینا چاہتا تھا؟“

”ہاں..... شاید مسٹر پیری کی سالگرہ کا چکر ہے۔“ وہ نہایت انہماک سے میرے چہرے کو پوچھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ”تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہیں ملازمت سے نکال دے گا؟“

”ممکن ہے وہ اس پیکٹ کی رقم میرے ذمے ڈال دے..... یا پھر ممکن ہے ملازمت سے نکالنے کے ساتھ ساتھ اس رقم کا بھی تقاضا کر دے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے، والٹ!“ میں نے بے بسی سے کہا۔

والٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”تم فکر نہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا۔“

”کیا مطلب؟“ میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے بھیگا ہوا تو لیا ایک طرف رکھ دیا اور بولی ”ایک بار تم نے تذکرہ کیا تھا کہ وہ چھ آوارہ قسم کا آدمی ہے۔“

اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں دکان سے ایک بلاک کے فاصلے پر پہنچا تھا کہ اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ میں چاروں خانے چت کر گیا۔ جب حواس قدرے بحال ہوئے تو خود کو دو غنڈوں کے زرخے میں پایا۔

وہ میری جامہ تلاشی لینا چاہتے تھے لیکن میں ہاتھ پاؤں مار کر نہ صرف اپنی جیبوں کو ان کی دسترس سے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ خود کو ان کے گھونٹوں اور ٹھوکروں سے بھی بچا رہا تھا۔ اچانک ان میں سے ایک نے میرے زرخے پر بازو بھجایا تو میری مدافعتانہ کارروائی کا ایک دم توڑ گئی۔

دوسرے نے پے در پے میرے پیٹ میں ٹھوکریں ماریں۔ پھر نہ صرف میری تلاشی لی گئی بلکہ جیسیں تک ادھیڑ ڈالیں۔ پیکٹ اور میرا بٹوا حاصل کرنے کے بعد دونوں غنڈے بھاگ نکلے میں نے یہ مشکل خود کو فٹ پاتھ سے اٹھایا۔ اس وقت تک دونوں غنڈے نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

میرے کپڑے پھٹ گئے تھے اور مجھے خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ میں دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا اور گہری گہری سانس لینے لگا میرے بٹوے میں آخری پونجی بیس ڈال رہی، وہ ضائع ہو چکی تھی اور مسٹر پیری کا پیکٹ بھی مجھ سے چھن چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس صورت حال میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟

چند لمحوں کے بعد میں نے اپنی ذہنی حالت کو سنبھالا اور سب سے پہلے قریبی ٹیلیفون بوتھ تک پہنچا۔ جیب میں تھوڑی سی ریزگاری تھی اسے استعمال کر کے میں نے کانپتے ہاتھوں سے مسٹر پیری کے گھر کا نمبر ڈائل کیا اور صورت حال بتانے لگا۔

”کیا بک رہے ہو؟“ اس کی دھاڑ سنائی دی۔ ”جانتے ہو اس پیکٹ میں کیا تھا۔ اس میں چار سو ڈالرز کے ہیرے تھے۔ ایک نگین تھا اور ایک قیمتی انگوٹھی تھی۔“

”میں نے ہر ممکن کوشش کی تھی، مسٹر پیری لیکن.....“ ”یہ نقصان نہیں پورا کرنا پڑے گا، جارج۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں اس سلسلے میں کل صبح تم سے بات کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھامنے پر مجبور ہو گیا میں نے اس منحوس پیکٹ کے لیے گھونٹے اور لاتیں برداشت کی تھیں اور مرتے مرتے بچا تھا لیکن مسٹر پیری کو اپنے ہیروں اور زیورات نہی سے ڈپٹی تھی۔ اس نے یہ تک

وائٹ، مس امریکا نہیں تھی بلکہ خوب موٹے موٹے عرسوں کا چشمہ استعمال کرنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ اس کے آنٹی رنگ کے بال اور ناک کا خفیف سا خم مجھے اتنا پسند تھا کہ ان کا خیال ذہن میں لاتے ہی میری دھڑکیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ مسٹر پیری کی حکم عدولی ممکن نہیں تھی اور فہرست تیار کرنے کے لیے تین گھنٹے سے کچھ زیادہ ہی وقت درکار تھا۔ میں نے والٹ کو فون کیا اور بے بسی ظاہر کر دی۔ توقع کے مطابق اس نے نہ صرف میری معذرت قبول کر لی بلکہ یہ دعوت بھی دے دی کہ واپسی میں اس کی دکان سے ہوتا جاؤں۔ اس نے ہلکے پھلکے کھانے کی تیاری کا وعدہ کیا تھا اس لیے میں نے اقرار کر لیا۔

میں جیولری کی جس دکان پر ملازم تھا اس کا مالک مسٹر پیری ایک کھنور سا آدمی تھا۔ ہر وقت کام میں گدھوں کی طرح جتا رکھنے کے باوجود نہ تو تنخواہ بڑھا رہا تھا اور نہ ہی ادور ٹائم دینے پر کبھی رضامندی ظاہر کی تھی۔ میں دل ہی دل میں اپنی قسمت کو کوستا ہوا فہرست تیار کرتا رہا حتیٰ کہ ساڑھے آٹھ بجے اس کام سے فارغ ہو گیا۔

ابھی میں جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ریسیور اٹھایا تو مسٹر پیری کی منحوس آواز سنائی دی۔ ”ہیلو جارج..... کہو..... کام کیسا جا رہا ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”فہرست تیار ہو چکی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب.....“ اس نے کہا۔ اس سے زیادہ تعریف اس شخص سے متوقع بھی نہیں تھی۔ ”دیکھو، میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ میری میز پر ایک پیکٹ رکھا ہے۔ میں اسے ساتھ لانا بھول گیا تھا۔ ٹیکسی پکڑو اور میرے ہاں پہنچا دو۔ کرایہ میں ادا کروں گا۔“

میں جبرے بھیجے کھڑا رہا۔ وہ شہر کے دوسرے کنارے پر رہتا تھا۔ ٹیکسی میں سفر کرنے کے باوجود نصف گھنٹے سے زیادہ وقت لگنے کا امکان تھا گویا میں والٹ سے کہے ہوئے دوسرے وعدے کو بھی پورا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مسٹر پیری شاید میری جان ہی جلانے کے درپے تھا۔

”بحث نہ کرو۔ اس پیکٹ میں ایک تحفہ ہے جو میں آج رات اپنی بیوی کو دینا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ مسٹر پیری کی دراز سے پیکٹ نکال کر میں باہر آ گیا۔ آٹن پاس کوئی ٹیکسی دکھائی نہ دی تو میں پیدل ہی ٹیکسی



جب سے تخلیق کائنات عمل میں آئی ہے اور انسان کو دنیا میں اتارا گیا ہے... تب سے انسانیت اصلاحی مدارج طے کرتے ہوئے معراج انسانیت کی طرف گامزن تو ہے مگر... اصلاح اعمال کے لیے اللہ نے بعثت کا سلسلہ جاری کیا تاکہ خالق و مخلوق کے درمیان پہچان کا رشتہ قائم رہے... ان ہی برگزیدہ بندوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا بھی شمار ہوا۔ جنہیں اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح بادشاہت کے ساتھ ساتھ نبوت بھی عطا ہوئی اور جن وانس، چرند پرند آپ علیہ السلام کے تابع ہوئے... اور ایسا عظیم الشان دربار نصیب ہوا کہ کبھی کسی اور کے حصے میں نہ آیا کہ جہاں ہر مخلوق ہاتھ باندھے کھڑی تھی... سبحان اللہ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
رضوانہ ساجد

ایک عظیم بادشاہ اور عظیم نبی حضرت سلیمان کی روایت حیات

کلام پاک میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ یہ ضرور ملتا ہے کہ خدا نے آپ کی آزمائش کی تھی اور آپ پر امتلا کا ایک دور گزرا تھا۔ سورہ ص کی آیات اس پر شاہد ہیں۔
”اور بے شک! ہم نے سلیمان علیہ السلام کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اس کی کرسی پر ایک جسم پھر وہ اللہ کی جانب

سے فاتحانہ انداز میں واپس آ گیا۔
گھر پہنچ کر میں نے وائلٹ کو فون پر اطلاع دی کہ معاملہ ہماری توقع کے عین مطابق ہی ثابت ہوا ہے۔ وہ جواباً خوشی سے چٹخ پڑی اور خود میرا بھی جی چاہا کہ خوشی سے گھنٹوں چنتا ہی رہوں۔

اگلے روز مسٹر پیری نے شوروم میں قدم رکھا تو اس نے میری طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ خاموشی سے اپنے دفتر میں جا گھسا۔ دس بجے کے قریب اس نے مجھے بلایا تو اس کے نقش و نگار معمول کے مطابق تھے اور لہجہ بھی قدرے سخت تھا۔
”جارج..... میں اس افسوس ناک حادثے کے بارے میں سوچتا رہا ہوں، جو کل رات تمہیں پیش آیا تھا۔ میرا خیال ہے پولیس جلد ہی ان غنڈوں کا سراغ لگا کر ہماری اشیاء برآمد کر لے گی۔ بہر حال مجھے افسوس ہے کہ میں نے رات فون پر تم سے سخت کلامی کی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

میں نے اسے اپنی بہترین مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے، جناب! کیا میں اپنی تنخواہ میں کچھ اضافے کی بھی توقع کر سکتا ہوں؟“
اس کے جڑے ایک لمحے کو تن کر ڈھیلے پڑ گئے۔ ”اوہ، ہاں تمہاری کارکردگی قابل اطمینان ہے، پچیس ڈالر زنی ہفتہ.....“
”پچاس ڈالر، جناب!“ میں نے جلدی سے کہا۔
ایک بار پھر اس کے جڑوں میں تناؤ اور پھر ڈھیلا پن پیدا ہوا..... پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے پچاس ڈالر کا اضافہ ہی سہی.....“

☆☆☆

اس رات میں نے وائلٹ کے ساتھ خوب شاندار جشن منایا۔ میں نے ضرورت سے زیادہ ہی شراب پی تھی اور خاصا بہک رہا تھا۔ وائلٹ بھی بات بے بات ہنس رہی تھی۔ اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ ”لیکن ڈارلنگ..... رات میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں نے تمہارے جانے کے بعد ڈیلیوری رجسٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گلاب کا آرڈر کسی اور مسٹر پیری نے دیا تھا تم تو جانتے ہی ہو کہ میری نگاہ خاصی کمزور ہے۔ میں نے ایسٹ پارک آرمرز کو ویسٹ پارک پڑھا تھا۔“

چند لمحوں تک میں سب کچھ بھول کر وائلٹ کو حیرت سے دیکھتا رہا..... پھر اس کی کمزور بینائی کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کرنے لگا۔



سے باہر لگی ہوئی تھی اور وہ کسی اور کو اپنے ہاں مدعو کئے ہوئے تھے..... کوئی ایسی عورت جسے وہ نہ صرف قیمتی کلکتا بلکہ انگلی اور گلاب بھی تحفے میں دینا چاہتا تھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ وائلٹ نے اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل چٹکیوں میں حل کر دی تھی۔

”کیا تمہیں یقین ہے ڈارلنگ کہ فون مسٹر پیری نے کیا تھا؟“ میں نے شے کی آخری لہر بھی ذہن سے نکالنے کے لیے تصدیق چاہی۔

”میں نے گل دستے پرائڈریس کی سلب دیکھی تھی، مسٹر رابرٹ پیری..... ویسٹ پارک آرمرز لکھا تھا۔“
میں نے اسے خوشی سے لپٹا لیا۔ میرے سر کا درد اور پیٹ میں اٹھنے والے مردڑ کا یک ختم ہو گئے تھے۔ ”ٹھیک ہے.....“ میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”مجھے ٹیکسی کے کرایے کے لیے کچھ رقم ادھار دے دو..... اور میں جا رہا ہوں۔“

☆☆☆☆

بیس منٹ بعد میں مسٹر پیری کے دروازے پر کھڑا بنے حد پرجوش تھا۔ اس دوران میں نے نہ جانے کیا کیا منصوبے بنا ڈالے تھے۔ میں نے اپارٹمنٹ کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

مسٹر پیری نے دروازہ کھولا اور اس سے پہلے کہ وہ میرے راستے میں حائل ہوتا میں کندھے کے زور سے اسے ہٹاتا ہوا سیدھا خواب گاہ میں جا پہنچا۔ وہ عقب میں چنتا ہی رہ گیا تھا۔

خواب گاہ میں ایک میز پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ دو گلاس بھرے ہوئے تھے اور قریب ہی برف کی ڈلیوں سے براہوا برتن تھا۔ دیوان پر ایک سرخ بالوں والی حسینہ دراز تھی اور اس کی حیرت اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ گلاب البتہ خواب گاہ میں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

”جارج.....!“ مسٹر پیری نے گرج کر کہا۔ ”آخر تمہاری اس حرکت کا کیا مقصد ہے؟“

میں نے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔ ”کچھ نہیں..... کل ہمارے درمیان جو بات چیت ہونے کا امکان ہے، میں اس سلسلے میں تصدیق کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔“

مسٹر پیری کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ نگاہیں چرانے لگا جبکہ سرخ بالوں والی حسینہ اب بھی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے مزید کچھ نہ کہنے بغیر بیرونی دروازے کا رخ کیا اور وہاں

توکل

حضرت ابو عمر حمیل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ 40 سال تک خدا کی رضا کے علاوہ اس سے کچھ طلب نہیں کروں گا۔ ایک مرتبہ آپ کی صاحبزادی شدید علیل ہو گئیں مسلسل علاج کے باوجود مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا چنانچہ ایک رات ان کے شوہر عبد الرحمن سلمی نے ان سے کہا کہ تمہارا علاج تمہارے والد کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ تمہارے والد نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ چالیس سال تک خدا کی رضا کے سوا کچھ طلب نہ کروں گا اور اس عہد کو چالیس سال گزر چکے ہیں لہذا وہ نقص عہد کر کے تمہارے لیے دعا کر دیں تو یقیناً صحت یاب ہو جاؤ گی نقص عہد گناہ ہے لیکن اس سے تمہیں صحت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر وہ آدمی رات کو ہی اپنے والد کے گھر پہنچ گئیں اور جب آپ نے پوچھا کہ ”عقد کے بعد سے تم یہاں بیس سال تک بھی نہیں آئیں پھر آج آنے کی کیا وجہ ہے۔“

صاحبزادی نے عرض کیا کہ ”اس کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے آپ جیسا عظیم المرتبت باپ اور عبد الرحمن سلمی جیسا شوہر عطا کیا ہے اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں زندگی سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتی اور مجھے بھی یہ تقاضا ہے بشریت اپنی زندگی عزیز ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی ہی کی بدولت مجھے آپ کا اور شوہر کا دیدار ہوتا رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے خدا سے یہ عہد کیا ہے کہ چالیس سال تک تیری رضا کے علاوہ اور کچھ طلب نہیں کروں گا۔ لہذا میں آپ کو آپ ہی کے عہد کا واسطہ دے کر عرض کرتی ہوں کہ آپ نقص عہد کر کے میرے حق میں دعائے صحت فرما دیں۔“ لیکن فرمایا آپ نے کہ ”نقص عہد کی طرح جائز نہیں خواہ وہ بندے ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو پھر خدا سے نقص عہد کرنا بہت ہی باعث ملامت ہے اور اگر میں نقص عہد کر کے تمہارے لیے دعا کر دوں اور تم صحت یاب ہو جاؤ پھر بھی اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی اور جب موت کی آمد میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تو پھر اب یا کچھ عرصے بعد موت آنے میں کیا فرق پڑتا ہے۔ لہذا میں اس گناہ کا مرتکب ہونا مناسب نہیں سمجھتا۔“ اس جواب سے آپ کی صاحبزادی کو یقین ہو گیا کہ اب میرا وقت آچکا ہے اور صحت یابی ممکن نہیں لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور آپ کی وفات کے بعد بھی چالیس سال زندہ رہیں۔ (حکایت اولیا سے اقباس)

ابھی آپ کے حکم کی گونج کم نہیں ہوئی تھی کہ ہمد کے پردوں کی آواز آئی اور وہ زمین پر اتر کر تخت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے باز پرس کی۔

”میں حکم دے چکا ہوں۔ تجھے ذبح کر دوں گا یا پھر تو معقول وجہ بتا کہ دربار سے کیوں غیر حاضر تھا۔“

”اے بادشاہ! میری غیر حاضری کی وجہ جان لے۔ اس کے بعد جو سزا ہوگی مجھے منظور ہے۔“

”اگر تیرے پاس کوئی معقول وجہ ہے تو ضرور بتا۔“

ہمد نے کہنا شروع کیا۔ ”میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جس کی خبر آپ کو پہلے سے نہیں ہے۔ میرا گزر یمن کے مشرقی علاقے میں ہوا۔ وہاں میں نے سبانا نام کا ایک شہر دیکھا۔ شہر کیا ہے سونے اور چاندی کا خزانہ ہے۔ یہاں ایک ملکہ حکومت کرتی ہے۔ اس کا تخت نہایت بیش قیمت ہے۔ صرف اس تخت کو دیکھ کر ہی اس قوم کی خوش حالی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن اخلاقی طور پر سب کے رہنے والے بہت گرے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں اور خدائے واحد کو بھولے ہوئے ہیں۔“

”اگر تو اپنی بات میں سچا ہے تو میں ملکہ سبا کو دین حق کی قبولیت کی دعوت دوں گا۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتی تو پھر میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔ تیرے جھوٹ بچ کا امتحان ابھی ہو جائے گا۔ اگر تو سچا ہے تو میرا یہ خط لے جا اور اس کو ملکہ تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اپنے درباروں سے اس کے متعلق کیا گفتگو کرتی ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک خط لکھ کر ہمد کے حوالے کر دیا۔

”یہ خط سلیمان علیہ السلام کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تم کو ہم پر سرکشی اور سر بلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور تم میرے پاس خدا کے فرماں بردار ہو کر آؤ۔“

سبا کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصے یمن کے مشرقی علاقے میں تھا اور دار الحکومت کا نام مارب تھا۔ اس کو شہر سابا بھی کہتے تھے اور آہستہ آہستہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضر موت تک وسیع ہو گیا تھا اور دوسری جانب افریقا تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا چنانچہ حبشہ میں اذنیہ کا علاقہ سبا کے ماتحت تھا جس پر مغائر ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

رجوع ہوا۔ کہا اے پروردگار! مجھ کو بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو میسر نہ آئے۔ بے شبہ تو ہی بخشنے والا ہے۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا کہ وہ اس کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتا تھا۔“

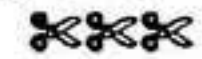
ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو آزمائش پیش آئی وہ کیا تھی۔ صرف یہ اشارہ ہے کہ ان کی کرسی پر ایک جسد الاکبریا۔ احادیث میں بھی کوئی تفصیل نہیں ملتی البتہ مفسرین نے دو آرائش کی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سخت علیل ہو گئے تھے۔ جب تخت پر لا کر بیٹھائے گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم ہے بے روح۔ دوسری رائے یہ ہے کہ آپ ”انشاء اللہ“ کہنا بھول گئے تھے جس پر سزا کے مستحق ہوئے۔

اسرائیلی روایات نے اس آزمائش کے واقعے کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا ہے۔ تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر شیطان کو قابض کر دیا تھا۔ اس کے مختلف اسباب بیان کیے گئے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا، بت پرست تھی اور اپنے باپ کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش کیا کرتی تھی لہذا خدائے تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی تھی اس مدت تک کے لیے وہ تخت سلطنت سے محروم کر دیے گئے اور ان کی انگشتی جس میں اسم اعظم کندہ تھا وہ ان کی باندی جرادیہ کے ذریعے شیطان کے ہاتھ پڑ گئی اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتی شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور چھلی اس کو نگل گئی اور وہ چھلی شکار ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتی نکال کر انہوں نے اپنا ملک واپس لے لیا۔

یہ قصے اس لیے رواج پا گئے کہ اہل کتاب میں ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی نہیں مانتا اور ان کی شان و شوکت کو وہ جادو کا کرشمہ سمجھتے ہیں جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ طاقت دی گئی تھی کہ آپ جنات سے کام لیتے تھے۔ ہوا پر سفر کرتے تھے اور چرند پرند کی بولیاں سمجھتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بارش نہیں ہوئی۔ قحط کی حالت دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی امت کے ساتھ استسقا کے لیے میدان میں نکلے۔ راہ میں دیکھا کہ ایک چوٹی اگلے قدم اٹھائے آسمان کی جانب نظر کیے یہ دعا مانگ رہی ہے۔

”خدا یا ہم بھی تیری مخلوق ہیں اور تیرے فضل کے محتاج۔ ہم کو بارش سے محروم نہ کر۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہ صرف اس آواز کو سن لیا بلکہ وہ جو کہہ رہی تھی اسے بھی سمجھ لیا۔ آپ نے واپس آ کر قوم سے فرمایا۔ چلو ایک حیوان کی دعا نے ہمارا کام کر دیا۔ اب تمہاری طلب کے بغیر ہی بارش ہوگی۔ یہ جادو کے کرشمے نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو معجزات عطا کیے تھے۔



حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک لشکر جبار تھا جس میں جفاکش اور بہادر لوگ شامل تھے۔ بار برداری اور سفری ذرائع کے لیے جنات آپ کے مطیع بنا دیے گئے تھے۔ ہمد پرندہ آپ کے قاصد کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

آپ نے جنات کی مدد سے ایک نہایت شاندار اور وسیع و عریض فرش تیار کروایا تھا۔ یہ فرش اتنا وسیع تھا جس پر تمام دربار بیٹھ جاتا تھا۔ جب آپ حکم دیتے تھے جنات اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا لے جاتے تھے۔ اسی فرش پر آپ کا تخت بھی نصب تھا۔

اس فرش کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ اس پر بیٹھ کر ایک ماہ کی راہ ایک دن میں طے کر لیتے تھے۔ چار ہزار علما آپ کے دائیں جانب اور چار ہزار امرا و رؤسا آپ کے بائیں طرف دست بدست کھڑے رہتے تھے۔ اسی طرح چار ہزار جن اور پریاں بھی دربار میں حاضر رہتی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انہیں اپنے فرمان لکھواتے اور مختلف امور کی تفصیلات اور شکایات سنتے تھے۔

دربار سلیمانی پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا۔ جنات، پرند، منصب دار سب حاضر خدمت تھے۔ آپ نے کسی کام کے لیے ہمد کو طلب کیا لیکن وہ غیر حاضر تھا۔

”میں ہمد کو غیر حاضر پاتا ہوں۔ وہ ایسی گستاخی کا مرتکب کیسے ہوا کہ میری اجازت کے بغیر دربار میں موجود نہیں۔“

پھر آپ اپنے وزیر برخیاہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”میں ہمد کو سخت عذاب دوں گا۔ اسے ذبح کر ڈالوں گا یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی وجہ بتائے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب تم لوگ مجھے مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں اس کی اطاعت قبول کر لوں۔ اس نے خط میں یہی لکھا ہے؟“

ارکان دولت نے اس کی مخالفت کی۔ ”ہمیں اس سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ملک کو بچانے کے لیے ہم جان کی بازی لگادیں گے۔ ہمارے پاس جنگی قوت کی کمی نہیں۔ ہم بھرپور مقابلہ کریں گے۔“

”میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کا پیغام ہمارے پاس عجیب طرح سے پہنچا ہے۔ اس کی طاقت کا ہمیں غلط اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔ بادشاہوں کا قاعدہ رہا ہے کہ جب وہ کسی ملک پر حملہ کرتے ہیں تو اسے لوٹ لیتے ہیں۔ وہاں کے رہنے والوں کو قتل کرتے ہیں اور ہر طرح کی بربادی لاتے ہیں۔ لہذا سلیمان کے بارے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ میں اپنا ایک اپنی سلیمان کے پاس بھیجوں۔ وہ بیش بہا تحائف لے کر جائے اور سلیمان کی خدمت میں پیش کرے۔ شاید وہ اس سے راضی ہو جائے۔“ ملکہ بلقیس نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح ہمیں اس کی شان و شوکت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ ہمارا اپنی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے گا۔“

تمام درباریوں نے اس مشورے کو صائب سمجھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا مخصوص پرندہ ہدایک گوشے میں دیکھا تھا اور ساری گفتگوں رہا تھا۔ وہ وہاں سے اڑا اور مسافت طے کرتا ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ گیا۔ ملکہ بلقیس کے دربار کی تمام کیفیات بیان کر دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ ان کی طرف سے ایک اپنی پہنچنے والا ہے۔

کئی مہینوں کی مسافت طے کر کے بلقیس کا اپنی حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تحائف سے لدے اونٹ دیکھے تو آپ کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ مقصد یہ تھا ہی نہیں جو بلقیس نے سمجھا تھا۔

آپ نے فرمایا۔ ”تم نے اور تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کا مقصد غلط سمجھا۔ کیا تم اس غرض سے میرے پاس آئے ہو کہ ان تحائف کے ذریعے جن کو تم بیش بہا سمجھ کر بہت مسرور ہو مجھ کو پھسلاؤ۔ ان تحائف کی میرے نزدیک کیا اہمیت ہے۔ مجھے دولت سے خریدنے آئے ہو جبکہ تم دیکھ رہے ہو کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو جو کچھ مرحمت فرمایا ہے اس کے مقابلے میں تمہاری یہ بیش بہا دولت قطعاً بیچ ہے۔ تم اپنے ہدایہ واپس لے جاؤ اور اپنی ملکہ سے کہو کہ اگر اس نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو میں ایسے عظیم الشان لشکر کے ساتھ تمہارے ملک پر حملہ کروں گا کہ تم اس کی مدافعت سے عاجز رہو گے اور پھر میں تم کو ذلیل و رسوا کر کے شہر بدر کر دوں گا۔“

قاصد اپنا سامنہ لے کر واپس چلا گیا۔ ملکہ قاصد کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور پوچھنے لگی کہ وہ کیا پیغام لایا ہے۔

قاصد نے اس کے سامنے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کی شان و شوکت کا نقشہ ساکھنچ کر رکھ دیا۔ یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ اگر جلد ہی کوئی انتظام نہیں کیا گیا تو وہ حملہ کر دیں گے۔

”سلیمان علیہ السلام کی حکومت صرف انسانوں ہی پر نہیں بلکہ جن اور حیوانات بھی ان کے تابع فرمان اور مسخر ہیں۔“ یہ سن کر ملکہ بلقیس نے طے کر لیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لڑنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ خود جائے اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا انہیں یقین دلانے۔

وہ ایک لشکر عظیم کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب روانہ ہوئی۔

بائبل میں مذکور ہے۔

”اور جب سب کی ملکہ نے خداوند کے نام کی بابت سلیمان علیہ السلام کی شہرت سنی تو وہ آئی تاکہ مشکل سوالوں سے اسے آزمائے اور وہ یروشلیم میں آئی۔ اس کے ساتھ اونٹ تھے جن پر بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے ہوئے تھے اور جب وہ سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچی تو اس نے ان سب باتوں کے بارے میں جو اس کے دل میں تھیں گفتگو کی۔ سلیمان علیہ السلام نے اس کے سب سوالوں کے جواب دیے اور جب سب کی ملکہ نے سلیمان علیہ السلام کی ساری حکمت اور اس محل کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کی نعمتوں اور اس کے ملازموں کی نشست اور اس کے خادموں کی حاضر باشی اور ان کی پوشاک اور ان کے ساقیوں اور اس سیڑھی کو جن سے خداوند کے گھر کو جایا جاتا تھا کو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ سلیمان نے اسے اپنی شاہانہ سخاوت سے عنایت کیا اور وہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو لوٹ گئی۔“

معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سب نے یمن اور اطراف یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لیے تھے۔ سب کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصہ دراز کے بعد ان میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکز حکومت بنا کر عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں۔

قوم سب ایک طاقتور اور تاجروں کی قوم تھی۔ ان کے دیار و مسکن میں قیمتی دھاتیں ہیرے، جواہرات، ریشم اور مسالے بہ کثرت ملتے تھے۔ نیز ہندوستان کا مال یمن کے ساحل پر اترتا تھا جہاں سے یہ لوگ ہندوستانی مال شام و فلسطین، مصر وغیرہ لے جاتے تھے۔ قوم سب دولت و حکومت کے نشے میں اللہ تعالیٰ کو بھول چکی تھی اور وہ تمام برائیاں جو قوم عاد و ثمود میں تھیں، ان میں بھی موجود تھیں۔

قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سب کے واقعے میں یہ نہیں بتایا ہے کہ اس ملکہ کا نام کیا تھا مگر عرب یہودی کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے اور اہل حبشہ جن کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملکہ سب اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل سے ہیں ملکہ کا نام ”ماکہ“ بتاتے ہیں۔

جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ اس کا ملک فلسطین سے مشرق میں ہے اور انجیل میں ہے کہ فلسطین کے جنوب میں ہے یوسیفوس کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر و حبشہ کی ملکہ تھی اور اہل حبش اس کو حبشی نژاد سمجھتے ہیں۔

ان روایات میں اہل تحقیق یوسیفوس کی روایت کو غلط سمجھتے ہیں اور باقی دونوں روایتوں کا حاصل ایک ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں حصے یمن ہی کی حکومت کے حصے تھے۔

شمالی عرب متصل عراق میں چار قدیم حکمران عورتوں کے نام ملتے ہیں لہذا زیادہ امکان یہ ہے کہ ملکہ سب اسی حصے سے تعلق رکھتی تھی۔

قرآن نے اس ملکہ کا نام لیے بغیر اس کا ذکر کیا ہے۔

”سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا پھر کہا میں نے ہد کو نہیں دیکھا یا وہ موجود نہیں۔ میں اس کو سخت سزا دوں گا یا ذبح کر ڈالوں گا یا کوئی صاف دلیل لائے۔ سلیمان علیہ السلام تھوڑی دیر ٹھہرے کہ ہد آ کر گویا ہوا۔ مجھے وہ معلوم ہے جو آپ کو نہیں معلوم میں سب سے ایک سچی خبر لے کر آیا ہوں۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو سب پر حکومت کرتی ہے۔ اس کو ہر شے عنایت کی گئی ہے۔ اس کا ایک بڑا تخت ہے۔ میں نے اس عورت کو اور اس کی رنایا کو خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے دیکھا۔ شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں اچھے کر کے دکھائے ہیں۔ صحیح راستے سے ان کو باز رکھا ہے۔ وہ راہ کو نہیں پاتے کہ خدا کو وہ سجدہ کریں جو آسمانوں سے اور زمین سے چھپی ہوئی چیز کو باہر نکالتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا ہم دیکھتے ہیں کہ توجہ کہتا ہے یا جھوٹا ہے۔ میرا یہ خط لے جا۔ ان کے پاس ڈال دے۔ پھر ان سے الگ ہٹ کے دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔“

ہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے گرامی نامے کو اپنی چونچ میں دبایا اور شہر سب کی جانب پرواز کر گیا۔ کچھ دیر ملکہ کے محل کے اوپر چکر کاٹتا رہا پھر ایک روشن دان کے ذریعے ملکہ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ ملکہ اس وقت محو استراحت تھی۔ ہد نے خط ملکہ کی چھاتی پر رکھ دیا اور خود روشن دان میں بیٹھ کر ملکہ کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد ملکہ بیدار ہوئی تو چھاتی پر خط پڑا دیکھ کر حیران ہوئی۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ خواب گاہ میں کوئی آیا نہ گیا پھر یہ خط کہاں سے آیا۔ اس نے کنیزوں کو بلایا سب نے یہی بتایا کہ دروازے بند تھے۔ اس نے پریشان ہو کر خط پڑھنا شروع کیا۔ خط پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر ثبت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نہایت طاقتور بادشاہ ہیں۔ اس خط کو اس نے ایک دھمکی ہی سمجھا۔ اس خط میں ”مسلمین“ کا لفظ دیکھ کر وہ یہ سمجھی کہ دوسرے قاہر بادشاہوں کی طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کا ماتحت ہو جاں قبول کر لوں۔ وہ حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکی۔

ملکہ سب نے اسی وقت ارکان دولت کا اجلاس طلب کیا اور خط ان کے سامنے رکھ دیا۔

”اے میرے ارکان دولت! میں کوئی کام تمہارے مشورے کے بغیر نہیں کرتی۔ اس خط کی عبارت تم نے سن لی۔ اب تم میں سے کوئی مجھے یہ بتائے کہ ان کے بارے میں تم کتنا جانتے ہو؟“

ان میں سے چند عہدے دار حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے ملکہ کو بتایا کہ وہ نہایت طاقتور اور جلیل القدر فرمان رواں ہیں۔ دین موسوی کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں اور خود کو نبی کہتے ہیں۔

تھا۔ اس کی چھت بھی شیشے کی تھی۔ فرش کے نیچے پانی میں مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس عمارت میں اپنے شاہی تخت پر جلوہ افروز تھے۔ شیشے کے پیچے سے پانی ایسی آب و تاب کے ساتھ بہہ رہا تھا کہ شیشہ درمیان میں نظر ہی نہ آتا تھا۔

ملکہ محل میں داخل ہوئی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا۔ اس نے گھبرا کر اپنے لباس کو پنڈلیوں سے اوپر کر لیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

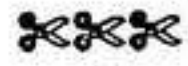
حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ”لباس بچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ پانی نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہی ہو۔ یہ محل اور اس کا محن چمکتے ہوئے شیشے کا ہے۔ اس لیے تم دھوکا کھا لیں۔“

بلیقیں اس جیلے پرخت خفیف ہوئی۔ ملکہ کا ملک یمن صنعت و حرفت کے لیے مشہور تھا لیکن ایسی کارگیری اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

بے درپے دو تین واقعات ایسے ہوئے تھے کہ اس (ملکہ) کے قوائے عقلی بیدار ہونے لگے۔ سب سے تخت کا آجانا، اس میں تبدیلی ہونا اور اب فرش کو پانی سمجھنا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے ایک زبردست بادشاہ کی قاہرانہ طاقت کا مظاہرہ نہیں بلکہ مجھ پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ بے نظیر طاقت اور معجزانہ قدرت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس و قمر بلکہ کل کائنات کا تہا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام مجھ سے اپنی تابعداری اور فرماں برداری کے طالب نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دینا ان کا مقصد ہے۔

یہ خیال آتا تھا کہ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ایک شرم سارا اور نام انسان کی طرح درگاہ الہی میں یہ اقرار کیا۔ ”پروردگار! آج تک میں نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا کہ اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش کرتی رہی لیکن اب میں سلیمان کے ساتھ ہو کر صرف ایک خدائی پر ایمان لاتی ہوں جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔“

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قوم سب بھی ایمان لے آئی تھی یا یہ بلیقیں کا انفرادی فعل تھا۔ اس لیے کہ جب وہ سب سے چلی تھی تو اس نے اپنے ارکان دولت سے مشورہ کیا تھا لیکن دربار حضرت سلیمان علیہ السلام میں آکر اس نے صیغہ واحد استعمال کیا۔ ”میں ایمان لاتی ہوں۔“ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں جو مذہب بادشاہوں کا ہوتا تھا اسی پر عام رعایا چلتی تھی لہذا قوم سب نے بھی کواکب پرستی کو چھوڑ کر دین موسوی اختیار کر لیا ہوگا۔



ملکہ سب آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس مہمان کی حیثیت سے وہ رہی تھی اور آپ کے معجزات اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی کہ جنات، ہوا، پرندے سب آپ کے مطیع ہیں۔ آپ کے تخت کو ہوا میں سفر کرتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی۔

ایک دن وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہنے لگی کہ مجھے بھی اشتیاق ہو رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ کے تخت پر بیٹھوں اور ہوا میں اڑتی پھروں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی خواہش پوری کی۔ تخت پر بلیقیں بھی بیٹھی، حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اور دیگر عمائدین سلطنت بھی۔ آپ نے ہوا کو حکم دیا۔ ہوا تخت کے نیچے پہنچی اور فرش نما تخت کو بلند کر دیا۔ پھر وہ اس طرح ہوا میں تیرنے لگا جیسے کشتی پانی میں تیرتی ہے۔ پھر ایک جزیرے پر نظر پڑی تو ملکہ بلیقیں نے اس جزیرے پر اترنے کی ضد کی۔ ہوا کو حکم ہوا اور تخت اس جزیرے پر اتر گیا۔ یہ جزیرہ سات سمندروں کے بیچ تھا اور ظاہر ہے یہاں اس سے پہلے کوئی نہیں آیا ہوگا۔

ابھی اس تخت کو اترے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ یہاں کا سبزہ آنکھوں کو رونق بخش ہی رہا تھا کہ عجیب الحلقہ گھوڑے نظر آئے۔ ان گھوڑوں کے پر نکلے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ اڑ بھی سکتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ فوراً ہو بھی گیا۔ ان گھوڑوں کی نظر جیسے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام اور دیگر لوگوں پر پڑی تو اس طرح اڑ گئے جیسے پرندے اڑتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو گھوڑے بہت پسند تھے۔ آپ کے اصطل میں ہر رنگ و نسل کے گھوڑے موجود تھے لیکن ایسے گھوڑے کبھی کسی نے نہیں دیکھے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کو تکتے رہ گئے اور گھوڑے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا جی اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے اسی وقت واپسی کا حکم دے دیا لیکن ایک فکر اپنے ساتھ

ملکہ بلیقیں ملک سب سے جانب یروشلم روانہ ہوئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ ملکہ سب حاضر خدمت ہو رہی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے درباریوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سب کے یہاں پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی اٹھا کر یہاں لے آیا جائے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے؟“

ایک دیوپیکر جن اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”میں آپ کے دربار پر خاست کرنے سے پہلے تخت کو لاسکتا ہوں، مجھ کو یہ طاقت حاصل ہے اور یہ کہ اس کے بیش بہا سامان کے لیے امین ہوں۔ ہرگز خیانت نہیں کروں گا۔“

یہ دعویٰ ابھی گردش میں تھا کہ ایک عفریت جن نے عجب دعویٰ کر دیا۔ ”میں آنکھ جھپکتے اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں“ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے گردن گھمائی تو ملکہ سب کا تخت قریب رکھے دیکھا۔

”حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب تخت اپنے پاس رکھے دیکھا تو کہا۔ ”یہ اس خدا کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں کہ ناشکری کرتا ہوں اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو خدا بے پروا اور بزرگ ہے۔“ (نمل)

یہ تخت کوئی معمولی تخت نہیں تھا۔ اس کے پائے یا قوت کے تھے اور اس کے تخت کا طول و عرض تیس گز تھا۔ آپ نے اس تخت کو دیکھا اور حکم جاری کیا۔

”اس تخت کی صورت میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اتنی نشانیوں کے بعد بھی وہ پیغام حق پر ایمان لاتی ہے یا نہیں۔“

یہ تخت یمن میں بہ حفاظت مقفل کمروں میں تھا جہاں سے اظہار معجزہ کے لیے ہل کے ہل میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے منگوا لیا تاکہ ملکہ باحقیقت پر ایمان لے آئے۔

سید سلیمان ندوی کی رائے یہ ہے کہ ملکہ سب نے تحفے کے طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کر رکھی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا، ضرور ہے کہ ملکہ اپنے ساتھ شام لائی ہوگی۔ انہوں نے نہ جانے یہ رائے کیسے قائم کر لی ورنہ قرآن نے سورہ نمل میں صاف کہہ دیا۔

”سلیمان (علیہ السلام) نے کہا۔ ”اے درباریو! تم میں کوئی ایسا ہے جو اس (بلیقیں) کا تخت لے آئے قبل اس کے کہ وہ فرماں بردار ہو کر آ پہنچے۔ ان میں سے ایک دیوپیکر جن نے کہا۔ میں اس کی مجلس پر خاست ہونے سے پہلے لاسکتا ہوں اور مجھ کو یہ قدرت حاصل ہے اور میں اس کے بارے میں امین ہوں اور جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا۔“

”میں تیری پلک جھپکتے اس کو حاضر کر سکتا ہوں۔“

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخت حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بنایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے قاصدوں کی معرفت جو ہدایہ بھیجے گئے، ان میں تخت کا کوئی ذکر نہیں اور وہ قاصد واپس بھی گئے اور غالباً حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہ تحائف واپس بھی بھیج دیے اور پھر یہ بھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس اعجاز کو دیکھ کر اس کو خدا کا عظیم الشان فضل قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہ ملکہ کا امتحان لینے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام اس تخت میں تبدیلی کا حکم بھی دیتے ہیں۔ کسی کے دیے ہوئے تحفے میں تبدیلی کون کرتا ہے۔

اس تخت کا معاملہ بے شک و شبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا نشان تھا۔ کچھ عرصے کے سفر کے بعد جب ملکہ بلیقیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئی اور جب دربار میں حاضر ہوئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں رکھے تخت کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ یہ تخت تو وہ یمن میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ بھی ایک جیسے بنے سات محلوں میں سے ایک میں مقفل تھا۔ یہاں کیسے پہنچ گیا؟

”یوں حیرانی سے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا یہ تمہارا تخت ہے؟“

”ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہ یقیناً میرا ہی ہے۔“

بلیقیں عقل مند تھی۔ وہ آپ کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ تو چکی تھی۔ شک بھی ہو گیا تھا کہ تخت اسی کا ہے۔ حیران بھی ہو رہی تھی کہ اس کے آنے سے قبل یہ تخت یہاں کیسے پہنچ گیا لیکن ابھی وہ اپنی فرماں برداری کے اعلان سے ہچکچا رہی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک عمارت بنوائی تھی جو شیشے کی تھی۔ فرش کے نیچے پانی چلا رہا

اللہ کا فضل

حضرت حبیب بن عجمی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مستجاب الدعوات تھے۔ آپ کے پاس اکثر ضرورت مند لوگ آتے تھے اور آپ ان کے لیے دعا فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ اپنے کرم و احسان سے ان کی مشکلیں آسان فرما دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ ”میرا بیٹا عرصے سے مفقودالخبر ہے۔ آپ میری امداد فرمائیے تاکہ میرا بیٹا مجھے مل جائے۔“

آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”تمہارے پاس کچھ چاندی ہے؟“

عورت نے عرض کیا۔ ”میرے پاس دو درہم ہیں۔“

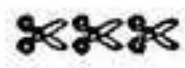
آپ نے وہ درہم لے کر خیرات کر دیے اور فرمایا۔ ”جاؤ تمہارا بیٹا گھر پہنچ گیا ہے۔“

عورت افاں و خزاں گھر پہنچی تو دیکھا کہ لڑکا گھر میں بیٹھا ہوا ہے، وہ اپنے بیٹے سے چٹ گئی اور حالات معلوم کرنے لگی۔ لڑکے نے بتایا کہ میں اس وقت کرمان میں تھا اور تعلیم حاصل کر رہا تھا ایک ضرورت سے بازار آیا۔ یکا یک ایک تیز آندھی آئی اور ہوا کے اس طوفان میں میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ اس وقت میں نے ایک پروتار آواز سنی کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے ”ہوا! اس لڑکے کو اڑا کر اس کے گھر لے جا۔“ میں ہوا کے بازوؤں پر تیر رہا تھا اور ایک حقیر پرزہ کاغذ کی طرح ہوا کے سہارے اڑا جا رہا تھا کہ آندھی کا زور کم ہوا اور میرے پاؤں زمین پر لگے، میں نے ہوش و حواس درست کرنے کے بعد دیکھا تو اپنے مکان کے قریب کھڑا تھا۔ میری مسرت اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور میں فوراً بھاگ کر اندر آ گیا۔

عورت نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پیغام مسرت سنایا تو حضرت نے فرمایا ”جو کچھ ہوتا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اسی کے حکم سے ہوتا ہے، خدا نے تم پر احسان کیا ہے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی کامیابی و کارفرمانی کا تصور بھی اپنے دل میں بھی نہ لانا اور ہمیشہ اسی کی اطاعت و فرمانبرداری اور رضا جوئی کی کوشش کرنا، خدا ہی تمہارا مددگار ہے اور اسی کے فضل و کرم سے تمہارے تمام امور سرانجام پائیں گے۔“ (حکایات اولیا سے اقتباس)

ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس غور و فکر کے درمیان گھوڑے، اصطبل کو روانہ ہو گئے چنانچہ جب انہوں نے نظر اوپر اٹھائی تو وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکے تھے۔ آپ نے حکم دیا، ان کو واپس لاؤ۔ جب وہ واپس لائے گئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے محبت اور آلات جہاد کی حیثیت سے عزت و توقیر کی خاطر ان کی پنڈلیوں اور گردن پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور ایک ماہر فن کی طرح ان کو مانوس کرنے لگے۔



قوم سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا اور وہ اس فلسفے کی قائل تھی کہ کائنات میں خیر و شر کی قدرت و طاقت کو اکب کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ آفتاب ان میں سب سے بڑا اور کائنات پر اثر انداز ہے اس لیے وہی اس قائل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔ بتقیس بھی اسی کو اکب پرستی میں مبتلا تھی اور اسی لیے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام کے مفہوم کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ سمجھی تھی تو صرف یہ کہ دوسرے دنیا دار بادشاہوں کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اس کی دولت و مملکت کے خواہاں ہیں اور اسے اپنا ماتحت بنانا چاہتے ہیں۔ اس کی تصدیق کے لیے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو معلوم تھا کہ وہ کافر ہے، بت پرست ہے۔ وہ انہیں محض بادشاہ سمجھتی ہے، نبی نہیں۔ اسی لیے آپ نے اس کا تخت ملک یمن سے منکویا تاکہ وہ ان کی نبوت کی قائل ہو جائے۔ بتقیس نے اپنے تخت کو دیکھا۔ اس کی بدلی ہوئی ہیئت کو دیکھا تو وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ بادشاہت سے بالاتر کوئی اور ہی واقعہ ہے۔ پھر پے در پے ایسے واقعات ہوتے رہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کی قائل ہو گئی۔ سمجھ گئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی پشت پر خدائے تعالیٰ کی وہ طاقت ہے جو پیغمبرانہ جاہ و جلال کے ساتھ ”نشان الہی“ کے نام سے وابستہ رہتی ہے۔

وہ اپنے قدیم فعل پر شرمسار ہوئی اور آپ کی نبوت پر ایمان لے آئی۔

کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا (بتقیس) سے نکاح کر لیا اور اس کو اپنے ملک میں جانے کی اجازت دے دی اور حضرت سلیمان علیہ السلام گاہے گاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے

لائے کہ یہ گھوڑے کس طرح انہیں مل سکتے ہیں۔ آپ نے یہ دشلم پہنچے ہی جنوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور انہیں حکم دیا کہ فلاں جزیرے میں جو گھوڑے نظر آئے تھے، انہیں پکڑ کر لاؤ اور جتنے ہیں سب لے آؤ۔ ان جنوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ تو خشکی کے جن ہیں۔ وہ جزیرہ سات سمندروں کے بیچ ہے لہذا آپ ان جنوں کو بلائیے جن کی حکومت سمندروں پر ہے۔ سمندروں سے تعلق رکھنے والے جنوں کا بادشاہ آپ کی اطاعت سے منحرف ہو کر سمندر کی تہ میں کہیں چھپ گیا تھا۔ ان گھوڑوں پر وہی قابو پاسکتا تھا اور اسے گرفتار کرنا مشکل تھا۔ خشکی کے جنوں نے آپ کی یہ مشکل بھی حل کر دی۔ ان جنوں نے سمندر کے جن تک یہ خبر پہنچا دی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب ہم بھی آزاد ہیں اور تو بھی۔ وہ جن اس قریب میں آ گیا اور باہر نکل آیا۔ خشکی کے جنوں نے اسے فوراً گرفتار کر لیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا دیا۔ سمندری جن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیکھا تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے اپنا انجام نظر آ رہا تھا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے کمال فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا لیکن اس شرط پر کہ وہ ان گھوڑوں کو پکڑ کر لائے گا۔ ان گھوڑوں کا معاملہ شاید اتنا مشکل تھا کہ جنوں کا وہ بادشاہ بھی وعدہ کرتے ہوئے بچکپار رہا تھا لیکن اسے اپنے انجام کی بھی فکر تھی۔ اسے وعدہ کرنا پڑا۔

جنوں کے بادشاہ نے کسی ترکیب سے چالیس گھوڑے پکڑے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا۔ عصر سے کچھ پہلے کا وقت تھا کہ یہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھ کر دیے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو قریب سے دیکھا تو دیکھتے رہ گئے۔ کبھی ایک گھوڑے کے قریب جاتے تھے، کبھی دوسرے کو دیکھتے تھے۔ یہ خیال بھی دل کو خوش کر رہا تھا کہ ایسے نایاب گھوڑے میرے سوا کس کے پاس ہوں گے۔ اس محویت میں اتنی دیر ہو گئی کہ عصر کا وقت نکل گیا۔

اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے۔ ”اے سلیمان! دنیا کے مال نے تمہیں اتنا مشغول کر دیا کہ نماز عصر بھی ادا نہ کر سکے۔ اللہ کو تمہاری یہ مشغولیت پسند نہیں آئی۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے استغفار کی اور سجدے میں گر کر دیر تک روتے رہے۔ پھر اپنے دل کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا کہ جب وہ ان گھوڑوں پر بیٹھ کر جہاد کریں گے تو اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا۔ اللہ تعالیٰ بھی ضرور خوش ہو جائے گا۔ مسلم مفسرین نے اوپر بیان کردہ واقعہ کہیں نہیں لکھا۔ یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں یہ تفصیل ضرور ملتی ہے لیکن اس واقعے کا ہلکا سا اشارہ قرآن میں ضرور ملتا ہے۔

”جب اس (سلیمان) کے سامنے اُصیل اور سبک رو گھوڑے پیش کیے گئے تو وہ کہنے لگا کہ بے شک! میری محبت مال (جہاد کے گھوڑے) پروردگار کے ذکر ہی میں سے ہے۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظر سے اوجھل ہو گئے (حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا) ان کو واپس لاؤ پھر وہ ان کی پنڈلیاں اور گردن چھونے لگا۔“ (سورہ ص)

حضرت علیؑ کی تفسیر کے مطابق اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جہاد کی مہم پیش آئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ اصطبل سے گھوڑوں کو لایا جائے۔ گھوڑے پیش ہوئے تو ان کی دیکھ بھال میں عمر کی نماز کا وقت جا تا رہا اور سورج غروب ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب خدا کی طرف سے تنبیہ ہوئی تو فرمایا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ مال کی محبت یا خدا پر غالب آگئی اور اس غصے میں گھوڑوں کو واپس منگایا اور یا خدا کی محبت میں ان سب کو ذبح کر ڈالا کہ وہی اس غفلت کا باعث بنے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق جو حسن بصری کی سند سے منقول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مہم کے سلسلے میں جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے گھوڑوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ پیش کیے گئے اور ان کی دیکھ بھال میں نماز کا وقت نکل گیا تو آپ نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہلکے ہلکے مارا اور فرمایا کہ ”آئندہ تم ذکر اللہ سے غفلت کا باعث نہ بننا۔“

ایک اور روایت اس طرح بھی بیان ہوئی ہے۔ ”ایک مہم کے موقع پر ایک شام کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کے گھوڑوں کو اصطبل سے لانے کا حکم دیا۔ جب وہ پیش کیے گئے تو آپ کو چونکہ گھوڑوں کی نسلوں اور ان کے ذاتی اوصاف کے علم کا کمال حاصل تھا۔ اس لیے آپ نے جب ان سب کو اُصیل، سبک رو، خوش رو پایا تو آپ پر مسرت و انبساط کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمانے لگے۔ ”ان گھوڑوں سے میری یہ محبت ایسی مالی محبت میں شامل ہے جو پروردگار کے ذکر ہی کا ایک شعبہ

تھے لیکن قرآن حکیم اور احادیث میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔



حضرت سلیمان علیہ السلام کی دولت و ثروت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آپ دولت اور حکمت میں زمین کے سب بادشاہوں سے سبقت لے گئے تھے اور سارا جہان آپ کے دیدار کا طالب تھا تا کہ اس... حکمت کو جو خدا نے ان کے دل میں ڈالی تھی سنے۔

اسرائیل کی تاریخ کے کسی دور میں ایسی خوشحالی پھر کبھی نہ ہوئی جیسی حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ہوئی۔ امن و سکون ہوا تو تجارت کو بھی فروغ ملا۔ بحری بیڑے حیرام کے بحری بیڑے کے ساتھ ترسیں کو جاتے تھے (ترسیں اندلس میں تھیں) ترسیں سے سونا چاندی اور ہاتھی دانت آتے تھے۔ مصر سے گھوڑوں کی تجارت کی جاتی تھی۔ ملک میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔

ہر سال آپ کے پاس باہر سے جو سونا آتا تھا اس کی مقدار چھ سو چھیاسٹھ قطار یعنی تقریباً آٹھ سو من تھی۔ توریت میں ہے۔ ”سلیمان بادشاہ نے سونا گھڑ کر دو سو ڈھالیں بنائیں۔ چھ سو مثقال سونا ایک ڈھال میں لگا اور اس نے گھڑے ہوئے سونے کی سوہریں بنائیں۔ ایک ایک سوہریں ڈیڑھ سیر سونا لگا۔ ماسوا ان کے بادشاہ نے ہاتھی دانت کا ایک بڑا تخت بنایا اور اس پر سونا چڑھایا۔ اس تخت پر چھ بیڑھیاں تھیں اور تخت کے اوپر کا حصہ پیچھے سے گول تھا اور بیٹھنے کی جگہ کی دونوں طرف ٹیلیں تھیں اور ٹیکوں کے پاس دو شیر کھڑے تھے اور ان چھ بیڑھیوں کے ادھر ادھر بارہ شیر کھڑے تھے۔ کسی سلطنت میں ایسا کبھی نہیں سنا تھا۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ کے بیٹے کے سب برتن سونے کے تھے۔ چاندی کا ایک بھی نہیں تھا کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں اس کی کچھ قدر نہ تھی۔

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک ہزار چار سو تھ اور بارہ ہزار سوار تھے جن کو آپ نے رتھوں کے شہروں میں اور یروشلم میں رکھا اور بادشاہ نے یروشلم میں چاندی کو تو ایسا کر دیا جیسے پتھر اور دیودار (قیمتی لکڑی) کو ایسا جیسے گولر کے درخت ہوتے ہیں اور جو گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تھے وہ مصر سے منگوائے گئے تھے اور بادشاہ کے سوداگر ایک ایک جھنڈ کی قیمت لگا کر ان کے جھنڈ کے جھنڈ خرید لیا کرتے تھے۔

آپ کی سلطنت کی وسعت یہ تھی کہ شمال مشرق میں دریائے فرات تک، جنوب مشرق میں یمن تک، مغرب میں فلسطینیوں کے ملک اور بحر روم تک شمال میں طلیل تک اور جنوب میں مصر کی حدود تک۔

خوش حالی اور وسعت کا یہ حال ہوا تو انہوں نے فرعون مصر کی بیٹی سے شادی کی۔ اس سے آپ کی حدود سلطنت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آپ کی حکومت کا کچھ علاقہ کسی زمانے میں فرعون کی عمل داری میں شامل ہو گیا تھا۔ آپ کی شادی فرعون کی بیٹی سے ہوئی تو وہ یہ علاقہ اپنے ساتھ جہیز میں لے آئی۔

اس کے بعد تو آپ کی بادشاہت کا جواب ہی نہیں تھا۔ بشری تقاضا ہوا۔ جی میں یہ آئی کہ دنیا کو بھی تو معلوم ہو میری سلطنت کیسی وسیع ہے۔ میرے اختیارات اور میری دولت کا کوئی جواب ہی نہیں۔

آپ سوچنے لگے کہ اس شان و شوکت کا مظاہرہ کس طرح کیا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مخلوق خداوندی کی دعوت کی جائے۔ اس دعوت میں صرف انسان نہیں ”اجنہ“ بھی شامل ہوں۔ جنات جس کثرت سے دنیا میں آباد ہیں اس کا شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کو اپنی دولت پر اعتماد تھا کہ وہ ضرور اس ضیافت کا اہتمام کر سکیں گے۔

اعلان ہو گیا کہ جملہ مخلوق مقررہ دن مقررہ میدان میں جمع ہو۔ ان سب کو کھانا حضرت سلیمان علیہ السلام دیں گے۔ اس اعلان کے بعد آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ بڑی بڑی دیکیں تیار کریں۔ جنوں نے دیکیں تیار کر دیں۔ کہا جاتا ہے ان دیکوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی اور ہر دیک ایک بڑے تالاب سے بھی بڑی تھی۔

ہزاروں جانور ذبح ہوئے۔

(جاری ہے)

قصص القرآن - قصص الانبیاء - توریت

ماخذات:



نمکین لاش

مختار آزاد

جو پولے دھوپ میں جل کر پلتے ہیں ان کی چھائوں میں ٹھنڈک نہیں ملتی۔ وہ جو پل پل محبت کو ترساتا... جس کے دل میں نفرت کا الاٹھ روشن تھا، جانے وہ کس لمحے کی گرفت میں تھا کہ لہو کی تڑپ نے اسے بے چین کر ڈالا۔ یہ اور بات کہ دھوپ میں جلنے کا رشتہ اس نے ہمیشہ برقرار رکھا کہ جس کا وہ عادی ہو چکا تھا۔

نمک میں دلی لاش کی دریافت اور باپ سے دکی کی ملاقات، یہ دونوں باتیں ایک ہی صبح کی ہیں۔ نہ کیپٹن ولیم کوفن کے قلیوں کو نمک کے ڈھیر میں دلی لاش ملتی اور نہ ہی دکی سے باپ کی ملاقات ہوتی۔ یہ دونوں باتیں اتفاقی تھیں۔ وہ موسم بہار کی خوشگوار صبح تھی جس وقت کیپٹن ولیم کے ایک قلی نے نگر انداز جہاز کے عرشے پر لدے نمک کے بڑے سے ڈھیر میں دلی لاش کو دیکھا، اُس وقت کیپٹن کا بیٹا دکی سامنے ساحل سے کچھ دوری پر بے گھر کے لان میں بیٹھا سکون سے

کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے پیٹھ پر دھوپ کی تپش گراں گزری تو کرسی ٹھیسٹ کر پورچ میں آ گیا۔ یہ گھر اس کے نانے بنایا تھا۔ جزیرے پر بنا، پرانی وضع قطع کا یہ گھر اسے بہت پسند تھا۔ اس نے اپنی عمر کے ابتدائی بارہ برس یہیں گزارے تھے۔ بعد میں اس کے پاپا پڑھنے کے لیے اسے امریکی ریاست میساچوسٹس کے شہر لیٹم لے گئے تھے۔ پڑھائی وہ کب کی چھوڑ چکا تھا اور اب کھلے سمندر میں مایہ گیری کرنے والے بحری جہاز پر ملازم تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ چھٹیاں گزارنے یہیں آتا تھا۔ کئی مہینوں کے تھکا دینے والے کام سے اس بار اسے لمبی چھٹی ملی تو وہ تازہ دم ہونے کے لیے یہاں آ گیا۔ اب اس کا ارادہ اگلے تین ہفتے تک یہیں آرام کرنے کا تھا۔

وکی کے ناناکا گھر بہت خوبصورت تھا بے آف آئی لینڈ پر بنے اس گھر کے پورچ کے سامنے لان تھا۔ چھوٹی چار دیواری کے باہر سامنے سمندر تھا جس کی موجیں ساحل سے ٹکراتیں تو کانوں کو بھلی لگنے والی آوازیں اُسے اپنے سحر میں جکڑ لیتی تھیں۔ ساحل پہ تاحد نگاہ ناریل اور دوسرے ساحلی درختوں کے جھنڈ تھے اور جب سرسراہٹ ہوا اُن سے ٹکراتی تو فضا میں جلتنگ بج اٹھے چھینوں میں وکی کا پسندیدہ مشغلہ کتابیں پڑھنا تھا۔ وہ بند کمرے کے بجائے کھلے ماحول میں مطالعے کا عادی تھا۔ اُس روز بھی وہ ایک سفر نامہ پڑھ رہا تھا۔ موسم بہار کا تھا مگر اُس روز جزیرے پر کچھ زیادہ گرمی ہو گئی تھی۔ وہ سورج کے رُخ پر پشت کیے بیٹھا تھا۔ گرمی سے اس کی پیٹھ میں خارش ہونے لگی تھی۔ وہ پورچ میں بیٹھا پیٹھ کھجا رہا تھا، اس کی نظریں ساحل کی طرف اٹھیں۔

ایسی دوران ایک کشتی ساحل کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت ساحل پہ اکا دکا کشتیاں ہی کھڑی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ جیٹی پر پہنچ گئی۔ ایک شخص کشتی سے اتر کر اس کا رٹا کھونٹے سے باندھنے لگا۔ ایک بڑی عمر کا مرد کشتی سے اترادہ کافی چوڑے کا ندھے، لمبے قد اور مضبوط ہاتھ پاؤں والا شخص تھا۔ آہستہ آہستہ وہ شخص آگے بڑھنے لگا۔ وکی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تھوڑا اور نزدیک آیا تو فاصلہ ہونے کے باوجود وہ اُس شخص کو پہچان گیا۔ حیرت سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس شخص سے اس کے بچپن کی کئی یادیں وابستہ تھیں۔ یہ اس کا باپ تھا۔ آخری بار اس نے اپنے ڈیڈی کو تقریباً پونے دو سال پہلے دیکھا تھا۔

وکی ماں کی طرف سے نسل پاولی نیقیائی قبیلے کی ایک شاخ ماؤری سے تعلق رکھتا تھا جبکہ اس کا باپ امریکی تھا۔ وہ جہاز

راں تھا اور میساچوسٹس سے یورپ اور مشرق بعید کے ساحلی علاقوں تک تجارت کرتا تھا۔ وہ ایک جگہ سے سامان خریدتا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں بیچ دیتا تھا۔ وکی کی ماں اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ بارہ سال کی عمر تک ناناکا، نانی نے اس کی پرورش کی تھی۔ وکی کا باپ کیپٹن ولیم میساچوسٹس میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہتا تھا جو امریکی تھی۔ وکی کی دیکھ بھال اور پرورش میں سب سے زیادہ کردار اُس کے ناناکا، نانی کا تھا۔ اسی لیے وہ بھی ان سے بہت قریب تھا۔ لڑکپن کے جن دنوں میں وہ میساچوسٹس میں باپ کے ساتھ رہا تھا، تب اس کی سوتیلی ماں ہی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ کیپٹن ولیم ہمیشہ سفر پر جاتے ہوئے اسے اپنے بیٹے کی اچھی دیکھ بھال کی تاکید کر کے جاتا اور پھر ڈیڑھ دو سال کے لیے غائب ہو جاتا تھا۔

کیپٹن ولیم جب بھی میساچوسٹس میں واقع اپنے گھر لوٹتا تو ڈھیر سارے تحائف، مزے مزے کی باتیں اور ایک دو نئی بولیاں ضرور سیکھ کر آتا تھا۔ زباں دانی کے معاملے میں وہ بہت ہوشیار تھا۔ کہتا تھا کہ جیسا دیس ہو، ویسا بھیس نہ بدلو تو کاروبار پر منفی اثر پڑتا ہے۔ وہ وکی کو اپنے بحری سفر کے قصے اتنے مزے لے کر سنا تا کہ اس کے دل میں بھی یہ خواہش اگڑا لیتی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے مگر کیپٹن ولیم کا کہنا تھا کہ اس طرح پڑھائی کا حرج ہوگا۔ باپ کے سنائے ہوئے سمندری سفر کے یہی قصے تھے کہ وہ بڑا ہو کر مایہ گیری بن گیا اور مہینوں سمندر میں رہ کر چھلی کا شکار کرنے لگا۔

یہ بات تو وکی کو معلوم تھی کہ اس کا باپ ہر بیس ماہ بعد ایک بار ضرور بے آف آئی لینڈ میں بہ ظاہر اپنے سرریلوں سے ملنے آتا ہے۔ مگر درحقیقت یہاں اس کا بڑا سا گودام تھا۔ جس کی وجہ سے آنا جانا اس کی مجبوری بھی تھی۔

جب سے وکی نے عملی زندگی شروع کی تھی، تب سے ان باپ بیٹوں کی ایک بار بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب وکی نے دیکھا کہ گھر کی طرف آنے والا اس کا باپ ہی ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ ڈھیروں تحائف اور قصے لے کر یہاں آیا ہوگا۔ اُسے امید ہو گئی کہ رشتہ دار اُس سے مل کر خوش ہوں گے مگر یہ بات کیپٹن ولیم کے لیے حیرت کا سبب بنے گی کہ اُس کا بیٹا بھی یہیں پر تھا۔ دونوں کے لیے یہ ملاقات ایک اتفاق ہی تھی مگر کیپٹن یہاں خوشی خوشی نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک مصیبت میں گرفتار تھا اور اب اس سے نکلنے کے لیے وہ اپنے سابق سر سے مدد مانگنے آ رہا تھا۔

”ارے تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ کیپٹن ولیم گھر میں داخل ہوا تو بیٹے کو دیکھ کر چونک گیا۔

”مطالعہ۔“ وکی نے سادگی سے جواب دیا۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں بحری سفر کے پس منظر میں لکھا ہوا جونا تھن سوئفٹ کا سفر نامہ تھا۔

”پڑھتے جاؤ۔“ اُس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا اور گھر کے داخلی دروازے کے قریب بھیجی بیچ پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ یہ گھرانا ماؤری عقیدے پر سختی سے کاربند تھا۔ دوسرے ماؤری باشندوں کی طرح ان کے گھر میں بھی جوتے پہن کر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ کیپٹن ولیم ہینڈ سٹم مرد تھا مگر جب اسے بیٹھا ہوا دیکھو تب اس کے بڑھتے وزن کا احساس ہوتا تھا۔ جوتے اتارتے ہوئے اس نے کن انگیوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی ایک ابرو اوپر اور دوسری نیچے تھی۔ اُس وقت وہ نہایت چالاک نظر آ رہا تھا۔ ”اب تم کافی بڑے ہو گئے ہو۔“ کیپٹن نے وکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بیک وقت خوف اور تشویش جھلک رہے تھے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

”تمہاری سوتیلی ماں کہہ رہی تھی کہ اس نے تمہیں مزید پڑھنے کے لیے کالج بھیج دیا ہے تاکہ تم مشنری میں اسٹنٹ بن سکو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے جوتے اتار کر بیچ کے نیچے رکھے اور پھر وکی کے سر ابا کا جائزہ لینے لگا۔ ”اس نے مجھ سے پورا بیچ نہیں کہا تھا۔“ کیپٹن ولیم نے یہ بات عجیب سے لہجے میں کہی تھی۔

”انہوں نے آپ سے ٹھیک کہا تھا۔“ وکی نے یہ سن کر فوراً جواب دیا۔ اسے باپ کی بات کافی عجیب لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ سوتیلی ماں کے حوالے سے اس کا باپ کسی غلط فہمی کا شکار ہے، سبھی وہ یہ کہہ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سوتیلی ماں قطعی جھوٹی نہیں ہے۔

”اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی تو پھر تم کالج کے بجائے یہاں کیوں چلے آئے؟“ کیپٹن ولیم نے بھوئیں چڑھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ اور کرنے کا ارادہ ہے؟“ اُس کا لہجہ سوالیہ تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا پچھلے سو سال سے مایہ گیری کر رہا تھا۔

”کچھ کرنے کا ارادہ نہیں۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ ”ویسے بھی میں کبھی گریجویشن نہیں کر پاتا۔“ یہ کہہ کر اس نے باپ کی طرف دیکھا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ”کیا بھی

آپ نے کوئی چیز دیکھا ہے؟“

کیپٹن کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات صاف دکھائی دینے لگے۔ وکی مصموانہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے چیتے سے خالص لگاؤ تھا۔ اس نے بچپن میں ایک لٹم پڑھی تھی۔ وہ لٹم چیتے کے بارے میں تھی:

چیتے اوجھتے!
تیری چمکیلی آنکھیں!

جیسے جنگل کی اندھیری رات میں روشن ہوں دودھے۔
یہ لٹم اسے اتنی بھائی کہ اُس کے بعد سے تو وہ چیتے کا دیوانہ ہو گیا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ ماؤری افسانوی داستانوں کی طرح چیتا بھی کوئی قصہ ہے یا پھر وہ کوئی عظیم المرتبت روحانی شخصیت ہے۔ یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ چیتا تو ایک جیتا جاگتا، گوشت پوست کا بنا ہوا جنگلی درندہ ہے۔

”کبھی نہیں دیکھا میں نے اپنی زندگی میں“ کیپٹن کی بھوئیں بہ دستور تپتی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”ارے یاد آیا۔“ چند لمحوں کے بعد بعد اس کی تنی ہوئی بھوئیں ذرا ڈھیلی پڑیں اور اس نے قدرے نرم لہجے میں وکی سے کہا۔ ”ایک بار موقع ملا تھا چیتا دیکھنے کا مگر میں دیکھ نہیں پایا۔“

”کب...؟“ وکی نے یہ سن کر حیرت سے کہا۔

”اُن دنوں میں میلا میں تھا، جب سلطان بردنائی نے وہاں کا دورہ کیا۔“ کیپٹن ولیم نے قصہ گوئی کے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”اُس موقع پر سلطان کو بہ طور تحفہ چیتوں کا ایک جوڑا پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں انہیں ایک پنجرے میں قید کر کے مارک میں رکھا گیا تھا تاکہ لوگ انہیں دیکھ سکیں۔ میں بھی دیکھنے جاتا مگر اُس روز مجھے بہت کام تھا۔ ویسے بھی وہ صرف ایک دن کے لیے وہاں رکھے گئے تھے۔“ یہ کہہ کر اس نے پاؤں پیارے اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹانے گا۔

”اچھا چھوڑیں چیتے کو، یہ بتائیں آپ یہاں کیسے آئے ہیں؟“ وکی نے باپ سے پوچھا۔

”میں کورو سے ملنے آیا ہوں۔“ یہ وکی کے ناناکا خاندانی نام تھا۔ ”دراصل مجھے ایک پادری کی ضرورت ہے جو جہاز پر مذہبی رسومات ادا کر سکے۔“

”کیا تم نوٹنگا سے ملنے آئے ہو؟“ وکی نے یہ سنتے ہی سوال کیا۔ یہ ماؤری قبیلے کے مذہبی پیشوا کا لقب تھا۔

”کوئی بھی ہو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ کیپٹن ولیم نے جواب دیا۔ ”بس اسے پادری ہونا چاہیے اور وہ مذہبی رسومات اور دعائیں کروا سکتا ہو۔“ اس کے لہجے

سے بیزاری جھلک رہی تھی۔

”ہوا کیا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ کوئی پادری آکر میرے جہاز پر دعا کروائے، جس سے آسپیری تو میں بھاگ جاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”وہ بھاگتی ہیں یا نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، کم از کم وہ اپنی دعا سے میرے توہم پرست قلیوں کو ضرور مطمئن کر دے۔“

”تو جہاز پر کچھ ہو گیا ہے؟“

”میں نے نیلا میں قلیوں کی ایک کھپ بھرتی کی تھی۔“ کیپٹن نے کہنا شروع کیا۔ ”ان میں سے ایک نے جہاز پر لدے سامان میں ایک لاش دیکھی ہے اور اب سب پریشان ہیں۔“

”کیا جہاز پر کوئی قتل ہو گیا ہے؟“ وہی نے قطع کلامی کی۔

”فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ لاش ضرور ملی ہے۔“ کیپٹن ولیم نے اس انداز میں کہا جیسے وہ تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ”قلیوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ آسپیری قوتوں کا کیا دھرا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ڈر کے مارے جہاز چھوڑ دیں۔ اس وقت میں نے قتل بھرتی کرنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ کاروباری مجبوری ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور گہری سانس بھر کر کہنے لگا۔ ”اب کوئی پادری ہی ان کے دل کا ڈر دور کر سکتا ہے۔“

”میں انہیں لے کر آتا ہوں۔“ وہی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور گھر کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں اس کا نانا کورو دکھاڑے سے لکڑی پھاڑ رہا تھا۔ کورو خاصا بوڑھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ وہ اپنی عمر سے خاصا چھوٹا لگتا تھا۔ بڑھاپے میں بھی وہ ایسے سخت کام کر لیتا تھا۔

وہی کو دیکھتے ہی اس نے کلباڑا چلا نا بند کیا۔ جب اس نے بتایا کہ کیپٹن اس سے ملنے آیا ہے تو اس نے رومال سے چہرے کا پسینا صاف کیا۔ گلے کے بٹن بند کئے، کاردرست کیا اور آستینیں نیچی کرتا ہوا اس کے ساتھ پورچ کی طرف چل دیا۔

”کیا تم اپنی روایات بھول گئے ہو؟“ کورو نے چلتے چلتے وہی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”ہوئے کہا۔“ ماؤری تہذیب ہے کہ جب کوئی شخص گھر کے سامنے والے حصے سے اندر داخل ہو تو اس کا روایتی طریقے سے استقبال کرتے ہیں، اس سے چائے کا پوچھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور وہی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ایسا کچھ نہیں کیا ہوگا؟“

”نہیں۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

”چلو۔“ یہ سنتے ہی کورو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔

کیپٹن اور کورو بڑے تپاک سے ملے۔ انہوں نے گرجوٹی سے ہاتھ ملایا۔ ماؤری لوگوں کی طرح ایک دوسرے کی ناک سے ناک رگڑ کر مبارک باد دی۔ کیپٹن نے اس کی خدمت میں بیش قیمت پائپ تمباکو اور دیگر چیزیں بہ طور تحفہ پیش کیں اور پھر تینوں گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہی کی ثانی چٹک میں اُلتے ہوئے پانی میں پتی ڈال کر ماؤری لوگوں کی مخصوص چائے تیار کر رہی تھی اُس معزز مہمان کے لیے جو بھی اُس کا داماد بھی تھا۔ وہی جانتا تھا کہ اس کا باپ یہاں کیوں آیا ہے لیکن اس نے ابھی تک مطلب کی بات نہیں کی تھی۔ اسے چائے کا انتظار تھا۔ ماؤری باشندے اس وقت تک مہمان سے آمد کا مدعا نہیں معلوم کرتے، جب تک وہ اُن کے ہاں کی چائے نہ پی لے۔ یہ بات کیپٹن بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ چائے ختم ہوئی تو کیپٹن نے سکھ کی سانس لی۔ اب وہ کام کی بات کر سکتا تھا۔

”مگر ایک مسئلہ ہے۔۔۔“ کیپٹن ولیم کی ساری بات سن کر کورو کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ”فرض کرو کہ تمہارے قلمی نوٹنگا کی دعا اور رسومات سے متاثر نہ ہوئے تو۔۔۔“ اس نے کیپٹن کی طرف گہری نظروں سے دیکھا، وہ خاموش تھا۔

”اگر ایسا ہوتا تو وہ بہت ہتک محسوس کرے گا۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کورو نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ ”وہ اس جزیرے کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہے۔ سب لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں لیکن تمہارے قلمی اجنبی ہیں، وہ نوٹنگا اور اس کے مقام سے ناواقف ہیں۔ اسی لیے میں ڈر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر کورو چپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔

کیپٹن ولیم کے ماتھے پر غل پڑے ہوئے تھے۔ وہ پریشانی کے عالم میں باری باری اپنی دونوں بھوؤں میں سے ایک کو کبھی اوپر تو کبھی دوسری کو نیچے کر رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر پادری نے دعا نہ کروائی تو قلمی جہاز چھوڑ سکتے ہیں۔ ایسا ہوتا تو وہ جہاز پر لدے سامان اگلی منزل تک وقت پر نہیں پہنچا

پائے گا۔ کیپٹن کو قلیوں کی نہیں، اپنے نقصان کی فکر تھی۔ کورو خاموش تھا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیپٹن اس کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ کافی دیر بعد کورو نے سر اٹھایا اور کیپٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں تمہاری پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔ اب جو بھی ہو، تمہاری مدد تو کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ”میں اور نوٹنگا دوپہر کو تمہارے جہاز پر پہنچتے ہیں۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ کیپٹن نے کورو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے باپ کے ساتھ باہر تک آیا۔ وہ اب تک اس ادھیڑ بن میں تھا کہ جہاز پر لدے سامان میں لاش کہاں سے آئی؟ وہ جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

لنچ کے بعد کورو، نوٹنگا اور وہی جیٹی کی طرف بڑھنے لگے۔ صبح کی نسبت اب وہاں کئی کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ جب وہ ایک کشتی کے ذریعے کیپٹن ولیم کے جہاز پر پہنچے تو وہاں پُر اسرار خاموشی طاری تھی۔ چھوٹے قد اور تانبے جیسی رنگت والے کئی قلمی عرثے پر موجود تھے مگر اس کے باوجود وہاں معنی خیز خاموشی طاری تھی۔ قلیوں کے چہروں پر بھی تشویش نظر آرہی تھی۔

”خوش آمدید۔“ جیسے ہی کیپٹن کو اطلاع ملی وہ ان کے استقبال کے لیے پہنچ گیا۔ وہی ان سے دو قدم پیچھے کھڑا خاموشی سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ جہاز سامان سے لد ا ہوا تھا۔ کیپٹن نے شاید عملے کو مطلع کر دیا تھا، اس لیے ان کی آمد کے ساتھ ہی عرثے پر میلا کے قلمی جمع ہونے لگے۔ جن کے چہروں سے دل میں چھپا خوف عیاں ہو رہا تھا۔

”وہ شیطان کہاں ہے؟“ نوٹنگا نے گہری نظروں سے کیپٹن کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا اشارہ لاش کی طرف تھا مگر اس کے کہنے کا انداز مختلف تھا۔ اُس وقت تک لگ بھگ سارے قلمی جمع ہو چکے تھے۔

”وہ شیطان نہیں، لاش ہے؟“ کیپٹن نے وضاحت کی۔ اُسے ڈر تھا کہ پادری کے منہ سے لاش کے لیے شیطان کا لفظ سن کر قلمی۔۔۔ مزید خوف زدہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کیپٹن نے بآواز بلند کہا تا کہ سارے قلمی سن لیں۔

”اچھا۔۔۔“ نوٹنگا نے کیپٹن کی بات سن کر بے تاثر لہجے میں کہا۔

”اچھا تو وہ لاش کہاں ہے؟“ کورو نے مداخلت کی۔

”وہاں، اُس طرف۔“ کیپٹن نے عرثے کے ایک حصے

کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ہر طرف سامان لد ا ہوا تھا۔

”چلو۔۔۔“ نوٹنگا نے قدم آگے بڑھایا۔ اُس کے پیچھے پیچھے سب لوگ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چل دیے۔ وہی بھی تجسس بھری نظروں سے ارد گرد دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔

وہاں نمک کے بہت بڑے ڈھیر میں واقعی ایک لاش موجود تھی۔ لاش کا نچلا دھڑ نمک کے ڈھیر میں دفن تھا تاہم اوپری نصف حصہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ مرنے والے کے چہرے پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی جس میں اُس کا زرد چہرہ چمک رہا تھا۔ اس نے نائٹ گاؤن پہنا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر پہلی نظر میں تاثر ابھرتا تھا کہ موت قدرتی طور پر واقع ہوئی ہو۔

وہی بھی دوسروں کی طرح لاش کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ اس نے اب تک کئی مردے دیکھے تھے مگر تابوت میں لیٹے اور تدفین کے لباس میں ملبوس۔ پہلی بار وہ ایسی لاش دیکھ رہا تھا جسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ تابوت میں لیٹنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

”یہ لاش کس شے میں دبی ہوئی ہے؟“ وہی نے اپنے باپ کے کان میں کہا۔

”اوہ۔۔۔“ یہ سن کر کیپٹن ولیم نے گردن موڑی اور بیٹے کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بتایا تو تھا نمک ہے۔“

”مگر یہ تو گلابی اور بھورا مال ہے؟“ وہی نے پھر سوال کیا۔

”یہ خام سمندری نمک ہے۔“ کیپٹن نے سرگوشی کی۔

”اسے کھانے کے قابل بنانے کے لیے مشینوں سے صاف کیا جاتا ہے۔“

”نمک۔“ یہ سن کر وہی نے خود کلامی کی۔ جہاز پر نمک لادنے کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ صرف پُریش سامان کی ترسیل و تجارت کرتا تھا مگر نمک۔۔۔؟ ”یہ آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟“ اس نے نمک کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے اسے جنوبی امریکا کی بندرگاہ کلاؤ سے خریدا تھا، سنڈنی میں بیچنے کے لیے۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ ”یہ وہاں کافی مہنگا ہے اور اسے کینکرو کی کھالوں کو خشک کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے جب میں کلاؤ سے چلا تو یہ سوچ کر خرید لیا کہ سنڈنی میں بیچ کر بھاری منافع کماؤں گا۔“

یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہوں میں لمحہ بھر کے لیے شاطر تاجر کی چمک ابھر آئی تھی۔ ”مگر یہ لاش۔۔۔ اب یہ مصیبت ختم ہو تو

آگے سفر کروں۔“ کیپٹن ولیم نے سرگوشی میں کہا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔
”لاش کے علاوہ کچھ اور بھی ملا ہے؟“ وکی نے سوال کیا۔

”ہاں...“ کیپٹن نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اس کے سوا یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جہاز سے کئی سیروزنی سونے کی وہ پانچ اینٹیں بھی غائب ہیں، جو خصل کی گھلی میں لپٹی ہوئی تھیں اور انہیں یورپ پہنچانا تھا۔ ریکارڈ میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ وہ سونا کہیں پر اتارا گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ چوری کر لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلاؤ سے روانہ ہونے کے بعد جب پڑتال کی گئی تو ایک قلی بھی غائب تھا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا۔
”اس وقت تو میرے لیے یہ گمشدگی اہم نہیں تھی مگر اب یقین ہے کہ وہی چور تھا۔“

”اوہ، ایک بار پھر...“ وکی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔
”کیا مطلب؟“ کیپٹن نے استفسار یہ نگاہوں سے بیٹے کو گھورا۔

”اسی طرح ایک بار پہلے بھی جہاز سے سونا چوری ہوا تھا۔ یہ 1820ء کی بات ہے۔“ وکی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”اب یہ کیا قصہ ہے؟“ کیپٹن نے وکی کو بازو سے پکڑا اور ایک طرف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”پتا ہے یہ کون سا دور ہے... 1899ء، ویسے تم کس کی بات کر رہے تھے۔“
”یہ ایک سچا قصہ ہے۔ سائمن بولیور کے سپاہی لیما کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔“ وکی نے قصہ سنانا شروع کیا۔ ”واسرائے جانتا تھا کہ اُس وقت لیما کی بندرگاہ پر ایک جہاز تیار کھڑا ہے جس پر شاہ اسپین کے خزانے کے لیے سونا لدا ہوا تھا۔ وائسرائے نے اسپین اطلاع کی اور پھر شاہی انتظامیہ نے اُس وقت کے مشہور جہاز راں کیپٹن میرے ڈیر کو بھیجا۔ اس نے جہاز پر سے سارا سونا اتروا کر اپنے جہاز پر لادا اور پناہ چل دیا لیکن پھر بھی وہ خزانہ بچا نہیں۔ بحری قزاقوں نے راستے میں اُس جہاز پر دھاوا بول دیا۔“

”اور سارا سونا لوٹ کر ایک جزیرے پر دفن کر دیا۔ اب بھی اگر کوئی وہ جگہ تلاش کر کے کھدائی کرے تو سونا حاصل کر سکتا ہے۔“ کیپٹن نے قطع کلامی کی اور مسکراتے ہوئے کہا۔
”آپ کی بات کچھ ٹھیک ہے اور کچھ نہیں۔“ وکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”قزاقوں نے سمونا لوٹ کر واقعی کسی جزیرے پر دفن کر دیا تھا مگر وہ بج نہیں پائے۔ اس حملے کی

اطلاع ملتے ہی اسپین کی بحری فوج کے جہازوں نے قزاقوں کی تلاش شروع کر دی۔ انہوں نے کیپٹن میرے ڈیر کو بھی اپنا پرغمال بنارکھا تھا۔ ایک مقام پر دونوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ تمام قزاق مارے گئے۔ صرف کیپٹن کو بچالیا گیا مگر وہ بہت بیمار اور خوف زدہ تھا۔ صرف کیپٹن جانتا تھا کہ قزاقوں نے سونا کس جزیرے پر دفن کیا تھا مگر قزاقوں کی قید سے رہائی کے فوراً بعد وہ سخت بخار میں مبتلا ہوا اور پھر کچھ ہی دن بعد بنا زبان کھولے مر گیا۔“ یہ کہہ کر وکی نے باپ کی طرف دیکھا۔ ”صرف کیپٹن ہی جانتا تھا کہ خزانہ کہاں دفن ہے۔“
”کہانی خوب ہے۔“ کیپٹن نے سامنے کی طرف دیکھا۔ کوروا اور نوٹنگا اب تک لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کے گرد سب سے ہوئے قلی کھڑے تھے۔ ”تو تم اس احقانہ کہانی پر یقین کرتے ہو۔“ کیپٹن کا انداز طنزیہ تھا۔

”کیوں نہیں۔“ وکی نے فوراً جواب دیا۔ ”میں نے یہ کہانی اپنے بچپن میں سنی تھی مگر افسوس...“ یہ کہہ کر اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ ”گلتا ہے آپ کو بچپن میں نہ تو کہانیاں سننے کا موقع ملا اور نہ ہی آپ نے پڑھی ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔ ”خیر جانے دیجیے اس بات کو۔“
”یہاں معاملہ یہ ہے کہ جہاز پر لاش موجود ہے۔ قلی سب سے ہوئے ہیں، سونے کی پانچ اینٹیں چوری کر لی گئی ہیں، جن کی مالیت ایک لاکھ ڈالرز سے اوپر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ملازم بھی غائب ہے۔ امکان یہی ہے کہ چوری اسی لاپچی ملازم نے کی ہے۔“ کیپٹن نے سخت لہجے میں کہا۔
”ایسے میں تم ہو کہ نہ جانے کیا قصہ سنار ہے ہو۔“

”خیر... اگر ہم 1820ء کی طرف واپس پلٹیں تو ایک قصہ ہے، جس میں ملازم اسی طرح مالک کا سونا چوری کر لیتا ہے مگر جانے دیجیے۔“ وکی نے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر اچانک اس لاش کا انکشاف کیسے ہوا؟“ وکی نے انگلی سے اُس طرف اشارہ کیا جہاں نمک کے ڈھیر میں آدھی لاش دفن تھی۔
”میں بے آف آئی لینڈ پر یہ نمک اتروا رہا تھا۔“
”مگر کیوں؟“ وکی نے قطع کلامی کی۔ ”آپ نے تو اسے سڈنی لے جانے کے لیے خریدا تھا۔“

”ہاں...“ کیپٹن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسے سڈنی لے کر گیا تھا مگر وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ آسٹریلیا میں ان دنوں کیٹیکرو کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے ان کا شکار عارضی طور پر روک دیا گیا ہے۔ اسی لیے وہاں نمک کی مانگ اور دام، دونوں بہت گر گئے ہیں۔ فیصلہ کیا کہ یہیں اتروا کر اپنے گوداموں میں رکھوا دیتا ہوں۔ جیسے ہی سڈنی میں اس

کی طلب بڑھے گی، یہاں سے لے جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا۔ ”مجھے یہاں سے تل لے کر نیویارک پہنچانا تھا۔ نمک نے بھی اتنی جگہ گھیری ہوئی ہے، اگر یہ لاش...“

”کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ جہاز پر نمک کے ڈھیر میں ایک لاش دبی ہوئی ہے؟“ وکی نے قطع کلامی۔

”غلط...“ اس نے فوراً وکی کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ بات جانتا تھا۔“

”کیا؟“ وکی نے حیرت سے کہا۔ ”آپ جانتے تھے کہ لاش... مگر کیسے؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

”اس لیے کہ میں نے ہی لاش نمک کے ڈھیر میں دبائی تھی۔“

”تو جب آپ کے آدمی نمک اتار رہے تھے تو آپ نے انہیں منع کیوں نہیں کیا؟“ وکی نے استفسار یہ لہجے میں کہا۔ ”اس طرح یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔“

کیپٹن نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”میں لاش کا تذکرہ کر کے اس احقانہ صورت حال کا مزید چرچا نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”یہ ماجرا کیا ہے؟“ وکی نے حیرانی سے کہا۔ پہلے تو وہ اس لاش کو پراسرار قل سمجھ رہا تھا مگر اب یہ سن کر تو وہ مزید پریشان ہو گیا تھا کہ اس کے باپ کو لاش کے بارے میں پہلے سے ہی علم تھا۔

”یہ سب اس کسٹم ہاؤس افسر کا کیا دھرا ہے۔“ کیپٹن نے غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔
”ہوا کیا تھا؟“

”جب میں کلاؤ سے نکلنے والا تھا، تب کسٹم ہاؤس کا ایک افسر میرے پاس آیا۔“ کیپٹن نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا اور سامنے نظر ڈالی۔ نوٹنگا کچھ دعائیں پڑھ رہا تھا، باقی تمام لوگ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ ”اس افسر کے ساتھ ایک بوڑھا جوڑا تھا۔ اس نے ہی بتایا کہ مرد کا نام سائیلون ٹو باتھ ہے اور وہ عورت اس کی بیوی اینا تھی۔ ٹو باتھ کو سڈنی پہنچنا تھا۔ اسے بخار بھی تھا۔ وہ کئی روز سے بندرگاہ پر تھے مگر انہیں کوئی جہاز نہیں ملا تھا اور نہ ہی آنے والے ہفتوں میں کسی مسافر بردار بحری جہاز کی آمد متوقع تھی۔ اس افسر نے بتایا کہ امریکی حکومت نے مسٹر ٹو باتھ کو سڈنی میں امریکا کا کمرشل ایجنٹ مقرر کیا ہے اور ان کا پہنچنا بہت ضروری ہے۔ کسٹم افسر جانتا تھا کہ میں نمک لے کر سڈنی جا رہا ہوں۔ میں نے اس کی درخواست یہ سوچ کر مان لی کہ چلو امریکی بھائی کی مدد کر رہا ہوں اور وہ بھی اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ ٹو باتھ نے اپنی مدد کا مطلب حکومت کی مدد کرنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

ہوا اور غصیلی نظروں سے سمندر کی طرف دیکھا۔ ”لیکن مدد کے چکر میں اب خود چھس گیا ہوں۔“

باپ کی بات سن کر وکی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے باپ کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ٹو باتھ کی مدد میں فائدہ نظر آیا ہوگا، بھی انہیں سوار کر لیا۔ لیکن خود کیپٹن ولیم کی بھی یہی سوچ تھی مگر مسافر کی موت کے بعد صورت حال بدل گئی۔

”ویسے میری نظر میں یہ شرم ناک بات تھی کہ دوران سفر انتقال کر جانے والے معزز شہری اور اعلیٰ امریکی عہدیدار کی لاش کی یوں بے توقیری ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وکی نے کیپٹن کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ”یہاں تو ان کی لاش کا مذاق بنا ہوا ہے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔“ یہ سن کر کیپٹن نے کہا۔ ”مگر جو کچھ ہوا، وہ اُس کی بیوی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ تو کلاؤ سے چلتے ہی میرے لیے عذاب جان بن گئی تھی۔ ہر وقت بک بک، ہر بات میں کیڑے نکالنا، تنگ آ گیا تھا میں اس سے۔ اسی لیے اسے اوپری عرشے پر بٹھرا دیا تھا۔“
”مگر ان کی موت کیسے ہوئی؟“ وکی نے پوچھا۔

”ہم تین ہفتے پہلے کلاؤ سے نکلے تھے، وہ وہیں پر بخار میں مبتلا تھے۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”راستے میں ان کی طبیعت مزید خراب ہو گئی اور وہ چل بسے۔ میں لاش کو کیونوں میں لپیٹ کر سمندر برد کرنے والا تھا لیکن اس کا اصرار تھا کہ اس کے شوہر کی لاش کو محفوظ کروں اور کسی طرح جلد سے جلد سڈنی پہنچا دوں، جہاں اس کی مہذبانہ انداز میں تدفین کی جاسکے۔ اسی لیے میں نے خاموشی سے لاش کو نمک کے ڈھیر میں دبا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے سوا لاش کو محفوظ کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔“

”تو یہ بات تھی۔“ وکی نے گہری سانس لے کر کہا۔
”اب تو اسے حسن اتفاق ہی کہیں گے کہ مال بردار جہاز پر ایک معزز امریکی افسر کی لاش بھی لدی ہوئی تھی۔“ وکی نے خود کلامی کی۔ بیٹے کی بات سن کر کیپٹن کی ابرو پر ہلکی سی جنبش ہوئی۔

”مسز ٹو باتھ کہاں ہیں؟“ وکی نے کچھ دیر خاموشی کے بعد پوچھا۔

”سڈنی میں۔“ کیپٹن نے سادگی سے جواب دیا۔
”کیا...؟“ یہ سنتے ہی حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”تو آپ سڈنی ہو کر آ رہے ہیں؟“ اس نے استفسار یہ نگاہوں سے کیپٹن کو دیکھا۔

”ہاں...“ کیپٹن نے مختصر سا جواب دیا۔
”تو پھر یہ...“ وہی نے لاش کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہی سوچ کر تو میں پریشان ہوں۔“ کیپٹن نے جواب دیا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ”سڈنی پہنچ کر مسز اپنائو ہاتھ سائل پر موجود سرکاری مہمان خانے میں منتقل ہو گئی تھی۔ میں خوش تھا کہ چلو جان چھوٹی۔ میں نے دو تین ملاحوں کو اس کی دیکھ بھال کے لیے بھیج دیا تھا۔ دو دن بعد اس نے ایک شاعر تاہوت اور کچھ لوگ اس پیغام کے ساتھ بھجوائے کہ مسز ٹوہاتھ کی میت انہیں دے دی جائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ نمک کے ڈھیر سے لاش نکال لیں۔ کچھ دیر بعد وہ میت لے کر چلے گئے۔ میں نے خود دیکھا تھا کہ چادر میں لپیٹی لاش تاہوت میں رکھی تھی۔ دوسرے دن سڈنی میں ہی ان کی مہذبانہ انداز میں تدفین کر دی گئی۔ سڈنی میں تو نمک فروخت نہیں کیا تھا۔ اسی لیے آج صبح یہاں نمک کی منتقلی کروا رہا تھا کہ یہ کمبخت...“ اس نے دانت پیٹتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ایک منٹ۔“ وہی نے ہتھیلی سے اپنی پیشانی دباتے ہوئے کہا۔ ”آپ مسز ٹوہاتھ کو پہچانتے تھے؟“
”بالکل پہچانتا تھا۔“
”تو یہ لاش انہی کی ہے؟“

یہ سن کر کیپٹن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”ایک بات سمجھ نہیں آرہی۔“ وہی نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ”اگر مسز ٹوہاتھ کی لاش سڈنی بندرگاہ پر اتاری گئی اور پھر وہاں تدفین بھی ہو چکی تو ان کی یہ لاش یہاں کیوں موجود ہے؟“ یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔
”دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ لاش ٹوہاتھ کی ہے تو پھر جہاز پر سے تاہوت میں جو لاش لے جانی گئی تھی، وہ کس کی تھی؟“
”میرے بچے... یہی سوال تو مجھے پریشان کیے جا رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے کیپٹن نے نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔
”تو ڈیڈی آپ کو یقین ہے کہ اس تاہوت میں جو لاش لے جانی گئی، وہ مسز ٹوہاتھ کی ہی تھی؟“

”اس وقت تو سو فیصد یقین تھا۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ ”اس یقین کی ٹھوس وجہ بھی ہے۔ جو لوگ لاش تاہوت میں لے جا رہے تھے، انہوں نے مجھ سے آکر پوچھا تھا کہ مرحوم کی کلائی پر جو برسلٹ ہے، کیا اسے اتارنا ہے؟“ یہ کہہ کر کیپٹن مڑا۔ ”یہ ٹھوس وجہ بھی یقین کرنے کی وجہ نہیں کیسے یہ بات معلوم ہو سکتی تھی کہ لاش کی کلائی پر برسلٹ لگے ہوئے ہے۔“

”تو آپ نے ان سے کیا کہا تھا؟“ وہی نے پوچھا۔
”دیکھو میرے سامنے اس کی تدفین ہوئی تھی۔ لاش پرانی تھی، نمک میں خشک ہو چکی تھی۔ اس لیے کسی نے چہرہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔
”ویسے بھی میں مطمئن تھا کہ اس بڑھے کھوسٹ جوڑے سے جان چھوٹی۔ یہ تو اب پتا چلا ہے کہ اس تاہوت میں لاش کسی اور کی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ ”اب یہ مشورہ مت دینا کہ میں سڈنی واپس جاؤں اور قبر کھود کر اس تاہوت میں اصلی مسز ٹوہاتھ کی لاش دفن کر دوں۔“ صاف ظاہر تھا کہ کیپٹن کو صبح سے جس طرح کی صورت حال کا سامنا تھا، اس کے باعث اس کا لہجہ نہایت تلخ ہو چکا تھا۔ اب تو وہ اپنے اس بیٹے کی باتوں کو بھی بکواس سمجھ رہا تھا جس سے اس کی ملاقات دو برس بعد ہوئی تھی۔

”کیا آپ نے مسز ٹوہاتھ سے یہ بات کہی تھی کہ وہ بند تاہوت میں موجود لاش کو دفنانے سے پہلے کم از کم اس کی تصدیق تو کر لیں کہ آیا...“
”نہیں کہی تھی یہ بات اس منحوس بڑھیا سے۔“ کیپٹن نے چڑ کر کہا۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“
”تو اب اس لاش کا کیا کریں گے؟“
”یہ ایک بار پھر دفن ہونے والی ہے۔“ کیپٹن نے تلخی سے کہا۔

”ایک بار پھر...“ وہی نے خود کلائی کی۔
”میں مذاق نہیں کر رہا۔“ کیپٹن نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تاہوت کا آرڈر دے دیا ہے اور وہ پہنچنے ہی والا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے بندرگاہ کی طرف نظر دوڑائی۔ ”میں امریکا کے تجارتی ایجنٹ اور معزز شخصیت مسز ٹوہاتھ سالکون کی لاش کو جزیرے پر نامعلوم ملاح کی حیثیت سے دفنانے جا رہا ہوں اور پھر کبھی کوئی یہ بات نہیں جان پائے گا کہ مسز ٹوہاتھ سڈنی میں دفن ہوئے تھے یا...“ اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سن کر وہی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسز ٹوہاتھ کی اس پراسرار اور گم نام تدفین کے ساتھ ہی یہ راز بھی ہمیشہ کے لیے ایک راز ہی رہ جائے گا کہ سڈنی میں اس کے نام پر دفن کیے گئے تاہوت میں کس کی لاش تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر بندرگاہ کی طرف دیکھا۔ وہاں کافی تعداد میں کشتیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک کشتی تیزی سے ان کے جہاز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ وہی کشتی تھی جو کیپٹن ولیم کے آرڈر پر تاہوت لے کر پہنچ رہی تھی تاکہ لاش اٹسے چھپا چھپا کر لے کر جلد از

جلد اس کی تدفین کر دی جائے۔
نوٹنگا کے مذہبی پیشوا کے حلیے، دعاؤں اور مذہبی باتوں کے باعث ملاحوں کا خوف بڑی حد تک دور ہو چکا تھا۔ انہوں نے نوٹنگا کے کہنے پر لاش کو نمک کے ڈھیر سے نکال کر قریب کچھی ترپال پر لٹا دیا تھا۔ مرحوم کے دونوں ہاتھ سینے پر دھرے تھے۔ گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ تاہوت لانے والی کشتی کو دیکھ کر کیپٹن بیٹے کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تاکہ اسے اوپر لانے کے لیے انتظام کر داسکے۔

وہی آگے بڑھا۔ کورو اور نوٹنگا لاش کے پاس کھڑے تھے۔ نوٹنگا آنکھیں بند کیے بہ دستور منہ ہی میں منہ میں کچھ کلمات بد بدارہا تھا۔ وہ لاش کو دیکھنا چاہتا تھا جیسے ہی اس کی پہلی نظر پڑی، اس کے جسم میں خوف کی سرسراہٹ دوڑ گئی۔ کئی ہفتوں تک نمک میں دبے رہنے کے باعث لاش کی حد تک سوکھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ نمک میں دبے رہنے کے بعد لاش بہت خوفناک ہو چکی تھی۔ اس وقت مرحوم ٹوہاتھ کی خوف ناک بھوت سے کسی صورت کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہی سمجھ گیا کہ قلمی کیوں خوف زدہ تھے۔ اگر وہ بھی حقیقت جانے بغیر یہ لاش دیکھ لیتا تو وہ ان سے کسی طور کم خوف زدہ ہو کر نہیں ہوتا۔

تاہوت اوپر پہنچ چکا تھا۔ کیپٹن ولیم ترپال کا ایک نیا کلا لے آیا۔ لاش کو اس میں لپیٹ کر تاہوت میں رکھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھٹیا سے تاہوت کے اوپری ڈھکن میں کیلیں ٹھونک کر اسے بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد نوٹنگا نے دعا کروائی اور پھر جہاز کو پاک کرنے کے لیے، ادھر ادھر مقدس پانی کے چھینٹے مارے۔ تاہوت لانے والوں نے بڑی آسانی سے اسے اٹھایا اور پھر رے سے باندھ کر نیچے کھڑی کشتی میں اتارنے لگے۔ وہی عرشے پر کھڑا تاہوت کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ قلمی بھی وہیں کھڑے تھے۔ اب ان کے چہرے کی حد تک مطمئن نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد تاہوت لے جانے والی کشتی سب کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ کیپٹن ولیم کے حکم پر ملاح نوٹنگا کو لے کر جہاز کے نچلے حصے کی طرف چل دیے تاکہ وہ انہیں نمک میں دبی روح کے آسیب سے پاک کر سکے۔ وہی عرشے پر اکیلا کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور تنقیدی نظروں سے نمک کے بڑے سے ڈھیر کا جائزہ لینے لگا۔

جہاں سے ٹوہاتھ کی لاش ملی، وہ مقام سامان کی منتقلی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ وہی نہایت گہری نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں کئی بیچے تھے۔ ان بچے ایک

بیچہ اٹھایا اور نمک کے ڈھیر میں مارا۔ اس نے کئی بار ادھر سے ادھر بیچہ چلایا مگر اسے ایسا کوئی ثبوت نہیں مل سکا جس سے لگے کہ اس ڈھیر میں دوسری لاش بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ ڈھیر کی اوپری سطح سے نمک تیزی سے نیچے کی طرف پھسل کر گرنے لگا تھا۔ وہی نے بیچہ رکھ دیا اور فرش کا جائزہ لینے لگا۔

ساگوان کی لکڑی کا بنا ہوا جہاز کے عرشے کا وہ فرش بالکل صاف ستھرا تھا۔ بہ ظاہر وہاں اسے ایسا کوئی معمولی سا دھبہ بھی نظر نہیں آیا، جس سے شک ہو کہ وہاں پر کسی شخص کو قتل کیا گیا ہو۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ اس کے باوجود وہ فرش پر بیٹھ کر تنقیدی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ ”شاید ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ نوٹنگا بھی اپنا کام ختم کرنے والا ہوگا۔

مسز ٹوہاتھ کا تاہوت چلے جانے کے لگ بھگ گھنٹا بھر بعد وہ سب واپس جانے والے تھے۔ اس وقت نوٹنگا بہ طور مذہبی پیشوا اپنی الوداعی تقریر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے طور پر قلموں کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ جہاز ہر قسم کی بدروح سے پاک ہو چکا ہے۔ وہی نے محسوس کیا کہ قلموں کے چہرے پر کچھ اطمینان نظر آرہا تھا۔

☆☆☆

”بڑی مشکل میں ہوں۔“ دوسرے دن صبح کے دس بج رہے تھے، جب ایک بار پھر کیپٹن ولیم، کورو کے گھر پہنچا۔ اس وقت کورو بھی وہی کے ساتھ پورج میں موجود تھا۔ اس نے کورو کو دیکھتے ہی پریشانی کے عالم میں کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا۔ ”تم جوتے اتار کر اندر آؤ، پھر دیکھتے ہیں کہ کیا کر سکتے ہیں۔“
”نہیں نہیں، آپ بیٹھیں، یہیں بات کرتے ہیں۔“

کیپٹن نے کہا اور کرسی کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہی زمین پر رکھی ایک بڑی سی ٹرے میں نمک کی ایک چھوٹی سی ڈھیری بنا کر، اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نمک وہ جہاز سے واپسی پر ایک تھیلے میں بھر کر ساتھ لایا تھا۔ ”اور تم کیا کر رہے ہو اس آسبی نمک کے ساتھ؟“ کیپٹن نے بیٹھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہ دستور نمک پر نظریں گڑائے بیٹھا تھا۔

”بہت پریشان کیا ہے اس منحوس بڑھے کی لاش نے۔“ کیپٹن، کورو کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہی اسے اپنا نیا ڈیکھڑا ستانے لگا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ مذہبی رسومات کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر کچھ نہیں ہوا۔ اب ابھی نمک

اتارنے سے انکاری ہیں۔ کہتے ہیں کہ نمک آسیب زدہ ہے۔ وہ اس کے قریب ہی نہیں جا رہے۔ کچھ تو یہاں تک بکواس کر رہے ہیں کہ پورا جہاز ہی آسیب زدہ ہو گیا ہے۔ مرنے والے کی روح آسیب بن کر ادھر ادھر گھوم رہی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور نہایت زہر آلود لہجے میں کہنے لگا۔ ”ان کم بختوں کو جہاز سے خوف آرہا ہے، نمک اتارنے میں انہیں آسیب کا خطرہ ہے لیکن میرا راسن ٹھونٹے ہوئے انہیں کوئی ڈر نہیں لگتا... حرام خور کہیں کے۔“ وہ بہت غصے میں لگ رہا تھا۔ ”کچھ کیجیے، ان کی وجہ سے میرا بہت نقصان ہو سکتا ہے۔“ اس نے کور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ادھر کیپٹن ولیم اپنے سابق سر سے باتیں کر رہا تھا، ادھر دوسری طرف وکی بہ دستور نمک کی ڈھیری پر نظریں گزائے غور سے دیکھے جارہا تھا۔ اس نے لکڑی کے ایک چھوٹے سے چوکور ٹکڑے کو اہرام کی شکل میں بنائی گئی ڈھیری کی تہ میں دبا دیا تھا۔ دانے دار نمک کی ڈھیری آہستہ آہستہ ٹرے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ آخر سارا نمک ٹرے میں پھیل گیا اور نمک کے بیچ سے لکڑی کا وہ چھوٹا سا چوکور ٹکڑا جھلکنے لگا۔ وکی نے ایک بار پھر اس ٹکڑے کو نیچے رکھا اور دوبارہ اس پر نمک کی ڈھیری بنانے لگا۔ کورو سے گفتگو کے دوران کیپٹن ولیم نے کئی بار گردن موڑ کر بیٹے کو دیکھا مگر سمجھ نہیں پایا کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے۔ ایک بار پھر سارا نمک ٹرے میں پھیل گیا اور تہ میں چھپا چوکور ٹکڑا نمودار ہو گیا۔

”سڈنی میں مسٹر ٹو باتھ کی لاش لے جانے والوں نے بریسلٹ کے متعلق کیا کہا تھا؟“ کورو گھر کے اندر چائے لینے گیا تھا۔ تب وکی نے نمک کی ڈھیری سے نظریں اٹھا کر باپ کو دیکھا اور پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ کیپٹن نے چوتکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ وہ لوگ نمک کے ڈھیر کو کھود کر صرف یہ دیکھنے کے لیے آئے تھے کہ لاش نے کیا کچھ پہنا ہوا تھا اور انہیں وہ نمک کے ڈھیر میں تو نہیں گر گیا۔“ اس کے لہجے میں پوشیدہ ناگواری صاف جھلک رہی تھی۔

”اگر آپ اس بارے میں کچھ یاد کر کے بتا سکیں تو مناسب ہوگا۔“ وکی نے باپ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار نظر آرہا تھا۔

”تم سمجھتے ہو کہ اُس وقت مجھے صرف یہی ایک کام تھا جو یہ بات یاد رکھتا کہ لاش نے بریسلٹ کس طرح کا پہنا ہوا تھا۔“ وہ بہ دستور تلخ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ”ویسے بھی جب وہ لاش لے جا رہے تھے تو میں نے جان بوجھ کر اسے

نہیں دیکھا۔ میں اس لاش کو اتنی بار دیکھ چکا تھا کہ مزید دیکھنے کے تصور سے ہی اُبکاٹی آتی تھی۔“

”مگر وہ بریسلٹ...“ وکی نے مداخلت کی۔

”بریسلٹ۔“ کیپٹن نے دہرایا اور کچھ سوچنے لگا۔ وکی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”ہاں یاد آیا۔ اُن میں سے ایک شخص کہہ رہا تھا کہ وہ بریسلٹ سلور رنگ کا تھا لیکن دوسرا کہہ رہا تھا کہ نہیں سنہری جیسا یا شاید سیاہ نال تھا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور وکی کو دیکھنے لگا۔ ”میں نے یہ سنا تو سہی مگر اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں لی، اس لیے ان سے اس بارے میں کوئی بحث نہیں کی۔“

”حیرت ہے۔“ وکی نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اگر وہ سونے یا چاندی کا تھا تو بہت قیمتی ہوگا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ انہوں نے ایک لاش کی کلائی میں قیمتی بریسلٹ دیکھا مگر اسے چوری کرنے کے بجائے اس کا انکشاف کرتے رہے۔ ان سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ سڈنی کے لوگ تو اپنی بے ایمانی، بجرمانہ سرگرمیوں اور چوری چکاری کی خانہ دانی تاریخ رکھتے ہیں۔“

”اے لڑکے...“ کیپٹن نے بیٹے کو پکارا۔ ”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں کہ سڈنی والے ایسے ہی ہیں مگر مرنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ جب زندہ تھا تو لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ یہ بات وہ بھی جان چکے تھے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے کہ اسی وجہ سے وہ ٹو باتھ کی لاش کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے، ورنہ کوئی اور خاص بات نہیں تھی۔“

”کیا وہ زیورات وغیرہ پہنتا تھا؟“ وکی پوچھا۔

”میرے خیال میں تو شاید نہیں۔“ کیپٹن نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے میں نے اسے کبھی بریسلٹ وغیرہ پہنے نہیں دیکھا تھا، البتہ اس کی ٹائی پن سونے کی تھی اور اس کے بیچ ننھا سا ہیرا جڑا تھا۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جب اس کا انتقال ہوا، تب وہ ٹائی پن نہیں لگایا ہوا تھا۔“

”تو کیا موت کے وقت آپ اس کے پاس تھے؟“ وکی نے سوال کیا۔

”بد قسمی سے ہاں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”صرف میں ہی نہیں، موت کے وقت اس کی بیوی بھی بیڈ کے قریب کھڑی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پوری چھت کو گھورنے لگا۔ ”جب ٹو باتھ نے آخری سانس لی تو میں نے

اپنے چند آدمیوں کو ترپال لینے بھیجا تا کہ اس میں لپیٹ کر لاش سمندر میں بہا دوں مگر اس کی بیوہ نے ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اگر وہ شور نہ مچاتی تو یہ مسئلہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ اسی کے زور دینے پر میں نے مسٹر ٹو باتھ کے کپڑے اتار کر انہیں گاؤن پہنایا اور لاش کو نمک کے ڈھیر میں دبا دیا جہاں تم بھی اسے دیکھ چکے ہو۔“

وکی کی نظریں نمک کی ڈھیری پر مرکوز تھیں۔ وہ یہ سن کر کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر اس نے سراٹھا کر کیپٹن کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم یہ سوچ سکتے ہو کہ نمک کے ڈھیر میں دو لاشیں تھیں۔ ایک تم نے دبا لی اور دوسری لاش اس وقت دبا کی گئی، جب جہاز پر نمک لادا جا رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ ”یا پھر لدا چکا تھا۔“

”نمک میرے آدمیوں کی نظروں کے سامنے کلاؤ بندرگاہ پر لادا گیا تھا۔“ اس نے یقینی لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کلاؤ کی بندرگاہ پر جب نمک لادا جا چکا تھا، تب اس ڈھیر میں کسی نے خفیہ طور پر ایک لاش دبا دی تھی۔“ وکی نے سوچتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔“ بیٹے کی بات سن کر کیپٹن کے منہ سے نکلا۔ ”سنو... مجھے یاد آیا، جب جہاز پر نمک لادا جا رہا تھا، تب ایک آدمی ایسا تھا جو دن میں بھی کام کرتا تھا اور رات کو بھی اودرتا تم لگتا تھا۔ رات کو تو وہ عرشے پر تنہا ہوتا تھا۔ میں نے ایک دو بار اسے دیکھا۔ وہ تندہی سے نمک کو درست طریقے سے رکھنے میں مصروف تھا۔ ممکن ہے کہ وہی...“

”تو آپ کے خیال میں جب جہاز کلاؤ سے چلا تو اس وقت نمک کے بہت بڑے ڈھیر میں ایک لاش موجود تھی جو کسی حادثے کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے یا پھر سوچی سمجھی سازش۔“

”ایسا ممکن ہے۔“ کیپٹن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اب اسے بیٹے کے دلائل میں وزن محسوس ہو رہا تھا۔ ”اکثر ملاج شراب کے نشے میں دھت ہو کر ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ ویسے وہ اجنبی بھی رات کو کام کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی ملاج نے اسے غصے میں آکر قتل کر دیا ہو۔ ممکن ہے کہ سڈنی کے ساحل پر جو لاش اتاری گئی، وہ اسی کی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور بیٹے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ ”اے سنو... کلاؤ سے چلتے وقت میرے عملے کا ایک آدمی کم تھا۔ یہ بات ہمیں دو دن بعد پتا چلی تھی۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اچانک یہ بات اُسے یاد آگئی ہو۔

”یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری لاش اُسی کی ہو۔“ وکی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے جہاں تک بریسلٹ

کی بات ہے تو عام طور پر جہازی مزدور اور قلعی اس قسم کی چیزیں نہیں پہنتے۔“

”میرا اندازہ ہے کہ وہ ضرور کسی چمک دار دھات کا بنا ہوگا۔ لاش نکالتے وقت وہ سورج کی روشنی سے چمکا ہوگا، تبھی اُن کی نظروں میں آیا ہوگا۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”ویسے جب وہ مجھ سے بریسلٹ کے بارے میں کہنے آئے تھے، تب میں نے انہیں ڈانٹ کر کہا تھا کہ سب کچھ دفع کرو، لاش اٹھاؤ اور جلدی سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

”ویسے مردوں کا کلائی میں اس طرح کی چیزیں پہننا تو خاصا پرانا فیشن ہو گیا ہے، اب تو شاذ ہی کوئی مرد بریسلٹ پہنتا ہو۔“ وکی نے کہا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے بھی ٹرے میں موجود نمک کی ڈھیری پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ دانے دار نمک آہستہ آہستہ ٹرے میں پھیلتا جا رہا تھا۔ ”اس بارے میں میری ایک تجویز ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سراو پر کیا اور بات مکمل کر کے کیپٹن کو دیکھنے لگا۔

”وہ کیا؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

”اگر میں کہوں کہ جہاز پر دوبارہ جانا...“

”تم جب بھی میرے جہاز پر آؤ گے، مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔“ کیپٹن نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور جھٹ سے بول اٹھا۔ یہ سن کر وکی خاموش رہا۔ ”کیا خیال ہے ابھی چلیں جہاز پر؟“ کوئی جواب نہ پا کر کیپٹن نے چند لمحوں کے توقف کے بعد وکی سے پوچھا۔

”چلیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ٹرے میں سارا نمک پھیل چکا تھا۔ لکڑی کا ٹکڑا ایک بار پھر نمک کے بیچوں بیچ دکھائی دینے لگا تھا۔

جہاز کے عرشے پر سب کچھ کل جیسا ہی تھا، کچھ نہیں بدلا تھا۔ بس ایک فرق تھا، کل نمک کے پہاڑی نما ڈھیر میں ایک لاش موجود تھی مگر اب وہ منوں مٹی تلے دفن ہو چکی تھی۔ باقی کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ نمک کے اُس ڈھیر سے کچھ فاصلے پر بجھے ترپال کے ٹکڑے پر میلا کے قلعی بیٹھے اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی نظر جب کیپٹن کے ساتھ آنے والے اجنبی نوجوان پر پڑی تو وہ سب خاموش ہو گئے۔ اُن میں سے کئی قلعی اُسے پہچان گئے۔ وہ کل بھی اسے دیکھ چکے تھے۔ کئی ایسے تھے جو اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کسی کے علم میں نہیں تھا کہ کیپٹن ولیم کے ساتھ آنے والا نوجوان اس کا بیٹا تھا، جو باپ کو مشکل سے نکالنے کے لیے اپنے طور پر کوششیں کر رہا ہے۔

وکی ان قلعیوں کے پاس جا کر گھٹنوں کے بل لکڑی کے

فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ ان سے پرتگیزی زبان میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سب ہونقوں کی طرح منہ کھولے اُسے دیکھتے جا رہے تھے۔

اُن سے گفتگو میں ناکام ہونے پر وہ کھڑا ہوا اور کیپٹن سے کہنے لگا۔ ”ان سے کہو کہ یہاں نمک کے ڈھیر کے نیچے کچھ دبا ہوا ہے، جو اسے نکال کر لائے گا، اسے سونے کا سکہ انعام میں ملے گا۔“ اس نے قلیوں کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم ایک اور لاش تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ کیپٹن نے اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

”نہیں، یہاں ایک تھیلا اور زنجیر دبی ہوئی ہے۔“ اس نے ڈھیر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ”وکی کالہجہ پڑا ہوا تھا۔“

”اور جو وہ تھیلا ڈھونڈ کر نکال لائے گا، اُسے میں سونے کا سکہ انعام میں دوں گا۔“ کیپٹن نے پیشانی پر ہل ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

وکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تمہارے خیال میں کیا میں اتنا ہی بے وقوف ہوں، جتنا تم سمجھ رہے ہو؟“ اُس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ طنز اور غصہ صاف نظر آ رہا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ سونے کے ایک سٹکے کے بدلے جو کچھ ملے گا، وہ آپ کے لیے بہت قیمتی ہوگا۔“ وکی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

کیپٹن نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور سامنے دیکھا۔ قلیوں کا سپروائزر کھڑا تھا۔ بور یوں میں نمک بھروانے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ وہ بھی کام نہ ہونے کی وجہ سے پریشان نظر آ رہا تھا۔ کیپٹن نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور پھر وکی کی بات دہرا دی۔

”میں ابھی نہیں کہتا ہوں۔“ سپروائزر نے کہا اور تیزی سے قلیوں کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس کی بات ختم ہوئی، ترپال پر بیٹھے قلیوں نے پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سب حرکت میں آ گئے۔ کچھ ہی دیر میں عرشے پر لگا نمک کا بڑا سا ڈھیر بور یوں میں پھر بھر کر رینگ کے ساتھ ترتیب سے رکھا جا رہا تھا۔ تمام قلی نہایت جوش سے کام کر رہے تھے۔ سونے کا ایک سکہ انعام میں ملنے کی آس نے ان کے تمام وسوسوں، خوف اور خود ساختہ آسیب کو دور بھگا دیا تھا۔ مزدور جتنی تیزی سے ہاتھ چلا رہے تھے، اسے دیکھ کر وکی کو یقین ہو گیا کہ سونے کا ایک سکہ اُن کے لیے کتنی

بڑی اہمیت رکھتا ہوگا۔ نمک کو بور یوں میں بھرتا دیکھ کر کیپٹن ولیم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔ دونوں باپ بیٹا عرشے پر کرسی ڈالے بیٹھے، قلیوں کو کام کرتا دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت کیپٹن کے ماتھے کی ہر شکن غائب ہو چکی تھی۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ انعام کے لالچ میں قلی دوپہر کا کھانا بھی بھول چکے تھے۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ انعام اسی کو ملے۔ پانچ گھنٹے کے اندر اندر تقریباً سارا نمک بور یوں میں بھر چکا تھا۔ رینگ کے ساتھ ساتھ دور دور تک صرف بوریاں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ کیپٹن ولیم کی خوشی کی کوئی انتہاء تھی البتہ وکی کا چہرہ بے تاثر تھا۔ کیپٹن خوش تھا کہ اس کے بیٹے کی عقلندی کام آگئی۔ اب عرشے پر بہت تھوڑا نمک رہ گیا تھا اور پھر قلیوں کا شور گونجا۔ ”یہ مل گیا۔“ وہ خوشی کے مارے چلا رہے تھے۔

یہ سن کر کیپٹن نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آ رہی تھی۔ ”آئیں۔“ وکی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ دونوں نمک والی جگہ پر پہنچنے لگے۔ عرشے پر اب نمک کی صرف ایک موٹی پرت ہی باقی رہ گئی تھی۔ کیپٹن اور وکی کو آتا دیکھ کر قلیوں کا ہجوم چھٹنے لگا۔ وہ ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دے رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹا قریب پہنچے اور جھک کر اسے دیکھنے لگے۔ مستطیل شکل کا ایک چمڑے کا بڑا سا تھیلا۔ گلابی مائل بھورے سمندری نمک میں بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

”اسے باہر نکلوا میں۔“ وکی نے کچھ دیر تک بیگ کو بے غور دیکھنے کے بعد کیپٹن سے کہا۔

”اوکے۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ ”اسے باہر نکالو۔“ اس نے حکم دیا۔

کیپٹن کا حکم سنتے ہی سارے قلی بیچے لے کر تھیلے کے اطراف سے نمک صاف کرنے لگے۔

جیسے ہی نمک صاف ہوا، تھیلے کے ساتھ ایک موٹی سے سفید زنجیر بھی نظر آئی۔ اس کا ایک سرا تھیلے میں جبکہ دوسرا لمبائی میں کافی آگے تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر زنجیر کو پکڑ کر کھینچا جاتا تو تھیلا خود بخود نمک کے ڈھیر سے باہر نکل آتا۔

”زنجیر علیحدہ کر کے تھیلا کیبن میں پہنچا دو۔“ وکی نے سپروائزر کو حکم دیا۔ یہ سن کر کیپٹن نے بھی سپروائزر کی طرف دیکھا اور ہاں میں سر ہلا کر اسے اشارہ کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اب بیٹے کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔

اُس وقت وہاں موجود ہر شخص کی آنکھوں میں سوال تھے۔ ہر شخص یہ بات جاننا چاہتا تھا کہ تھیلے میں کیا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ کیپٹن اسے یہیں کھولے گا۔ کیپٹن بھی اُن کا جیس

سمجھ گیا تھا مگر وکی ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تھیلا اٹھوایا اور کیپٹن کے کمرے میں لے آیا۔ سارے لوگ واپس بھیج دیے گئے۔ اس نے کمرے کی کنڈی لگائی۔ تھیلا کمرے میں موجود بڑی سی میز کے پیچوں بیچ رکھا تھا۔ کیپٹن کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔ اب کیپٹن کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا بیٹا زیادہ عقلمند ہے۔ اس کی عقلندی کی وجہ سے ہی سارا نمک بور یوں میں بھرا گیا تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہ کر منتظر تھا کہ خود وکی کیا کہتا ہے۔ وہ دونوں گہری نظروں سے چری تھیلے کا جائزہ لے رہے تھے۔

”اس میں ایک نہیں، کئی تالے لگے ہوئے ہیں۔“ وکی نے نظریں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”انہیں توڑ دیتے ہیں۔“ کیپٹن نے فوراً جواب دیا۔

”نہیں...“ وکی نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اسے یہاں سے لے کر جانا ہوگا۔ نیچے سستی اترواؤ، ہم اسے لے کر چلتے ہیں۔“ کیپٹن جاننا چاہتا تھا کہ کہاں اور کیوں مگر وہ خاموش رہا۔ اسے اب اپنے بیٹے کی ذہانت پر پورا یقین آچکا تھا۔ کچھ دیر بعد تین چار قلی نیچے کھڑی کشتی میں رستے کی مدد سے تھیلے کو اتار رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد کشتی ساحل پر پہنچ گئی۔

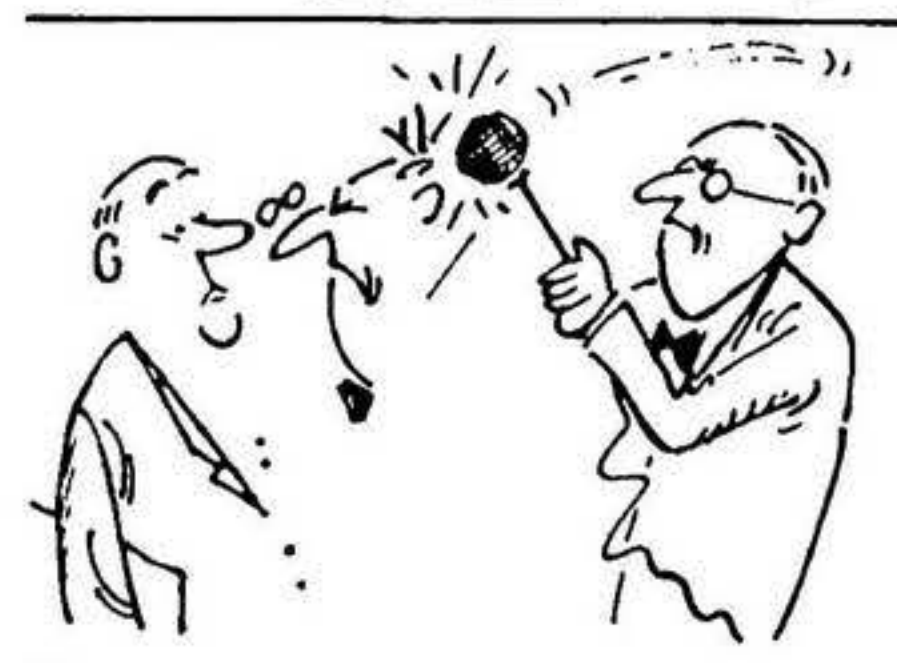
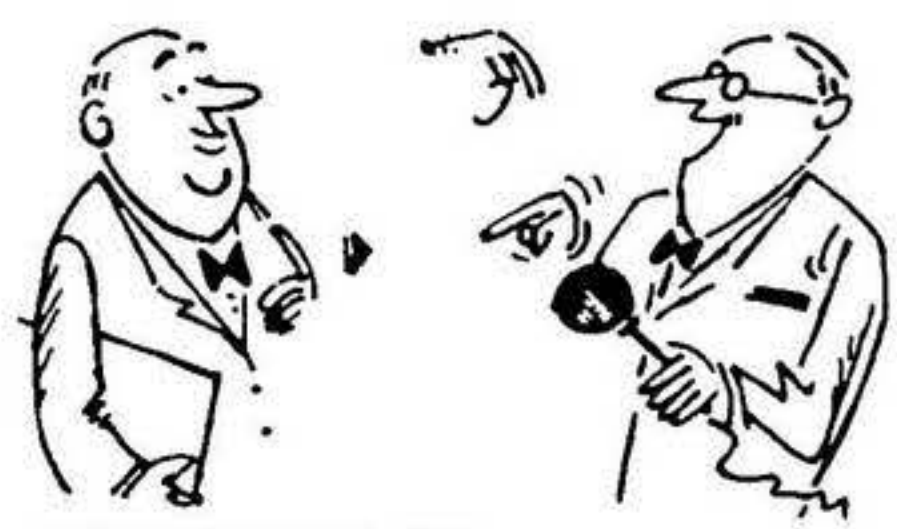
”بہتر ہے کہ جہاں مناسب سمجھو، وہاں اس تھیلے کو لے جا کر کھول لو۔“ ساحل پر پہنچنے کے بعد وکی نے کیپٹن سے کہا۔

”میرے خیال میں جہاز پر تھیلا کھولنا مناسب نہیں تھا، اسی لیے میں آپ کو ساتھ لے کر آیا۔ اب آپ کی مرضی، جو چاہیں وہ کریں۔“

”کیا مطلب...“ کیپٹن نے حیرانی سے کہا۔

”بہتر ہے کہ اسے اپنے گودام میں لے جا کر کھولیں۔“ وکی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا کام ختم ہو گیا۔“ یہ کہہ کر وکی چھلانگ مار کر کشتی سے اترا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس وقت وکی کو اپنی مرحومہ ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کے باپ کی وجہ سے اُس کی ماں کو کتنی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ اسے یاد کرتے کرتے سسکتی ہوئی مر گئی مگر کیپٹن تو دو سال کے سفر پر گیا ہوا تھا۔ اس کا بچپن باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں کی طرح گزرا۔ وہ اپنے باپ کے بہت قریب نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنے باپ کی مدد کی۔ اس لیے کہ وہ اُس وقت مشکل میں تھا۔ اس نے اپنے باپ کو درپیش دو مشکلات کا خاتمہ اپنی ذہانت سے کر دیا تھا مگر وہ سمجھتا تھا کہ اب اس کا کام ختم ہو گیا ہے، اسی لیے وہ کیپٹن کو چھوڑ کر تنہا گھر جا رہا تھا۔

کیپٹن ساحل پہ کھڑا وکی کو جانا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار



اس کے دل میں بیٹے کی محبت جاگ اٹھی۔ کیپٹن خالص دنیا دار بندہ تھا۔ اس کی زندگی میں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن اُس وقت۔ وکی کو جانا دیکھ کر اس کی آنکھیں بھرا آئی تھیں۔ وہ بیٹے کو آواز دے کر روکنا چاہتا تھا مگر اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُسے روک سکے۔

وکی اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا مگر پھر بھی کیپٹن ساحل پہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے غم پلکوں کو

صاف کیا۔ ”ادھر آؤ۔“ اس نے قریب موجود ٹھکی کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ ”یہ تھیلا کشتی سے اتار کر میرے ساتھ لے کر چلو۔“ کچھ دیر بعد کیپٹن تھیلا لے کر اپنے گودام کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد کیپٹن ولیم اپنے بیٹے کو تلاش کرتا ہوا جزیرے کے قبرستان میں پہنچا۔ وہ ایک درخت کے نیچے بھی لکڑی کی بیچ پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔

”اے وکی۔“ کیپٹن اسے دیکھتے ہی چلایا۔

باپ کی آواز سن کر اس نے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔ ”آپ...“ اس نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جانتے ہو، اُس تھیلے میں کیا تھا؟“ کیپٹن نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

”اندازہ ہے۔“

”اس میں سونے کی وہ پانچوں اینٹیں موجود تھیں جو چوری ہو گئی تھیں۔“ کیپٹن کا چہرہ خوشی سے تھم رہا تھا۔ ”ہر اینٹ چار سیر وزنی تھی۔ میں تو بہت مشکل میں تھا کہ اب ڈیوری لینے والوں کو کیا جواب دوں گا مگر تم نے مجھے بہت بڑی پریشانی سے بچالیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بھی بیچ پر بیٹھ گیا۔ ”یہ سب کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”ضرورت ہے۔“ کیپٹن نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہاری وجہ سے نہ صرف گمشدہ سونا ملا بلکہ نمک بھی آسانی سے گودام میں منتقل ہو گیا۔ تم نے میری دونوں مشکلیں آسانی سے حل کر دیں۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر کہنے لگا۔ ”مگر تمہیں یہ شک کیسے ہوا کہ...“

”شک نہیں، ایک مفروضہ تھا جسے تجربے نے درست ثابت کیا اور مسئلہ حل ہو گیا۔“

”مگر کیسے؟ میں صرف یہی سوچ رہا ہوں۔“ کیپٹن نے کہا۔

”نمک میں چھپا خزانہ نمک نے ہی حل کیا۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں نے بہت آسانی سے پتا چلا لیا تھا کہ نمک میں دو لاشیں ہی نہیں کچھ اور بھی دفن کیا گیا تھا۔ وہ ایسا کچھ تھا کہ جس کی وجہ سے مسٹر ٹو باتھ کی لاش مل جانے کے باوجود بھی نمک کا پہاڑ نما ڈھیر اپنی جگہ ٹھہر نہیں پاتا تھا۔“

”کیا...“ کیپٹن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”سادہ سی بات ہے۔“ وکی نے کہنا شروع کیا۔ ”آپ کے جہاز سے سونا چوری ہوا۔ چور کا قتل ہوا، لاش نمک میں دبائی گئی، قاتل فرار ہوا... اور یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں عرصے پر ہی ہوا تھا، وہ بھی جہاز کی کلاؤ بندرگاہ سے روانگی سے صرف ایک دو روز پہلے۔“ یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ ”سونا اس وقت چوری کیا گیا تھا جب جہاز کلاؤ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تھا۔“

”یہ سب کچھ تم کیسے جانتے ہو؟“ کیپٹن نے حیرت سے کہا۔

”مفروضہ...“ وکی نے مسکرا کر کہا۔

”مگر...“ کیپٹن نے ہچکچاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”تم نے صرف ایک مفروضے کی بنیاد پر سونا کیسے تلاش کر لیا، میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔“

”بتاتا ہوں۔“ وکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نمک کا ڈھیر اہرام کی شکل میں تھا اور اس کے اوپر سے دانے دار نمک نہایت غیر محسوس انداز میں نیچے کی طرف لڑھک رہا تھا۔ جب پہلی دفعہ میں نے اس پر توجہ دی تو میرا شک بہت جلد یقین میں بدلنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب تک اس ڈھیر کی تہ میں ایسا کچھ دفن ہے، جس کی وجہ سے ڈھیر اندر سے غیر مستحکم ہے۔ اسی لیے دانے دار نمک بہ دستور عرصے کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ میں نے گھر آ کر بار بار یہ تجربہ کیا۔ جب اس کی تہ سے لکڑی کا ٹکڑا نکل آتا تو ڈھیری پر سے نمک پھسلنا بند ہو جاتا۔ دوبارہ رکھنے پر وہ پھر پھسلنے لگتا، بس! اسی سادہ سی بات نے سمجھا دیا کہ اب بھی اُس ڈھیر کے اندر کوئی شے موجود ہے۔“

”تو وہ دوسری لاش، جو سڈنی پر اتاری گئی تھی؟“ کیپٹن نے سوال کیا۔

”وہ کلاؤ کی بندرگاہ پر سونا چوری کرنے والے آپ کے ملازم کی تھی، جو آپ کے بقول واپسی پر غائب تھا۔“

”اُسے کس نے مارا ہوگا؟“

”پہلے صرف یہ بات بتائیں کہ روانگی سے کتنے دن پہلے ٹو باتھ جہاز پر سوار ہوا تھا؟“ وکی نے سوال کیا۔

”شاید تین دن پہلے۔“ کسٹم افسر نے کہا تھا کہ وہ بیمار ہے اور بندرگاہ پر رہنے کا اچھا انتظام نہیں۔ اسی لیے میں نے اسے جہاز پر سوار کروالیا اور رہنے کے لیے پُر آسائش کیمین دے دیا۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔

”سونا چرانے والے نے ٹو باتھ کو متمول شخص جان کر اسے بیچنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی آمادگی ظاہر کی اور پھر اس نے یہ سونا خرید لیا، لوٹ لیا۔“

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں..... ماہنامہ سرگزشت کراچی کا ایک اور معرکتہ آرا خاص نمبر

عشق ناکا کا نمبر

عشق..... جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی..... عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت و ناموری کو داؤ پر لگا دیا۔

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں..... دل پر اثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

ایک ایسا خاص شمارہ جیسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے

مہرت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

صاحب



محمد
سليم انور

کائنات کے رمز کو پالینا اگرچہ بہت بڑا ہنر ہے مگر یہ کب ضروری ہے کہ ہر ایک کو اس سے واقفیت بھی ہو۔ دنیا کے تمام شاطروں میں ایک قدر تو لازمی مشترک ہوتی ہے اور... وہ ہے ان کا ٹھنڈا مزاج... جس کے ذریعے وہ اپنے مخالف کو ٹھنڈی مار، مار کر بازی اپنے حق میں پلٹ لیتے ہیں مگر وہ تو انتہائی گرم مزاج ثابت ہو رہی تھی... پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی چال نہ لڑکھڑاتی... جبکہ اسے منہ کے بل گرانے والا انتہائی مضحکہ خیز شخصیت کا مالک تھا مگر اسے کب اپنی پروا تھی۔

سیدمی انگلی سے ڈھیر سارا گھی نکالنے والا ایک شاطر فنکار

کرٹی باہر نکلنے کے لیے ابھی بیرونی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ اس کا بھائی بونی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ بونی کو دیکھتے ہی کرٹی پریشان ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے کرٹی نے سوچا کہ اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے کیونکہ جن نظروں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا انہیں مشکوک ہی کہا جاسکتا تھا لیکن پھر کرٹی نے اس خیال کو اپنے اعصابی دباؤ کا واہمہ سمجھ کر ذہن سے فوراً ہی جھٹک دیا۔

بونی کو کسی طور یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اس رات

گڑھ۔“ کیپٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔
”اور چوری شدہ سامان بھی ٹھیک جگہ پہنچ گیا۔“ وکی نے لقمہ دیا۔

”ہاں... تمہارا مفروضہ بھی کمال کا ہے۔“
”کہیں تو سب کچھ تجربے سے سچ کر دکھاؤں۔“
”کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے ترنت جواب دیا۔ ”جو کچھ ہوا، وہ سب کچھ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ہوا، وہ بھول جاؤ۔“
”مگر میرے ساتھ جو ہوا، اُسے بھلانا ممکن نہیں۔“ وکی نے گھبر لہجے میں جواب دیا۔

یہ سن کر کیپٹن نے شرمندہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ میسا چوس چلو۔“ کیپٹن نے اچانک سنجیدہ لہجے میں بات شروع کر دی۔ ”تمہاری سوتیلی ماں اب تمہارا اور زیادہ خیال رکھے گی۔ تم مشنری کالج میں داخلہ لو اور اپنی تعلیم مکمل کرو۔“
”نہیں۔“ وکی نے تڑپ کر کہا۔ ”آپ کی طرح مجھے بھی سمندر اچھا لگتا ہے۔ میں اپنے کام سے خوش ہوں۔“

”جانتا ہوں۔ کورو نے مجھ سب کچھ بتا دیا ہے۔“ کیپٹن نے کہا۔ ”تمہیں جہاز رانی پسند ہے تو پھر میرے جہاز پر آ جاؤ، وہ تمہارا ہی تو ہے۔“
”ہرگز نہیں، مال برداری اور مایہ گیری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

”آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ کیپٹن نے زچ ہو کر کہا۔
”آپ... ڈیڈی، آپ۔“
”کیا...“

”جب مجھے آپ کی ضرورت تھی، اُس وقت آپ مجھ سے دور تھے۔“ وکی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب آپ جان چکے ہیں کہ آپ کو میری ضرورت ہے مگر نہیں...“ یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”مجھے اب آزادی کی ضرورت ہے اور وہ میرے پاس ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور قبرستان کے بیچوں بیچ گزرنے والی گیڈنڈی پر چلتا ہوا باہر نکلنے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ کیپٹن کی آنکھیں نم تھیں۔

”واقعی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ وکی کو نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر اس نے خود کلائی کی۔ لمحہ بھر میں وہ جہاز رانی ترک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میسا چوسش میں اس کی دوسری بیوی اور تین سال کا بیٹا منتظر تھا۔ اب وہ ماضی کی غلطی کو ایک بار پھر دہرائی نہیں چاہتا تھا۔

حسرت

”کیسے؟“ کیپٹن نے قطع کلائی کی۔

”چور نے نمک لادتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے سونا تہ میں چھپا کر اسے ایک زنجیر سے باندھ دیا تھا۔“ وکی نے بتانا شروع کیا۔ ”جب ٹو باتھ نے خریدنے سے پہلے اُسے دیکھنا چاہا تو اس چور نے جگہ بتادی۔ اس کے بعد ٹو باتھ نے روانگی سے ایک دو رات پہلے اسے عرشے پر بلوایا اور وہاں چور کی موت منتظر تھی۔ ٹو باتھ نے کلاؤ کے اُس مزدور کے ہاتھوں معاوضہ دے کر چور کو قتل کر دیا، جورات کو کام کرتا تھا۔ لاش بھی اسی مزدور نے نمک میں دبائی تھی۔“
”تم قتل کی بات کس طرح کہہ سکتے ہو؟“ کیپٹن نے قطع کلائی کی۔

”اس لیے کہ ساگو ان کی لکڑی سے بنے فرش پر کچھ ایسے دھبے ہیں جو خون کے ہیں مگر وہ اتنے دھندلا گئے ہیں کہ انہیں دیکھنا یا شناخت کرنا ممکن نہیں۔“ وکی نے جواب دیا۔ ”یہ وہی مقتول چور ہے جو اب سڈنی میں ٹو باتھ کے نام پر بنی قبر میں سو رہا ہے۔“

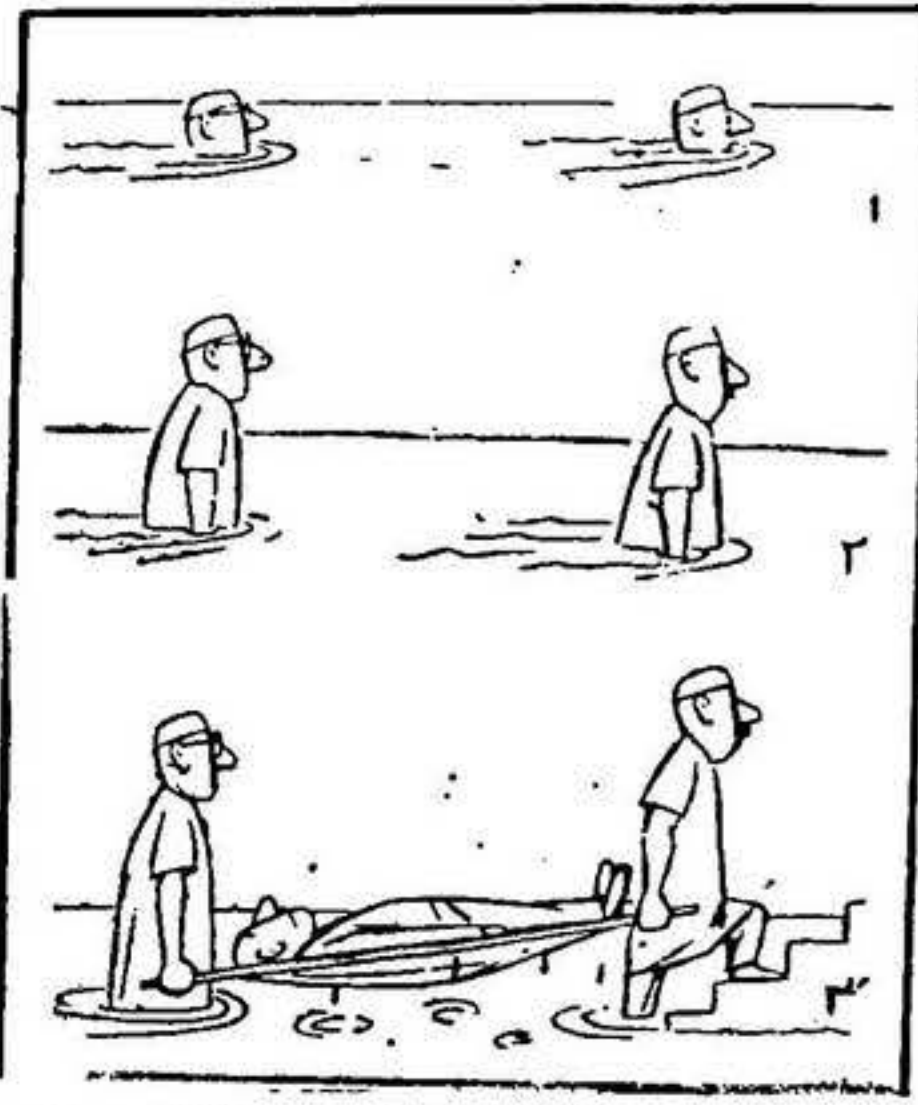
”اوہ میرے خدا...“ کیپٹن نے سر تھام لیا۔
”اور وہ بریسلٹ...“ وکی نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ بریسلٹ نہیں، زنجیر کی لکڑی تھی جو نمک کے ڈھیر میں کنارے پر جھلک رہی تھی۔ اسے وہ لوگ بریسلٹ سمجھے تھے مگر آپ کے ڈانٹنے پر انہوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔“

”دیکھو، مجھے اب اس قصے میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ کیپٹن بیٹے کے انکشافات سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کافی دیر خاموشی کے بعد اس نے منہ کھولا اور بیزاری سے کہا۔ ”مجھے سونا واپس مل گیا۔ نمک گودام میں پہنچ گیا۔ لاشوں سے بھی جان چھوٹ گئی۔ اب لعنت بھیجوان سب پر۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ وکی نے رازداری سے کہا۔ ”مسٹر ٹو باتھ امریکی تجارتی ایجنٹ نہیں، کوئی جھلسا تھا۔“
”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ کیپٹن نے اسے گھور کر دیکھا۔

”اگر وہ واقعی کوئی اعلیٰ سرکاری عہدیدار ہوتا تو اس کی بیوی لاش امریکا لے جانے کی ضد کرتی، اسے سڈنی میں دفن نہیں کرواتی۔“ یہ کہہ کر وکی نے اپنے باپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اب وہ کچھ عرصہ امریکی عہدیدار کی بیوہ کے نام پر سڈنی میں گزارے گی اور لوگوں کی ہمدردیاں اور ممکن ہے اُن کا مال بھی ہتھیانے کی کوشش کرے گی۔ دونوں ہی جلساری میں برابر کے شریک تھے۔“

”چلو... سچ جگہ پہنچ گئی وہ۔ سڈنی تو ہے ہی مجرموں کا



یہ اس بحث کے آغاز کا ایک عذر ہوتا تھا جو ہر رات بوبی اور اس کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب بوبی نے اسے رچڑ کی چیٹنگ کے بارے میں بتایا تھا۔

اس وقت بھی اس موضوع پر بحث نے کرسٹی کو اس قدر اشتعال دلادیا کہ وہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھی۔ اس نے بوبی کو راستے سے دھکیلتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے اور بولی۔ ”میں آج شب یہ کام نہیں کر سکتی، بوبی۔“ اس نے اپنے لہجے میں بے پروائی کا عنصر نمایاں رکھا تھا تاکہ بوبی کو یہ بات لازمی یاد رہے کہ اس موقع پر اس کا رویہ کیسا رہا تھا۔

کرسٹی کا ہاتھ اپنی کار کے دروازے کے ہینڈل پر تھا جب اسے بوبی کی معذرت کے الفاظ سنائی دیے۔ لیکن اب قدرے دیر ہو چکی تھی۔ کرسٹی نے اپنی کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ بوبی بھی اپنی کار میں سوار ہو رہا تھا۔

کرسٹی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے یقین آ گیا کہ جب وہ گھر لوٹے گی تو بوبی وہاں موجود نہیں ہوگا۔

بوبی سے پیچھا چھڑانے کے بعد کرسٹی بے مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی۔ وہ اپنے سل فون پر کسی کال کی منتظر تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ فون کال اس سے مس تو نہیں ہوگئی؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے تابی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس وقت آٹھ بجنے والے تھے جب اسے وہ فون کال موصول ہوئی۔

نے اپنے شوہر رچڑ کو اس کا وچ پر بوبی کی آوارہ دوست کے ہمراہ گل چھڑے اڑاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے کرسٹی عملی قدم اٹھانے کے انتظامات میں مصروف رہی تھی۔ اس نے اس معاملے میں نہ تو اپنے شوہر سے کوئی باز پرس کی تھی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ وہ مذہبھیڑ سے غریز کر رہی تھی کیونکہ اس طرح وہ سر پر اثر برباد ہو جاتا جس کا منصوبہ اس نے اپنے شوہر کے لیے بنایا تھا۔ لیکن اس وقت بوبی دروازے میں اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اور اگر وہ فوری طور پر گھر سے نہ نکلتی تو اس شخص سے ملاقات کے طے شدہ وقت پر پہنچنے میں اسے دیر ہو سکتی تھی جس کی خدمات اس نے اپنے شوہر رچڑ کو وہ سبق سکھانے کے لیے مستعار لی تھیں جسے وہ بھی فراموش نہ کر پائے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بوبی پر چیخنا شروع کر دے۔ اسے کھری کھری سنا ڈالے کہ وہ وبال جان، دخل اندازی کا عادی، احمق اور نہ جانے کیا ہے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اگر وہ اس قسم کے شدید غصے کا اظہار کرتی تو وہ اسے یاد رکھ سکتا تھا۔ وہ اس سے یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ جب وہ اطراف میں موجود ہوتا ہے تو اسے اس سے کس حد تک نفرت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس بات کو بھی یاد رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ یہ بات بھی اس کے ذہن میں ایک خلش بنی رہتی۔ اس نے اپنے یہ جذبات کسی اور دن کے لیے بچا کر رکھ لیے۔

کرسٹی نے بوبی کو کچھ بھی کہنے سنانے کی جرأت نہیں کی کیونکہ اگر بعد میں پولیس اس کے رویے کے بارے میں بوبی سے پوچھ گچھ کرتی تو اسے یہ تمام باتیں یاد آ سکتی تھیں۔ ”بوبی، پلیز!“ کرسٹی نے یہ کہتے ہوئے بوبی کو ہلکا سا دھکا دیا تاکہ وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔

”رچڑ آج کل پھر دیر سے گھر آ رہا ہے، ہے نا؟“ بوبی نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا اور جس انداز سے اس نے یہ بات کہی تو یوں لگا جیسے اس کا مطلب ہو۔ ”میں تمہیں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہوں۔“

کرسٹی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے سوال کا کیا جواب دے کہ بوبی کو کوئی شبہ نہ ہونے پائے۔ وہ بولی۔ ”اس نے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ اسے دیر تک کام کرنا پڑے گا۔“

”جیسے کرسٹی! تم جانتی ہو کہ یہ ایک جھوٹ ہے۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ تم خود وہاں جاؤ اور ان دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لو۔ اس معاملے کو روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔“ بوبی نے کہا۔

اپنے شبہ سے ہار مان لی اور پھر ایک سہ پہر رچڑ کے دفتری چھٹی کے معمول کے وقت سے ذرا پہلے کارڈ رائیو کر کے رچڑ کو چیک کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی کار رچڑ کے دفتر سے نزدیک ایسے مقام پر پارک کر دی کہ جب وہ کام سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو اس کی نگاہ میں رہے۔ البتہ خود اتنے فاصلے پر تھی کہ رچڑ کی نگاہ اس کی کار پر نہ پڑ سکے۔

رچڑ اس رات قدرے دیر تک کام کرتا رہا کیونکہ چھٹی کے وقت وہ باہر نہیں نکلا تھا۔ کرسٹی اپنی کار میں بیٹھی اس کے دفتر سے نکلنے کا انتظار کرتی رہی۔

پھر سات بجے کے قریب رچڑ اپنے دفتر سے باہر نکلا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ البتہ اس کا رخ اپنے گھر کی جانب نہیں تھا۔

کرسٹی نے اس کا پیچھا کرنے کی زحمت نہیں کی کیونکہ بوبی اسے اس لڑکی کے گھر کا پتا بتا چکا تھا جس سے رچڑ معاشرے لڑا رہا تھا۔ کرسٹی دس منٹ تک وہیں کار میں بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ پھر اس لڑکی کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ اسے پتا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ رچڑ کی کار وہاں پہلے سے موجود تھی۔

کرسٹی نے اپنی کار فاصلے پر پارک کر دی اور پیدل چلتے ہوئے اس مکان کے ڈرائیوے میں موجود رچڑ کی کار کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کھڑکی کے پاس جا پہنچی جس میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے چھپ کر کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اس کا شوہر ایک کاؤچ پر تنہا بیٹھا ٹیلی وژن پر باسک بال کا میچ دیکھ رہا تھا۔

کرسٹی وہاں سے پلٹ آئی۔ پھر وہ لگ بھگ ہر گھنٹے بعد اس گھر کے سامنے سے کار میں گزرتی رہی۔ جب گیارہ بج کر چند منٹ پر وہ اس گھر کے سامنے سے گزری تو اسے ڈرائیوے میں ایک اور کار کھڑی دکھائی دی۔

کرسٹی نے تھوڑی دور جا کر اپنی کار روک دی اور سڑک کے کنارے پارک کرنے کے بعد کار سے اتر کر پیدل اس مکان کی جانب چل پڑی۔ وہ دے پادوں اسی کھڑکی کے پاس جا پہنچی اور چوری چھپے اندر جھانکنے لگی۔

اس کا شوہر رچڑ بد دستور کاؤچ پر موجود تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ تنہا نہیں تھا اور نہ ہی ٹیلی وژن... دیکھ رہا تھا۔ اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا جب اس رات کرسٹی

اپنے شوہر کو قتل کرانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ”کہیں جا رہی ہو؟“ بوبی نے پوچھا۔

کرسٹی کا بے ساختہ یہ جواب دینے کو جی چاہا۔ ”بھلا میں اور کیوں دروازہ کھولنے جا رہی تھی؟“ لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی زبان ہونٹوں تلے دبالی۔ وہ بوبی کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور نہ ہی وہ اس سے کوئی جھوٹ بولنا چاہ رہی تھی کہ جسے بعد میں یاد رکھنا پڑتا اور اگر اس کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ اس کی بہن اب سیٹ ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح ایک باوقار، گرویدہ، چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے دیر تک رک جائے گا اور اس کے لیے وبال جان بن جائے گا۔

یہ دو ہفتے پہلے کی بات تھی جب بوبی کہیں جاتے ہوئے کرسٹی کے پاس یہ بتانے کے لیے رکا تھا کہ اس کا شوہر رچڑ اس کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہے۔ بوبی نے بتایا کہ رچڑ دفتر میں دیر تک کام کرنے کے بارے میں مسلسل جھوٹ بول رہا ہے۔ کرسٹی نے پہلے تو بوبی کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب بوبی نے یہ بتایا کہ اس لڑکی کو اس کے شوہر سے خود اس نے ہی متعارف کرایا تھا اور یہ کہ وہ دونوں ابتدا ہی سے ایک دوسرے سے باقاعدگی سے ملاقاتیں کر رہے ہیں تو پھر کرسٹی کے لیے اس کی بات ماننے سے انکار کرنا مشکل ہو گیا۔

اس بات کو مہینے ہو چکے تھے کہ اس کا شوہر رچڑ ہفتے میں کئی راتوں کو دفتر میں دیر تک کام کیا کرتا تھا اور کئی رات تو نصف شب کے بعد گھر لوٹتا تھا۔ بوبی کے رچڑ کی بے وفائی کے بارے میں بتانے سے پہلے کرسٹی کو رچڑ پر ترس آیا کرتا تھا۔ وہ اس کے پاس پر غصے کا اظہار تک کر چکی تھی کہ وہ کام کے معاملے میں رچڑ کے معیار اور کمپنی کے لیے ہمہ تن انہماک اور یکسوئی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن بوبی نے کرسٹی کے ذہن میں شک کا ایک بیج بو دیا تھا۔

سوالگی مرتبہ جب رچڑ نے فون پر یہ بتایا کہ اسے دفتر میں دیر ہو جائے گی تو کرسٹی نے اس کا پسندیدہ ڈنر تیار کرنے اور اس کے دفتر پہنچانے کی پیشکش کر دی۔

رچڑ نے اعتراض کیا۔ کرسٹی اصرار کرتی رہی پھر ان کے درمیان خوب بحث رہی۔ رچڑ کی ہچکچاہٹ اور اسے روکنے کی کوشش نے کہ وہ ڈنر تیار کر کے اس کے دفتر نہ لائے، کرسٹی کے شبہ کو مزید تقویت دے دی۔ اپنے بھائی بوبی کی حوصلہ افزائی پر بالآخر کرسٹی نے

کرٹی نے اس شخص کا چہرہ تو نہیں دیکھا تھا مگر اس کی کسمبیر آواز سے اسے پہچان گئی۔ اس شخص نے بتایا کہ وہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ ملاقات کے لیے جگہ کا انتخاب خود کرٹی نے کیا تھا۔ وہ ایک گندے علاقے میں ایک چھوٹا سا غلیظ ٹھکانا تھا جسے عام مزدوروں کا بار کہہ سکتے تھے اور چند ایک مختصر قسم کے لوگ اس کے باقاعدہ گاہکوں میں شامل تھے۔ وہ ان بد نصیبوں کی آماجگاہ تھی جو کسی پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ وہ دوسرے گاہکوں پر ایک اچنی نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے میں مگن رہتے تھے۔

کرٹی کو یقین تھا کہ یہاں اس کی آمد کو کوئی بھی یاد نہیں رکھے گا اور نہ ہی اسے یہاں اس قسم کی غلیظ جگہ پر اپنے کسی دوست سے ملے بھیکڑ کا خدشہ تھا۔

نک عین اسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا جہاں اس نے بتایا تھا کہ وہ موجود ہوگا۔ وہ کمرے کے آخر میں ایک بوتھ تھا جہاں روشنی بھی بے حد کم تھی۔ اس کے سامنے میز پر دو گلاس تھے جن میں مشروب موجود تھا۔ ان میں سے ایک گلاس کرٹی کے لیے تھا۔

کرٹی اس کے مقابل میز پر دیوار کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ یہ ہدایات کرٹی نے پہلے ہی نک کو دے رکھی تھیں تاکہ وہاں پر موجود گاہکوں کی جانب اس کی پیٹھ رہے۔ وہ کسی قسم کا چانس نہیں لینا چاہتی تھی کہ کوئی اس کے چہرے کو یاد رکھ سکے۔

نک سے دو بد ملاقات کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ نک کو دیکھ کر کرٹی کو مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کہیں سے بھی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا جیسے کہ پیشہ ور قاتل ہوتے ہیں۔ پستہ قد اور گول مٹول ہونے کے علاوہ اس کے چہرے کی رنگت سیاہ اور آنکھیں پڑمردہ تھیں۔ اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا، سستا اور فرسودہ تھا۔

اس سے قبل کہ کرٹی کچھ کہتی، نک نے اس کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر سوال پھینچ مارا۔ ”میں تمہارے تاثرات سے دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہارے اعتماد پر پورا نہیں اترا ہوں، لیڈی اور دوسری جانب تم نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کے لیے میری خدمات مستعار لی ہیں۔ تم اس صورت حال میں کس طرح مفاہمت کرو گی؟“

کرٹی کسی طور خود بھی نک جیسے ایک کٹر شخص سے اخلاقیات کے بارے میں بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی، لہذا اس نے موضوع بدلنے کو ترجیح دی۔

”میرا شوہر وہاں آٹھ بجے موجود ہوگا۔“ کرٹی نے۔

کہا۔

”کیا تم کچھ بھول نہیں رہی ہو؟“ نک نے کہا۔

کرٹی نے اسے ایک دبیز سالفاہ تھا دیا۔ نک نے سالفاہ کھولا اور نوٹوں کی گڈی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ البتہ نوٹ گننے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ پھر اس نے نوٹوں کی گڈی واپس سالفاہ میں رکھ دی اور اپنے سامنے میز پر موجود گلاسوں میں سے ایک کرٹی کی جانب بڑھا دیا۔

”میں نہیں پیوں گی۔“ کرٹی نے اس گلاس کو منہ

لگانے والے افراد کا تصور ذہن میں لاتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔ ساتھ ہی وہ گلاس واپس نک کی جانب کھسکا دیا۔

”تم زیادہ دوستانہ مزاج کی حامل نہیں ہو۔ ہے نا؟“

نک نے قدرے رکھائی سے کہا۔ اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے اس موقع پر دیدہ دلیری دکھائی تھی کہ شاید کرٹی اس کی دوستی کی پیشکش کو قبول کر لے گی۔ لیکن کرٹی کی بے اعتنائی کے سبب اس نے موضوع بدل لیا کیونکہ کرٹی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”مجھے وہ پتا درکار ہے؟“

کرٹی نے اپنے پرس میں سے ایک کاغذ کا پرزہ نکالا اور میز پر نک کی جانب کھسکاتے ہوئے بولی۔ ”وہ گیارہ بجے کام سے گھر لوٹتی ہے لیکن وہ آٹھ بجے وہاں موجود ہوگا۔ اس وقت جب باسکٹ بال گیم کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ کبھی کوئی گیم مس نہیں کرتا۔“

کرٹی بات کرتے کرتے رک گئی۔ اسے خود پر غصہ آیا کہ وہ اپنی زندگی کے ایک ایسے باب کی بابت نک سے کیوں بات کر رہی تھی جس کا اسے علم نہیں ہونا چاہیے۔ اسے ڈر ہوا کہ کہیں نک اس بات کو دوستی کی پیشکش سے تعبیر نہ کر لے۔ نک اپنی بے کیف، تاثرات سے عاری گہری نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ کرٹی کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ کاش وہ اسے گھورنے کے بجائے زبان سے کچھ کہہ دے۔

اور تب وہ بول پڑا۔

اس کی آواز پُرسکون اور جذبات سے عاری تھی جیسے کہ موسم کے بارے میں تبصرہ کر رہا ہو۔ ”وہ آج شب کے گیم کے آخری حصے کو دیکھنے سے محروم رہ جائے گا۔“

کرٹی اسے اپنے مشروب کی چسکیاں لیتے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک سرد مزاج پستہ قد آدمی تھا جس کا چہرہ غیر دلکش اور بیزار کن تھا۔ پھر کرٹی کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اس مجہول شخص سے شخص کے سامنے اس گھٹیا شراب خانے میں کیوں بیٹھی

ہوئی ہے۔ اسے خود پر غصہ آ گیا۔ جب وہ گویا ہوئی تو اپنی آواز کی شدت پر اسے خود بھی حیرانی ہوئی۔

”تم اسے فوراً یا آسانی سے مرنے نہیں دینا۔ اسے تکلیف میں مبتلا کرنا۔ کیا سمجھے؟“

اس بات پر وہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ہلکا سا مسخرہ تھا جیسے اس کے غصے پر وہ محظوظ ہوا ہو۔

”تو تم چاہتی ہو کہ میں اسے ایک سبق دوں؟ یہی بات ہے نا؟“

”اگر یہ کام میں خود کر سکتی تو خود ہی کر لیتی۔“ کرشی نے کہا۔

”تو پھر ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ تم وہاں آ کر خود دیکھ لو کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟“ نک نے مشورہ دیا۔

رچرڈ کی دردناک موت اور رحم کی بھیک کا تصور کرشی کے لیے نہایت اطمینان کا باعث تھا لیکن ایک سفاکانہ خون آلودہ قتل کا منظر اسے قابل دید نہیں لگ رہا تھا۔

وہ بولی۔ ”بس مجھے فون کر لینا جب تم.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ اسے قتل جیسے الفاظ منہ سے ادا کرتے ہوئے ایک بے چینی سی محسوس ہوتی تھی۔

نک نے دوسرا گلاس ہاتھ میں اٹھایا اور سیلیوٹ کرنے کے انداز میں اسے کرشی کی جانب کرتے ہوئے اپنے منہ سے لگایا اور پھر غٹا غٹ مشروب حلق میں اتار لیا۔ کرشی کو اس کی اس بدتمیزی پر غصہ آ گیا اور وہ اسے گھورنے لگی۔

نک کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسخرانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

”اور تم بقیہ رقم وہاں لے کر آ جانا۔“ اس نے کہا۔ اس کے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اس بارے میں کسی قسم کی بحث کا خواہاں نہیں ہے۔

پھر اس نے کرشی سے کہا کہ وہ کہیں چلی جائے اور اس کی فون کال کا انتظار کرے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چند مڑے مڑے نوٹ میز پر ڈال دیے اور وہاں سے چلا گیا۔

کرشی وہیں بیٹھی رہی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ان دونوں کو وہاں سے اکٹھے نکلتے ہوئے دیکھ لے اور بعد میں اسے شایخت کر لے۔ گو ایسا ممکن تو نہیں تھا لیکن احتیاط ضروری تھی۔ اس لیے وہ کوئی چانس نہیں لینا چاہتی تھی۔

وہ اپنے سیل فون پر پانچ منٹ تک کسی کال کا انتظار کرتی رہی پھر اٹھ کر اس گھٹیا بار سے نکل کھڑی ہوئی۔

وہ ایک بار پھر اسی علاقے میں اپنی کار میں بے مقصد گھومتی رہی اور اپنے سیل فون کی گھنٹی بجنے کا بے تابی سے

انتظار کر رہی تھی۔ اسے بھروسہ تھا کہ جب اگلی مرتبہ وہ نک کی آواز سنے گی تو وہ یقیناً رچرڈ، اس کے غصے اور اس کی بے باکی سے نجات حاصل کر چکی ہوگی..... ماسوائے رچرڈ کی دولت کے۔

وہ بار بار اپنا سیل فون چیک کر رہی تھی کہ وہ واقعی آن ہے یا نہیں۔ یا اس کی بیٹری تو ڈیڈ نہیں ہوگئی۔ یا اس نے اتفاقاً یا بے دھیانی میں سیل فون کے رنگر کو آف تو نہیں کر دیا۔

بالآخر جب اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو بوکھلاہٹ کے عالم میں اس نے کار کا اسٹیرنگ آنے والی لین کی جانب گھما دیا اور اس کی کار سامنے سے آتی ہوئی ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

یہ فون کال نک کی تھی جو اسے باقی رقم لانے کو کہہ رہا تھا۔ کرشی نے اس کے الفاظ پر دھیان نہیں دیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ بس گھبرائے اور اس بات کا اشارہ ہی کہ رچرڈ کا کام تمام ہو گیا ہے لیکن یہ وقت جشن منانے کا نہیں تھا۔ ابھی اس قابلِ نفرت شخص کو اس کے گھٹیا فعل کی ادائیگی بھی کرنا تھی۔

وہ اب اس آخری ناخوش گوار فعل کو سرانجام دینے کے لیے بے چین تھی تاکہ اسے مکمل سکون مل جائے اور وہ اپنے انتقام سے بھرپور لطف اندوز ہو سکے۔

کرشی نے کار کا رخ رچرڈ کی گرل فرینڈ کے گھر کی جانب موڑ دیا۔

جب وہ وہاں پہنچی تو قدرے حواس باختہ تھی۔ اس نے اپنی کار سڑک پر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی کر دی۔ مکان کے کچن کے عقبی دروازے کا رخ کرنے سے پہلے اس نے کئی گہرے گہرے سانس لیے تاکہ نک کے ساتھ ایک اور میٹنگ کے لیے خود کو تیار کر سکے اور اس منظر کا سامنا کر سکے جو اندر اس کی آمد کا منظر تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ معمول کے قدموں سے چلتے ہوئے تاکہ کسی پڑوسی کو شک نہ ہو، مکان کے کچن کے عقبی دروازے پر پہنچ گئی اور دو مرتبہ دستک دی۔

جب نک نے کچن کے دروازے پر دستک سنی تو اس نے کھڑکی سے چھپ کر جھانکا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ دستک دینے والی شخصیت کرشی کی ہے تب وہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو کرشی تیزی سے اندر آئی اور اس کے پاس سے گزرتے ہوئے یوں گھر کے اندر چلی گئی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

اندرونی کمرے میں پہنچ کر وہ پلٹی تو یوں لگا جیسے وہ کوئی خوفزدہ بچی ہو۔ وہ بے چینی سے اپنا پرس گھما رہی تھی اور چورنگا ہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب نک نے بقیہ رقم کا مطالبہ کیا تو کرشی نے اپنے پرس میں سے ایک لفافہ نکالا اور اسے کچن کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

پھر بولی۔ ”میں لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔“

نک لفافہ اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو کرشی سمٹ کر ایک جانب ہو گئی۔ وہ اس کے نزدیک جانے سے ڈر رہی تھی۔

نک نے لفافہ کھول کر اس میں موجود نوٹوں کی گڈی کو پہلے کی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا، البتہ نوٹ گننے کی کوشش نہیں کی۔

پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اسے کھول کر اس میں موجود تھوڑا سا سیال مادہ کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر انڈیل دیا۔ پھر وہ دونوں ایک لمحے کے لیے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کرشی اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہی ہے لیکن اسے ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔

پھر جس وقت کرشی نے دروازے کی جانب دوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ وہ زیادہ دور پہنچ نہیں پائی۔

نک نے اپنا ایک ہاتھ اس کے کمر کے گرد لپٹاتے ہوئے اسے جکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ میں موجود کپڑا اس کے منہ پر رکھ دیا۔

کرشی نے اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے چند لمحوں تک ہاتھ پیر مارے لیکن پھر کلوروفارم نے اسے مغلوب کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

نک نے کرشی کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا اور اسے لے کر بیڈ روم کی جانب چل پڑا۔ اس نے بے ہوش کرشی کو بیڈ پر لٹا دیا اور پھر اس کے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ پھر بیڈ کے کنارے موجود کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب کرشی نے کراہنا شروع کیا تو نک نے اٹھ کر کرشی کے چہرے پر طمانچے لگائے تاکہ اسے ہوش آجائے۔

کرشی نے چند مرتبہ آنکھیں جھپکائیں، پھر حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جب اس کے ذہن پر چھائی دھندلاہٹ چھٹ گئی اور اسے سب کچھ واضح دکھائی دینے لگا تو اس نے اپنے ہاتھ پیر میں بندھی رشتی سے خود کو

آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

لیکن پھر جب اس نے بیڈ پر اپنے برابر میں کسی اور کو بے حس و حرکت موجود پایا تو اچانک گھبرا کر پیچھے سمٹ گئی۔

نک اپنی گھبرائی آواز میں بولا۔ ”ہاں، یہ تمہارا شوہر ہے۔“

پھر وہ چند لمحے انتظار کرتا رہا تاکہ یہ بات واضح طور پر کرشی کے ذہن میں سما جائے کہ وہ واقعی اس کا شوہر ہے جو بیڈ پر اس کے برابر میں موجود ہے۔ قدرے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”اگر تم غور سے دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس کی سانسیں چل رہی ہیں۔ مجھے اس کو دو تین مرتبہ کلوفارم سنگھانا پڑا ہے۔ لیکن جہاں تک اسے قتل کرنے کی بات ہے تو میں بتا دوں کہ میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔“

یہ سن کر کرشی نے خود کو آزاد کرانے کے لیے ایک بار پھر ہاتھ پیر چلانے شروع کر دیے۔ نک اطمینان سے بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔

بالآخر کرشی نے تھک کر خود ہی ہار مان لی اور ہاتھ پیر مارنا بند کر دیے۔

”تم نے کئی ایک غلطیاں کی ہیں۔“ نک نے کہا۔

”ایسی غلطیاں جن کی وجہ سے تم پکڑی جاسکتی تھیں۔ لہذا تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میں نے تمہیں جیل جانے سے بچالیا اور تمہیں اپنے آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ میں خود کو بچائی کی کرسی پر پہنچانے کا خطرہ کیوں کر مول لیتا جبکہ میں کسی کو قتل کیے بغیر ہی تمہاری رقم اینٹھ سکتا تھا؟“

نک نے کہا کہ کرشی اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے نکلنے لگا۔

لیکن پھر دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور پلٹ کر بولا۔ ”میری خواہش ہے کہ کاش میں اس وقت تک یہاں موجود ہوتا جب تمہارے شوہر کو ہوش آئے گا۔ اس لیے کہ اسے بے ہوش کرنے سے پیشتر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تم نے اسے قتل کرانے کے لیے میری خدمات اجرت پر حاصل کی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں اسے طرافت کا کوئی پہلو دکھائی دے گا اور پھر جب اس کی گرل فرینڈ اپنے گھر واپس آئے گی اور تم دونوں کو اپنے بیڈ پر یکجا دیکھے گی تو..... ویل مجھے امید ہے کہ اس صورت حال سے تم سب کو ایک عمدہ سبق سیکھنے کو مل جائے گا۔ گڈ بائی!“

یہ کہہ کر نک، کرشی کو حیران اور ششدر چھوڑ کر وہاں سے نکل گیا۔



در اور دروازہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جب زندگی اپنے مقصد اور مرکز سے ہٹ جائے تو کوئی خواب پورا نہیں ہوتا... اور جب یہ ادراک ہو جائے کہ زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ ہمیشگی لیے ہوئے ہے تو بستی بستی صحرا صحرا ایک خلش کہیں بھی چین نہیں لینے دیتی... وہ جو حسن کا پیکر تھی... کتنے ہی دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں میں خواب کے مانند تھی... وہ جو اپنے بابل کے اونچے شملے کا مان تھی، جانے کیسے ایک فقیر سے اس لگا بیٹھی۔ وہ زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں کو تو پنس کر سہ گئی مگر اس بار دل کو ایسا روگ لگاتھا جس نے تمام خواہشوں کو آزمائشوں میں بدل ڈالا۔ انسان خوش گمانی کی منزل پہ کھڑا ہوا یا اداس راہوں میں گم ہو... اکثر تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے... حتیٰ کہ زندگی ”کیا کرے اور کیا نہ کرے“ کی عملی تفسیر بن کر سودو زیاں سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔ وہ بھی جب اپنے محبوب کے دل پر دستک دیتے دیتے ہار گئی تو اپنی اونچی پیشانی کو انتہائی عاجزی سے اس درپہ جھکا دیا، جہاں کوئی دل سے مانگے اور نامراد لوٹے، ایسا وہاں دستور نہیں... اور جب اس کی بکھری ہوئی زندگی بھی ایک مرکز پہ سمٹ گئی تو منزل بھی خود چل کر اس کے دروازے پر دستک دینے چلی آئی... اور بس یہی انہونی اس کی زندگی کا حاصل ٹھہری۔

جہنوں کے مانند بچے جذبات میں غلام برپا کر دیے والی ایک ہنگامہ خیز داستان



شاہ ہے مور جب خوش اور اپنی خوب صورتی پر نازاں ہوتا ہے تو اپنے خوش رنگ پروں کا گول چھاتا سا بنا کر ناچتا ہے، لیکن جب اپنے پروں کی طرف سر جھکا کے دیکھتا ہے تو ان کی بد صورتی پر اس قدر رنجیدہ اور دل گرفتہ ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور اس کی مادہ وہ آنسو پی کر سہاگن بن جاتی ہے۔

وہ مور تو نہیں تھی، نہ ہی اس کے پاؤں بد صورت تھے، بلکہ وہ تو سرتا یا حسن کا مکمل شاہکار تھی، ادائے حسن دل آرا کا پیکر، سیم تن اور مکمل بدن تھی وہ۔ لیکن..... باوصف اس کے وہ اپنے حسن و جمال میں کوئی ان دیکھی خای کو بھی محسوس کرتی تھی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ یکنائے حسن اور بے عیب تھی، خای شاید اس کی سوچ کے انداز میں تھی کہ وہ من کے بجائے تن کی بد صورتی کو ڈھونڈتی رہ جاتی۔

”اڑی سو رٹھ! تو ہی کچھ بتا دے، آخر مجھ میں کس بات کی کمی ہے؟“ وہ تنگ آ کر اپنے قریب کھڑی اپنی راز داں اور خادمہ خاص کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگتی۔ ”میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے گوٹھ کے کتے ہی گبرو اور کڑیل جوان اپنا دل تھامے بے تاب رہتے ہیں، مگر ایک وہ ہے کہ.....“ پھر جیسے اسے فوراً کچھ یاد آ جاتا، کہتی.....

”کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میری امارت سے، میرے خاندان یا میرے باپ سے ڈرتا ہو؟“ پھر وہ خود ہی گویا اپنی بات کی توجیہ بھی پیش کرنے لگتی۔ ”مگر وہ کیا! سب ہی اچھی طرح یہ بات جانتے ہیں کہ میں کسی اتنے بڑے یا بھرے پرے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی جو جدی پشتی زمینداری کرتا ہو، نہ ہی میرا باپ کوئی روایتی یا جاہل قسم کا بار سوخ و ڈیرا ہے، کبھی کو معلوم ہے کہ زمیندار حاجی خدا بخش کیا تھا، کون تھا اور اب کیا ہے۔ ایک معمولی سا ہماری اور کھیت مزدور ہی ہوا کرتا تھا وہ، سرکاری طرف سے زمین کا ایک ٹکڑا ملا تھا اسے جس پر اس نے خود رہا کی (کھیت مزدوری) کر کے اسے سو سے چھ سو جریب تک پہنچا دیا۔ پھر میں اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی، ماں میری مرگئی، باپ اب بوڑھا ہو کے چار پائی سے جالگا، تیرا باپ سائیں رکھو بھی مر گیا تو تجھے ہم نے رکھ لیا۔ مرضی میری چلتی ہے اب، فیصلہ میرا ہے اپنی زندگی کرنے کا کہ میں چاہے کسی بادشاہ زاد کو اپنا جیون سفر سوئپ دوں، چاہے کسی غریب ہاری (کسان) کو اپنی تقدیر کا مالک بنا لوں، میں خود مختار ہوں۔ پھر کیوں؟..... سو رٹھ! کیوں.....؟ پھر کیوں نہیں وہ میرے طرف مائل ہوتا ہے؟“ وہ آخر میں بے اختیار قریب کھڑی اپنی خادمہ سو رٹھ کو جھنجھوڑ ڈالتی۔

”وہ ملنگ ہے، اللہ والا ہے، بی بی سائیں! وہ سمجھتا ہے کہ اس کا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔“ بالآخر سو رٹھ ڈرتے ڈرتے کہتی۔

”ہے جوڑ، اس کا اور میرا۔ وہ جوان ہے، میں بھی جوان ہوں، عمر میں صرف دو سال ہی بڑا ہے وہ مجھ سے، یہ ٹھیک ہے وہ ملنگ ہے، اللہ والا ہے، بابا کالی چادر والے آستانے کا فقیر ہے مگر وہ ایک مرد بھی ہے، ایک جوان اور بھرپور مرد، تم نے دیکھا نہیں اسے، کس قدر خوب رو اور وجیہ ہے وہ، کیا اس کے دل میں امنگوں بھرے جذبات نہیں ہوں گے؟ کیا اس کے من میں تمنائوں کے سوتے نہیں پھوٹتے ہوں گے.....؟“

”توبہ..... توبہ..... بی بی سائیں! کیوں کفر تولتی ہو، بھلا ایک مجاور فقیر کا ان باتوں سے کیا کام؟“ سو رٹھ کا نون کو ہاتھ لگا کر توبہ تلا کرنے لگتی، مگر وہ نہیں چپ ہوتی، کہتی۔

”میں نے کیا، کسی نے بھی آج تک ایک نو جوان کو کسی آستانے یا درگاہ کا مجاور یا مسند نشین فقیر بننے نہیں دیکھا ہے، اسے وہاں اس کی مرضی کے خلاف زبردستی بٹھا دیا گیا ہے۔“

”بس کرو بی بی سائیں! بس کرو، اللہ سائیں سے ڈرو، تم کفر بول رہی ہو۔“

”میں کفر نہیں بول رہی ہوں۔“ سائیں کہتی۔ ”میں تو اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں، اس سے محبت کرتی ہوں، میں اس کی بیوی بن کر وہاں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، میں یہ نہیں کہتی ہوں کہ وہ بابا کالی چادر والے مرشد سائیں کا آستانہ چھوڑ دے، مانتی ہوں وہ نیک انسان ہے مگر شادی کرنا تو کوئی گناہ نہیں۔“

”مگر بی بی سائیں! وہ آپ کی طرف مائل بھی تو نہیں ہو رہا، فقیر لوگ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔“

آنکھیں موندے دوزانوں بیٹھا تھا۔ اس کی ڈاڑھی سیاہ چمکدار اور گھنی تھی، سر کے بال لمبے، کانڈھوں تک آتے تھے۔ صحت اچھی تھی، رنگ سرخ و سپید تھا، چہرے پر معصومیت اور نور تھا جہاں روحانیت کا عنصر غالب نظر آتا تھا کشادہ پیشانی پر گول نشان تھا جو کثرت عبادت کا نتیجہ تھا، درگاہ میں زیارت اور منتوں مرادوں کے لیے جتنے بھی سائیں مرد، عورت آیا کرتے تھے، وہ اس نو جوان ملنگ فقیر کی خوب صورتی سے ضرور متاثر ہوتے تھے، وہ اس کی شخصیت میں روحانیت کا جلال بھی محسوس کرتے تھے، اس کی آواز بھی سنتے، اس کا صوفیانہ راگ بھی سنا کرتے، سر دھنا کرتے۔

وہ عورت سرتا یا سفید لباس میں ملفوف تھی، آنکھیں اس کی بڑی بڑی اور بلوریں تھیں جن میں اداسی کی پرچھائیاں، چہرے سے ظاہر ہوتی ویرانی دل سے بڑی گہری ممانگت رکھتی تھیں، ایک چاند جیسا گول داغ اس کی سپید پیشانی پر بھی چسپاں نظر آتا تھا، وہ ہنستیں کے لپٹے میں تھی، چہرے سے ازلی اداسی ضرور جھلکتی محسوس ہوتی تھی، مگر یہ پتا بھی چلتا تھا کہ یہاں بھی حسن دل آرا کی رعنائیاں بھی تھیں، مگر اس وقت وہ ایک پہلو سے سرتا یا کفنائی ہوئی لاش کی غمازی بھی کرتی تھی۔

وہ قبر پر پھول اور چادر چڑھانے کے بعد ایک حجرے کی طرف بڑھی، وہاں دو خدام موجود تھے، عورت نے ان کی طرف دیکھا۔ ایک خادم لے ہوئے سے اپنے سر کو جنبش دی اور حجرے کی چوکھٹ پر جھولتے ہوئے سیاہ رنگ کے پردے کو ایک طرف سرکایا اور اندر داخل ہو گئی۔

سامنے سادہ سی مسند پر وہ نو جوان ملنگ سادون آلتی پالتی مارے براجمان تھا، کچھ عورتیں بھی بیٹھی تھیں اس کے سامنے، وہ ان کی حاجت روائی میں زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا کچھ سے دھیمے لہجے میں بات بھی کر لیتا تھا۔ وہ سفید پوش عورت بھی ایک جانب سر جھکا کے دوزانوں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر گزری، اب حجرے میں صرف وہ سفید پوش عورت تھی اور وہ ملنگ سادون فقیر تھا، اس نے ہاتھ کے خفیف اشارے سے سفید پوش عورت کو اپنے سامنے ذرا قریب سرک آنے کا کہا۔ اس کے بعد اس..... نو جوان ملنگ سادون نے کچھ زیر لب پڑھ کر عورت پر پھونک ماری، پھر پر جلال کی آواز میں بولا۔

”اللہ سائیں تجھ پر، تیرے حال پر رحم کرے، مگر تیرا مہر بھی ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے، تو اب تک اللہ کی رضا پر راضی ہے اور اس کٹھن گھڑی میں تو نے اب تک ایک قابل

رحم زندگی گزاری ہے، رب سائیں تجھے اس ایک ایک گھڑی کا اجر دے گا کہ تو ایسے برے اور کڑے حالات میں بھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ سے امید لگائے رکھی، چڑھتے دریا پہ بند پاندھنے سے وہ منہ زور ہو کے ابل بھی پڑتا ہے اور سب کچھ جس نہیں کر ڈالتا ہے۔ میں برس کی عمر میں تجھ پر جو ظلم کیا گیا تو نے تب سے آج تک یہ پندرہ برس کمال صبر سے بتائے، ہوس طمع کے مارے جاہلوں نے تیری دنیا کی پندرہ بہاریں خزاں میں بدل دیں مگر درحقیقت انہوں نے خود اپنی آخرت خراب کر ڈالی لیکن تیری عاقبت سنور گئی اب بھی اسی طرح صبر و تحمل کے ساتھ میری نصیحت پر عمل کرتی رہنا، کسی بھی پراگندگی سے خود کو پاک رکھنا، کبھی نفس اور خواہشات کو خود پر سوار مت کرنا، سیدھی راہ سے بھی مت بھٹکنا، یہ مت سمجھنا کہ تیری جوانی کی پندرہ حسین بہاریں خزاں کی نذر کر دی گئیں، ہرگز نہیں تیری ان پندرہ بہاروں کی خزاں نے تیری آخرت کی کھیتی سنوار دی ہے، وہ آخرت جو ایک نیک انسان کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے جبکہ یہ زندگی دنیاوی اور عارضی ہے، پس! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا، مرشد سائیں جو ذیل شاہ کی دعاؤں کے طفیل نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی تو سرخ رو رہے گی، ایک بات یاد رکھنا، انسان چاہے جتنا بڑا ہی جاہل و طاقت ور ہو، بے انتہاد دولت کا مالک ہو، مقدر ہر حال میں اس کا دو گز زمین ہی ہے، اس پر بھی وہ شکر کرے کہ یہ دو گز زمین اسے نصیب ہو جائے۔“

ملنگ سادون اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا، سفید پوش عورت نے اپنا غم ناک چہرہ اٹھایا اس کی کشادہ آنکھوں میں برسوں کا کرب اور دکھ، بے کراں سمندر کی طرح موجزن نظر آتا تھا۔ پھر اس کے لب مرعش ہوئے، بولی ”ملنگ سائیں! میں ایک کمزور انسان بھی ہوں مگر یہ شاید آپ کی دعاؤں اور وظیفوں کا طفیل ہے کہ اب تک مجھے گناہ گار کے پائے استقلال میں لغزش تک نہ آئی، میں اللہ سائیں کی رضا پر شاکر و راضی ہوں، مجھے کسی سے کوئی گناہ نہیں، میرا اپنے رب سائیں پر پورا اور بھرپور آسرا ہے۔ لیکن سائیں! ایک بے چینی، ایک غلط میرے اندر کانٹے کی طرح چبھتی ہے، میری ذات سے کسی کو کسی قسم کا ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے یہ مجھے منظور نہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔“

اس کی بات پر پہلی بار نو جوان ملنگ سادون نے نظر اٹھا کے عورت کے چہرے کی طرف بغور دیکھا اور پوچھا۔ ”پوچھ سکتا ہوں وہ کون ہے؟“

”مجھ سے محبت کرتا ہے، ایک غریب شخص ہے وہ۔“
عورت نے نہایت ہولے سے مرد اس لفظوں میں کہا۔
”مجھتی ہے تو کہ وہ سچا انسان ہے؟“
”ہاں! ورنہ میں اس کا ذکر تک کرنا بھی معیوب سمجھتی۔“ عورت نے گہرے لہجے میں کہا۔ پوچھا گیا۔
”یہ سب حقیقت جاننے کے باوجود.....؟“ ملنگ ساون کا لہجہ کچھ غیر یقینی سی حیرت لیے ہوئے تھا۔
”ہاں!“

ملنگ ساون نے چند ثانیے کے لیے جذب کی سی کیفیت میں خاموشی اختیار کیے رکھی پھر بولا۔ ”سچے اور نیک انسان پر اللہ سائیں کی رحمت ہو..... ہم اس کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ پر تیرا اپنا من اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ مناسب لگے تو بتا دو۔“

”وہ سچا آدمی ہے۔“ عورت نے ہولے سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھ پر جبر کرنے والوں کی بربریت کا شکار نہ ہو جائے، اس لیے میں اس سے پہلو ہٹتی کیے ہوئے ہوں کہ اس میں ہی اس کی جان کی امان سمجھتی ہوں، مگر وہ نہیں مانتا۔“
”اسے کبھی میرے پاس بھیج دینا۔“ ملنگ ساون نے کہا اور عورت نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

وہ بے دلی کے ساتھ اوطاق کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھا، اس کا نام خالق داد تھا، عمر تیس چوبیس کے درمیان تھی، دبلا پتلا مگر دراز قامت تھا۔ کبھی مضبوط نظر آتی تھی۔ رنگ سانولا تھا، باریک مونچھیں تھیں، سر پر شیشے کے کام والی سرخ ٹوپی تھی، وہ حویلی کے پرانے خدمت گار داد محمد کا اکلوتا بیٹا تھا، داد محمد خود بھی ابھی جوان ہی نظر آتا تھا، دونوں باپ بیٹے ساتھ دیکھنے پر بھائی نظر آتے تھے، چھوٹی عمر کی شادیوں میں یہی ہوتا ہے۔ خالق داد کی ماں یعنی داد محمد کی بیوی حیاتاں بھی جوان ہی تھی، وہ ایک خوب صورت عورت تھی، وہ حویلی کے زنان خانے کی چاکری پر مامور تھی۔
جب خالق داد نے ایک روز باپ سے کہا تھا۔

”بیو! آج سے میں بھی تیرے ساتھ کام پہ جاؤں گا۔“ تو اس کی بات سن کر داد محمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے آتا بھی کیسے، کام سے تو خالق داد عرف خالقو کو گویا خدا واسطے کا بیر تھا، وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا، لاڈلا تھا، پھر باپ بھی اس کا ڈیرا الف خان کی حویلی کا چاکر خاص یعنی جدی جتنی خدمت گار تھا اور یہ معمولی بات اور چھوٹی

نوکری نہ تھی، اجرت کے علاوہ ”اجرت خاص“ سے بھی نوازا جاتا تھا، یہی سبب تھا کہ یہ تینوں کسی رداقتی تنگ دستی یا غربت کا شکار نہ تھے۔

غریب کی خوشحالی یہی ہوتی ہے کہ دو وقت کی روٹی ملتی رہے، رہنے کو سرکنڈوں کی چھت اور بس۔

خالق داد عرف خالقو اس طرح کی بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا، کوئی کام نہ کرتا، نہ باپ کچھ کہتا نہ ماں۔ وہ تو اسے خوش فکر دیکھ کر ہی خوش ہوتی رہتی تھی، لیکن ایک روز اچانک جانے کیا ہوا کہ خالقو نے یہ بات باپ سے کہہ ڈالی۔
”کیوں پٹ خالقو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟“ باپ کو پریشانی سی ہوئی۔

”میں ٹھیک ہوں بیو!“ خالقو نے کہا۔ ”بس! آج سے میں بھی تیرے ساتھ کام پہ جایا کروں گا۔“

باپ نے سمجھا شاید بیٹا کام میں دل لگانا چاہتا ہے، وہ اسے حویلی لے چلا۔ یوں خالقو نے اوطاق کی جھاڑ پونچھ کا کام سنبھال لیا، وہاں آتے جاتے مہمانوں وغیرہ کی خدمت چاکری کرتا، اس طرح حویلی کے اندر بھی اسے جانے کا موقع ملتا رہتا، یہ راز صرف خالقو ہی جانتا تھا کہ اس نے گوٹھ کی آزاد اور خوش فکر فضا میں یاروں دوستوں کے ساتھ میرساپا آوارہ گردی اور کا دو جھکرائی کے چھپر نما چائے خانے میں آنا تک اچانک کیوں چھوڑ دیا تھا۔

اس پر جہاں حیاتاں اور داد محمد کو حیرت تھی وہاں خالقو کے دوستوں کو بھی زبردست اچنبھا ہوا تھا، اور تو اور خالقو نے تو دوستوں سے ملنا تک چھوڑ دیا تھا۔

آخر وہ راز کیا تھا جس سے صرف خالقو ہی واقف تھا، اس حیرت انگیز تبدیلی کا سبب رات کا وہ نصف پہر تھا جب حویلی سے اچانک بلاوا آ گیا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی ان کے لیے حویلی سے اس طرح کے راتوں کے اچانک بلاوے آتے رہتے تھے، مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس روز داد محمد کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے حویلی سے آنے والے چاکر کے ہمراہ خالقو کو بھی جانا پڑا تھا۔ حویلی پہنچ کر پتا چلا تھا کہ وہاں کی بجلی شارٹ سرکٹ کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی، اگست کا مہینا تھا، ایسے میں فضا ٹھن، جس زدہ ہو جایا کرتی ہے اور پھر الگ تنگ کرتے ہیں، لہذا حویلی کے مکینوں کو ”جھلنی“ دینا بھی تاکہ وہ آرام و سکون سے نیند پوری کر سکیں، حالانکہ ٹریکٹر کے انجن سے بڑا جزیر بھی بنوایا گیا تھا جو ڈیزل سے چلتا تھا مگر آج وہ بھی خراب تھا، جھلنی مقامی زبان میں ہوا پہنچانے کو کہتے ہیں، پرانے وقتوں کا یہ طریقہ

آج بھی دور دراز کے گاؤں گوٹھوں میں رائج تھا۔
کھلی جگہ کے وسط میں ایک درخت جیسا موٹا گول تنہا گاڑ دیا جاتا تھا اور ایک چرخی یا گراری کی مدد سے اس کے اوپر سرے پر تقریباً دس سے بیس فٹ لمبا اور لچکدار بانس ”دوپٹھ“ کی طرح نصب کر دیا جاتا تھا اور پھر بانس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لمبا سا کپڑا باندھ کر جھلا دیا جاتا تھا، اس کے بعد وسط میں گڑھے ہوئے موٹے تنے کے گرد ایک گدھے کے گلے میں رسی ڈال کے اسے ہٹکا یا جاتا تھا، گدھا تنے کے گرد گھومتا جاتا اور دوپٹھ بانس بھی متحرک ہو جاتا یوں اس کے نیچے چار پائیوں پہ سوئے ہوئے افراد کو ہوائی اور وہ سکون سے سوتے رہتے، یوں گدھا ساری رات تنے کے گرد طواف کرتا رہتا تھا، مگر ایک قیاحت ہوتی تھی کہ ایک تو گدھا کبھی کبھار رک جایا کرتا تھا تو کسی کی بھی آنکھ گری سے کھل جاتی تو وہ چار پائی کے قریب رکھی چھڑی اس کی ”چٹنگ“ پہ رسید کر دیتا اور یوں گدھا دوبارہ حرکت میں آ جاتا، گدھا گندمی بھی کرتا تھا، پیشاب اور لید کرتا جس سے بدبو ہوا کرتی تھی، مگر لوگ اس کے بھی عادی تھے، تاہم بڑے زمیندار ٹائپ گھروں میں گدھے کی جگہ انسان کو ”جھلنی“ میں جوتا جاتا تھا، چنانچہ خالقو کو بھی اس مقصد کے لیے وہاں بلایا گیا تھا۔

ایک انسان کے لیے جھلنی لگانا بڑا الکی اور مشقت کے علاوہ بیزار کن اور تھکا دینے والا کام ہوا کرتا تھا، خالقو کے لیے تو یہ کام قیامت کی گھڑی کے مترادف تھا مگر وہ مجبور تھا لیکن درحقیقت کام سے دور بھاگنے والے داد محمد کے لاڈلے بیٹے خالقو نے اسی روز سے ہی حیرت انگیز طور پر کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی، اس کی ایک بڑی خاص اور ”معنی خیز“ وجہ تھی۔

جب اسے حویلی کے کشادہ صحن میں جھلنی کھد بڑنے پر لگایا گیا تو وہ نہایت بیزار کن انداز میں چوبی دسٹر پکڑ کے تنے کے گرد گھومتا رہا، تھک جاتا تو تھوڑا استرا لیتا اور پھر طواف کرنا شروع کر دیتا۔

حویلی کے مکین بڑے آرام سے بڑی بڑی منقش پائیوں والی چار پائیوں پہ سوئے ہوئے تھے، خالقو بے چارہ اسی طرح صبح تک ان سب کو دتی پنکھا جھلاتا رہا، تب اس دوران اس کی نگاہ ایک قریب بھی چار پائی پہ پڑی اور پھر جیسے وہ خود بھی ”سکتے“ میں آ گیا۔ کسی نے عجیب اور بھرپور انداز میں چار پائی پر کروٹ بدلی تھی اور وہ زور سے چرچرائی تھی۔
چوبی جھلنی کی ابھرنے والی مخصوص مگر یکساں بیزار کن

”چک چوں..... چک چوں“ تاروں بھرے آسمان تلے ستارے میں عجیب سی محسوس ہو رہی تھی، ایسے میں قریب بھی چار پائی پر کسی نے کروٹ بدلی تو بے اختیار طواف کرتے ہوئے خالقو کی نگاہ وہاں پڑی تھی۔

کروٹ بدلنے سے چادر سرک گئی تھی اور کسی لالہ گل کے نرم و نازک وجود کا گوشہ نہاں عیاں ہوا تھا جھلنی کا طواف کرتے ہوئے خالقو کے نہ صرف قدم بلکہ دل بھی تھم سا گیا تھا۔ وہ رخ روشن چہرہ، چادر کی اوٹ سے کسی بدلی کے عقب سے ابھرتے طباق چاند ہی کی طرح طلوع ہوا تھا اور خالقو کے اندر تک اپنی خیرہ کن ضو نشانیاں بکھیر گیا تھا۔ رات کے اس دم بہ خود پہر میں گویا ایک طلسم ہو شر با تھا جو خالقو پر طاری ہو گیا تھا۔ معا خالقو کو احساس ہوا کہ اس کے رکنے سے ہوا تھم گئی تھی جس کے باعث بند آنکھوں والے چاند چہرہ وجود میں بے چینی سی واقع ہو رہی تھی، کہیں یہ نظارہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے، اس خیال سے آپوں آپ اس کے قدم حرکت کرنے لگے، جھلنی پر لگی چادر نے معلق اور رکی ہوئی ہوا کو تھپک کے رقصاں کیا اور ہر پھیرے پہ خالقو اس رخ روشن کا نظارہ کرتا گیا۔ کہاں تو اسے یہ کام حد سے زیادہ تھکا دینے والا، قیامت کی گھڑی جیسا محسوس ہو رہا تھا نہ صرف یہ بلکہ وہ ایک گھنٹے میں ہی تھک کے چور ہو گیا تھا، مشقت طلب کام میں یکسانیت اور بوریت بھی شامل ہو جائے تو وہ کام مزید جان توڑ بن جاتا ہے، مگر اب دیدار حسن نے تو گویا تن مردہ میں صور پھونکنے کا کام کیا تھا اور پھر جانے کتنے ہی گھنٹے رات بھر کے بیت گئے، خالقو کو کب اس کا کوئی احساس رہا، وہ تو شوق دید میں اس طرح جانے کب تک چلتے رہنے کا قصد کر چکا تھا۔

سحر ہوتے ہی مکین جاگنے لگے تو خالقو نے سر جھکا لیا، پھر اسے وہاں سے جانے کا کہا گیا۔ وہ اس طرح سر جھکائے چلا آیا۔ نظارہ حسن محو ہوتے ہی یکدم اس کا پورا وجود جھکن سے چٹختنے لگا۔ وہ گھر آ کے چار پائی پر گر گیا۔

سہ پہر تک وہ بے سدھ سویا رہا۔ جاگا تو طبیعت میں عجیب کسلندی اور بوجھل سی آنکھوں میں اکٹا ہٹ تھی، مگر نیم غنودہ دل و دماغ پر وہی چہرہ ابھرا تو وجود کا سارا سکندر جاتا رہا۔ وہ کھو کے رہ گیا۔ وہ تصویر ہی تصور میں اس چہرہ ماہ تاب کی کشیدہ کاری کرتا رہا، تب پھر معانی عقل و خرد کا احساس بیدار ہوا تو اس نے ٹھوکا دیا۔

”خالقو! تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، تو کہاں، وہ کہاں۔ وہ آسمان، تو زمین، وہ بلند و بالا حویلی کی چھت اور تو سرکنڈوں کی جھونپڑی کا ٹوٹا ہوا چھپرہ۔ ہوش کر، اپنی اوقات

دیکھ اور اس کی حیثیت پہچان۔ عقل و خرد کے اس طرح کھد پڑنے پر مایوسی نے اس پر غلبہ پایا اور وہ اداس سا ہو گیا۔ مگر پھر اس روز کے بعد یہ ضرور ہوا تھا کہ اس نے گھر سے باہر نکلتا کم کرتے کرتے تقریباً ترک کر دیا۔ دوست گھر آنے لگے تو ان سے بھی نہ ملتا۔ جی بے قرار رہنے لگا اور وجہ وہی پری چہرہ تھی۔ وہ کسی نصیبی سبق بن کے اندر ہی اندر اسے ہر روز دہرایا کرتا، تمام بچے کے ساتھ، گول چہرہ، دودھ میں گلاب ملا رنگ، ہونٹوں کی ملکوتی بناوٹ ملائم حوروں جیسی تصویراتی خوبصورت جلد، بند آنکھوں پر پلکوں کی سیاہ کھنی لکیر اور ابرو چشم کی آفرینی بناوٹ..... وہ بھولے نہیں بھول پارہا تھا اس چہرے کو..... کئی بار ذہن سے جھٹکنے کی کوشش بھی کی تھی وہ جیسے ہر روز افق سے طلوع ہو کے سامنے آتا رہتا۔

دل بے چین کو جب بے قراری نے ادھ موا کر ڈالا تو سرکشی نے آتش فشاں سے اٹھتے بھڑکتے لادے کا روپ دھار لیا۔ بالآخر دل نے دماغ سے بغاوت کرتے ہوئے باور کرا دیا کہ یہی محبت ہے، یہی وہ جذبہ دل ہے جو اونچ نیچ ذات پات، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

تب اس نے باپ سے کہہ کر خود کو حویلی کے مستقل چاکروں میں شامل کرا لیا۔

باپ داد محمد اور اس کی بیوی حیاتاں کا شمار چونکہ حویلی کے خاص خدمت گاروں میں ہوتا تھا جو اندر کے کام سنبھالتے تھے، اس لیے خالق کو بھی حویلی کے اندر کا کام بھی ملتا رہتا تھا، باہر کے خدمت گاروں کو ”اندر“ آنے کی ممانعت تھی۔

خالق سے کبھی کبھار اوطاق کی صفائی، جھاڑ پونچھ کا کام بھی لیا جاتا تھا اور اگر وڈیرے الف خان کے کوئی فریسی عزیز یا دوستوں کو اندر حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا تو خالق کو مکمل طور پر ان کی خدمت داری سونپ دی جاتی تھی اور یوں خالق راتوں تک حویلی کے اندر مہمان خانے میں رہتا تھا۔

اس روز بھی حویلی کے اندر دیر تک رہنے کا موقع ہاتھ آیا۔

شہر سے وڈیرے الف خان کا ایک بچپن کا دوست مع اپنی فیملی کے ان کے ہاں چند روز کے لیے رہنے آیا۔ یہ ایک بڑا بیوروکریٹ افسر تھا، وہ اکثر کمزور اور کالے بھٹ تیتروں کے شکار کے لیے آتا رہتا تھا، جبکہ وڈیرا الف خان بھی شہر اپنے بیوی بچوں سمیت اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ شنیدھی کہ بچپن کے ان دونوں دوستوں کے درمیان دور کی رشتے داری

بھی تھی اس لیے دونوں خاندانوں کے لوگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ کھلے ملے ہوئے تھے۔

بہر طور..... جس موقعے کی خالق کو تلاش تھی، وہ اسے مل ہی گیا تھا۔ وہ اب صبح ہوتے ہی حویلی چلا جاتا تھا اور کام میں مصروف ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ اس نے مہمان گروں کے علاوہ بھی دیگر گروں کی صفائی ستھرائی اپنے ذمے لے لی تھی اب حویلی کا کوئی فرد بھی اس کے لیے اجنبی نہ رہا تھا، وہ سب کو پہچاننے لگا تھا اور اس چہرے کو بھی جس نے ہوش و خرد کی دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔ ہاں! وہ چہرہ اب اس کا خوب اچھی طرح آشنا ہو گیا تھا مگر اس کر یہ حقیقت کے ساتھ کہ..... نور خاتون نامی اس چہرے کو ”وٹی“ کیا جا چکا تھا، یعنی اس کا قرآن سے نکاح کر دیا گیا تھا (نعوذ باللہ)

خالق کو یہ تلخ حقیقت جان کر بہت دکھ ہوا تھا، نور زادی اس سے پانچ سال بڑی تھی، پچیس سال کی عمر میں اسے ”وٹی“ کر دیا گیا تھا۔

خالق کو یہ بات اب معلوم ہوئی تھی۔ وہ اب پریشان سا رہنے لگا تھا۔ بے شک نور کے ساتھ اور بھی تلخ حقیقتیں تھیں، سب سے بڑی اور تلخ حقیقت تو یہ تھی کہ نور خاتون وڈیرے الف خان کی بیٹی تھی، جبکہ اس کے مقابلے میں خالق ایک نوکر تھا، پھر وہ وٹی بھی کر دی گئی تھی۔ وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا تو حاصل کرنے سے پہلے ہی وڈیرے الف خان کے بھیڑیا صفت کارندے اسے گولیوں سے بھون کر لاش کی ویرانے میں پھینک دیتے۔ ان سارے سفاک حقائق کے باوجود خالق کے سر پر عشق نامراد کا بھوت بہ دستور سوار تھا۔

فطرتاً وہ بڑا جی دار تھا، کوئی شے پسند کر لیتا تو اسے حاصل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا تھا اور اگر ایسے کسی ”معاٹے“ میں جب وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگتا تو یہی احساس محرومی خود کار نظام کے تحت سرکشی میں تبدیل ہو جاتا اور اس سرکشی کا سبب ہی تھا کہ اس روز شام کے پھر اس کی مڈ بھیڑ نور خاتون سے ہوئی گئی۔

وہ اس وقت مہمان خانے کے گروں کی صفائی ستھرائی اور رات کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرنے میں مصروف تھا کہ حویلی کے ایک قدرے ویران کچھ میں اس کا نور خاتون سے سامنا ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہے، وہ عقب میں بنی ایک قدرتی جھیل کی طرف کھلنے والے درخت سے لگی کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ حسب معمول اس نے سفید رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

”بی بی جی! آ..... آپ رور ہی ہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ قریب پہنچ کر خالق نے بالآخر اسے مخاطب کرنے کی جرأت کر لی۔ اس کی آواز پر نور خاتون نے چونک کر درخت کے باہر سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ اونچا لانا قد، بڑی بڑی آنکھیں، گھنے بال، لمبی قلمیں، چوڑے شانوں اور فراخ پیشانی والا یہ معمولی نوکر..... اس کے لیے نامانوس تو ہرگز نہ تھا لیکن..... اب یہ شاید نسوانی وجدان کا کمال تھا کہ..... وہ اس کی بات میں چھپی ہمدردی کی تہ میں انسیت محسوس کیے بغیر نہ رہی تھی۔

ادھر اچانک ہی خالق کو یہ احساس ہوا کہ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کہہ ڈالی تھی، شاید بی بی جی نے برا منایا ہے لہذا نور خاتون کی چند ثانیوں کی پرسوج خاموشی کے دوران ہی وہ بول پڑا۔

”معافی چاہتا ہوں بی بی جی! شاید میں نے غلط بات کہہ دی۔“

”نہیں، تم نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔“ نور خاتون اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کی طرح اس کی آواز بھی اداس تھی۔ نور خاتون نے چادر کے پلو سے اپنی آنکھوں کے نمناک گوشے پونچھ ڈالے، اب اسے سامنے سر جھکائے کھڑے خالق کا چہرہ صاف دکھائی دیا۔ جانے کیوں نور خاتون کو اس کے چہرے پر بھی اداسی کی رمت محسوس ہوئی، جو اسے اپنی اندر کی غمناکی کا پرتو لگی۔

”آ..... آپ..... کی طبیعت خراب ہے تو آپ جاکر آرام کر لیں، کسی شے کی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں۔“ خالق نے اس طرح جھکے جھکے سر سے کہا۔ آج پہلی بار وہ بی بی جی سے بات کر رہا تھا، اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا، مگر یہ بھی درست تھا کہ بی بی جی کو سو گوار دیکھ کر وہ خود بھی رنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ ادھر نور خاتون پہلی بار اسے غور سے تنکے لگی، اس کا نسوانی وجدان کہہ رہا تھا کہ اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے جو مرد کھڑا تھا۔ اس کی وجود خالی از علت نہ تھا، اس کے چہرے پر نور خاتون کو دہلی دہلی سے پہچل محسوس ہو رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”پھر یہ آنسو؟ اور یہ آپ کا اس قدر اداس چہرہ.....؟“

بے اختیار خالق کے منہ سے نکلا تھا، ساتھ ہی اس نے اپنا چہرہ بھی دوسری جانب کر لیا تھا، اسے اپنا دل بے طرح دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا، سمجھتا تھا وہ ایک چوری جسارت کرنے جا رہا تھا۔ نور خاتون کو اس کی بات میں پھر کچھ محسوس ہوا، وہ ایک بار پھر اسے یک ٹک تنکے لگی نظروں میں گہرائی اتری تو دل

کے یکسرے نے ساز الفت چھیڑا، ابھی یہ ساز خفیہ تھا مگر اندیشہ لگاؤ کا پتا ضرور دیتا تھا۔

”بی بی جی! شاید مجھ سے پھر کوئی غلطی ہو گئی؟“ بی بی جی کی ایک لمحہ خاموشی پر خالق نے کہا تو اس بار نور خاتون اس کے اس بھولپن پر بے اختیار مسکرا دی۔ اداسی کے اڑے اڑے رنگ میں کھلی مسکراہٹ عجب تاثر دیتی تھی۔

”نہیں، تم کوئی غلطی نہیں کر رہے۔“

”سچ بی بی جی!“ خالق کو یک گونہ مسرت محسوس ہوئی۔

”ہاں۔“ نور خاتون نے ہولے سے کہا۔ اب وہ نگاہوں سے گویا مسکرا رہی تھی۔

”تم چاچا داد محمد کے بیٹے ہونا؟“

”جی، بی بی جی۔“ خالق کو اس کا سوال پوچھنا اچھا لگ رہا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”خالق داد، مگر مجھے پیار سے خالقو کہتے ہیں۔“ اس نے بڑے اشتیاق سے بتایا۔

پہلی خاموش ملاقات کے بعد بی بی جی سے یہ دوسری بار ملاقات بھر پور بھی خالقو کے لیے۔ وہ سارا دن شاداں و فرحاں رہا، کھنٹوں تنہائی میں وہ بی بی جی کا تصور کرتا رہا، زیر لب بار بار اس کے سوال اور اپنے جواب دہراتار پلٹے اسے کسی ڈرامے کا اسکرپٹ پکڑا دیا گیا ہو اور وہ تنہائی میں مکالمے بول بول کے حفظ کر رہا ہو۔ اسے یہ محسوس ہوتا جیسے بی بی جی ہنوز اس کے سامنے کھڑی ہو، کتنی لطافت تھی اس کے دیکھنے کے انداز میں، کسی انسیت بھرا دھیمپن تھا اس کے لہجے میں، بی بی جی کے اندر کون سا غم تھا وہ ہر وقت اداس کیوں رہتی تھی رنجیدگی کیوں ان کے چہرے، ان آنکھوں میں گویا برسوں سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے؟ یہ بھلا کون نہیں جانتا ہوگا، یہ حقیقت بھی بھلا کسی سے چھپی رہی تھی کہ نور خاتون کو وٹی کر دیا گیا تھا۔ خالقو بھی جانتا تھا، مگر پھر بھی اس نے بی بی جی سے اس کی اداسی، اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی وجہ پوچھی تھی، اس کا ایک مقصد تھا، وہ چاہتا تھا کہ بی بی جی اسے اپنا غم آشنا کرے، اسے بتائے کہ وہ کیوں ہر وقت غمزدہ رہتی ہے؟ تاکہ وہ بھی اس کے جواب میں کچھ اس سے کہہ سکے، وہ اس موقعے کی تلاش میں تھا جو اسے میسر بھی آیا تھا۔

”تم مجھ سے بار بار یہ سوال کیوں کرتے ہو کہ میں اداس اور غمگین کیوں رہتی ہوں؟“ نور خاتون نے اس

روز اس کے وہی سوال دہرانے پر پوچھ لیا۔

”اس لیے بی بی جی! کہ میں آپ کا دکھ جانتا ہوں۔“
خالقو نے بڑا حوصلہ کیا تھا۔

”تو پھر؟ جانتے ہو تو بار بار پوچھنے کا مطلب؟“

”اسی لیے بی بی جی! کہ آپ کے ساتھ جو بات غلط ہوئی ہے، اس کا آپ کو احساس جگا سکوں۔“

”یہاں صحیح غلط کسے نظر آتا ہے، خالقو!“ نور خاتون کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔

”یہاں تو فقط اپنی مرضی اور حکم مسلط کیا جاتا ہے۔“

”آپ کو ایسے مکروہ حکم پر سر نہیں جھکانا چاہیے تھا بی بی جی!“

”تو کیا کرتی میں؟“

”صاف انکار کر سکتی تھیں آپ، اس حویلی میں آپ کے اپنوں نے آپ کو ساری عمر کے لیے زندہ درگور کرنے کا سامان کر ڈالا اور آپ خاموش رہیں۔“

”ہم عورتوں کی کیا حیثیت ہے حکم عدولی کرنے کی۔“

”اور اگر آپ کے ساتھ کوئی مرد ہو، تب.....؟“

خالقو نے یہ کہہ کر نور خاتون کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں پہلے حیرت، بے تاثر مسرت اور پھر آخر میں خوف کا عنصر غالب آ گیا۔

”جواب دیں بی بی جی؟“ خالقو نے بہ دستور نور خاتون کے چہرے پہ نظریں گاڑی ہوئی تھیں۔

نور خاتون کو خالقو کی آنکھوں میں آتش نمرود میں دیوانہ وار کود پڑنے کی سرکشی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی، بولی۔

”کک..... کون مرد؟“

نور خاتون کے اکتے ہوئے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اس ”مرد“ کو جان گئی تھی۔

”میں۔“ خالقو نے جیسے خم ٹھونکے۔

”تنت..... تم.....“

”ہاں بی بی جی! میں آپ کو وہ مرد بن کے دکھا سکتا ہوں جو آپ کو اس بیچ اور خود ساختہ روایتوں کی زنجیر سے آزاد کر کے خوشیوں اور مسرتوں بھری زندگی دے سکتا ہے، جو آپ کا اور ہر عورت کا حق ہے۔“

خالقو کی بات پر ایک لمحے کے لیے نور خاتون کے اندر کی روایتی عورت فخر سے پھول گئی تھی، لیکن پھر سماج زدہ عورت نے اسے ٹھوکا دیا تو وہ خوف زدہ ہو گئی، بولی۔

”ہم بے دردی سے مار دیے جائیں گے، نہیں جانتے تم کہ میں کس کی بیٹی ہوں؟“

”میں صرف یہ جانتا ہوں تم اللہ سائیں کی بنائی ہوئی ایک حسین مورت ہو اور ایسی ہی حسین زندگی تمہارا مقدر ہونا چاہیے۔“ خالقو نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”اور میں مرنے سے نہیں ڈرتا، کیا تم موت سے ڈرتی ہو؟“ اس نے آخر میں نور خاتون سے پوچھا تو اس کے گداز سے، اداسی لیے ہونٹوں پر بے تاثر مسکراہٹ ابھری، بولی۔

”جوروز موت سے بدتر زندگی کا مزہ چکھ رہا ہو، بھلا وہ ایک دن کی موت سے کیوں ڈرے گا، ایک دن کی موت تو مجھے بد نصیب کا نصیب بنا دے گی۔“ اس کے جواب پر خالقو کے اندر تک دکھ بھر گیا، اس نے بے قرار ہو کر نور خاتون کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ نور خاتون کی آنکھیں پھیل گئیں۔

خالقو، اس کی پھٹی پھٹی مگر دلکشی کا تاثر دیتی آنکھوں میں محبت پاش نظریں جما کے بولا۔

”پھر مجھے بھی اپنی اس ایک دن کی موت کے ساتھ خوش نصیبی عطا کر دو، نور..... کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اب تمہاری مرضی کہ اس معمولی حقیر نوکر کی اس بے اختیاری پہ اپنے غصے کا اظہار کر دو، تھپڑ میرے چہرے پہ مار دو، میں اف تیک نہیں کروں گا، مگر پیچھے بھی نہیں ہٹوں گا۔“

”یا اللہ سائیں.....“ بے اختیار نور خاتون کے مرتعش لبوں سے یہ الفاظ برآمد ہوئے۔ ”کیا مجھ پر پھر کوئی کڑی آزمائش آنے والی ہے۔“

”نہیں نور.....“ خالقو اب اسے بڑی محبت سے، نام لے کر مخاطب کرنے لگا تھا۔

”دوسری بار کوئی بھی کڑی آزمائش تمہارا مقدر نہیں بن سکتی۔ بس! میرا ساتھ دو، ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں، رب سائیں کی دنیا بہت بڑی ہے، ہم ہنسی خوشی اور پیار بھری زندگی کا کہیں بھی آغاز کر سکتے ہیں۔“

نور خاتون کا پورا وجود مرتعش ہو گیا، اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور خشکی ہوئی اس سے دور ہو گئی۔

وہ تیار ہو کے اور پورے ”کیل کانتوں“ سے لیس ہو کر اپنی خادمہ خاص سورٹھ کے ساتھ سائیں جو ذیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے کی درگاہ پر جا پہنچی۔

پھول نچھاور کرنے اور نئی ریشمی کڑھائی کی سوتی چادر چڑھانے کے بعد وہ سائیں عورتوں کے حصے کی طرف بڑھی۔ وہاں چند عورتیں موجود تھیں۔ سائیں نے غصے سے پلٹ کر سورٹھ کو دیکھا اور بولی۔

”تو نے تو کہا تھا کہ اس وقت میں بھی بڑی جائیداد تھی، دو فلور ملوں کے علاوہ تین رائس ملز

در اور دروازہ

سائیں نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں، یہ کیا سب تیری مائیں بیٹھی ہیں؟“ خادمہ سورٹھ گھبرا کے بولی۔

”بی بی سائیں! آپ اس وقت پہلے بھی آتی رہی ہیں اور خود بھی دیکھ چکی ہیں کہ یہاں کوئی ساکن نہیں ہوتا، مگر جانے کیوں آج.....“

”بند کر اپنی بکواس، اب ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔“ سائیں کا غصہ ناک پر چڑھا ہوا تھا، سورٹھ اسے ایک طرف لے گئی اور وہاں بٹھا دیا۔ پھر خود ملنگ ساون کے حجرے کی طرف چکر لگاتی رہی، خاصی دیر بعد اس نے بتایا کہ تمام سائیں عورتیں جا چکی ہیں، پھر سائیں جب سورٹھ کے ساتھ تیز قدم اٹھاتی ہوئی حجرے کی طرف بڑھی تو وہاں موجود ایک خادم نے راستہ روک لیا اور بولا۔

”سائیں ملنگ فقیر (ساون) اب عبادت اور مراقبے میں مصروف ہو گئے ہیں، اب کوئی ان سے نہیں مل سکتا۔“

درگاہ کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں مگر سائیں کی برغور اور سرکش فطرت ان اصولوں کو کب تسلیم کرنے والی تھی، اس لیے کہ اس کے یہاں آنے کا مقصد اور ہوتا تھا، وہ ناک بھوں چڑھا کے اسے گھورتے ہوئے پرغور لہجے میں بولی۔

”تو جانتا نہیں ہمیں، ہم کس کی بیٹی ہیں۔“ خادم نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”یہاں فقیر اور بادشاہ سب ایک ہوتے ہیں۔“

”تم اندر جا کر ملنگ فقیر کو بتا تو دو کہ باہر ڈیرے خدا بخش کی بیٹی سائیں بی بی آئی ہیں۔“

”ڈیرے خدا بخش سائیں کی عزت آنکھوں پر، مگر ملنگ سائیں جب عبادت یا مراقبے میں ہوں تو کسی سے ملاقات نہیں کرتے، آپ واپس تشریف لے جائیں اور کل آنا۔“

ساون ملنگ سے ملاقات کیے بغیر واپس لوٹنا سائیں کو بھاری پڑ گیا۔ وہ بلا کی انا پرست اور مغرور لڑکی تھی، ناک پر کبھی بیٹھنا تک گوارہ نہ کرتی، ہر دقت برتری کا بھوت سوار رہتا تھا سر پہ، اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اس میں اس کی خوب صورتی کا تو دخل تھا ہی مگر وہ دولت مند بھی تھی اور آج تک اپنے باپ کا نام کما رہی تھی، وڈیرا حاجی خدا بخش کا بڑا نام تھا، اب جبکہ وہ چار پائی سے لگ گیا تھا، مگر اس کا اثر درسونخ اور تعلق داری میں چنداں فرق نہ آیا تھا، اس کی ایک وجہ تھی، وہ حسی طور پر آدھے گوٹھ کا مالک تھا، یہی نہیں ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک بھی تھا، دس بارہ مسافر لاریاں تھیں جو گوٹھ سے شہر اور شہر سے گوٹھ کے درمیان چلا کرتی تھیں۔ شہر میں بھی بڑی جائیداد تھی، دو فلور ملوں کے علاوہ تین رائس ملز

اور ایک سالونٹ پلانٹ کا مالک بھی تھا۔ شہر میں بھی شاندار بنگلا نما گھر تھا جو بھٹائی ہاؤس کے نام سے موسوم تھا۔ نوکر جاگروں کے علاوہ وفادار آدمیوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی، کئی گوٹھوں کے وڈیروں اور وڈیرے زادوں کے رشتے اس کے لیے آئے تھے مگر سائیں نے ٹھکرا دیے تھے۔ باپ کی اکلوتی اولاد تھی، سونے یہ سہاگلا ڈلی تھی اور خاصی پڑھی لکھی بھی، سو جو بوجھ بھی رکھتی تھی۔ مگر یہ بات اس کی انا پرست اور مغرور شخصیت کے برعکس جاتی تھی کہ وہ ایک نوجوان ملنگ فقیر ساون کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی دوسری وجوہات سمجھ میں آتی تھیں، پہلی تو یہ کہ اسے اپنے حسن پہ بڑا ناز تھا مگر ساون نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ملنگ ساون نوجوان تھا اور حد درجہ خوب رو اور وجیہہ لڑکا تھا۔ اب یہ معاملہ دل تھا کہ اس کا دل اس فقیر پر آ گیا تھا، جس کی مسلسل بے رخی نے سائیں کو مزید ضدی بنا دیا تھا، اب نجانے یہ سائیں کے لیے انا کا مسئلہ بن گیا تھا یا پھر وہ اس سے واقعی محبت کرنے لگی تھی کہ وہ اس کے پیچھے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے اسے رجھانے کے لیے ہر طرح کے ”جھالیا تی“، ”تھکنڈے استعمال کر ڈالے تھے مگر وہ اس کی طرف ذرا بھی راغب نہیں ہوا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنی ملازمہ خاص سورٹھ کے ساتھ پھر درگاہ جا پہنچی۔ اتفاق تھا کہ اسے تنہائی میں شرف ملاقات حاصل ہو گیا۔

نوجوان ملنگ فقیر ساون اپنے حجرے میں تنہا موجود تھا، سائیں اندر داخل ہو کے اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور ساون کا چہرہ ٹکنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ حجرے میں ساون فقیر کی پر جلال آواز ابھری، سائیں فرشی دری پر کسمسا کے بیٹھ گئی۔ ”جو بات، جو راز ہے بول دے، میں سن رہا ہوں۔“ ساون نے کہا۔

”میں آج اپنے حسن کی بد صورتی تلاش کرنے آئی ہوں۔“ سائیں نے کہا۔ اس کے دلنشین ہونٹوں پر معنی خیز اور پرشونخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

ساون نے اس کی بات سن کے کہا۔ ”پہلے اپنے اندر کا حسن تلاش کر پھر تجھے خود ہی اپنے تن کی بد صورتی نظر آجائے گی۔“

”میرے اندر تو کسی کی محبت کا دیار روشن ہے اور اس کی روشنی میں مجھے صرف ایک ہی نام نظر آتا ہے۔“ سائیں نے جیسے دل کی عمیق گہرائیوں سے کہا۔

”محبت عبادت ہے، جا کر اللہ کو یاد کر۔“

سسپنس ڈائجسٹ 268 جولائی 2012ء

سسپنس ڈائجسٹ 269 جولائی 2012ء

تاج محل

باز نہیں آتے۔ جیتے۔ ایک روز ”رندوے کی فریاد“ لکھتے لکھتے ان کا دل جاہا کہ ایک کیلا کھائیں انھوں نے بہت کوشش کی کہ دل کو اس بیوہ خیال سے باز رکھیں مگر بڑا کایاں دل تھا۔ اڈ گسیا کہ کیلا کھاؤں گا اور ابھی کھاؤں گا رندو دھڑکنا چھوڑ دوں گا۔

ناچار تاج محل آئو اور صوری نظم چھوڑ کر اٹھے، بازار میں گئے اور پھل فروش کی گود میں ہ پیسے کا سترہ پیسہ کر بولے۔ یہ رندو جلدی سے ایک اچھا سا کیلا تو دینا۔ دیکھو، کچا نہ ہو۔

پھل فروش نے حیرت کی ایک نظر تاج محل پر ڈالی۔ دوسری پانچ پیسے کے سکے پر۔ سمجھ گیا کہ یہ حضرت کیلا لیے بغیر نہیں ملیں گے اور پانچ کی جگہ چھ پیسے بھی نہیں دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں عقل اور احتیاط کا تقاضہ ہے کہ دکانداری غراب نہ کی جائے۔

پس اس نے ایک بڑا سا کیلا اٹھایا اور ان کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”یہ لیجئے سرکار، کیلا حاضر ہے۔“ پھر مسکرایا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ حضور والا کے ہاں کوئی بڑی پارٹی ہونے والی ہے۔ جس کی خاطر آپ اتنی زوردار خریداری کتے پھر رہے ہیں۔“

تاج محل آئو چپ ہے۔ تاج محل آئو نہیں دیئے۔ تاج محل آئو گھر کو کھسک لیے۔ منظور تھا کھانا کیلا!

از خالہ نسیم..... نیوزی لینڈ

کرتے ہوئے ایک رازدارانہ ملاقات کے دوران اسے

پر باپ ہی کی طرح بڑے کروفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آٹھ دس کمدار اور کچھ سچ کار پرداز ایک طرف سر جھکائے مودبانہ کھڑے تھے۔

”اڑے بابا پھکو! منشی آرہیلو بتا رہا تھا کہ اس بار ایک نمبر باستی بہت کم اتری ہے کیوں.....؟“

در باری ستائے میں وڈیرے الف خان کی گونجی مگر کرخت آواز ابھری۔ ایک مضبوط تن و توش کا مالک شخص جھٹ سے آگے بڑھ کے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”سائیں بھوتار کے سر کی خیر ہووے! آپ نے ٹھیک سنا ہے، پر سائیں وڈا! اس میں میرا قصور نہیں ہے، وارے کا پانی پورا نہیں پڑتا، زمین بیاہنے کے بعد اسے فوراً اور بہت سے پانی کی ضرورت پڑتی ہے مگر.....“ اس کی آواز حلق میں دب گئی کیونکہ اگلے ہی لمحے الف خان کی گوجدار آواز ابھری۔

”اڑے او، جبل!“

”حاضر سائیں وڈا!“ معاً ایک قد آور اجرک پوش کار پرداز آگے بڑھا، اس کی پشت سے گن جھول رہی تھی۔

”اڑے بابا! یہ وارے کے پانی کا کیا مسئلہ ہے؟“

الف خان نے پوچھا تو جبل نامی وہ کار پرداز مودبانہ بولا۔

”سائیں بھوتار! کوئی خاص نہیں، ساتھ میں زمیندار

کرتے ہوئے ایک رازدارانہ ملاقات کے دوران اسے

”کک..... کیا تم نے اس ملک فقیر کو اس بارے میں سب بتا دیا؟“ خالقو کے چونکے ہوئے لہجے میں تحیر اور آنکھوں میں قدرے تشویش تھی۔

”فکر کی بات نہیں، وہ ملک فقیر جانے کتنے ہی لوگوں کے رازوں کا امین بھی ہے۔“ وہ ازراہ تشفی بولی۔

”مگر کیوں؟ میں اس سے کیوں جا کر ملوں نور! اور کس لیے؟“

”وہ تو تجھے کچھ سمجھانا چاہتا ہے۔“

”کیا سمجھائے گا مجھے؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ ”یہی کہ تجھے حاصل کرنے کی راہ سے ہٹ جاؤں؟“

”میری خاطر ایک بار اس سے جا کر مل لو۔“ نور خاتون نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور خالقو نے سر جھکا لیا۔

بلند چھت والی اوطاق میں وڈیرا الف خان اونچے اور قدرے چوڑے پٹے والے سرکنڈوں کے بنے موٹے

پر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کا بیٹا وڈیر خان بھی اس کے برابر موٹے نقشیں پایوں والے بان کے پیڑے

وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کے سرشاری سے بولی۔

”تیرا میرا کیا جوڑ ہے۔ تو ریشم و کھواب کے بستر پر سونے والی نرم و نازک شہزادی ہے، سونے کے برتن میں تیرے لیے اعلیٰ اقسام کے طعام رکھے جاتے ہوں گے، میرے ساتھ تجھے کیا ملے گا بچی؟ میں تو سمجھو سے روٹی کھاتا ہوں، چٹائی پر سوتا ہوں اور اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔“

”میری ساری آسائیں تیرے سامنے بیچ ہیں میرے محبوب سادو!“ سائیں کے گویا دل کی عین گہرائیوں سے آواز نکلی، سادو نے دھیرے سے اسے خود سے الگ کیا پھر بغور اس کے دلکش چہرے کو نکتے لگا۔ سائیں بھی اسے مخور نگاہوں سے نکتے لگی۔ حجرے کی پر نور فضا میں عجب رنگ گھلا ہوا تھا، ایک انوکھی محبت کی خوشبو جو چہار سو گردش کر رہی تھی اور غیر مرئی احساس کی ڈور میں باندھے دے رہی تھی۔

سادو کو اس طرح ایک ننگ اپنی طرف دیکھتے پا کر سائیں نے بھی بھکی سرشاری سے ڈوب کر کہا۔

”اسی طرح میری آنکھوں میں دیکھتے رہو میرے محبوب! تمہیں میرے اندر تک صرف اور صرف تمہاری محبت کا سمندر موجزن نظر آئے گا۔“

”ہاں! جذبات کے اس تلاطم خیز سمندر کو میں نہ صرف دیکھ رہا ہوں، بلکہ محسوس بھی کر رہا ہوں۔“ سادو نے ہولے سے مگر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن.....“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا میرے محبوب؟“ سائیں نے تڑپ کر پوچھ لیا۔ ایسے میں اس کی ملائم و سپید جلد سے گندھی پیشانی پر سیاہ ریشمی بالوں کی لٹ سی جھول گئی جس نے سائیں کے ملکوتی حسن کو چندے ماہتاب بنا دیا مگر سادو کا چہرہ بھی مردانہ وجاہت کے ساتھ وقار اور نور کے امتزاج میں شوکت بہار نکھیر رہا تھا۔

”ہم تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتے۔“ سادو نے ہولے سے کہا تو سائیں یکدم بے چین ہو گئی، بولی۔

”کیوں؟..... ایسی کیا بات ہے؟..... جو تم سمجھ رہے ہو یا محسوس کر رہے ہو؟“

”میری عبادت کا وقت ہونے والا ہے، تم اب جا سکتی ہو۔“ سادو نے کہہ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

سائیں جانتی تھی، اب سادو سے مزید کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی تھی، وہ خاموشی سے اٹھی اور حجرے سے نکل گئی۔

نور خاتون نے نوجوان ملک فقیر سادو کی بات پر عمل

”میرے من میں ایک محبوب بسا ہوا ہے۔“

”اللہ کے سوا انسان کا اور کون محبوب ہو سکتا ہے؟“

”میں عشق مجازی کی بات کر رہی ہوں۔“

”عشق مجازی کی انتہا عشق حقیقی ہے۔“

”ابھی میں شاید اس منزل تک نہیں پہنچی، میرا محبوب تو مجھے پہچاننے سے ہی انکاری ہے۔“

”تجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے؟“

”ملنگ سائیں! تو تو سب جانتا ہے، پھر یہ سوال کیوں کیا؟“

”دلوں کا بھید صرف اللہ جانتا ہے، جو پوچھا ہے، اس کا جواب دے، تیرا محبوب کون ہے؟“

”میرا محبوب، اس وقت میری آنکھوں کا مرکز، میرے سامنے ہے۔“

”میں اس لائق نہیں۔“

”کیوں نہیں لائق؟“ سائیں تڑپ گئی۔

”تجھ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔“

”کیا تو اللہ والا ہے، اس لیے؟“

”نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں تو گناہ گار ہوں۔“

”تو پھر؟“

”میں طبقاتی فرق کی بات کر رہا ہوں، تو بادشاہ کی بیٹی ہے اور میں ایک فرش پر بیٹھنے والا عام فقیر۔“

”فقیر کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے۔“ سائیں نے اسے لاجواب کرنا چاہا۔

”فقیر کا دل سب کے لیے بڑا ہوتا ہے، اپنے لیے کچھ نہیں ہوتا۔“ اس کے جواب پر سائیں خود لاجواب ہو گئی۔ ٹوٹ کر بولی۔

”سادو! میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے؟ کیا شادی گناہ ہے؟“

”شادی سنت ہے اور ہم پر فرض ہے۔ بچی! یہ گناہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے سادو فقیر پہلی بار اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اس کی نرم میٹھی مسکراہٹ نے سائیں کا من مسرت سے بھر دیا۔ وہ بے اختیار کشش محبت سے اس کے قریب سرک آئی اور بے اختیار اس کے بازو پر اپنا سر رکھ دیا۔

”ہم محبت کے جذبے کی قدر کرتے ہیں، لیکن یہ ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ ہماری ذات سے کسی انسان کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچے۔“

”میں آپ کے ساتھ شادی کر کے خوش رہوں گی۔“

حاجی خدا بخش کی زمینیں لگتی ہیں، وہ محکمہ آب والوں کو ہم سے زیادہ آبیانہ دیتا ہے اس لیے..... وارے کا بہت سا پانی اس کے حصے میں چلا جاتا ہے۔“

اس کی بات پر وڈیرے الف خان کے گھنی مونچھوں اور ڈاڑھی بھرے چہرے پر نہر خند مسکراہٹ ابھری۔ پھر پر غرور لہجے میں بولا۔ ”ڈھل (ٹیس) اور آبیانہ تو ہم بھی دیتے ہیں، تھوڑا ہے تو کیا ہوا، دیتے تو ہیں ناں، آئندہ سے ہمیں وارے کا پانی بھی زمیندار حاجی خدا بخش کا نصف ملنا چاہیے۔“

”بابا سائیں! ہم کل ہی پانی کاٹ کر برابر کر لیتے ہیں، بھلا یہ بڑھا خدا بخش ہمارا کیا بگاڑ لے گا، وہ تو خود چار پائی سے لگا ہوا ہے۔“ اس بار اس کے بیٹے وزیر خان نے کہا تو الف خان نے دھیرے سے اپنے سر کو اٹھائی جنبش دی۔

”تم آگ اور پانی کا کھیل کھیل رہے ہو جوان!“ ساون فقیر نے اپنے سامنے موجود خالقو کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ فقیر ہمیشہ تم لوگوں کی بھلائی اور فلاح کی بات کرے گا۔“

جواباً خالقو نے سر اٹھا کے ساون فقیر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تو کیا میں بھلائی کا کام نہیں کر رہا، ایک زندہ درگور اور مجبور عورت سے بیاہ کر کے.....؟“ ساون نے بہ غور اس کے چہرے پر اپنی پر جلال نظریں گاڑ دیں پھر بولا۔

”جس دروازے سے گزر کر یہ کام تم کرنا چاہتے ہو، اس کے ایک ذرا کھٹکے سے تمہارا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ نہ تم زندہ بچو گے نہ نور خاتون۔“

”محبت کی خاطر کوئی نہ کوئی دروازہ تو پار کرنا ہی پڑتا ہے، ملنگ سائیں!“ خالقو بولا۔

”لیکن محبت کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم دانستہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی اور دوسرے کی موت کا سامان پیدا کرو۔“ جگرے میں ملنگ ساون کی آواز ابھری۔

”تو پھر میں اسے کس راستے سے حاصل کروں؟“

”در سے حاصل کرو، اللہ کے در سے۔ اس سے لو لگا لو، پھر وہ جو بہتر کرے اس پر شکر رہو، اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“ ساون ملنگ بولا۔

”میں اب یہاں سے جانا پسند کروں گا۔“ خالقو نے کہا۔

”اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو، مگر میری بات پر غور ضرور کرنا۔“ ساون نے آخر میں اسے دعا دیتے ہوئے تنبیہ بھی

کر ڈالی۔

خالقو درگاہ سے نکل گیا۔ اسے یہ بات شروع ہی سے اچھی نہیں لگی تھی کہ نور خاتون نے اس کا ذکر بابا کالی چادر والے درگاہ کے ملنگ سے کر ڈالا تھا۔

اس سلسلے میں خالقو کا نظریہ مختلف تھا، وہ زور بازو کو سب کچھ سمجھتا تھا کہ یہ طاقت بھی اللہ ہی عطا کرتا ہے، اسے اپنے آپ پر پورا یقین تھا کہ اگر نور نے اس کا ساتھ دیا تو وہ اسے جابر باپ وڈیرے الف خان اور اس کے کارندوں کی پہنچ سے دور لے جائے گا، جس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار نور سے کرتا رہتا تھا مگر نور خوف زدہ رہتی تھی، اگرچہ اسے بھی یہ جی

دار مرد اچھا لگنے لگا تھا جو اس کی خاطر موت تک سے ٹکر لینے کو تیار تھا مگر بات وہی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گیموں کے ساتھ گھنٹی بھی بے، اپنی زندگی تو اس کی ویسے ہی زندہ درگور کر دی گئی تھی، نہیں چاہتی تھی کہ خالقو جیسا جیتا جاگتا نگڑا اور خوش

باش آدمی کسی کڑی آزمائش کی نذر ہو جائے۔ نور خاتون کو اس سلسلے میں ملنگ ساون کی باتیں بھی یاد آئی تھیں، وہ کہتا تھا کہ محبت کو دل کے دروازے سے حاصل کرنے والے اس کی فلاح اور بھلائی کا بھی خیال رکھیں، اللہ کے در پہ سجدہ فیک کے بہتری کی دعا مانگیں، یوں دیوانہ وار جانتے بوجھتے موت کے منہ میں خود کو لے جانا کفر کے زمرے میں بھی آسکتا تھا۔

لہذا ملنگ فقیر ساون کی یہی تعلیمات نور خان کو ازیں بر تھیں اور وہ خالقو کا ساتھ نہ دینے پر مجبور تھی لیکن یہ بھی ایک اہل حقیقت تھی کہ وہ بہر حال ایک عورت بھی تھی، جوان اور صحت مند عورت اس کے سینے میں بھی آگ کو دیکھ کر پیش آتی تھی، احساس محرومی تو ایسی زنجیر ہے جسے آدمی توڑ کے پھینک دینا چاہتا ہے۔

لہذا اب نور خاتون حصوں میں بٹ گئی تھی، ملنگ ساون فقیر کے در پہ جاتی تو پائے استقلال میں ایک ذرا بھی لغزش نہ محسوس کرتی اور جب خالقو ایک محبوب نما اس کا نجات دہندہ بن کے دل کے دروازے سے اندر آنے کی سعی کرتا تو وہ ڈھسے سی جاتی۔ خالقو کے جذبہ دل سے وہ اپنے جذبات کو ممانٹ پانے لگتی۔

وزیر خان اپنے آدمیوں کے ساتھ پانی کی حد بندی والی جگہ پر پہنچا اور پھر اس نے اپنے کارندوں کو زمیندار حاجی خدا بخش کے حصے کا پانی کاٹنے کا حکم دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی، آبی کھالوں میں نیچے اور پھاوڑے چلنا شروع ہو گئے۔ خدا بخش کے ہاری قریب ہی زمین پر کام کر رہے تھے، ان بے

چارے غریبوں کو تو انہیں پانی کاٹنے سے روکنے کی جرأت نہ ہو سکی، البتہ وہ سرپٹ دوڑتے ہوئے اس کی اطلاع دینے حاجی خدا بخش کے یہاں جا پہنچے۔ وہ تو بے چارہ فلاح زدہ مریض کی طرح چار پائی پر اٹھائی کھنوا پیڑے رہتا تھا، البتہ اس کی بیٹی سائیں نے اس بات کا ذکر کیا۔ جوش غیظ سے سائیں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لہذا اس نے بھی اپنے چند مسلح کارندوں کو تیار کیا اور جیب میں سوار ہو کے مذکورہ مقام تک جا پہنچی۔

وہاں وزیر خان بہ نفس نفیس خود کھڑا اپنے سامنے زمیندار حاجی خدا بخش کے حصے کا پانی کاٹ رہا تھا۔ اس کے آدمی بڑی تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔

دفعۃً فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور کام کرتے ہوئے ہاتھ تھم گئے، وزیر خان نے بڑی نوحہ سے فائر کی سمت دیکھا۔ ایک ڈبل ڈور پجیر و قریب کھڑی تھی اور قریب اس کے چار پانچ مسلح آدمیوں کے درمیان میں اسے حاجی خدا بخش کی لاڈلی بیٹی سائیں ہاتھ میں رائفل پکڑے کھڑی نظر آئی۔ جیسے ہی وزیر خان کی نگاہ اس پر پڑی، سائیں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور وزیر خان کے بالکل قریب پہنچ کر وہ سخت برہم لہجے میں اس سے بولی۔

”کیا اب اونچے شملے والے زمینداروں کی حیثیت اتنی کمتر ہو گئی ہے کہ وہ خود کھڑے ہو کر بڑی ڈھٹائی سے پانی کی چوری کروانے لگے ہیں۔“ طنز اور طیش میں سمجھے ہوئے ان الفاظ نے وزیر خان کا چہرہ سرخ کر دیا۔ ایک عورت کے منہ سے اپنے کمداروں کے سامنے ایسی سخت اور طنزیہ بات، کم از کم وڈیرے الف خان کے بیٹے وزیر خان کے لیے کسی طور بھی قابل برداشت نہ تھی، وہ انا، جبر اور مطلق العنانی میں

اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا، آج ایک عورت کی زبان سے جو ضرب اس کی پر غرور، انا اور اکڑفوں پر پڑی تھی، وہ ایسے انسان کو زبان کی بولی کے بجائے بندوق کی گولی سے جواب دینے کا عادی تھا اور ہوا بھی وہی، وزیر خان نے یکنخت اپنے بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال کر چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی سائیں پر تان لیا اور انگلی ٹرائیگر پر تھمکنے لگی۔

”خوب! کیا اب عورتوں پر بھی گولی چلانے کا ایک نیا شیوا اختیار کرنا چاہتے ہو، تو چلاؤ گولی وزیر خان! یہ کھلونا مجھے بھی چلانا آتا ہے۔“ سائیں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اپنی رائفل بھی سیدھی کر لی۔ اب دونوں ایک دوسرے کی گولی کی زد میں تھے کہ اچانک سائیں کے ایک آدمی نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور اچانک وزیر خان کا

پستول والا ہاتھ آہستگی سے نیچے کر دیا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کے مودبانہ بولا۔ ”چھوٹے سائیں! اس جرأت کی معافی چاہتا ہوں، اس غلام کی جان وڈے سائیں (الف خان) اور آپ پر قربان، اس عورت سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ابھی چلیں اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے، میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“

وزیر خان نے پریش نظروں سے سائیں کی طرف آخری بار دیکھا اور زمین پر تھوک کے پستول دوبارہ ہولسٹر میں اڑس لیا اور اس دوران اس شخص نے اچانک سائیں کی رائفل کی ٹال پکڑ کے آہستگی سے نیچے جھکا دی۔ پھر اس کے سامنے آ کے بولا۔

”سائیں! ہم معافی چاہتے ہیں، ہم سے غلطی ہو گئی۔ معاملے پر بات کرنے کے بجائے جھگڑے کی شروعات کر ڈالی۔“ وزیر خان کا غصہ کم نہ ہوا تھا، مگر اس اثنا میں وہی آدمی جلدی سے مودبانہ لہجے میں سائیں سے بولا۔

”بی بی جی! اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، مگر اس میں آپ کی، ہم سب کی بھلائی ہے، اللہ کا واسطہ ابھی چلے چلو یہ مردار خوروں کا غول ہے، ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، بعد میں اس مسئلے کو دیکھ لیں گے، میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“ اس چاکر کا نام سجاد علی تھا، سائیں نے کچھ سوچ کر رائفل جھکا دی۔ پھر اس کے بعد یہ لوگ پلٹ گئے۔

فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ پجیر و میں سوار ہوتی ہوئی سائیں اور اس کے آدمی لمحہ بھر کو ٹھٹکے۔ وزیر خان کے آدمیوں نے فاتحانہ انداز میں ہوائی فائرنگ کی تھی۔

سائیں وغیرہ کے سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے جیب آگے بڑھا دی۔ سب خاموش تھے، چپ کا سفر جاری تھا۔ سائیں کے چہرے پہ ابال کی کیفیت تھی وہ اندرونی طور پر شدید تناؤ کا شکار تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے ان کے حصے کا پانی بڑی ڈھٹائی کے ساتھ کاٹا جا رہا تھا اور ان کے ساتھ چوری اور سینہ زوری والا سلوک بھی روا رکھا گیا تھا۔

مراد علی کے بروقت اقدام نے انہیں اگرچہ ایک بڑی خوف ناک جنگ سے بچالیا تھا، یوں بھی جانی نقصان ان کا ہی ہوتا، وزیر خان کے آدمیوں کے مقابلے میں یہ صرف چند افراد تھے لیکن اس طرح میدان چھوڑنا بھی انہیں بار بار کچوکے لگا رہا تھا، غیظ اور غیرت کی آگ تھی جوان سب کو اندر ہی اندر سلگا رہی تھی، سائیں کا تو معاملہ ہی اور تھا..... باپ خدا بخش پر بڑھا پے اور فلاح کا حملہ ہوتے ہی اس نے یہ عزم صمیم کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے باپ کا بازو بنے گی اور اپنی

جاگیر کے ایک ایک انچ کے ٹکڑے کی نگرانی کرے گی تاکہ کوئی ان پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ چنانچہ تب سے اب تک اس نے سارے معاملے اپنے ہاتھ میں لیے تھے۔ مراد علی اس سلسلے میں سائین کا معاون و مددگار تھا اور مشیر بھی بعض اہم معاملات پر سائین اپنے باپ کے اس خاص آدمی پر بہت بھروسہ کرتی تھی۔

”ہم کدھر جا رہے ہیں اب مراد علی؟“ کافی دیر تک کی پریشانی خاموشی کے بعد سائین نے بارعب لہجے میں اپنے خاص آدمی سے پوچھا۔

”وڈیرے الف خان کی اوطاق، اس سے ملنے تاکہ اس کے بیٹے کی شکایت کر سکیں۔“ مراد علی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کی بات پر سائین کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اسی لہجے میں مراد علی سے بولی۔ ”ایک شیطان کی شکایت دوسرے شیطان سے کرنے کا فائدہ؟“

”یہ محض خانہ پری ہوگی چھوٹی بی بی!“ مراد علی نے مودبانہ متانت سے کہا۔

”ہم سمجھ نہیں۔“ سائین کچھ الجھی گئی۔

مراد علی نے صراحت میں کہا۔ ”بی بی جی! حکم آج آپ پاشی والوں کے ہاں جانے سے پہلے وڈیرے الف کے علم میں یہ بات لانا ضروری ہے کہ اس کا بیٹا اور اس کے گماشتے آخر کس کے ایما پر پانی کاٹنے کا جرم کر رہے ہیں۔“ سائین اس کی بات کا مطلب جان کر چپ ہو رہی۔

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ حتیٰ کہ یہ لوگ وڈیرے الف خان کی اوطاق میں جا پہنچے مراد علی نے سائین سے جیب میں ہی بیٹھے رہنے کی درخواست کی تھی، جسے اس نے رد کر دیا اور چند آدمیوں کے ساتھ، جیب سے اتر کر اوطاق میں داخل ہو گئی۔

اوطاق میں اس وقت چند ہی لوگ تھے، البتہ وڈیرا الف خان اپنے مخصوص موٹہ پر براجمان تھا۔ سائین پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سا گیا۔ سائین سے ابھی وہ واقف نہ تھا مگر زمیندار حاجی خدا بخش کے حوالے سے اس کا نام ضرور سنا تھا، تاہم اوطاق پر تعینات ایک خدمت گار نے اس کے کان میں سرگوشی کر کے اسے سائین کے سلسلے میں آگاہ کر دیا تھا۔

سائین، پروقار چال چلتی ہوئی وڈیرے کے قریب پہنچی تو الف خان یکدم اس کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے ایک بڑی

سی اجرک کی ریشمی چادر الف خان کو تھما دی، جسے الف خان نے فوراً نہایت عزت و احترام کے ساتھ سائین کے سر پر ڈال دیا اور خالص رواجی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر بھی رکھ دیا۔

”اس عزت افزائی کا شکریہ سائین مان دارا..... لیکن افسوس سے مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ میں اس وقت آپ کے بیٹے وزیر خان اور.....“ اس کے بعد سائین نے اپنی شکایت اس کے گوش گزار کر دی، نیز یہ بھی بتا دیا کہ اس کے لاڈلے بیٹے وزیر خان نے اس پر پستول بھی تان لیا تھا۔

سائین اور مراد علی سمیت اس کے چار پانچ آدمیوں کو اس وقت شدید حیرت ہوئی جب وڈیرے الف خان نے ان کی توقع کے برخلاف اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ سب سے پہلے تو وڈیرے الف خان نے انہیں عزت و احترام سے اپنے پاس بٹھایا پھر اسی وقت اپنے خاص آدمیوں کو سخت حکم کے ساتھ اپنے بیٹے وزیر خان کو اپنی اوطاق میں طلب کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ وزیر خان اپنے کارندوں کے ساتھ حیران پریشان سا اوطاق میں داخل ہوا، اور پھر سائین وغیرہ پر نگاہ پڑتے ہی اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

”اڑے تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ بیٹے کو دیکھتے ہی وڈیرے الف خان نے سخت نظروں سے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

وزیر خان باپ کی اس کایا پلٹ پر مزید اچھنبے میں پڑ گیا۔ بولا۔ ”لل..... لیکن..... بابا سائین!“

”اڑے بس کر اب، خبردار جو آئندہ اوڑی سائین کے حصے کا پانی کاٹنے کی کوشش کی تو.....“ وڈیرے الف خان نے برہمی والے انداز میں بیٹے کی بات کاٹ دی، کیونکہ وہ شاید جانتا تھا کہ اس کا بیٹا یہی کہنے والا ہے کہ یہ سب اس کے (الف خان) کے حکم سے ہی تو کیا گیا تھا۔ مگر باپ کے اس طرح یکدم نیچلی بدل لینے پر خود بیٹا وزیر خان بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔

”چل! آگے بڑھ اور اوڑی سائین سے معافی مانگ..... جلدی کر.....“ باپ نے ایک اور حکم دیا۔ ناچار بیٹے کو باپ کی بات ماننا پڑی۔ وہ سائین کی طرف آیا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وڈیرے الف خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی۔ ”بس سائین چاچا! اب اس کی ضرورت نہیں، آپ نے میرا مان رکھ لیا یہی بہت ہے۔ اب ہمیں جانے کی اجازت چاہیے۔“

”ضرور سائین وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جا کر.....“ مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آ کر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ”اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہو گیا ان سے ملے۔“

در اور دروازہ

تھوڑی دیر بعد سائین اپنے کارندوں کے ساتھ جیب میں واپس لوٹ رہی تھی۔

شام کا وقت تھا، دور مغربی افق پر نارنجی ستارے اترنے لگے تھے۔

ایک لمبی چوڑی نئے ماڈل کی انٹرکولرزمیندار حاجی خدا بخش کے مکان سے ملحق اوطاق کے سامنے رکی، وہاں موجود چند ایک خدمت گار گاڑی کو پہچانتے ہی بری طرح بدکے تھے، پھر تو جیسے یہاں سے وہاں بھاگ دوڑی گئی۔ کوئی مکان کے دروازے کی طرف دوڑا تو کوئی اوطاق کے اندر جا گھسا۔ دو ایک وہیں پٹنائے سے کھڑے رہ گئے اور ہونٹوں کی طرح گاڑی کی طرف دیکھنے لگے، شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

کھٹا کھٹ دروازے کھلے، چار قد آور مسلح افراد بڑی تیزی سے نیچے اترے اور نہایت پھرتی کے ساتھ دو افراد نے گاڑی کے دونوں طرف کے بیک وقت دروازے کھولے تھے، دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ اترے تھے۔

یہ وڈیرا الف خان اور اس کا بیٹا وزیر خان تھا۔

الف خان کے مخصوص اشارے پر ایک کارندہ فوراً حرکت میں آیا اور گاڑی کے عقبی حصے سے پھل اور مٹھائی کے دو بڑے بڑے ٹوکڑے نکال لایا۔

وہاں موجود چاکروں نے نہایت مودبانہ انداز میں دونوں باپ بیٹے کا استقبال کیا اور انہیں اوطاق میں لے آئے، ان میں چاکر خاص مراد علی بھی شامل تھا جو وڈیرے الف خان جیسے آدمی کو بہ نفس نفیس موجود پا کر اندر سے حیران بھی تھا اور الجھا ہوا بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا تھا؟ وڈیرا الف خان تو ناک پہ کبھی تک نہیں بیٹھنے دیتا تھا وہ یہاں کیسے آ گیا؟ وہ بھی اپنے جوان بیٹے سمیت۔

”بابا ہمیں حاجی صاحب سے ملنا ہے۔“ وڈیرے الف خان نے مراد علی سے کہا۔

”ضرور سائین وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جا کر.....“ مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آ کر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ”اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہو گیا ان سے ملے۔“

”ضرور سائین وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جا کر.....“ مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آ کر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ”اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہو گیا ان سے ملے۔“

”ضرور سائین وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جا کر.....“ مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آ کر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ”اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہو گیا ان سے ملے۔“

”ضرور سائین وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جا کر.....“ مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آ کر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ”اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہو گیا ان سے ملے۔“

”ضرور سائین وڈا! آپ تشریف رکھیے، میں ابھی جا کر.....“ مراد علی نے جواباً ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک اوطاق میں سائین داخل ہوئی، اس نے بڑی سی اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ قریب آ کر اس نے وڈیرے الف خان کو نہایت احترام سے سلام کیا۔ الف خان نے دست شفقت اس کے جھکے جھکے سر پر رکھا اور بولا۔ ”اوڑی سائین! بابا ہم حاجی صاحب کی خیریت پوچھنے آئے ہیں، بڑا عرصہ ہو گیا ان سے ملے۔“

”ضرور سائین وڈا! آپ نے ہمارے غریب خانے پر پاؤں رکھ کر اس کی روئیں بڑھا دیں، آئیے میرے ساتھ تشریف لائیں۔“ سائین نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد الف خان اور اس کا بیٹا مکان کے اندر ایک ہال کمرے میں تھے، ان کے سامنے بڑی سی موٹی نقشیں پایوں والی مسہری پر اسی پچاسی سالہ انتہائی ضعیف شخص صاحب فراش حالت میں نیم دراز تھا۔ یہ سائین کا باپ حاجی خدا بخش تھا۔ اس کا دایاں حصہ فالج گرنے کے باعث مفلوج ہو چکا تھا تاہم وہ تھوڑا بہت بول اور سن لیتا تھا، مقدور بھر ہاتھوں کو جنبش دینے کی سکت رکھتا تھا۔ اس کی یادداشت بھی اس حد تک ہی متاثر ہوئی تھی کہ اگر کوئی یاد دلاتا تو وہ پہچان لیتا تھا، جیسا کہ اب ہوا، سائین نے باپ کے قریب ہو کے دھیرے سے اسے کان میں بتایا تھا کہ..... وڈیرا الف خان اور اس کا بیٹا وزیر خان ان کی عیادت کو آئے ہیں، یہ سن کر حاجی خدا بخش کے بشرے پر واضح طور پر چونکنے کے آثار نمودار ہوئے تھے، گویا اسے بھی ان کی آمد غیر متوقع لگی تھی۔

وڈیرا الف خان اور وزیر خان نے باری باری حاجی خدا بخش کا ہاتھ تھام کے اسے سلام کیا تھا۔ پھر خدا بخش کے لب مرعش ہوئے۔ ”الف..... خان! تہ..... تمہیں اپنے پاس..... اتنے قریب دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“ اس کی آواز نحیف سی تھی۔

الف خان جلدی سے اس کا ہاتھ دبا کے بولا۔ ”کیوں شرمندہ کرتے ہو بابا حاجی صاحب! آپ کی خیریت پوچھنے کے لیے تو مجھے بہت پہلے آ جانا چاہیے تھا، مگر کیا کروں زمینوں کے مسائل ہی اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اپنی بھی خبر نہیں تھی اور پھر بابا حاجی صاحب! ہمارے یہاں آنے کا ایک مقصد اور بھی ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر ذرا کا ایک نظر قریب کھڑی سائین کی طرف دیکھا پھر بولا۔

”ہم آپ سے معافی بھی مانگنا چاہتے ہیں۔“

”معافی.....؟ کیسی معافی؟“ حاجی خدا بخش ہولے سے کپکپاتا تو وڈیرے الف خان نے ایک نظر سائین پر ڈالی اور نرمی سے بولا۔

”تو نے ابھی تک اپڑیں بابا جانی سے ہماری شکایت نہیں کی؟“

جواباً سائین نے اپنے سر کی چادر درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”چاچا سائین! شکایت کیسی؟ جب آپ نے خود ہی سارا معاملہ حل کر دیا۔“

حاجی خدا بخش حیران پریشان تھا، اس نے بیٹی کی

”ہاں؟“ الف خان بولا۔ ”تب تک تو اس کی بیٹی یعنی اپنی ہونے والی بیوی سائمن کے ناز نخرے اٹھاتے رہنا۔“

”سائمن میری پسند نہیں ہے، میں شاید اس سے زیادہ محبت نہیں جتا سکتا۔“

”دولت حاصل کرنے کے لیے سب کرنا پڑتا ہے، پٹ وزیر! ایک بار زمینوں کا مالک بن جانے دے پھر سائمن کو حویلی کے کسی کونے میں گلے سڑنے کے لیے پھینک دیں گے۔“ وڈیرے الف خان کے مکروہ لہجے میں بڑی سفاکی تھی اور باپ کا منصوبہ جاننے کے بعد بھی بیٹے کے بددیت ہونٹوں پر بھی بڑی کریمہ مسکراہٹ تھی۔

”نہیں بابا جانی! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ سائمن نے باپ کی بات سن کر اٹل لہجے میں کہا۔ ”وزیر خان کس قماش کا آدمی ہے، یہ میں ہی نہیں پورا گوٹھ جانتا ہے اور بابا جانی! وڈیرے الف خان کی خصلت سے تو تو خود بھی ذاتی طور پر واقف ہوگا۔ مجھے تو اس وقت ہی دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا تھا جب دونوں باپ بیٹے مٹھائی اور پھل کے ٹوکے لیے اچانک یہاں آن پہنچے تھے۔“

خدا بخش نے عورت سے بیٹی کی بات سنی، وہ اس کا عندیہ لے چکا تھا، وہ بیٹی پر شادی کے لیے ہرگز دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا تھا، تاہم نجف سی آواز میں بولا۔ ”دھیے! میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میں تو چاہتا تھا تجھے اپنی زندگی میں وداع کر دوں۔“

”بابا جان! ایسی باتیں نہ کریں، اللہ سائمن آپ کو بڑی عمر دے، آپ میری فکر نہ کریں، میں بچی نہیں ہوں، اپنا برا بھلا سب جانتی ہوں اور یہ بھی جان سکتی ہوں کہ کون، کیوں مجھ سے شادی کا خواہش مند ہو سکتا ہے، مگر میں نے سوچ رکھا ہے، شادی کروں گی تو کسی غریب شریف اور سادہ دل انسان جسے میری زمین جامد اداسے نہیں، صرف مجھ سے محبت ہو۔“ یہ کہتے ہوئے سائمن کے تصور میں، ملنگ فقیر ساون کا چہرہ رقصاں ہونے لگا اور وہ اس کے خیالوں کھو گئی۔

خالقو، نور خاتون کے عشق کے جام جم میں سر تا پا غرق ہو چکا تھا، اس پر کوئی نصیحت اور کوئی تنبیہ اثر نہیں کر رہی تھی اور اس کی دیوانگی و فرزاگی سے نور خاتون پریشان تھی، اسے اپنی فکر نہ تھی مگر اس دیوانے کی جان کی طرف سے تشویش زدہ ہو رہی تھی جو اسے حویلی سے لے کر بھاگنے کے لیے پرتولے

طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھا تو سائمن نے باپ کو پانی کی چوری سے متعلق ساری بات گوش گزار کر دی۔

”ارے الف خان! یہ بھی بھلا کوئی معافی مانگنے والی بات ہوئی، جب تو نے خود ہی ہماری دمی (بیٹی) سائمن کا بڑا بن کر اٹا اپنے بیٹے وزیر خان کو ڈانٹ دیا تو..... وزیر خان ہمارا بھی بیٹا جیسا ہے تو ہمارے لیے بھی حق چھوڑ کہ اس نالائق کے کان کھینچیں۔“ یہ کہتے ہوئے خدا بخش نے باپ کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے وزیر خان کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا جھکا ہوا سر حاجی خدا بخش کے قریب کر دیا۔ جس پر حاجی خدا بخش نے اپنا دست شفقت گھما دیا۔

”بس! سائمن مان وارا خدا بخش صاحب! وڈیرا الف خان جھٹ سے بولا۔ ”اب اس نالائق کو آپ اپنی فرزندگی میں لے لو..... یہی میری خواہش ہے۔ سائمن جوان دمی ہے، کب تک بٹھائے رکھو گے۔“

وڈیرے الف خان کی بات پر خدا بخش کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ خود سائمن کم صدمی ہو گئی۔

”کیا کوئی اعتراض ہے تجھے بابا خدا بخش! یا میرے بیٹے وزیر خان میں کوئی کمی ہے؟“ الف خان اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ اس اثنا میں سائمن نے وہاں کھڑے رہنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

”شرما گئی پگلی.....“ باپ نے ہنستے ہوئے کہا۔ لوہا گرم دیکھ کر وڈیرے الف خان نے بیٹے کو اشارہ کیا۔ وزیر خان نے فوراً چاکر کو حکم دیا۔ چاکر مٹھائی اور پھل کے ٹوکے سنبھالے آگے بڑھا اور بڑی آہستگی سے حاجی خدا بخش کی مسبری کے قریب رکھ دیے۔

”اس کی کیا ضرورت تھی یا رالف خان!“

”یار بھی کہتا ہے اور تکلف بھی برتا ہے۔“ الف خان اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ”مجھے فوراً تاریخ چاہیے، میں نہیں چاہتا یہ نالائق مزید آوارہ ہو جائے، سائمن بیٹی اس کی ناک میں نیل ڈال کے رکھے گی۔“

”ارے نہیں..... نہیں، بابا الف خان! پٹ وزیر خان تو ہمارا ہونا اور اچھا لڑکا ہے، بس ذرا جوانی کا نشہ ہوتا ہے، ہم پر بھی تو کبھی یہ نشہ چڑھا تھا، یاد نہیں ہے، فصلوں کی بٹائی پر ہم دونوں کس بری طرح سے لڑے تھے۔“

”ہاں! یاد ہے، خدا بخش! بس۔۔۔ گھم گھم گھم ہونے کی دیر تھی۔“

حاجی خدا بخش اپنی سادگی سے مار کھا رہا تھا اور

علحدہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خالقو کے والہانہ پن، محبت کی دیوانگی اور بے لوث چاہت نور خاتون کے خستہ دل میں بھی گھر کر چکی تھی اور وہ اس کی بے قراری، بے چینی اور دیوانہ وار راہ پر خوار کی جانب پیش قدمی کے لیے بے صبری برداری بھی جاری تھی۔

”ٹھوڑا ٹھہر جاؤ، میں کچھ ضروری سامان اٹھا لوں۔“ بالآخر نور خاتون نے کہا اور خالقو کے چہرے پر خوشیوں کے چراغ روشن ہو گئے، وہ وہیں سنان راہداری میں ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ نور کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

حویلی کے بلند و بالا درو دیوار پر شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ اوطاق میں موجود کچھ لوگوں کے وقفے وقفے سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں، وہاں روشنی بھی تھی۔ حویلی کے اندر البتہ عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔

خالقو ایک کونے میں کھڑا تھا، ابھی سردست اس نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ اسے کسی قسم کا خوف محسوس ہوتا۔ اچانک وہ ایک کھٹکے کی آواز پر چونکا۔

”اُوئے خالقو! تو ادھر کھڑا کیا کر رہا ہے؟“ ایک گرج دار آواز سنان راہداری میں ایک سرے سے دوسرے سربیک گونج گئی، خالقو بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ تک چڑھی روشا تھی، وڈیرنی کی خاص خدمت گار۔ منہ پھٹ اور منہ چڑھی، پکی عمر کی بھی اور غیر شادی شدہ بھی، اس کا لہجہ ہمیشہ روکھا ہوتا تھا، خود ملازمہ ہوتے ہوئے حویلی کے ملازمین پر ہر وقت حکم چلاتی رہتی تھی۔ موٹی اور کالی سی تھی، شکل سے ہی مرد مار نظر آتی تھی۔ مرد نوکروں کو بھی جوتے کی نوک پر رکھتی تھی، سب اس سے ڈرتے تھے، یہ وڈیرنی کو شکایت لگانے میں دیر نہیں لگاتی تھی اور اسی لیے حویلی کے تقریباً سبھی چاکر نوکر اس سے دبتے تھے۔

یہی سبب تھا کہ اس جیسی ڈھنڈور جی عورت کو ایسے نازک وقت میں دیکھ کر خالقو کی جیسے روح ہی فنا ہو گئی، اس کا جی تو چاہا کہ اس موٹی کالی ڈائن کی گردن ہی مروڑ ڈالے، مگر یہ آسان نہ تھا۔

”وہ..... میں..... ایسے ہی، وزن پاڑیں کرنے کا سوچ رہا تھا، یہ کونا مجھے اچھا لگا تو آکر کھڑا ہو گیا۔ کوئی کام مجھ سے؟“ خالقو نے بات بنائی، نوکروں چاکروں کا حویلی کے دور افتادہ کونوں کھدروں میں نشہ، بیڑی اور چرس بھنگ چھپ چھپ کے پینا عام بات تھی، اس لیے خالقو کی بات مانی عجیباں پر کارگر ثابت ہوئی، مگر ایک مشکل ضرور جان کو آگئی، مانی عجیباں نے ہاتھ بڑھا دیا اور بڑے ٹھسے دار لہجے میں

بولی۔ ”لا مجھے بھی ایک بھنگ کی بوٹی دے۔“ خالقو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”بھنگ تو نہیں ہے میرے پاس اماں!“

”تو پھر یہاں چوروں کی طرح کھڑا کیا کر رہا ہے؟“ مانی عجیباں نے تیوری پہل ڈال کے پوچھا۔

”کاسو کا انتظار کر رہا تھا، وہ ابھی آنے کا کہہ کر گیا تھا۔“ خالقو نے جلدی سے بہانہ بنایا۔

”اچھا..... اچھا، لے آئے تو مجھے بھی تھوڑی بوٹی (بھنگ) چکھا دینا۔“ وہ ہاتھ نچا کے بولی اور ایک طرف کو چلی گئی۔ خالقو نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر وہ مانی عجیباں کی آنکھوں میں ابھرنے والے تشکیک کے سائے بھانپ چکا تھا، صاف لگتا تھا کہ اسے خالقو کی طرف سے کوئی کرید پڑ گئی تھی۔ خالقو نے خود کو تسلی دی، ابھی تھوڑی دیر میں نور اپنا ضروری سامان سمیٹ کے آجائے گی پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس منحوس جگہ کو خیر آباد کہہ دیں گے۔

نور آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بچی تھا۔ ہوتے تھی، اس پر چادر تھی، اسے اپنے ساتھ مائل بہ رخصت پا کر خالقو کا دل مسرت و شادمانی سے بھر گیا مگر جب اس نے مدھم سی روشنی میں نور کا اداس چہرہ دیکھا تو چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

”یہ کیا نور؟ تم روتی ہو؟“ اس نے ملاحت آمیزی سے پوچھا۔

”ہاں خالقو!“ وہ سسک کے دھیرے سے بولی۔ ”ہتا نہیں ہمارا انت کیا ہو؟ ہمارا کیا انجام ہو؟“

”اللہ سامیں بہتر کرے گا، میرے ہوتے ہوئے کیوں فکر کرتی ہو، تم دیکھنا ہم بہت جلد اس منحوس جگہ سے بہت دور چلے جائیں گے اور خوشیوں اور محبت بھری زندگی کی ابتدا کریں گے۔“ اس کی بات پر نور نے زیر لب کچھ دعائیہ کلمہ ادا کیا تھا۔ پھر اس کے بعد دونوں آگے بڑھے۔ ان کا ارادہ حویلی کے عقبی چور دروازے سے باہر نکلنے کا تھا، باہر شام رات میں ڈھلنے والی تھی۔

یہ دونوں جب راہداری سے نکل کے حویلی کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے تو انہیں خبر نہ ہو سکی تھی کہ ایک خفیہ آڑ سے دو خراٹ آنکھیں ان کی چور پیش قدمی کو گھور رہی تھیں، یہ مانی عجیباں تھی، جس کا ماتھا پہلے ہی خالقو کے انداز و اطوار کو دیکھ کر ٹھنک گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

پھر جیسے ہی خالقو اور نور حویلی کے اس چور دروازے سے باہر نکلے، مانی عجیباں نے شور مچا دیا۔

در اور دروازہ

خود بھی اپنے منہ میں ڈالتی جاتی تھی۔ بہر طور فارغ ہونے کے بعد سائمن کی عادت تھی کہ سونے سے پہلے در و دروازے اچھی طرح چیک کر کے سوتی تھی۔

دفعتاً دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ وہ بری طرح ہنسی، رات ہو چکی تھی، باہر گلی میں تاریک سناٹا تھا۔ ”اس وقت کون ہے؟“ وہ زیر لب بڑبڑائی، گھر میں دو ایک ملازم تھے، وہ جا چکے تھے۔ مکان سے ملحق اوطاق میں بھی کوئی نہ تھا۔ چونکہ ارشاد کی کوئی کھدرے میں ہوگا۔ ایک بار پھر دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا، اس بار سائمن نے اندازہ لگایا کہ آنے والا نہ صرف غلٹ میں تھا بلکہ کسی مصیبت میں بھی محسوس ہوتا تھا۔ وہ دروازے کے قریب آئی، بہ آواز بلند پوچھا۔

”کون ہے؟“ ”خ..... خدا کے لیے جلدی دروازہ کھولو، ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔“ باہر سے ایک گھبراہٹ ہوئی مردانہ آواز ابھری، مگر سائمن نے دروازہ نہ کھولا۔

پوچھا۔ ”مگر تم کون ہو؟ اور کس نے تمہاری جان کو خطرے میں ڈال رکھا ہے؟“

”ادی! اللہ سامیں کا واسطہ دروازہ کھول دو، ہمیں پناہ کی ضرورت ہے، میں..... میں وڈیرے الف خان کی بیٹی نور خاتون ہوں۔“ اس بار نسوانی آواز ابھری اور پھر سائمن نے دروازہ کھولنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

صبح تک حویلی میں زبردست کھرام مچ گیا تھا۔ وڈیرے الف خان اور اس کے بیٹے وڈیر خان کی مارے طیش و غضب کے بری..... حالت ہو رہی تھی، یہ معمولی بات نہ تھی، الف خان کی بیٹی ایک معمولی نوکر کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور ابھی تک وہ دونوں مفروز تھے۔

اوطاق میں سارے کارندے دست بستہ سر جھکائے ناکامی کی تصویر بنے کھڑے تھے اور دونوں باپ بیٹے ان سب کے بری طرح لتے لے رہے تھے، پھر کسی کارپرداز خاص نے ڈرتے ڈرتے یہ مشورہ دیا کہ اس طرح وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کھوجی رحمو خان سے ”بہرے“ اٹھوائے جائیں (قدموں کے نشان تلاش کیے جائیں) لہذا اس تجویز پر فوری عمل کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔

سائمن نے بڑے غور سے ان کی بات سنی تھی اور پھر

”ارے کوئی ہے، پھر تھی ویو (غضب ہو گیا) وہ دو نکلے کا چاکر خالقو پڑیں نور کو لے گیا بھگا کے..... اٹھو پکڑو، ورنہ وڈاسائیں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

مانی عجیباں کے اس طرح شور مچانے اور چلانے سے جیسے پوری حویلی میں زلزلہ بپا ہو گیا۔ یہاں سے وہاں، خالقو اور نور خاتون کی ڈھنڈیاں پڑ گئی۔

اس منحوس شور کی آواز نیکر کے جنگل کی طرف بھاگتے ہوئے، خالقو اور نور کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ نور کا چہرہ یکدم فح ہو گیا تھا، خالقو بھی پریشان ہو گیا تھا، وہ نیل گاڑی میں سوار تھے، خالقو نے چابک تمام کر دونوں بیلوں کو زور زور سے ٹسکارنا شروع کر دیا۔

”وہ..... وہ..... لوگ ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔“

بیلوں کی راسیں تھامے ہوئے خالقو کو اپنے عقب سے نور کی خوف سے کپکپاتی آواز سنائی دی۔ پھر اس سے پہلے کہ خالقو نور سے تسلی کے دو بول کہتا۔ اچانک عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ بے اختیار نور کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ خالقو نے پریشان ہو کے عقب میں ذرا دور دیکھا۔ لوگوں کا مختصر گردہ ہاتھوں میں لاشیں اور جلتی مشعلیں لیے ان کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔

”اب کیا ہوگا، خالقو؟.....“ نور نے سرا سیمہ آواز میں کہا۔ مگر خالقو کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے پل کے پل سوچا۔ بھاگنے سے دشمنوں کے ہتھے چڑھ جانے کا خطرہ تھا، کیونکہ وہ بہر حال دیکھ لیے گئے تھے اور ان کے فرار کا بھانڈا ابھی پھوٹ چکا تھا۔ کوئی دم کو وڈیرے کے سفاک حواری تیز رفتار گاڑی میں انہیں چھاپ سکتے تھے، چنانچہ خالقو نے فوراً نیل گاڑی کا رخ آبادی کی طرف موڑ دیا۔

وہی ہوا، تھوڑی دور تک ہی گئے تھے کہ عقب سے کسی گاڑی کی دو ہیڈ لائٹس نظر آنے لگیں۔

ایک گلی میں داخل ہوتے ہی، خالقو نے نیل گاڑی روک دی اور نور کا ہاتھ پکڑے نیچے اترا پھر ایک سمت تاریکی میں دوڑ لگا دی۔ گاڑی کے انجن کی گھر گھرائی آواز لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

سائمن نے باپ کو دودھ کا گلاس تھمایا اور اپنے سامنے اسے پلایا بھی۔ ورنہ مسہری کے قریب دھری تپائی پہ پڑا رہ جاتا تھا۔ رات کا کھانا باپ بیٹی نے مل کے کھایا تھا۔ سائمن اپنے ہاتھ سے نوالے توڑ توڑ کے باپ کو بھی کھلاتی جاتی اور

یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کس قدر خطرناک کام تھا، وہ ان دونوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، بولی۔
”یہ اچھا ہی ہوا کہ تم دونوں ادھر نکل آئے، ورنہ کم از کم شاید اس گوتھ میں تم دونوں کو کوئی پناہ نہ دیتا، بلکہ الٹا الف خان کے حواریوں کے حوالے کر دیتا۔“

”ہاں! ادی سائین! ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے، بس! ہمیں کسی طرح گوتھ سے فرار ہونے کا بندوبست کر دیں۔“ خالقو نے سائین کی طرف ہتھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ نور ابھی تک گم سم اور سراپہ سی بیٹھی تھی حالانکہ سائین نے اسے تسلی دینے کی بھی کوشش کی تھی۔
”لیکن میں تم دونوں کو زیادہ دیر اپنے ہاں پناہ نہیں دے سکتی، یہ بہت حساس اور نازک مسئلہ ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ تم دونوں کو ابھی تو میں بھی نہیں یہاں سے جانے دوں گی، الف خان کے حواری تمہارے خون کی بوسوٹھتے پھر رہے ہوں گے۔“

کمرے میں چند ثانیوں کے لیے دم بہ خودی خاموشی طاری رہی پھر اس کے بعد سائین نے ان دونوں کو اپنے گھر کے تہ خانے میں لے جا کر چھپا دیا۔

باہر سپیدہ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ کھوجی رحمو خان ایک پچاس پچپن سالہ دبلا پتلا مگر اپنے کام میں بڑا گھاگ اور تجربے کا رتھا، گوتھ میں کسی کی بکری یا بھینس چوری ہو جاتی تو چور کے قدموں کے نشانات ڈھونڈنے کے لیے اسی کی خدمات لی جاتی تھیں۔ چوروں کے لیے یہ مقامی زبان میں ”پڑی“ کہلاتا تھا، یعنی ان کا علاج تھا یہ۔

کھوجی رحمو خان کے ساتھ بہ نفس نفیس وڈیرا الف خان اور وزیر خان بھی تھے۔ رحمو خان نے جلد ہی ان پر یہ انکشاف کر کے سنسنی پھیلا دی کہ خالقو اور نور ابھی تک اس گوتھ میں ہی کہیں پناہ لیے ہوئے ہیں اور گوتھ سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

اس اعلان کی دیر تھی کہ فی الفور گوتھ کی ناک بندی کر دی گئی، پیروں کی تلاش جاری تھی اور بالآخر یہ سب لوگ زمیندار حاجی خدا بخش کے مکان کے سامنے جا پہنچے۔
”سائین وڈا! آپ کے دونوں شکار اسی گھر میں موجود ہیں اور ابھی تک یہاں سے نہیں نکلے ہیں۔“ بالآخر کھوجی رحمو خان نے دست بستہ عرض کی اور باپ بیٹا ایک دوسرے کا منہ ٹکٹے لگے، اگر کسی اور کا یہ گھر ہوتا تو اب تک یہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نذر ہو چکا ہوتا مگر یہاں ان دونوں باپ بیٹے کا اپنا مفاد تھا۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی، دونوں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پھسری۔ پھر اپنے کچھ حواریوں کو خفیہ طور پر یہاں تعینات کر کے کڑی ہدایات بھی دیں اور اسی طرح واپس لوٹ آئے۔

”بابا سائیں! کیا ہم نے اس طرح واپس لوٹ کے شیک کیا؟“ حویلی آکر وزیر خان نے باپ سے پوچھا۔
”ہاں!“ الف خان نے مختصراً مگر گہرے لہجے میں کہا۔

”مگر بابا سائیں! ہمارے پاس یہ سنہری موقع تھا..... شکار حاجی خدا بخش کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھا، ضرور اس کی بیٹی سائین نے ہی یہ حرکت کی ہوگی، ہم اس طرح اپنا شکار ان کے گھر سے برآمد کر کے ان پر بہت سی باتوں کے لیے دباؤ بھی ڈال سکتے تھے، بہت سے مطالبات بھی منوا سکتے تھے۔“

”تمہاری بات صحیح ہے پٹ وزیر خان!“ باپ الف خان نے بیٹے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے بڑی اسرار بھری مسکراہٹ تھی۔ ”جب تک شکار وہاں موجود ہے، موقع ہمارے ہاتھ میں ہی رہے گا، ہم اب دراصل ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔ شکار کی طرف سے بے فکر رہو، وہ اب کہیں نہیں جاسکتا، اس کے ساتھ اب چوہے بلی کا کھیل کھیلیں گے مگر اس طرح کہ ہماری پانچوں انگلیاں گھٹی میں اور سر کڑھائی میں ہوں۔“

وزیر خان شاید باپ کی دہرے فائدے والی اس جال کو سمجھ رہا تھا کیونکہ اب اس کے چہرے پر بھی معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

زمیندار حاجی خدا بخش کی کوئی زینہ اولاد نہ تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی سائین نے اسے آج تک کسی بیٹے کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔ وہ باپ کے ساتھ رہتی تھی، جہاں وہ جاتا جو کام کرتا، حتیٰ کہ زمینوں کے معاملات سے لے کر شہر کے دفتری امور، محکمہ آب سے ڈینک، منڈی میں اناج کی فروخت، کارندوں سے کام لینا غرضیکہ وہ سب کچھ اس نے اپنے زمیندار باپ کے ساتھ رہتے ہوئے سیکھا تھا اور کیا بھی تھا۔

یہی سبب تھا کہ سائین باشعور اور سمجھدار تھی، نازک معاملات کو کیسے ہینڈل کیا جاتا تھا، وہ سب جانتی تھی۔ یہی نہیں، بلکہ پس پردہ یا آنے والے وقتوں میں کسی معاملے

در اور دروازہ

کے کیا نتائج نکل سکتے تھے، وہ اس کا ادراک بھی پہلے سے رکھتی تھی۔

یہی سبب تھا کہ جب وڈیرے الف خان نے اس کے باپ سے اپنے بیٹے وزیر خان کے لیے اس کا ہاتھ (رشتہ) مانگا تھا تو سائین فوراً اندر سے کھسک گئی تھی، خوب صورت تو خیر وہ تھی، اسے کوئی بھی پسند کر سکتا تھا لیکن جہاں تک وزیر خان کی پسند کا معاملہ تھا، وہ محض پسند کرنے تک ہی محدود نہ تھا، وہ ایک نمبر کا عیاش انسان تھا، کوئی بھی خوب صورت عورت اس کے لیے محض دل کا بہلاوا تھی۔ مگر سائین کے نسوانی وجدان نے اسے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ دونوں باپ بیٹے یعنی الف خان اور وزیر خان کی ان کی زمینوں پر نظر ہے، دونوں اسے مردار خور گدھ کی طرح نظر آتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ سائین نے باپ سے صاف صاف کہہ ڈالا تھا کہ اسے یہ رشتہ ہرگز منظور نہیں اور منظور ہو بھی کیسے سکتا۔ وہ تو پہلے ہی کسی کو دل دے بیٹھی تھی۔

چنانچہ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس نے موجودہ نازک حالات میں تجزیہ کیا تو اسے بہت سی متوقع ہولناکیوں کے ظہور پذیر ہونے کا خطرہ نظر آنے لگا۔

الف خان کی بیٹی اور وزیر خان کی بہن نور کو اس نے اپنے ہاں خفیہ پناہ دے رکھی تھی جو حویلی کے معمولی نوکر خالقو کے ساتھ بھاگی تھی، گویا دونوں ہی واجب القتل قرار دیے جاسکتے تھے مگر سائین کو اس خدشے کا بھی احساس تھا کہ..... ان کو پناہ دینے کا مطلب اس کی پراندیش سوچ سے زیادہ خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ اگر الف خان یا وزیر خان کو حقیقت کا علم ہو جاتا تو وہ اس پر شادی سمیت اور بھی بہت سی باتوں کا دباؤ ڈال سکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ یہاں کوئی بھی کسی کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ جاگیر داری نظام تھا اور فیصلوں کی تکرار عموماً ناداروں مجبوروں یا کمزوروں پر ہی گرتی تھی اور پھر یہ معاملہ تو کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ گوتھ کے ایک بڑے اور بااثر زمیندار وڈیرے الف خان کے گھر کا تھا۔

لیکن..... ان سب خطرات، خدشات اور متوقع ہولناکیوں کے باوجود، سائین نے ان دونوں دیوانوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی وجہ سمجھ میں آنے والی تھی کہ سائین کا اپنا دل بھی تو کسی کا دیوانہ تھا۔

وہ دن خیریت سے گزر گیا، دوسرے دن رات کو سائین کا ارادہ ان دونوں کو خاموشی سے اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر لے جانے کا تھا وہاں بھی وہ ان کی مکمل سپورٹ کرنا

منگنی سے چند لمحوں قبل دوستوں نے تاج محمد کو دیکھا کہ انتہائی پریشان ہیں چہرا اترا ہوا ہے۔ پسینوں پر پسینے آ رہے ہیں۔
پوچھا: کیا بات ہے دوست؟ تم نے منگنی کی انگوٹھی تو نہیں کھو دی؟
”نہیں!“ تاج محمد آنسو نے جواب دیا: ”میرا جوش و خروش کھو گیا ہے۔“

کلاسیکل بے عزتی

ایک لڑکا سائیکل پر جا رہا تھا۔ سائیکل کا ٹائر بھینس کے گوبر کے بیچ میں سے گزر گیا، قریب کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ انہوں نے تالیاں بجا کر کہا۔ ”پتی برتھ ڈے ٹویو۔ لڑکا رکا اور بولا“ ”دش کرنے سے کام نہیں چلے گا ایک تو کھانا پڑے گا۔“

☆☆.....☆☆

گرلز آروی ری اسمارٹ

گرل۔ ”اورنج کاریٹ کیا ہے؟“
اورنج والا۔ ”100 کے 10“
گرل۔ ”کچھ کم کرونا پلیز!“
اورنج والا۔ ”اچھا آج 80 کے آٹھ لے لو۔“
گرل خوشی سے۔ ”تھینکس.....“ یہ ہوئی نہ بات..... دے دو۔“

☆☆.....☆☆

قابلیت

باپ: ”پپر کیسا ہوا؟“
بیٹا: ”ایک سوال رہ گیا دوسرا انہیں رہا تھا..... چوتھا کرنا بھول گیا پانچواں نظر نہیں آیا۔“
باپ۔ ”باقی تین سوالات؟“
بیٹا۔ ”صرف وہی غلط ہوئے ہیں۔“

مراسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور

جوتے میں پانی

میزبان، مہمان سے۔ ”اپنے بیٹے کو سمجھائیں وہ میری ٹوپی میں پانی لارہا ہے۔“
میزبان۔ ”ارے وہ تو میرا بھتیجا ہے۔ میرا بیٹا تو وہ ہے جو آپ کے جوتے میں پانی لارہا ہے۔“

☆☆☆

حادثہ

ایک محترمہ نے اپنی سہیلی سے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”شکیلہ میں نے سنا تھا کہ تمہارے شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ یہ حادثہ کب اور کہاں پیش آیا تھا؟“
شکیلہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں تمہیں تو پتا ہے کہ میرے شوہر پر دھیس ہیں۔ ہوائیوں کہ انہوں نے ایک کھلے مین ہول میں پہلے سگریٹ پھینکا اور پھر عادتاً جوتے کی نوک سے اسے بجھانے کی کوشش کی۔“

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

باتوں سے خوشبو آئے

☆ بیٹیاں اور مردہ مچھلیاں اسٹور روم میں غیر معینہ مدت تک رکھنے کی چیزیں نہیں۔ (انگریزی مقولہ)
☆ جو بیٹیوں کا باپ ہے وہ ایک خاندان کا مالک ہے اور جس کے بیٹے ہیں اس کے لیے اجنبیوں کا مجمع انتظار کر رہا ہے۔ (چیکو سلواکیہ کی کہات)

☆ جس کی بیٹی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہوتی ہے تو اسے بیٹا مل جاتا ہے ورنہ وہ بیٹی کو بھی کھودیتا ہے۔ (کولز)

☆ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو لیکن بیٹی تمام عمر کے لیے بیٹی ہوتی ہے۔ (فلر)

☆ بیٹی کی شادی میں سب سے دگھی ہنسی باپ کی ہوتی ہے۔ (ہومر)

☆ نافرمان بیٹی ناقابلِ اصلاح بیوی ہوتی ہے۔ (فرینک لن)

مرسلہ: ماہا ایمان..... حافظ آباد

نہیں کیا تھا۔“

”تو پھر کیا وجہ تھی انکار کی؟“

”یہ بتانا ضروری تو نہیں ہوتا۔“ سائمن نے اس بار الف خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”لیکن میں آپ لوگوں کی دل سے عزت اور احترام کرتی ہوں مگر کچھ ذاتی معاملات میں سمجھوتا نہیں کیا جاسکتا، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ابھی شادی کا سوچا تک نہیں ہے، میرے بابا جانی کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ایسے میں، میں انہیں کس طرح تنہا چھوڑ کے اپنا گھر بسا سکتی ہوں۔“

”یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“ اس بار وزیر خان نے سائمن سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ ”شادی کے بعد حاجی صاحب کا پورا پورا خیال رکھا جاسکتا ہے۔“

سائمن کو وزیر خان کا درمیان میں یوں ناقطعی ناگوار گزرا تھا، جس کا اظہار اس نے اسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے براہِ راست اس کے باپ الف خان کی طرف دیکھ کر کیا۔ ”ایک عورت ہونے کے ناتے میں اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ مجبوری کی حد تک جتنی بات ہو سکی اسے کافی سمجھیں، یوں بھی میرے انکار کے بعد یہ موضوع اب ختم ہو جانا چاہیے۔“

سائمن کے اس مسکت جواب پر دونوں باپ بیٹے کی ناک بھوں چڑھ گئیں۔ پھر الف خان نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

”موضوع تو اب یہ کسی فیصلے پر پہنچ کر ہی ختم ہوگا۔ کیونکہ الف خان کے بیٹے سے رشتے پر انکار پر تمہارا غرور بہت جلد خاک میں مل جائے گا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اب تک تم کو بھی اس بات کا پتا چل چکا ہوگا کہ ہمارے یہاں آنے کا اصل مقصد کیا تھا۔“

سائمن نے محلِ مزاحی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”شاید نہیں، آپ بتادیں۔“

”خوب! تمہارے اس انجانے پن کی داد دینی پڑے گی۔“ وزیر خان نے اس کی طرف دیکھ کر زہریلے طنز میں کہا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں تمہارے بابا جانی سے گفتگو میں مصروف ہوں اور تم نے دروازے کے پیچھے کان لگا کے سب سن لیا ہو۔“

سائمن کو خفت سی محسوس ہوئی، اس کا چور پکڑ لیا گیا تھا مگر وہ سنہلے ہوئے بات بنا کے بولی۔ ”ظاہر ہے ہر لڑکی اپنے مستقبل کے بارے میں ہونے والی باتوں پر نہ صرف کان بلکہ نظریں بھی رکھتی ہے۔“ اس نے اب بھی دانستہ تجاہل

اس گونج سے ہی نہیں نکل سکا ہے اور اب ہماری معلومات کے مطابق ان دونوں کو آپ نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے، کیا یہ سچ ہے؟“

وڈیرے الف خان نے خاصے سنسنی خیز انداز میں اپنی بات کا اختتام کرتے ہوئے آخر میں خدا بخش کے جھروں بھرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

حاجی خدا بخش کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اختلاجِ قلب کے سے آثار اس کے چہرے سے مترشح ہونے لگے، اس کی سانسیں یکدم تیز تیز چلنے لگیں۔ اس پر تیزی تنفس کے ساتھ شدید کھانسی کا دورہ بھی حملہ آور ہوا تھا۔ دروازے کے عقب میں سر تا پا ساعت بنی کھڑی سائمن سے اپنے بوڑھے بیمار باپ کی یہ حالت چھپی نہ رہ سکی اور وہ فوراً کمرے میں داخل ہو گئی۔

الف خان اور وزیر خان اسے یکدم کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے، پھر دونوں باپ بیٹے نے معنی خیز انداز میں بیک وقت اپنے سروں کو جنبش دی تھی۔

سائمن باپ کو سنبھالنے لگی، وہ خاصی پریشان اور متوحش سی نظر آنے لگی تھی، ساتھ ہی اس نے کسی خدمت گار ملازمہ کو بھی چلا کے پکارا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حاجی خدا بخش کی حالت کچھ سنبھل تو گئی، مگر وہ بات کرنے کے قابل نہ رہا تھا، اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

”بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اگر کوئی ایسی ضروری بات ہے تو آپ مجھ سے کر سکتے ہیں؟“ سائمن نے دونوں باپ بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کا لہجہ معذرت آمیز تھا۔

الف خان کے چہرے پر درشتی عود کر آئی تھی۔ وہ اسی عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، پھر سائمن کے چہرے پر نظریں جما کے بولا۔

”تم نے ہمارے بیٹے سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے؟“

”کیا بابا جانی نے آپ کو اس بارے میں ابھی جواب نہیں دیا تھا؟“ سائمن نے محتاط لہجہ اختیار کیا۔

”بتا دیا تھا، کیا ہمارے بیٹے میں کوئی خرابی ہے؟“

الف خان نے اکھڑے لہجے میں دریافت کیا تو سائمن نے ایک نگاہ اٹھا کے باپ کے ساتھ کھڑے وزیر خان پر ڈالی، پھر بولی۔

”میں نے کسی خرابی کے باعث اس رشتے سے انکار

چاہتی تھی مگر مسئلہ یہاں سے انہیں رازداری کے ساتھ نکال لے جانے کا تھا۔

سہ پہر کے وقت حاجی خدا بخش کی قیام گاہ کے سامنے ایک بھاری بھر کم انٹرکولر اور پتھر وچھیں آن رکیں، ان میں وڈیرے الف خان اور وزیر خان موجود تھے، باقی ان کے مسلح حواری۔

اندراں کی آمد کی اطلاع دی گئی تو سائمن کا دل دھک سے رہ گیا۔ ممکن تھا وہ اس کے رشتے کے سلسلے میں، اس کے باپ سے عندیہ لینے آئے ہوں، اس نے سوچا، تاہم اس نے اپنے حواسوں پر قابو پایا، سر کی چادر درست کی اور چند خدمت گاروں کے ساتھ ان کا استقبال کیا، دونوں باپ بیٹے کو حاجی خدا بخش سے ملوایا گیا۔

رسمی سلام دعا کے بعد حاجی خدا بخش نے اپنی بیٹی سائمن کی طرف سے دونوں باپ بیٹے کو انکار کا عندیہ دے ڈالا۔ ”یہ معاملہ بعد میں دیکھیں گے، حاجی صاحب!“

دفعتاً الف خان نے اکھڑے ہوئے لہجے میں خدا بخش سے کہا۔ ”ہم دراصل ایک اور مسئلے کے لیے آئے تھے۔“

”کیسا مسئلہ.....؟“ حاجی خدا بخش نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔ سائمن اس وقت کمرے کے دروازے کے عقب سے کان لگائے کھڑی تھی اور اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

”مسئلہ بہت نازک اور حساس نوعیت کا ہے جو آپ کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ نے ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو.....“ وڈیرے الف خان کے جھٹکے دار لہجے میں لرزہ دینے والی دھمکی پوشیدہ تھی۔ تاہم اس بات پر حاجی خدا بخش کے چہرے پر شکنوں کا جال سا ابھرا، بولا۔

”ایسی کیا بات ہو گئی ہے، الف خان! جو میرے علم میں نہیں ہے، کچھ پتا تو چلے۔“ دروازے کے عقب میں کان لگائے کھڑی سائمن کا ماتھا ٹھک گیا تھا۔ وہ جیسے اب سر تا پا ساعت بن گئی تھی۔ وڈیرے الف خان نے ایک نظر اپنے ساتھ بیٹھے بیٹے پر ڈالی پھر ایک گھبرسی ہنکاری خارج کر کے بولا۔ ”غیرت، عزت اور اپنی روایتی شان کی خاطر ہم اپنی اولاد تک کو بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں۔ جان بھی لینی پڑ جائے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے ہیں۔ ہماری بیٹی کو ایک بد بخت شخص درغلا کے لے گیا ہے، خالقو نام ہے اس بد ذات کا، اس نے تو خیر اپنی عبرت ناک موت کو آواز دے ہی ڈالی اور پاتال سے بھی ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے لیکن وہ بزدل تو

اقوال زریں

اچھی بات یہ نہیں کہ اچھے وقت پر اچھی بات کرو بلکہ اچھی بات ہے کہ برے موقع پر بری بات نہ کرو۔

+++

اگر کوئی تم سے زیادتی کرے اور تم اس سے اچھائی کرو تو ریت پر لکھو اور کوئی تم سے اچھائی کرے تو اسے پتھر پر لکھو۔

+++

جو آدمی فارغ ہو اور اس کی نظر دوسروں کے عیوب پر نہ ہو وہ مصروف ہے اور جس کی نظر دوسروں کے عیوب پر ہو وہ فارغ ہے۔

+++

غلطی جتنی بڑی ہو اسے ماننے والا اس سے بڑا ہوتا ہے۔

+++

اگر تم نے سب کچھ کھو دیا ہے مگر حوصلہ، ہمت، دلیری نہیں کھوئی تو تم نے کچھ نہیں کھوایا۔

+++

مرسلہ: امتیاز احمد، کراچی

عورت کیا ہے

☆ عورت پورا چاند ہے اگر بادل اسے چھپانے لیں۔
☆ باد نسیم ہے اگر اس کا دامن کینہ اور فساد کے دھبوں سے آلودہ نہ ہو۔

☆ دلوں کا قرار ہے، اگر بے وفانہ ہو۔
☆ زندگی ہے اگر اسے پیار کیا جائے۔
☆ حسن ہے اگر اس پر توجہ دی جائے۔

☆ خوبصورت ہے..... اگر میک اپ نہ کرے۔
☆ زندگی بھر کا ہم سفر ہے۔ اگر اسے صدق دل سے اپنایا جائے۔

مرسلہ: ریاض بٹ..... حسن ابدال

بلا اس وقت مل جائے، اس کے بعد وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر خالق اور نور کو یہاں سے بھگا لے جائے گی۔

”ہمارے انکار کو آپ نے شاید دل پہ لے لیا تھا اور اسے ہمارا غرور یا ناپسندیدگی سمجھا، لیکن ایسی بات نہ تھی جو سچ بات تھی، وہ ہم نے بتادی تھی کہ ہمیں اپنے بیمار اور بوڑھے بابا جانی کی فکر تھی، کہ ہماری شادی کے بعد ان کی دیکھ بھال کون کرے گا لیکن جب وزیر خان نے ہم سے ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ کہا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں، ہم تمہارے بابا جانی کا شادی کے بعد بھی ہر طرح کا خیال کریں گے، تو ہم کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔“ بالآخر سائمن نے ان دونوں باپ بیٹا کی کھسر پھسر کو اختتام تک پہنچانے کی غرض سے ایک نیا تیرا اچھا لالہ تو وہ دونوں یکدم اس کی طرف متوجہ ہوئے اور وزیر خان اس کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں اور باجھیں پھیلا کر بولا۔

”تو کیا پھر ہم تمہارے انکار کو اقرار سمجھیں؟“

”انکار کی وجہ تو تم نے خود ہی ختم کر دی، رہی ہمارے اقرار کی بات تو وہ اس پر منحصر ہے کہ تم ہم پر کتنا بھروسہ کرتے ہو۔ دراصل ہم اپنے گھر کی تلاشی دینے کو اپنی سکی سمجھتے ہیں۔ کہنے والے تو یہی کہیں گے ناں کہ، پتا نہیں، حاجی خدا بخش کی بیٹی نے کیا چوری کر ڈالی ہے کہ، وڈیرے سائمن کو حویلی کی تلاشی لینے پر مجبور ہونا پڑا۔“

سائمن نے چالاکی سے کہا۔ وہ دانستہ کبھی آپ کا تکلم استعمال کر رہی تھی تو کبھی تم کا صیغہ.....

”اگر یہ بات ہے تو ہم ابھی بغیر تلاشی لیے لوٹ جاتے ہیں کیونکہ ہمیں بھی اپنی ہونے والی بیوی کے باپ کے گھر کی عزت کا خیال رکھنا پڑے گا۔“ وزیر خان نے سائمن کی طرف دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو سائمن نے پر حیا شرم کی اداکاری کرتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا۔

دونوں باپ بیٹا، اپنے حواریوں کے ساتھ بغیر گھر کی تلاشی لیے واپس لوٹ گئے۔

لیکن..... ساتھ ہی اپنے ان کارپردازوں کو پہلے سے زیادہ چوکس ہو کے مکان کی خفیہ نگرانی کی ہدایت بھی کر ڈالی جنہیں یہاں خفیہ طور پر مامور کر رکھا تھا۔

اب یہ سائمن کی بد قسمتی تھی یا پھر حد سے زیادہ اعتماد یا شاید..... غلط وقت پر غلط چال چلنے کا نتیجہ کہ..... اسے اس حقیقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ الف خان اور وزیر خان ان کے مکان کی خفیہ طور پر مستقل نگرانی بھی کروا سکتے ہیں۔

بہر طور..... دونوں باپ بیٹے کے جاتے ہی سائمن نے فوراً تہ خانے کا رخ کیا اور خالق اور نور کو ساری تفصیل بتا

”خوب! ہمیں زبردستی اور بلیک میل کر کے حاصل کرنے کا طریقہ اچھا نکالا ہے تم نے۔ تمہاری ہمیں حاصل کرنے کی یہ کوشش جارحانہ تھی لیکن ہم اسے بھی اپنے لیے تمہاری محبت کا ایک انداز سمجھتے ہیں۔“ سائمن کی اس اچانک کا یا پلٹ اور بے باکی پر باپ بیٹا دونوں چند ثانیے کے لیے حیران اور ہونق سے نظر آنے لگے، مگر وزیر خان تو سمجھ سا گیا۔ الف خان کو بھی دال گئی نظر آنے لگی، دونوں باپ بیٹے نے ہلکی آواز میں ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پھسری۔

بیٹا باپ سے بولا۔ ”بابا سائیں! عورت کے ہزار روپ ہیں، کب بے وقوف بن کے خود کو سپرد کر دے۔ لگتا ہے بے وقوف ہماری بلیک میلنگ کو محبت سمجھ رہی ہے، موقع اچھا ہے، وہ دونوں (خالق اور نور) بھلا اب کدھر جاسکتے ہیں، کیوں نہ پہلے اس پر ہاتھ صاف کر لیا جائے۔“

جوابا باپ بولا۔ ”بے وقوف! عورت کے ہزار روپ ضرور ہوتے ہیں، لیکن کیا خبر اس کے کس روپ میں محبت اور کس روپ میں موت چھپی ہوئی ہے؟ تلاشی لینے پر اڑے رہو، یہ مجرم ثابت ہو جائے گی تو راجواڑیں (جرگے) کے فیصلے میں اسے خود ہی حاصل کر لیں گے۔“ بیٹے پر باپ کی بات کا اثر نہ ہوا، بولا۔

”بابا سائیں! جب گھی سیدھی انگلی سے نکل رہا ہے تو ٹیڑھی انگلی کرنے کی کیا ضرورت ہے، تروپ کا پتا ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم جب چاہے خالق اور نور کو یہاں سے برآمد کر لیں گے، بلکہ ادھر ہی مروا دیں گے دونوں کو، لیکن..... یہ تیل اگر آسانی سے منڈھے چڑھ رہی ہے تو راجواڑیں (جرگے) وغیرہ کا کھٹواگ پالنے کی پھر کیا ضرورت ہے؟“

باپ فکر مندی سے بولا۔ ”اور اگر اس نے ان دونوں کو یہاں سے ہماری بے خبری میں فرار کروا دیا تو.....؟“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وزیر خان دھیمی آواز میں بولا۔ ”ہمارے آدمی چوبیس گھنٹے اس مکان کو گھیرے رکھیں گے، جیسے ہی خالق اور نور یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے، ہمارے آدمی ان دونوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے، اب چٹ بھی اس کی پٹ بھی اس کی، لیکن ہمیں وقت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

سائمن خاموش کھڑی دونوں باپ بیٹا کو کھسر پھسر کرتے دیکھ رہی تھی، وہ بہ ظاہر پرسکون نظر آرہی تھی لیکن..... اس کے اندر بھی زبردست ہچکچاہٹ ہوئی تھی، وہ اندر ہی اندر یہی سوچنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح یہ

عارفانہ سے کام لیا تھا۔

”ہمیں تمہارے پورے گھر کی تلاشی لینا ہے۔“ بالآخر الف خان نے دھماکا کیا۔

سائمن یکدم پھسری گئی۔ ”کیوں؟ کیا اب رشتے سے انکار کے جواب میں اسی طرح کی انتقامی روش کا سامنا کرنا پڑے گا ہم باپ بیٹی کو؟ کہ اب ہم پر چوری کا الزام بھی.....“

”زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں ہے، چھو کری!“ الف خان نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا اور پھر اصل بات بھی بتادی۔

”جس کو ہم پر اس بات کا شبہ ہوا ہے، اسے ہمارے سامنے لاؤ۔“ سائمن نے اندر سے پریشان اور تشویش زدہ ہونے کے باوجود پورے اعتماد سے کہا۔

”کھوجی رحموں کو ہم کیا پورا گوٹھ جانتا ہے، کہ وہ اپنے کام میں کتنا ماہر ہے۔ اس نے ہی ان دونوں (خالق اور نور) کے ”پہرے“ تلاش کیے ہیں جو حویلی سے بھاگنے کے بعد ہمارے آدمیوں کے تعاقب سے ڈر کے تیل گاڑی چھوڑ کے بھاگے اور سیدھا تمہارے گھر میں آ کے پناہ لی ہے۔“ الف خان نے اس کی طرف گھور کے بتایا تو سائمن نے بھی ترکی بہ ترکی جواب میں کہا۔

”پیسوں کے زور پر کسی بھی انسان سے کچھ بھی کہلوا یا جاسکتا ہے۔ یہ بے چارے سو گھی دال روٹی کھانے والے کھوجی پھر کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ میں پھر یہ کہوں گی کہ یہ ہمارے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہو رہا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر اگر ہم جھوٹے اور تم سچی ہو تو ابھی اسی وقت اپنے گھر کی تلاشی دو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا۔ کیونکہ ہمیں کھوجی رحموں کی بات پر پورا یقین ہے کہ اس بد ذات خالق نے ادھر ہی پناہ لے رکھی ہے۔“ وزیر خان نے سائمن کی طرف گھور کے کہا۔

سائمن اندر سے بہت پریشان اور کبیدہ خاطر ہو رہی تھی، جانتی تھی کہ وزیر خان جو کہہ رہا تھا وہ بہر حال جھوٹ نہ تھا، اگر وہ اسی طرح تلاشی پراڑے رہے تو، یقینی طور پر وہ تہ خانے سے خالق اور نور کو برآمد بھی کر سکتے تھے۔

سائمن زمانہ شناس تھی، جانتی تھی ایک حسین عورت کو کب تریا چلتر چلتے ہوئے مرد کو بے وقوف بنانا ہے، کب ضد پہ اڑنا ہے اور کب جھکنا ہے، لہذا اسے اب ضد پہ اڑنے سے کام بنا نظر نہیں آیا تو جھکی ہوئی پھل دار ٹہنی بن کر وزیر خان پر پہلی بار مسکراہٹ بکھار کر بولے ہوئے بولی۔

دی اور کہا۔

”اب تم دونوں کا یہاں میرے پاس رہنا کسی کے لیے بھی بہتر نہ ہوگا۔“

نور بولی۔ ”ادی سائین! تمہارا ہم پر بہت بڑا احسان ہے، تم نے خود کو مصیبت میں ڈال کر ہماری جان بچائی اور اب بھی ہماری مدد سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہو، لیکن..... خود مجھے امید نہیں ہے کہ ہم زندہ بھی بچ سکیں اس لیے جتنی جلدی ہو سکے، ہمیں خود سے دور کر دیں۔“ نور یہ کہتے ہوئے فرط غم سے رو پڑی۔ سائین کا دل بھی پیچھے لگا، خالقو نے بے اختیار محبت سے نور کو اپنے سے لگایا اور اسی لمحے میں بولا۔

”ماپوسی کی باتیں مت کرو نور! اللہ سائین پر کامل بھروسہ رکھو، وہ ہمارے ساتھ ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں میں کسی بھی موڑ پر تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ آخر دم تک تمہارا ساتھ نبھاؤں گا مگر تم بے حوصلہ ہونے لگو گی تو پھر میں کچھ نہ کر پاؤں گا۔“

”ادا خالقو ٹھیک کہہ رہا ہے نور! ایک فرد کی طاقت ایک عورت ہی ہوتی ہے اور تم خالقو کی طاقت ہو۔ پھر تم میری فکر نہ کرو، میرا اللہ مالک ہے۔ الف خان یا وزیر خان جیسے جابر انسان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ مگر ہمیں کوئی بھی قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔“ سائین کی بات پر خالقو نے اس سے کہا۔

”ادی مان واری! اللہ سائین کی تجھ پر رحمت ہو نور کی یہ بات بہر حال درست ہے کہ ہماری وجہ سے آپ بھی خطرے میں گھری ہوئی ہیں اور پھر الف خان وغیرہ کو بھی میں سمجھتا ہوں، اس بات پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا ہے کہ ہم اس مکان میں چھپے ہوئے ہیں، اس لیے اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے بھی نکل جانا ہوگا۔“

”ہاں! اب ایسا کرنا ناگزیر ہے۔“ سائین نے بھی اس کی بات کی تائید کر ڈالی اور مزید بولی۔ ”لیکن میں تم دونوں کو تنہا نہ ماساعد اور غیر یقینی حالات کے سپرد ہرگز نہیں کروں گی بلکہ میں خود تمہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر شہر روانہ ہو جاؤں گی، وہاں بھی ہماری ایک خالی قیام گاہ ہے، وہاں کچھ روز رہنے کے بعد تم سوچ سمجھ کر کسی اور دوسرے شہر چلے جانا۔“ نور اس بات پر رضامند نظر نہیں آرہی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ وہ بھی خطرے کا شکار ہو جائے لیکن خالقو چاہتا تھا کہ سائین کی مدد سے وہ بہ خیریت یہاں سے نکل سکتے ہیں۔

سائین کا اپنا دل کسی کا دیوانہ تھا اور جب دو دیوانے

مل بیٹھے تھے، تو بھلا ایک دوسرے کو کیسے تنہا چھوڑ سکتے تھے اس لیے سائین نے آخر دم تک ان دیوانوں کی مدد کرنے کا حتی فیصلہ کر لیا تھا۔

باہر نکلنے سے پہلے سائین نے اپنے کچھ خاص خدمت گاروں کو گرد و پیش کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا تھا، جنہوں نے آکر یہ تشویش ناک اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ مکان سے باہر کچھ مشکوک لوگوں کی نقل و حرکت دیکھی گئی ہے۔

اس انکشاف پر سائین نے بے بسی کے مارے اپنے ہونٹ بھیج لیے، اسے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنی مطلب براری کے لیے الف خان اور وزیر خان ان کے ساتھ چوے ملی کا کھیل، کھیل رہے تھے، یہ مشکوک لوگ یقیناً انہی کے متعین کردہ ہو سکتے تھے۔

سائین کی اب کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، وہ لمحہ بہ لمحہ خود کو الف خان اور وزیر خان کے مقابلے میں کمزور محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ سائین کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ اس نے الف خان وغیرہ کے انتہائی مطلوب و محبوب افراد کو اپنے ہاں نہ صرف خفیہ پناہ دے رکھی تھی بلکہ ان کی بھرپور مدد کرنے پر بھی کمر بستہ تھی، کبھی کبھی تو سائین خود بھی یہ سوچ کر لرز جاتی تھی کہ اگر معاملہ بگڑ گیا تو اس کا اپنا کیا حشر ہوگا؟ وہ سوچتی رہی اور سارا وقت پریشان ہوتی رہی کہ آخر وہ کیا کرے؟ کہ ایک اور نئی پریشانی نے جنم لے لیا۔

حاجی خدا بخش کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے بغیر سائین خود کو اکیلا محسوس کرنے لگی، یہ اس کے لیے ان حالات میں بڑا دکھ تھا مگر اس نے سوچا اللہ کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی، شاید کوئی بڑی مشکل یا مصیبت آنے والی تھی جو اس بیمار بوڑھے کے لیے ناقابل برداشت ہوتی اور وہ بڑا بے چین ہو کے اس دنیا سے رخصت ہوتا مگر اس متوقع مصیبت کو دیکھنے سے پہلے ہی بستر پر بڑی پرسکون موت مرا تھا۔ مرنے والے کے ساتھ مرانہیں جاتا، معاملات چلتے رہتے ہیں۔ سوگ کے تین روز بعد متوقع آنے والی مصیبت سے بچنے کی تدبیر کے لیے سائین نے اس دن سائین جوڑیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے کی درگاہ کا رخ کیا۔ سائین کے جی کو جانے کیا سوچیں تھی کہ اس نے اس سلسلے میں ساون فقیر سے مدد اور مشورہ کرنے کی ٹھانی تھی۔

تنہائی میں موقع پا کر وہ ساون فقیر کے دو در پہنچی اور دھیرے دھیرے اسے ساری حقیقت سے آگاہ کر ڈالا۔

ملنگ ساون فقیر، جو پہلے ہی سے خالقو اور نور کے

در اور دروازہ

معاملہ دل سے آگاہ تھا، اب جو اس نے ان کے متعلق یہ تازہ مگر مخدوش صورت حال سے آگاہی حاصل کی تو وہ یکدم گم صم سا ہو گیا۔ وہ کئی تائینے تک کسی گہری اور پرسوج خاموشی میں مستغرق رہا۔

سائین بھی خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو سکے جاری تھی، اپنے محبوب کے دو در اور قربت میں از خود اس کے اندر کی ساری پریشانیاں اور بے چینیوں ختم ہونے لگی تھیں۔ یہاں ہمیشہ اسے ایک روحانی سکھ اور سکون سا ملا کرتا تھا۔

”کیا مجھے اور کوئی بات بتانے کو رہ تو نہیں گئی ہے؟“ معا ساون فقیر نے وجدانی سی آواز میں سائین کی طرف دیکھ کر کہا۔

سائین کو جانے کیوں ایک جھٹکا سا لگا۔ ساون کے پوچھنے پر سائین کے ذہن میں اچانک ہی ایک جھماکا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ کیا بات تھی اور..... جو بتانے کو رہ گئی تھی اور جسے ملنگ ساون نے فوراً محسوس کیا تھا۔

تب پھر اچانک اسے خیال آیا کہ وہ وزیر خان سے متعلق اسے یہ بتانے سے دانستہ یا غیر دانستہ کترا گئی تھی کہ وزیر خان اس سے شادی کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ یہ بتانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا، مگر اب ساون کے پوچھنے پر اس نے سر جھکا کے یہ بات بھی بتادی۔

یہ بات سننے کے بعد ساون فقیر نے جلالی آواز میں کہا۔ جبکہ اس کے لہجے میں سائین کے لیے بالخصوص تشویش کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔

”تمہیں نا دیدہ چال کے چال میں جکڑا جا رہا ہے اور ان دونوں (خالقو اور نور) کے ساتھ بھی کسی خاص مقصد کے تحت چوے ملی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔“ سائین نے کہا۔

”سائین! آپ کی بات کو میں جھٹلا نہیں سکتی، لیکن اب کیا کیا جائے؟ کیونکہ میں تو نیک نیتی سے ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔“

”در کو جھٹلانے والے جب نفس کے دروازے کا رخ کرتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

حجرے میں ساون فقیر کی جلالی آواز ابھری۔ ”اللہ سائین کے در پہ ما تھا نیکنے سے جب خدا مل جاتا ہے تو محبوب کیسے نہیں ملتا، میں نے خالقو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ آگ سے مت کھیلے اور وقت کا انتظار کرے، ورنہ اپنے ساتھ کسی اور کی جان کو بھی اس میں جلا ڈالے گا۔“

”سائین! دیوانے کو ایسی باتیں سمجھ میں آنے لگ

جوان اور خوبصورت لڑکی

خوبی کے پاس اپنی قیمت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے گئی خوبی نے جوان لڑکی کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے اندازے سے کہا۔ ”تمہاری شادی تمہارے خوابوں کے شہزادے سے ہوگی جو جوان خوبصورت اور صحت مند ہوگا۔“ اور دولت مند بھی؟“ لڑکی نے سوالیہ نظروں سے خوبی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہاں ہاں کیوں نہیں دولت بے انتہا ساتھ میں عمر بھی ۲۸ سال کے قریب؟“ خوبی نے جواب دیا۔ ”لڑکی خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔“ اب مجھے یہ بھی بتادو کہ میں اپنے موجودہ شوہر سے کس سسرال جان بچھڑا سکتی ہوں!!“

جائیں تو پھر اسے دیوانہ ہی کیوں کہا جائے، وہ تو بس اپنے محبوب کو ہر قیمت پر پالنے کے لیے..... دیوانہ وار آتش نمرود میں بھی کود جاتے ہیں۔“ سائین نے بڑے بے تے انداز میں سہی، یہ جملے کہے تھے مگر ان جملوں کی تپش سے وہ خود کھٹکنے لگی تھی۔

ساون فقیر نے بڑے دھیان سے محبت کا یہ فلسفہ سنا تھا، بارش چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری تھی پھر بولا۔ ”ہاں! دیوانہ واقعی دیوانہ ہی ہوتا ہے، وہ تو خود سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے، سمجھانے والے الفاظ و جملے اس کے لیے بے معنی ہوتے ہیں، لیکن ہمارے لیے وہ بڑے معنی رکھتے ہیں، المیہ تو یہی ہے کہ جوش و جذبات میں نصیحت اثر نہیں کرتی مگر نصیحت کرنے کی ضرورت بھی ایسے ہی وقت پڑتی ہے لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہے، غیرت اور عزت سے بڑھ کر بے انت خواہشات کا خار ڈار ہے، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اور زہر، زہر کو..... لہذا اب اس مسئلے کا مجھے ایک ہی حل نظر آتا ہے۔“

”وہ کیا سائین؟“ سائین نے یکدم بے قرار ہو کے پوچھا۔

ساون فقیر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم خواہشات کے دروازے سے اپنا ما تھا اٹھاؤ اور رب سائین کے در پہ ما تھا نیک دو، تمہیں دو انسانوں کو بچانے اور ان کی فلاح کی

معاوضہ

”آپ مجھے اس طرح پیار کیوں نہیں کرتے جس طرح شاہ رخ فلم میں کاجول سے کرتا ہے؟“ بیوی نے بڑے لاڈ کے ساتھ پوچھا۔

”وہ پیار کرنے کے دو کروڑ لیتا ہے!“ شوہر نے آنکھیں نکال کے جواب دیا۔ ”تمہارے ابا نے کبھی مجھے دو سو روپے بھی دیے!“

ہانیہ عزیز، کراچی

زندگی کے موڑ

یاد رکھو کہ ہر شخص کی زندگی میں دو اہم موڑ آتے ہیں... ایک داہنا موڑ اور دوسرا بائیں موڑ...!

رائف چودھری، جہلم

”ان دونوں معصوموں کی جان بخش دو، انہیں جانے دو، میں اس شادی پر آمادہ ہو جاؤں گی، نہ صرف یہ بلکہ اپنا سب کچھ تمہارے نام بھی بہ رضا خوشی لکھ دوں گی۔“

لیکھت کرے میں اسرار بھونچا خاموشی طاری ہو گئی۔

”تم بھول رہی ہو کہ اس وقت تم اپنا کوئی بھی مطالبہ ہم سے منوانے کی پوزیشن میں نہیں بنو سائیں!“ الف خان نے گھبر لہجے میں اس سے کہا۔

”ہم اب بھی چاہیں تو.....“

”بھول تم رہے الف خان.....“ معا سائین نے اس کی بات کاٹ کر غیر تاثر لہجے میں کہا۔ ”میں نے ابھی کہا تھا کہ زبردستی اور طاقت کے زور پر مجھے حاصل تو کیا جاسکتا ہے، مگر میری دولت جائیداد نہیں، اگر میرے ساتھ ایسا کیا بھی تو میں جرگے کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہوں۔ جس کی شروعات تم سے پہلے ہی ہو چکی ہوگی اور تمہیں اندازہ ہوگا ہی کہ ایک بار معاملہ جرگے سے حل ہو بھی جائے تو وہی جرگہ ملزم کے لیے نجات دہندہ بھی بن سکتا ہے۔“

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ ان کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ حاجی خدا بخش کی بیٹی، اتنی ذہین فطین اور چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ ”پیش آئند“ حالات کا اس قدر کھلا اور واضح ادراک بھی رکھتی ہے۔

یہی سبب تھا کہ سب کچھ کر سکنے کا اختیار رکھنے کے باوجود بھی وہ دونوں باپ بیٹے، ایک عورت کے سامنے خود کو مجبور سمجھ رہے تھے۔

بالآخر ”یہ ڈیل“ دو طرفہ کامیاب قرار پا گئی۔

سائین کی ایک آخری کوشش یہ بھی تھی کہ وہ..... خود کو وزیر خان جیسے ناپسندیدہ شخص سے شادی کرنے سے بچا لیتی اور ایسے ہی سب کچھ الف خان اور وزیر خان کے حوالے کر کے، خالقو اور نور کی زندگی بچانے کا سودا کر لیتی مگر.....

بلا جواز اتنی بڑی جائیداد اور زمینوں سے محروم ہو جانا اور پھر الف خان وغیرہ کی ملکیت میں چلے جانا، بہت سی باتوں کو جنم دے سکتا تھا، اس سے بچنے کے لیے، سائین نے اس بات پر بھی غور کیا تھا کہ جرگے کا ڈراما ہی رچا کے جرمانے کی صورت میں ہی وہ اپنا سب کچھ الف خان وغیرہ کے حوالے کر دیتی تو، اس میں یہ قیامت تھی کہ..... خالقو اور نور کو جرگے کے سامنے ظاہر کرنا پڑتا اور پھر دونوں کو روایتی اصول کے مطابق الف خان وغیرہ کے حوالے کر دیا جاتا،

ہو رہی تھی۔ سات پردوں میں، کسی خفیہ گوشوں میں ایسی ”ڈیلنگ“ بے شک اپنے اندر بڑی کریہہ حقیقت رکھتی ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس میں ایک انداز مثبت ہوتا ہے اور دوسرا منفی۔

جن تین افراد کے درمیان رات کے اس پہر یہ اہم نوعیت کی خفیہ ڈیلنگ ہو رہی تھی، ان کے نام تھے..... ڈویرا الف خان..... اس کا بیٹا، وزیر خان..... اور تیسری ایک عورت جو حاجی خدا بخش کی بیٹی..... سائین تھی۔

اس قسم کی خفیہ ”ڈیلنگ“ میں ساری باتیں صاف صاف اور کھل کے کر دی جاتی ہیں۔ ایسی ڈیلنگ کے نتیجے میں سب کچھ متوقع ہوتا ہے، غیروں سے گٹھ جوڑ، انہوں سے ناتا توڑنا، عزت نفس کا جنازہ، غیرت بالائے طاق اور..... خونی رشتوں کے سودے بھی..... یہاں بھی ایک ایسا ہی سودا ہو رہا تھا۔

تاہم یہ بات واضح تھی کہ اس ڈیلنگ میں سائین کا مقصد مثبت تھا اور وہ یہ سب سادون فقیر کے ایما اور نصیحت کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے کر رہی تھی۔

”میں پہلے ہی یقین کی حد تک شبہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں کو تم نے ادھر ہی پناہ دے رکھی ہے۔“ الف خان کی سرسراہی آواز ابھری جو کسی حد تک سرگوشی سے مشابہ تھی۔ سائین نے انہیں بالآخر بتا دیا تھا کہ ان کے دونوں شکار خالقو اور نور اس کی پناہ میں تھے۔

”ہم چاہتے تھے تو زبردستی تلاشی لے کر یہاں نہ خانے سے ان دونوں کو برآمد کر سکتے تھے، پھر ان دونوں کا ہم جو حشر کرتے سو کرتے، تم بھی نہیں بچ سکتی تھیں۔“ یہ آواز وزیر خان کی تھی، جو فتح اور نشے کے غرور سے لبریز تھی۔

سائین نے سپاٹ مگر دھیمی آواز میں کہا۔

”ہونے کو سب کچھ ہو سکتا تھا، لیکن اسی ”سب کچھ“ ہونے میں ایک بھی بات نہ ہو پائے تو سمجھو کچھ نہیں ہوا۔ تم راجواڑیں فیصلے میں مجھے گھسیٹ کر خود سے شادی پر مجبور تو کر سکتے تھے، مگر میں تمہارا اصل مقصد پھر بھی کبھی پورا نہیں ہونے دیتی، تم کیا، کوئی بھی شوہر قانوناً اور شرعاً اپنی بیوی کی جائیداد اور دولت زبردستی اپنے نام نہیں لکھوا سکتا۔“

سائین کے اس نپے تلے اور دو ٹوک جواب پر دونوں باپ بیٹے کولمبہ بھر کے لیے سانپ سوگھ گیا پھر وزیر خان نے لب کشائی کی۔

”اب کیا چاہتی ہو تم؟“

خاطر ایک بڑی قربانی دینا ہوگی، مگر خبردار..... اس کا اجر کسی بشر سے نہیں صرف اور صرف اللہ سائیں سے مانگنا۔“

”مجھے کک..... کون سی قربانی دینا ہوگی سائیں؟“

سائین کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

”ڈویرا الف خان اور وزیر خان سے معاملے کی بات کرو۔“ سادون نے گہرے لہجے میں کہا۔

”معاملے کی بات؟“ وہ الجھ سی گئی۔ ”کون سے معاملات کی بات سائیں؟“

سادون فقیر نے اسے تسبیح والے ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنے ذرا قریب آنے کا کہا۔ سائین دھیرے سے سرک کے اس کے قریب ہو گئی۔

•••••

جو کام اسے سمجھایا گیا تھا وہ فوری عمل کا متقاضی تھا۔ یہ سب اگرچہ سائین کے دل و دماغ پر ایک پہاڑ جیسے بوجھ سے کم نہ تھا مگر اس کے سائیں، اس کے محبوب..... سادون فقیر کی اسے یہی کرنے کی نصیحت تھی سائین کو یوں یہ سب کرنا ناممکنات میں سے ہی نظر آ رہا تھا لیکن محبوب کی بات..... اس کی نصیحت..... سائین کے لیے تو حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

سائین نے جب سادون فقیر کی پوری بات سن لی تو بے اختیار رو دی، اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا سب کچھ ختم ہو رہا ہو، سارا کچھ چھن رہا ہو، اس نے کس قدر بے چارگی اور رحم طلب نگاہوں سے اپنے محبوب کی طرف دیکھ کر اتنا کہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو میرے سائیں؟ میں تو جیتے جی مرجاؤں گی۔“

”پہلی! تم مردگی نہیں، امر ہو جاؤ گی۔ آج تک تم دل کا دروازہ ہی کھٹکھٹاتی رہیں، اب ذرا در پہ ماتھا بھی ٹیک کے دیکھو، یہ اللہ کا در ہے جہاں انہونی بھی ہونی ہو جاتی ہے، انسان کو وہ کچھ مل جاتا ہے جسے اس کی توقع بھی نہیں ہوتی، پس! ایک ذرا اس کے لیے قربانی تو دے کر دیکھ۔“

سادون فقیر کے پر جذب لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ سائین کو اپنے تن مردہ میں ایک ایسی انجانی قوت سی اترتی محسوس ہوئی اور اس نے دل کا دروازہ چھوڑ کے درمولا پہ سر ٹکا دیا۔

•••••

زمیندار حاجی خدا بخش کے مکان کے ایک گوشے میں ان تینوں کے درمیان بڑی خفیہ اور اہم نوعیت کی ”ڈیلنگ“

یہ ساون فقیر کی محبت کا اثر تھا؟ وہ سوچتی کہ محض ایک اشارے پر اس نے اپنی زندگی کا اتنا اہم بڑا اور کڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں اس کے اپنے محبوب کی مرضی کا دخل تھا، اس کی نصیحت، اس کا حکم تھا۔ شاید یہی بات تھی۔ مگر نہیں، سائین کے لیے صرف یہی بات نہیں تھی اس کا حکم، اس کا کہنا ماننے کے لیے کچھ اور بھی تھا، کچھ ایسا تھا جس کے باعث سائین نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا اور اہم قدم اٹھایا تھا۔ اس کی بات میں ایسا کیا تھا جو اس کے کہنے پر اس نے یہ عمل کیا تھا؟ کیا اس میں اس کی فرماں برداری تھی یا کسی برآور ہوئی امید کا لالچ..... پھر کیوں ساون فقیر کے یہ الفاظ بار بار اب اس کی سماعتوں میں گونج رہے تھے۔ وہ آخری الفاظ جن پر اس نے فوراً عمل کیا تھا۔

”تم خواہشات کے دروازے سے اپنا ماتھا اٹھاؤ اور رب سائین کے در پہ اپنا ماتھا ٹیک دو، تمہیں دو معصوم اور بے گناہ انسانوں کو بچانے اور ان کی فلاح کی خاطر اپنی خواہشات کی ایک بڑی قربانی دینا ہوگی، لیکن خبردار اس کا اجر کسی بشر سے نہیں صرف اور صرف اپنے اللہ سائین سے مانگنا، اسی سے اجر کی توقع رکھنا۔“

”سائین! میں تو جیتے جی مرجاؤں گی۔“ اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔

”بھئی! تم مرو گی نہیں امر ہو جاؤ گی اللہ کے در پہ تم سرخرو ہو جاؤ گی۔“ ساون فقیر نے بڑے جذب کے عالم میں اور پورے یقین سے کہا تھا۔

”آج تک تم دل کا دروازہ ہی کھٹکھٹاتی رہی ہو اب اس در پہ ماتھا بھی ٹیک کر دیکھو، یہ اللہ کا در ہے جہاں انہونی بھی ہوتی ہو جاتی ہے اور انسان کو وہ کچھ مل جاتا ہے، جسے اس کی توقع بھی نہیں ہوتی، پس! ایک ذرا اس کے لیے قربانی تو دے کر دیکھ.....“

اب سائین اس امید کے آسرے پہ کچھ دیکھنے کی منتظر تھی۔



دونوں باپ بیٹے بہت شاداں و فرحاں تھے، ان کی جاگیر میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ محاورتا نہیں بلکہ حقیقتاً شمالاً جنوباً تک پھیل گئی تھیں۔ وقت کا وتیرہ گزرتا ہے، وہ گزرتا رہا۔ پھر تھوڑے عرصے میں وزیر خان نے وہی کیا تھا جس کی توقع سائین کو بھی تھی، یعنی اسے بیکار ”شے“ سمجھ کر حویلی کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کی طرف سے بڑی سنگ دلی اور بے رخی برتی جاتی۔ وقت نے پلٹا کھایا۔ امید کا جادو چلا، اجر کے ملنے کا وقت اور قربانی کے صلے کا وہ بڑا انوکھا دن

تھا کہ پتا چل گیا، اللہ کی لالچی بے آواز ہے، حرکت میں آتی ہے تو عالم جابر اور نفس پرست انسان اس کی تیزی کی پیمائش تک بھی کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

وزیر خان، نیکار کے لیے چھو کے نیم صحرائی علاقے کی طرف گیا تھا کہ کسی نامی گرامی خطرناک اور صوبائی شہرت یافتہ ڈاکوؤں کے گروہ سے اس کی مڈ بھیڑ ہوگئی۔ وہ اسے تاوان کی خاطر اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر وزیر خان اور اس کے چند مسلح ساتھیوں نے ان سے جنگ کی ٹھانی۔ اس جنگ میں وزیر خان سردار ڈاکو کی گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔

جوان بیٹے کی لاش حویلی پہنچی تو کھرام مچ گیا۔ باپ الف خان یہ غم نہ سہ سکا، اسے سکتہ ہو گیا۔

کونے کی صورت میں وہ تین دن شہر کے بڑے اسپتال میں رہا اور چوتھے دن وہ بھی چل بسا۔

سائین نے چالیس روز سفید جوڑا پہنے رکھا۔ اس کے سات روز بعد وہ اب عام لباس میں نظر آنے لگی۔

اس روز وہ..... سائین جو ذیل شاہ المعروف بابا کالی چادر والے کی درگاہ پہنچی۔ وہ ملنگ ساون فقیر سے ملنا چاہتی تھی مگر وہاں مریدین اور خدام سے معلوم ہوا کہ ملنگ فقیر ساون کی کو بتائے بغیر کہیں چلے گئے ہیں۔ سائین کے دل کو دھچکا لگا۔ اسے ساون کے یہ الفاظ یاد آنے لگے۔ ”درمولا پر اس کی امید جگائے رکھو، اجر بشر سے نہیں، صرف رب سے مانگو جو انہونی کو ہونی کر دیتا ہے۔“

وہ سوچنے لگی، انہونی تو ہو گئی تھی اور شاید اجر بھی مل گیا تھا مگر آس کیوں قریب ہوتے ہوئے دور چلی گئی تھی؟ وہ دل مسوس کر واپس لوٹ آئی۔

اب وہ ساری جاگیر کی مالک تھی، گوٹھ کی دولت مند بیوہ وڈیرنی کہلانے کی حقدار تھی مگر اس نے اپنا سارا مال غریبوں کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے گوٹھ ہی میں باقاعدہ غریب، نادار اور بے سہارا عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ادارہ قائم کر دیا اور اس میں عورتوں ہی کو ملازم رکھا۔ ایک روز وہ خود اپنی حویلی کے باہر اپنے ہاتھ سے لنگر بانٹ رہی تھی کہ اچانک دو ہاتھ آگے بڑھے۔ وہ کسی کی مخصوص خوشبو کو پہچان گئی اور چادر ہٹا کے، سر اٹھا کے دیکھا۔ سامنے ساون فقیر کھڑا تھا، اس کے چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ تھی۔ بے اختیار سائین نے ان دونوں ہاتھوں کو تھام کر چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

